ماہنامہ **جامعہ** دہلی

مدیر: ضیاء الحسن فاروقی — مدیر معاون: عبداللطیف اعظمی

جلد ۷۶	بابت ماہ جنوری و فروری ۱۹۷۹ء	شمارہ ۱ و ۲

جامعہ ملیّہ اور علوم اسلامیہ

نائب وزیر حج حکومت سعودیہ کا خیر مقدم

۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ جب قائم ہوئی تو اس کے بانیوں کے ذہن میں یہ تھا کہ اسے بغداد اور قرطبہ کی اعلیٰ درس گاہوں کی طرح ایک عظیم الشان دار العلوم بنایا جائے، چنانچہ اس کے لیے جو نصاب بنایا گیا اس میں جدید علوم کے ساتھ مذہب اسلام، قرآن و تفسیر، علم حدیث، تاریخ اسلامی اور عربی زبان و ادب کو نمایاں حیثیت حاصل تھی، یہ یوں بھی ضروری تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی صدیوں کی تاریخ کے دوران علوم اسلامیہ کے ذخیرہ میں مہتم بالشان اضافہ کیا تھا، لغت، تفسیر قرآن، حدیث اور فقہ کے شعبوں میں ان کے علمی کارناموں سے ساری دنیا واقف ہے۔ علوم دینیہ کے ان شعبوں میں ان کی خدمات کی داستان بڑی طویل ہے، پھر اس ملک کے علماء کے مجددانہ و مجاہدانہ کارنامے بھی مشہور عالم ہیں، ان سب کی تفصیل بیان کروں تو ایک دفتر تیار ہو جائے، اور جب ولی اللّٰہی مکتب خیال کے ایک ممتاز نمائندے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی نے جن کا علم حدیث میں سلسلۂ درس بیچ میں چار اساتذہ کو چھوڑ کر شاہ ولی اللّٰہؒ سے ملتا ہے، اس جامعہ کا سنگِ بنیاد رکھا تو

اس کے دینی عزائم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، لیکن چونکہ اس جامعہ کا ایک بنیادی نصب العین
برطانوی سامراج سے ہندوستان کو آزاد کرانا بھی تھا کہ ہندوستان کی آزادی عالم اسلام کے ایک بہت
بڑے علاقے کی آزادی کے مترادف بھی تھی، اس لیے برطانوی دورِ حکومت میں اس جامعہ کو ترقی کا موقع
نہیں ملا۔ لیکن اس کے باوجود اس درس گاہ نے علوم اسلامیہ کی عظیم الشان خدمت انجام دی،
اس کے شیخ الجامعہ نے جو بعد میں آزاد ہندوستان کے صدر رہے اور جن کا نام ڈاکٹر ذاکر حسین تھا،
شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ایک ممتاز شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی کو جامعہ میں بلایا اور علوم اسلامیہ
کا ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ "بیت الحکمت" کے نام سے قائم کیا۔ اس نام سے ہمارا ذہن فوراً خلافت عباسیہ
کے ممتاز حکمراں ہارون اور مامون کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اس سے جامعہ کے علمی منصوبوں کا پتہ چلتا ہے۔
آزادی کے بعد ہم کو ترقی کا موقع ملا ہے اور علوم جدیدہ کے ساتھ ہمیں عربی زبان و ادب، علوم اسلامیہ
اور فارسی زبان و ادب کے شعبوں کو قائم کرنے اور اس جامعہ میں دینی علوم کے ساتھ اسلامی زبانوں خاص
طور سے عربی زبان کو سکھانے اور رائج کرنے کا موقع ملا ہے۔ اسی کے ساتھ ہم نے علوم اسلامیہ میں اعلیٰ
تحقیقی کام کے لیے ایک انسٹی ٹیوٹ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے نام سے قائم کیا ہے،
ہمارا خیال ہے کہ ہم اسے بیت الحکمت کے نہج پر ترقی دیں۔

اس جامعہ میں ایک عالیشان مسجد سعودی حکومت کے گراں قدر عطیہ سے تعمیر ہوئی ہے۔ اس مسجد کو
آپ ابھی ملاحظہ فرمائیں گے۔ سعودی حکومت کی عنایت سے ہمیں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کی عمارت کے لیے
بھی ڈھائی لاکھ روپے کا عطیہ ملا ہے۔ ہم نے عمارت کا جو نقشہ بنوایا ہے وہ دس لاکھ روپے کا ہے، ہم اس انسٹی ٹیوٹ
کی عمارت مسجد کے پاس بنوانا چاہتے ہیں، مسجد کے پاس ہی ہماری لائبریری ہے۔ جامعہ کی مسجد، انسٹی ٹیوٹ کی
عمارت اور لائبریری تینوں مل کر اس درس گاہ میں ایک ایسا اسلامی سینٹر بن جائے گا جو ہماری دینی و ثقافتی
علمی زندگی کا مرکز ہوگا۔ ہمارا منصوبہ ہے کہ اس سینٹر سے دین اسلام کی صحیح معنوں میں خدمت ہو، علوم اسلامیہ
کی مختلف شاخوں، مثلاً تفسیر، حدیث اور فقہ میں تحقیق کا کام اعلیٰ درجہ کا کیا جائے، ہندوستانی مسلمانوں کے
دینی و علمی کارناموں پر ریسرچ کی جائے اور انھیں دوسری زبانوں، خاص طور سے عربی اور انگریزی میں شائع
کیا جائے۔ عربی زبان میں "اسلام اور عصرِ حاضر" کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ نکالا جائے جس میں انسٹی ٹیوٹ
کے تحقیقی کام کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر وقیع مضامین شائع ہوں تاکہ عالم اسلام ہمارے

حالات، ہماری بلندی اور ہماری پستی سے باخبر رہے، ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی تحقیقی و علمی سرگرمیوں میں جن میں مغربی ایشیا خاص طور سے عرب ملکوں کے معاشی، سماجی اور سیاسی ترقیات سے متعلق مطالعات خاص طور سے شامل ہوں گے نہ صرف جامعہ کے سماجی علوم کے شعبے ہی اشتراک و تعاون کریں بلکہ دنیائے اسلام کے، خاص طور سے عرب ممالک کے، بڑے بڑے اسکالر جو دینی ذوق رکھتے ہوں جامعہ آئیں، انسٹی ٹیوٹ میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کچھ دن قیام کریں تاکہ ان کے علم، علمی شخصیت اور تجربے سے جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ کو استفادہ کا موقع ملے۔ اسی غرض سے ہم نے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کی عمارت کا جو نقشہ بنوایا ہے اور جس کے مطابق عمارت جلد بننی شروع ہو جائے گی، اس میں ایک ونگ میں باہر سے آنے والے وزیٹنگ پروفیسر کے قیام کے لیے اچھے اور آرام دہ کمروں کی تعمیر کا منصوبہ بھی ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی عمارت اور ایسے منصوبوں کے لیے کثیر وسائل کی ضرورت ہے، سعودی حکومت کی گراں قدر امداد سے مسجد بن گئی ہے، اسی کے عطیہ سے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جانے والا ہے، ہم جانتے ہیں کہ سعودی حکومت ایسے علمی مراکز کی جو دین کا مرکز بھی ہوں اور جو الحاد کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں دین کا عظیم الشان منارہ روشن رکھیں، ہمت افزائی کرتی ہے۔

مہمان مکرم! ہم آپ کے بھائی ہیں آپ ہمارے ایسے عظیم بھائی ہیں کہ آپ کی حکومت حرمین شریفین کی جو تمام دنیا کے مسلمانوں کی دونوں آنکھوں کا نور ہیں، خادم اور محافظ ہے اور اس دین کی خدمت گذار جس کا آفتاب مکہ معظمہ سے طلوع ہوا اور مدینہ منورہ کے افق سے ایسا چمکا کہ ساری دنیا روشن اور منور ہو گئی۔

مذکورہ بالا مضمون جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے اساتذہ اور طلبہ کے اس جلسے میں پڑھا تھا، جو سعودی عرب کے ڈپٹی منسٹر امور حج جناب شیخ عبداللہ بوقس کے اعزاز میں ۸ رفروری کو شعبۂ اسلامک و عرب ایرانین اسٹڈیز میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے اور تلاوت قرآن حکیم کے بعد شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب نے معزز مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس گہرے تعلق کا ذکر فرمایا جو حکومت سعودیہ اور سعودی عوام کو جامعہ سے ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ مسلمانان ہند کے دلوں میں اس وجہ سے سعودی عرب کا بڑا احترام اور ان سے بڑی عقیدت ہے کہ وہ مقامات مقدسہ

(بقیہ صفحہ ۳ پر)

کوائفِ جامعہ

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی یاد میں جلسہ

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی وفات کی اطلاع ماہنامہ جامعہ کے پچھلے شمارے میں دی جاچکی ہے۔ مرحوم کی یاد میں شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب کی صدارت میں ۲۰ر دسمبر ۷۸ء کو جامعہ میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں جامعہ کے سابق استاد اور انجمن جامعہ کے حیاتی رکن جناب سعید انصاری صاحب نے ایک طویل تقریر کی اور جامعہ کے سینیر ڈین جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے ایک مبسوط مضمون پڑھا، جن میں مرحوم کی شخصیت اور خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صاحب (ریڈر شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی)، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر مشیر الحق، پروفیسر شمس الرحمن محسنی، جناب روشن لال گپتا، جناب رادھے شام پاٹھک اور ڈاکٹر شمیم حنفی صاحب نے تقریریں کیں۔ آخر میں شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب کی طرف سے ان کے سکریٹری عبد اللطیف اعظمی نے حسب ذیل تجویز پڑھ کر سنائی جو خاموشی کے ساتھ کھڑے ہو کر منظور کی گئی۔

" ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نہ صرف یہ کہ ایک مثالی استاد تھے، بلکہ اردو کے بہترین مترجم، بے نظیر مصنف اور قابل تقلید دانشور رہتے۔ انھوں نے کوئی تیس سال تک درس و تدریس کے ذریعہ تعلیم کی اور تقریباً ۵۵ سال تصنیف و تالیف، ترجمے اور اردو اکادمی کے ذریعہ اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کی۔ عمر کے آخری دور میں آپ نے اسلام اور عصر جدید کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور اس کے ذریعہ مذہب اور ہندوستانی سماج دونوں کی عظیم الشان خدمت انجام دی اس میں شبہ نہیں کہ وہ مذہبی اقدار کو زندگی میں اولین اور سب سے اونچا مقام دیتے تھے، مگر اسی کے ساتھ ان کی زندگی سیکولرزم

کا بہترین نمونہ تھی۔ وہ تمام فرقوں اور تمام مذاہب کا یکساں احترام کرتے تھے۔ انھوں نے انسان دوستی (ہیومنزم) کی حمایت میں صرف مضامین ہی نہیں لکھے، اس کے بنیادی اصولوں پر سختی سے عمل بھی کیا۔

جامعہ کے استادوں، کارکنوں اور طالب علموں کا یہ جلسہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی وفات کو ملک و قوم اور علم و تعلیم کے لیے بالخصوص جامعہ کے لیے ایک نقصان عظیم تصور کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ مرحوم کو اعلیٰ علیئین میں جگہ دے اور بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ، حکیم مہدی حسن صاحب، ڈاکٹر صغریٰ مہدی صاحبہ اور دیگر اعزا کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!"

جلسے کا آغاز تلاوت قرآن حکیم سے ہوا تھا جسے مسجد جامعہ کے پیش امام مولانا محمد سلیمان قاسمی صاحب نے انجام دیا تھا۔

عابد صاحب کی وفات کی خبر پڑھ کر جامعہ کے سابق طالب علم اور سابق استاد جناب سید نذیر نیازی صاحب نے جن کا مرحوم سے گہرا اور خصوصی تعلق رہا ہے۔ لاہور سے راقم الحروف کو خط لکھا اور اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔ موصوف لکھتے ہیں: "عابد صاحب کی وفات کا دلی رنج ہے۔ عابد صاحب ۲۶ء میں دہلی [جامعہ] آئے، ۲۶ء سے جب تک [میرا] دہلی [جامعہ] میں قیام رہا عابد صاحب سے شب و روز کی ملاقاتیں سامنے آگئیں، جیسے وہی دن ہوں، وہی جامعہ اور اس کے در و دیوار، عابد صاحب سے باتیں ہو رہی ہیں علمی مباحث ہیں، ادبی مضامین، لطائف اور برج۔ تھوڑی دیر کے لیے ماضی میں گم ہو گیا۔ ۵-۶ برس ہوئے عابد صاحب لاہور آئے، مرحوم وقار عظیم کے یہاں ملاقاتیں ہوئیں۔ افسوس خدا کو منظور نہیں تھا کہ پھر ان سے ملاقات ہوتی، عابد صاحب سے ملاقات کی حسرت ہی دل میں رہ گئی۔ میں کیا کہوں کہ مجھے ان کی وفات کا کتنا صدمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، ان کے مقامات میں اضافہ کرے۔ آمین۔ بیرن صاحب سے میری طرف سے تعزیت کر دیجئے اور بیگم صاحبہ سے بھی۔"

شامی وفد کا خیر مقدم

جمہوریہ شام کا ایک وفد ۳۱ جنوری کو جامعہ ملیہ آیا جس کے سربراہ شام کے وزیر اوقاف جناب عبدالستار سید تھے، ان کے علاوہ مفتی حلب شیخ محمد الحکیم شامی اوقاف کے ڈائریکٹر اور دوسرے حضرات شامل تھے۔ شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی، کالج کے پرنسپل جناب ضیاء الحسن فاروقی اور دیگر

اساتذہ نے اس وفد کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اس کے اعزاز میں شعبۂ اسلامک و عرب و ایرانین اسٹڈیز میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں اساتذہ اور طلبا نے عربی میں تقریریں کیں۔ تلاوت قرآن مجید کے بعد شیخ الجامعہ جناب قدوائی صاحب نے انگریزی میں تقریر کی جس کا عربی میں ترجمہ شعبے کے استاد ضیاء الحسن ندوی صاحب نے کیا، اس کے بعد صدر شعبہ ڈاکٹر سید محمد اجتبا ندوی نے جامعہ ملیہ اور شعبے کا مفصل تعارف کرایا پھر طلبا کی طرف سے ایم اے پہلے سمسٹر کی طالبہ فرحانہ طیب نے عربی زبان میں معزز مہمانوں کا استقبال کیا۔ وفد کی طرف سے مفتی حلب شیخ محمد الحکیم نے ایک مختصر مگر پرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کی۔ جلسے کے بعد وفد نے ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کے نادر مخطوطات کو ملاحظہ فرمایا۔ آخر میں ان معزز مہمانوں کی پرتکلف چائے سے تواضع کی گئی۔

یوگوسلاویہ کے دو ممتاز اساتذہ جامعہ میں

یوگوسلاویہ کے دو ممتاز اساتذہ، ڈاکٹر سلیمان گردزوانی جو کہ سراجیوو یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین اور معہد البحوث الاسلامیہ کے ڈائرکٹر ہیں، اور ڈاکٹر زاک ڈری بیکر نے جو اسی یونیورسٹی میں فارسی زبان و ادب کے استاد ہیں، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائے تھے۔ ازراہ کرم یہ دونوں اساتذہ جامعہ ملیہ بھی تشریف لائے اور شعبۂ اسلامک و عرب ایرانین اسٹڈیز میں ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اول الذکر معزز مہمان نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ ان کا اپنا شعبۂ استشراق، عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کی تعلیم و تحقیق کے لیے وقف ہے اور یوگوسلاویہ کے کتب خانوں میں ان زبانوں کے اہم اور قیمتی ذخیرے موجود ہیں اور ثانی الذکر معزز مہمان نے فارسی میں تقریر کرتے ہوئے فارسی ادب کے بارے میں مفید اور دلچسپ باتیں بیان کیں۔ صدر شعبہ ڈاکٹر اجتبا ندوی صاحب نے جامعہ ملیہ کا تعارف کرایا اور پروفیسر مشیر الحق صاحب نے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا۔

قرۃ العین حیدر جامعہ میں بحیثیت وزیٹنگ پروفیسر

اردو کی مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ شعبۂ اردو میں وزیٹنگ پروفیسر مقرر ہوئی ہیں اور اس حیثیت سے انھوں نے کام شروع کر دیا ہے۔ محترمہ کے خیر مقدم کے لیے

فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ سائنسز کے ڈین جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں بطور خاص شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب نے بھی شرکت کی۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر عنوان چشتی صاحب نے ناظم جلسہ کے فرائض انجام دیے اور پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب نے محترمہ کے تعارف میں ایک مختصر تقریر کی۔ اس موقع پر محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ نے "ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی" کے عنوان سے ایک افسانہ سنایا جسے بیحد پسند کیا گیا۔ اس سلسلے میں افسانہ سے متعلق اور محترمہ کے ادبی نقطۂ نظر اور افسانوی تکنیک کے بارے میں بہت سے سوالات کیے گئے۔ آخر میں صدر جلسہ جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے محترمہ کے افسانوں اور ناولوں کے بارے میں اظہار خیال فرمایا۔

پروفیسر ابو اللیث صدیقی صاحب جامعہ میں

مولانا محمد علی مرحوم کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں ۲۷، ۲۸ اور ۲۹ جنوری کو دلی میں بین اقوامی سیمینار منعقد ہوا، جس میں شرکت کے لیے پاکستان کے دو ممتاز ادیب پروفیسر ابو اللیث صدیقی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی تشریف لائے تھے۔ جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے ان دونوں مہمانوں کو جامعہ آنے کی دعوت دی تھی اور ان دونوں حضرات نے بخوشی وعدہ فرمایا تھا مگر عین وقت پر کسی اتفاقی مجبوری کی وجہ سے پروفیسر بریلوی صاحب تشریف نہ لاسکے۔ صرف پروفیسر ابو اللیث صاحب تشریف لائے

جناب ابو اللیث صاحب کے اعزاز میں اساتذہ اور طلبا کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں معزز مہمان کا پرخلوص اور پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر عنوان چشتی صاحب نے معزز مہمان کا مختصر تعارف کرایا، پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب نے موصوف کے ادبی کارناموں پر بالخصوص لسانیات اور اردو لغت کی خدمات پر روشنی ڈالی اور صدر جلسہ جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے محترم مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے جامعہ کے حالات اور اس کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد معزز مہمان نے تقریر کی جس میں جامعہ ملیہ سے اپنے گہرے اور دیرینہ تعلق کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میرا پہلا مضمون ماہنامہ جامعہ میں شائع ہوا تھا۔ جلسے کے بعد جناب صدیقی صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری تشریف لے گئے اور اسے تفصیل سے ملاحظہ فرمایا۔

REGD-NO. D.(S)-110 VOL. 76 NO 1, 2 FEBRUARY, 1979

The Monthly JAMIA

بسلسلہ صفحہ ۳

کے محافظ اور امین ہیں اور فلسطینیوں کے کاز کی پرزور حمایت کرتے ہیں۔ اس کے بعد صدر شعبہ ڈاکٹر اجتبا
ندوی صاحب نے جامعہ اور شعبے کا تعارف کرایا اور طلبہ کی طرف سے عزیز احمد صاحب نے معزز مہمان کا
خیر مقدم کیا اور رسید خالد علی نے معزز مہمان اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ جلسے کے بعد معزز مہمان
ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری تشریف لے گئے، جہاں پُرتکلف چائے پیش کی گئی، اس کے بعد معزز مہمان
جامعہ کی مسجد دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے جس کی تعمیر میں سعودی حکومت کے گراں قدر عطیے سے
بڑی مدد ملی ہے۔ (عبد اللطیف اعظمی)

مولانا محمد علی نمبر

ماہنامہ جامعہ کا مولانا محمد علی نمبر جنوری سے اپریل تک چار مہینوں پر مشتمل ہوگا۔ اور اس
کی ضخامت کم از کم دو سو صفحات ہوگی اور قیمت آٹھ روپے۔ "جامعہ" کے مستقل خریداروں
سے اس کی الگ سے قیمت نہیں لی جائے گی، مگر رجسٹری کے لیے مزید دو روپے ادا کرنا ضروری
ہے۔ اس لیے جن لوگوں کا سالانہ چندہ ختم ہوگیا ہے وہ مبلغ آٹھ روپے جلد سے جلد بھیج دیں اور
جن کا چندہ ختم نہیں ہوا ہے، وہ دو روپے فیس رجسٹری ضرور بھیج دیں۔

ماہنامہ جامعہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر۔ عبد اللطیف اعظمی   مطبوعہ: جمال پریس۔ دہلی

ماہنامہ جامعہ دہلی

مدیر: ضیاء الحسن فاروقی مدیر معاون: عبداللطیف اعظمی

جلد نمبر ۷۶ | بابت ماہ مارچ ۱۹۷۹ء | شمارہ ۳

کچھ اس شمارے کے بارے میں

پچھلے ماہ جنوری اور فروری کا آٹھ ورقی شمارہ شائع کیا گیا تھا اور اس مرتبہ بھی مارچ کا شمارہ حسب سابق، آٹھ ورق کا شائع ہو رہا ہے، اس پر قارئین جامعہ کو شاید تعجب ہو اس لیے نامناسب نہ ہوگا اگر اس کی وضاحت کر دی جائے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ڈاکخانے کے قواعد کے مطابق، منظور شدہ رسالوں کو جنہیں محصول ڈاک کی رعایت حاصل ہوتی ہے، مقررہ تاریخوں پر شائع ہونا ضروری ہے اور ان کی اشاعت میں معمولاً تین دن سے زیادہ وقفہ نہیں ہونا چاہیے، لہٰذا اس قاعدے کی وجہ سے یہ مختصر شمارہ، جسے ضمیمہ کہنا چاہیے، پچھلے ماہ شائع کیا گیا تھا اور اس ماہ دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے، اگلے ماہ یعنی اپریل میں انشاءاللہ **محمد علی نمبر** شائع ہوگا۔

اس کے علاوہ قارئین سے تعلق کو قائم رکھنے کے لیے بھی اس ضمیمے کی اشاعت ضروری سمجھی گئی۔ اگرچہ دسمبر (۱۹۷۸ء) کے شمارے میں اعلان کر دیا گیا تھا کہ اگلا شمارہ مولانا محمد علی نمبر ہوگا جو مارچ میں شائع ہوگا، مگر پھر بھی بہت سے لوگوں کے شکایتی خطوط آ رہے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ اس ضمیمے کے ذریعہ سے قارئین جامعہ کو ہر ماہ اطلاع ملتی رہے کہ مولانا محمد علی نمبر کی تیاریاں باقاعدہ جاری ہیں۔ (ادارہ)

کے پرو وائس چانسلر کی حیثیت سے کوئی سات سال تک خدمت انجام دی۔ اس عرصے میں انتظامی معروفیات کے باوجود سہ ماہی "فکر و نظر" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے اور مرحوم کے بقول : "رسالے کا معیار کافی اونچا رہا، چنانچہ اس کے بعض مضامین کے حوالے روس، ایران اور ترکی کے رسائل میں دیئے گئے اور ان ملکوں میں اس کی قدر افزائی ہوئی[1]۔"

علی گڑھ سے مستعفی ہو کر دلی آگئے اور اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ساتھ ٹھہرے جو اس وقت نائب صدر جمہوریہ تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنی آپ بیتی "یادوں کی دنیا" لکھی جو ۱۹۶۷ء میں دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہوئی۔ اس سلسلے میں موصوف نے لکھا ہے کہ : "میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلری سے مستعفی ہو کر اکتوبر ۱۹۶۵ء میں دہلی آگیا اور دسمبر ۱۹۶۵ء میں میں نے "یادوں کی دنیا" لکھنا شروع کیا۔ ۔ تقریباً ایک سال کی مدت میں اسے ختم کیا۔" اس سے فارغ ہونے کے بعد "غالب اور آہنگ غالب" لکھی جس کا پہلا ایڈیشن دسمبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا اور ستمبر ۱۹۷۱ء میں تقریباً ڈیڑھ گنے اضافے کے ساتھ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

۱۹۶۷ء کے اوائل میں شملہ کے مشہور ادارے انڈین انسٹی ٹیوٹ فار ایڈوانسڈ اسٹڈیز میں فیلو کی حیثیت سے موصوف کا تقرر ہو گیا۔ چار پانچ سال وہاں کام کیا، مگر ایک ہلکا سا دل کا دورہ پڑا اس لیے دہلی چلے آئے اور حضرت نظام الدین میں قیام کیا اور باقی زندگی یہیں گذار دی۔

خوشی کی بات ہے کہ آپ کی زندگی کا بالخصوص آخری دور کا ایک ایک لمحہ علمی و ادبی خدمت میں بسر ہوا جامعہ ملیہ، انجمن ترقی اردو (ہند)، ایوان غالب، اور غالب اکیڈمی سے آپ کا گہرا تعلق رہا ہے اور دلی کے دوران قیام میں یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں ممتاز حصہ رہا ہے۔ چنانچہ آپ کی شاندار خدمات کے اعتراف میں ۱۹۷۷ء میں ساہتیہ پریشد دلی نے اور جنوری ۱۹۷۹ء میں ساہتیہ اکیڈمی نے انعامات سے اور ۱۹۷۷ء میں حکومت ہند نے پدم بھوشن کے خطاب سے نوازا۔ افسوس کہ موصوف کی وفات سے دلی کے یہ تمام علمی و ادبی اور تعلیمی ادارے غالب اور اقبال کے ممتاز ماہر اور اردو کے جلیل القدر مصنف اور دانشور سے اور جامعہ ملیہ ایک قابل فخر قدیم طالب علم سے محروم ہو گئی۔ شیخ الجامعہ، جامعہ کے اساتذہ اور کارکن اور ماہنامہ جامعہ کا ادارۂ تحریر مرحوم کی بیگم صاحبہ، ان کے صاحبزادے جناب جمن حسین خاں اور ان کی بیگم ڈاکٹر عاصمہ جو جامعہ

---

[1] ڈاکٹر یوسف حسین خاں، یادوں کی دنیا صفحہ ۲۶۴

میں منیجری کے فرائض انجام دے رہی ہیں اور سابق شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین، جناب خورشید عالم خاں (ایم پی) جناب غلام ربانی تاباں اور دیگر متعلقین اور اعزہ کے غم میں شریک ہیں۔

اس عظیم سانحے پر ۲۵ فروری کو غالب اکیڈمی کے بانی جناب حکیم عبدالحمید صاحب کے تعزیتی جلسے میں مرحوم کے بھتیجے اور داماد جناب انور حسین صاحب نے جو مستقل طور پر کراچی میں رہتے ہیں اور فی الحال کویت میں ہیں، جو تقریر کی تھی وہ ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔۔

"یوسف چچا کے علم و ادب کا تذکرہ تو میرے بزرگ اور اس شہر کے اہل علم حضرات مجھ سے بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ یقیناً مرحوم کی تصانیف سے ان کی شخصیت کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ان کے احساس و شعور کی تازگی، ان کی وسعتِ نظر، ان کی شخصیت کا جزو تھیں اور ان کی تصانیف کا حصہ بھی

لیکن میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ انسان کی ایک خاص روشنی بھی ہوتی ہے باطن کی روشنی، محبت اور صداقت کی روشنی، ضمیر کی روشنی جو انسان کی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے۔ یہی یوسف چچا کی متاعِ حیات تھی۔

یہ روشنی پیدا ہوتی ہے وسعت دل سے، وسعتِ نظر سے، یہ عہدوں اور منصب کی روشنی نہیں ہے اور یہ کسی خاندان یا نسل یا قبیلہ کی میراث نہیں ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور یہ معاملہ توفیق کا ہے اور تمیز کا بھی — کیونکہ روشنی اُس ایمان کا حصہ ہے جو ہمیں خدا کی مخلوق سے محبت کرنا سکھاتا ہے اور اس محبت میں کوئی تفریق نہیں، کوئی دیوار نہیں۔ کوئی حد نہیں کوئی فاصلہ نہیں — کیوں کہ یہ تفریق اور یہ فاصلے تو انسان کے اپنے پیدا کردہ ہیں اور انسان انھیں اس لیے قائم کرتا ہے کہ ان کے ذریعہ وہ اس آفاقی روشنی کو روک سکے جو تمام انسانیت کا مقدر ہے۔

آپ میں سے جن لوگوں نے یوسف چچا کو قریب سے دیکھا ہے محسوس یہ ہوگا کہ وہ ایک روشن ضمیر انسان تھے اور ہمیں اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ انھوں نے اسی وجہ سے بعض اوقات دل پر زخم کھائے ذہنی طور پر انھیں اذیت بھی ملی مگر یہ ان کا ظرف تھا، حوصلہ تھا۔ ان کی رواداری اور وضع داری تھی کہ انھوں نے کبھی شکوہ نہ کیا۔ نہ اپنوں کی کدورت کا نہ غیروں کی عداوت کا۔ میں نے یوسف چچا کے متعلق ہمیشہ یہی سنا۔ ایسا ہی دیکھا انہیں ایسا ہی پایا، اور رشتۂ خون کے باوجود میں یہ بات جذباتی طور پر نہیں کہہ رہا میں یہ بات حقیقت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ ان کی تمام زندگی روشنی کا سفر تھی، خوشبو کا سفر، محبت اور صداقت کا سفر۔ ان کا یہ سفر ختم ہوا۔ یاد باقی ہے اور باقی رہے گی۔ ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے۔

مولانا محمد علی بین اقوامی سیمینار

مولانا محمد علی مرحوم کا صد سالہ یوم پیدائش منانے کے لیے دہلی میں جو "محمد علی جوہر صدی کمیٹی" قائم کی گئی تھی، اس کے اہتمام میں ۲۷ اور ۲۸ جنوری کو دو روزہ بین اقوامی سیمینار منعقد ہوا جس میں برصغیر ہند و پاک کے مشہور ادیبوں نے شرکت کی اور مقالے پڑھے۔ افتتاحی جلسے کی صدارت، کمیٹی کے صدر جناب ذوالفقار اللہ صاحب مرکزی وزیر مملکت برائے فنانس نے کی نیز اس کا افتتاح مرکزی وزیر برائے پٹرولیم جناب ہیم وتی نندن بہوگنا نے فرمایا اور اس موقع پر طویل اور فکر انگیز تقریر کی۔ بالکل شروع میں جنرل سکریٹری ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صاحب نے رپورٹ پیش کی جس میں ۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء سے اس سیمینار کے انعقاد تک کی کارروائیوں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ان کارروائیوں کے بعد پاکستان کے سفیر جناب عبدالستار صاحب اور پاکستان کے معزز مہمانوں، پروفیسر ابواللیث صدیقی، پروفیسر عبادت بریلوی اور سید محمد تقی صاحب نے تقریریں کیں۔

اس افتتاحی اجلاس کے بعد سہ پہر میں پروفیسر آل احمد سرور صاحب کی صدارت میں سیمینار اور بعد مغرب ایک مختصر سا مشاعرہ منعقد ہوا۔ دوسرے دن سیمینار کے دو اجلاس منعقد ہوئے جن کی صدارت کے فرائض پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے انجام دئیے۔ اس دو روزہ سیمینار میں حسب ذیل حضرات نے مقالے پڑھے:

۱۔	پروفیسر ابواللیث صدیقی	مولانا محمد علی اور میر محفوظ علی
۲۔	پروفیسر عبادت بریلوی	مولانا محمد علی کی شخصیت
۳۔	پروفیسر گوپی چند نارنگ	شعر جوہر اور وارداتِ قتل
۴۔	جناب سید حامد	مولانا محمد علی کی انگریزی صحافت
۵۔	جناب عتیق صدیقی	محمد علی کی صحافت و سیاست

۶۔	ڈاکٹر قمر رئیس	محمد علی کی شخصیت کے نقوش
۷۔	محترمہ بیگم انیس قدوائی	محمد علی کا خاکہ
۸۔	ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی	مولانا محمد علی اور ان کی صحافت
۹۔	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	مولانا کی ہمہ گیر شخصیت
۱۰۔	ڈاکٹر شان محمد	مولانا محمد علی — نئے نیشنلزم کا ایک مجسمہ
۱۱۔	ڈاکٹر انصار اللہ	مولانا محمد علی ۔ تلمیذ داغ
۱۲۔	عبداللطیف اعظمی	مظلوم محمد علی

مولانا محمد علی نمبر۔ قارئینِ جامعہ سے ضروری گذارش

ماہنامہ جامعہ کا مولانا محمد علی نمبر اب کتابت کی آخری منزل میں ہے اور ہمیں پوری توقع ہے کہ انشاءاللہ وسط اپریل تک پوسٹ کر دیا جائے گا۔ ہم جیسا کہ پہلے کئی مرتبہ اطلاع دے چکے ہیں کہ اس خصوصی نمبر کی قیمت آٹھ روپے ہوگی اور صرف ان ہی خریداروں کو مفت ملے گا جن کا کم از کم ایک سال کا چندہ مبلغ چھ روپے اور رجسٹری فیس مبلغ دو روپے آخر مارچ یا زیادہ سے زیادہ اپریل کے پہلے ہفتے میں وصول ہو جائے گا۔ بعد میں یہ نمبر قیمتاً ملے گا اور محصول ڈاک میں خاصا اضافہ ہو جائے گا۔

ان مضمون نگاروں کو بھی دو روپے رجسٹری فیس ادا کرنی ہوگی جن کو رسالہ اعزازی طور پر جاری ہے البتہ وہ مضمون نگار اس شرط سے مستثنیٰ ہوں گے جن کے مضامین اس شمارے میں شامل ہیں۔

ادارہ ماہنامہ جامعہ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

Regd. No. D(S) 110 Vol. 76 No. 3 March, 1979.

THE MONTHLY JAMIA

بیان ملکیت ماہنامہ جامعہ و دیگر تفصیلات

(فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸)

۱۔ مقام اشاعت :۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

۲۔ وقفۂ اشاعت :۔ ماہانہ

۳، ۴۔ پرنٹر و پبلشر کا نام :۔ عبداللطیف اعظمی

قومیت :۔ ہندوستانی

پتہ :۔ دفتر شیخ الجامعہ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

۵۔ اڈیٹر کا نام :۔ جناب ضیاء الحسن فاروقی

قومیت :۔ ہندوستانی

پتہ :۔ پرنسپل جامعہ کالج۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

۶۔ ملکیت :۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

میں، عبداللطیف اعظمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں

دستخط پبلشر :۔ عبداللطیف اعظمی

۱۶ مارچ ۱۹۷۹ء

آپ کا چندہ ختم ہوگیا ہے

نیچے دائرے کے اندر اگر سرخ نشان ٹک مارک ✓ ہو تو سمجھئے کہ آپ کا چندہ ختم ہوگیا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ مارچ کے آخر تک یا اپریل کے پہلے ہفتے میں سالانہ چندہ مبلغ چھ روپے اور مولانا محمد علی نمبر کی رجسٹری فیس مبلغ دو روپے، کل آٹھ روپے ضرور بھیج دیجئے، ورنہ مولانا محمد علی نمبر آپ کو نہیں بھیجا جائے گا۔ اور بعد میں اس نمبر کی قیمت مبلغ آٹھ روپے ادا کرنی ہوگی اور محصول ڈاک بھی زیادہ ادا کرنا پڑے گا۔

○

ماہنامہ جامعہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

طابع و ناشر :۔ عبداللطیف اعظمی مطبوعہ :۔ جمال پریس دہلی

ماہنامہ جامعہ دہلی

مدیر۔ ضیاء الحسن فاروقی   مدیر معاون۔ عبداللطیف اعظمی

جلد نمبر ۷۶ | بابت ماہ مارچ ۱۹۷۹ء | شمارہ ۳

کچھ اس شمارے کے بارے میں

پچھلے ماہ جنوری اور فروری کا آٹھ ورقی شمارہ شائع کیا گیا تھا اور اس مرتبہ بھی مارچ کا شمارہ حسب سابق، آٹھ ورق کا شائع ہو رہا ہے، اس پر قارئین جامعہ کو شاید تعجب ہو اس لیے نامناسب نہ ہوگا اگر اس کی وضاحت کر دی جائے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ڈاکخانے کے قواعد کے مطابق، منظور شدہ رسالوں کو جنہیں محصول ڈاک کی رعایت حاصل ہوتی ہے، مقررہ تاریخوں پر شائع ہونا ضروری ہے اور ان کی اشاعت میں، معمولاً تیس دن سے زیادہ وقفہ نہیں ہونا چاہیے، لہٰذا اس قاعدے کی وجہ سے یہ مختصر شمارہ، جسے ضمیمہ کہنا چاہیے، پچھلے ماہ شائع کیا گیا تھا اور اس ماہ دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے، اگلے ماہ یعنی اپریل میں انشاء اللہ محمد علی نمبر شائع ہوگا۔

اس کے علاوہ قارئین سے تعلق کو قائم رکھنے کے لیے بھی اس ضمیمے کی اشاعت ضروری سمجھی گئی۔ اگرچہ دسمبر (۱۹۷۸ء) کے شمارے میں اعلان کر دیا گیا تھا کہ اگلا شمارہ مولانا محمد علی نمبر ہوگا جو مارچ میں شائع ہوگا، مگر پھر بھی بہت سے لوگوں کے شکایتی خطوط آ رہے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ اس ضمیمے کے ذریعہ سے قارئین جامعہ کو ہر ماہ اطلاع ملتی رہے کہ مولانا محمد علی نمبر کی تیاریاں باقاعدہ جاری ہیں۔ (ادارہ)

عبداللطیف اعظمی

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کی وفات

جامعہ ملیہ کے ممتاز قدیم طالب علم، ماہنامہ جامعہ کے سابق اڈیٹر اور اردو کے جلیل القدر ادیب و نقاد ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کا ۲۱ فروری کی شام کو بدھ کے دن جامعہ ملیہ سے متصل مشہور ہسپتال ہولی فیملی میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون!

جیسا کہ عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے، مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے چھوٹے بھائی تھے اور وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً ساڑھے ۷۷ سال تھی۔ کوئی تین سال پہلے سخت بیمار ہوئے تھے، اس وقت اللہ نے رحم کیا، مگر اس وقت سے ان کی صحت بہت زیادہ اچھی نہیں رہی، کچھ عمر کی وجہ سے بھی صحت کمزور تھی، مگر پھر بھی نہ صرف یہ کہ زندگی کے معمولات بڑی حد تک قائم رہے، مثلاً جلسوں وغیرہ میں شرکت کرتے رہے اور حسب ضرورت و موقع تقریریں بھی کرتے تھے، بلکہ حیرت اور خوشی کی بات یہ ہے کہ صحت کے اس زوال کے زمانے میں مرحوم نے تصنیف و تالیف کے کام کو جاری رکھا اور اس عرصے میں کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ مثلاً

(۱) روح اقبال (ساتواں ایڈیشن) ۱۹۷۳ء (۲) حافظ اور اقبال۔ مئی ۱۹۷۶ء

(۳) غالب کی غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ، ۱۹۷۷ء (۴) غالب کے فارسی کلام کا بھی انگریزی ترجمہ اسی زمانے میں کیا ہے جو غالباً زیر طبع ہے۔ اسی زمانے کی کتاب "حافظ اور اقبال" پر انھیں ملک کے سب سے اہم اور بڑے انعام ساہتیہ اکیڈمی اوارڈ کا امسال جنوری میں اعلان کیا گیا ہے، مگر افسوس کہ وہ اپنی زندگی میں اسے حاصل نہ کرسکے۔

اس مرتبہ فروری میں جب یکایک ان پر مرض کا شدید حملہ ہوا تو انھیں فوراً ہی ہولی فیملی میں

داخل کر دیا گیا۔ جہاں تقریباً ایک ہفتہ تک بے ہوشی کی حالت طاری رہی اور بالآخر ۱۲ فروری کی شام کو چھ سوا چھ بجے وہ اپنے مولا سے جا ملے۔ اسی وقت ان کی نعش ان کے مکان واقع حضرت نظام الدین پہنچا دی گئی اور دوسرے دن ایک بجے جامعہ میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور جامعہ کے اس قبرستان میں جہاں امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور جامعہ کے دوسرے ممتاز جیالی اراکین وغیرہ آسودۂ خاک ہیں، سپرد خاک کئے گئے۔

شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب کے ارشاد پر خاص طور پر ایک ریتھ (WREATH) تیار کرایا گیا تھا جسے شیخ الجامعہ کی طرف سے سینیر ڈین جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے قبر پر رکھ کر تمام حاضرین کے ساتھ فاتحہ پڑھی۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ۱۸ ستمبر ۱۹۰۲ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ نو سال کی عمر میں ۱۹۱۱ء میں اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے، جہاں ان کے دو بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین اور زاہد حسین خاں پہلے سے زیر تعلیم تھے۔ اتفاق سے ۱۹۱۹ء میں یوسف صاحب بیمار ہو گئے تو اپنے وطن قائم گنج آگئے۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی تو دوسرے سال ۱۹۲۱ء میں یوسف صاحب جامعہ آگئے اور یہاں تقریباً پانچ سال، جولائی ۱۹۲۱ء سے مئی ۱۹۲۶ء تک رہے اور اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے فرانس چلے گئے۔ یوسف صاحب نے اپنی آپ بیتی "یادوں کی دنیا" میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان میں علم و ادب اور تنقید و تحقیق کا جو ذوق پیدا ہوا وہ جامعہ کی تعلیم و تربیت کا فیض ہے

فرانس میں ساڑھے تین سال سے کچھ زیادہ قیام رہا۔ دسمبر ۱۹۲۹ء میں تاریخ میں پی، ایچ، ڈی، کی ڈگری لی اور جنوری ۱۹۳۰ء کے آخری ہفتے میں ہندوستان واپس آگئے۔ کچھ دن عزیزوں کے ساتھ قیام کرنے کے بعد مارچ کے شروع میں حیدر آباد چلے گئے اور مولوی عبدالحق صاحب کی دعوت پر انگلش اردو ڈکشنری میں کام شروع کیا۔ اتفاق سے اکتوبر ۱۹۳۰ء میں دو سال کے لیے ایک صاحب کے رخصت پر چلے جانے کی وجہ سے شعبۂ تاریخ میں ایک جگہ خالی ہو گئی تو اس پر یوسف صاحب کا تقرر ہو گیا۔ اور پھر وہیں مستقل ہو گئے ۱۹۵۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد) سے ریٹائر ہو گئے تو ۱۹۵۸ء میں علی گڑھ آگئے اور مسلم یونیورسٹی

کے پرو وائس چانسلر کی حیثیت سے کوئی سات سال تک خدمت انجام دی۔ اس عرصے میں انتظامی مصروفیات کے باوجود سہ ماہی "فکر و نظر" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے اور مرحوم کے بقوم : "رسالے کا معیار کافی اونچا رہا، چنانچہ اس کے بعض مضامین کے حوالے روس، ایران اور ترکی کے رسائل میں دیئے گئے اور ان ملکوں میں اس کی قدر افزائی ہوئی۔"[1]

علی گڑھ سے مستعفی ہو کر دلی آ گئے اور اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ساتھ ٹھہرے جو اس وقت نائب صدر جمہوریہ تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنی آپ بیتی "یادوں کی دنیا" لکھی جو ۱۹۶۷ء میں دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہوئی۔ اس سلسلے میں موصوف نے لکھا ہے کہ : "میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلری سے مستعفی ہو کر اکتوبر ۱۹۶۵ء میں دہلی آگیا اور دسمبر ۱۹۶۵ء میں میں نے "یادوں کی دنیا" لکھنا شروع کیا۔ . . . تقریباً ایک سال کی مدت میں اسے ختم کیا۔" اس سے فارغ ہونے کے بعد "غالب اور آہنگ غالب" لکھی جس کا پہلا ایڈیشن دسمبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا اور ستمبر ۱۹۷۱ء میں تقریباً ڈیڑھ گنے اضافے کے ساتھ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

۱۹۶۷ء کے اوائل میں شملہ کے مشہور ادارے انڈین انسٹی ٹیوٹ فار ایڈوانسڈ اسٹڈیز میں فیلو کی حیثیت سے موصوف کا تقرر ہو گیا چار پانچ سال وہاں کام کیا، مگر ایک ہلکا سا دل کا دورہ پڑا اس لیے دہلی چلے آئے اور حضرت نظام الدین میں قیام کیا اور باقی زندگی یہیں گذار دی۔

خوشی کی بات ہے کہ آپ کی زندگی کا بالخصوص آخری دور کا ایک ایک لمحہ علمی و ادبی خدمت میں بسر ہوا جامعہ ملیہ، انجمن ترقی اردو (ہند)، ایوان غالب، اور غالب اکیڈمی سے آپ کا گہرا تعلق رہا ہے اور دلی کے دوران قیام میں یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں ممتاز حصہ رہا ہے۔ چنانچہ آپ کی شاندار خدمات کے اعتراف میں ۱۹۷۷ء میں ساہتیہ پریشد دلی نے اور جنوری ۱۹۷۹ء میں ساہتیہ اکیڈمی نے انعامات سے اور ۱۹۷۷ء میں حکومت ہند نے پدم بھوشن کے خطاب سے نوازا۔ افسوس کہ موصوف کی وفات سے دلی کے یہ تمام علمی و ادبی اور تعلیمی ادارے غالب اور اقبال کے ممتاز ماہر اور اردو کے جلیل القدر مصنف اور دانشور سے اور جامعہ ملیہ ایک قابل فخر قدیم طالب علم سے محروم ہو گئی۔ شیخ الجامعہ، جامعہ کے اساتذہ اور کارکن اور ماہنامہ جامعہ کا ادارۂ تحریر مرحوم کی بیگم صاحبہ، ان کے صاحبزادے جناب اجمل حسین خاں اور ان کی بیگم ڈاکٹر عاصمہ جو جامعہ

---

[1] ڈاکٹر یوسف حسین خاں! یادوں کی دنیا صفحہ ۴۶۲

میں میشر طمی کے فرائض انجام دے رہی ہیں اور سابق شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین، جناب خورشید عالم خاں (ایم پی)
جناب غلام ربانی تاباں اور دیگر متعلقین اور اعزہ کے غم میں شریک ہیں۔
اس عظیم سانحے پر ۲۵ رفروری کو غالب اکیڈمی کے بانی جناب حکیم عبدالحمید صاحب کے تعزیتی جلسے میں مرحوم
کے بھتیجے اور داماد جناب انور حسین صاحب نے جو مستقل طور پر کراچی میں رہتے ہیں اور فی الحال کویت میں ہیں، جو
تقریر کی تھی وہ ذیل میں پیش کی جاتی ہے:-
" یوسف چچا کے علم وادب کا تذکرہ تو مرے بزرگ اور اس شہر کے اہل علم حضرات مجھ سے بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔
یقیناً مرحوم کی تصانیف سے ان کی شخصیت کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ان کے احساس وشعور کی تازگی، ان کی وسعت
نظر، ان کی شخصیت کا جزو تھیں اور ان کی تصانیف کا حصہ بھی۔
لیکن میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ انسان کی ایک خاص روشنی بھی ہوتی ہے باطن کی روشنی، محبت اور
صداقت کی روشنی، ضمیر کی روشنی جو انسان کی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے۔ یہی یوسف چچا کی متاع حیات تھی۔
یہ روشنی پیدا ہوتی ہے وسعت دل سے، وسعت نظر سے، یہ عہدوں اور منصب کی روشنی نہیں ہے اور یہ کسی
خاندان یا نسل یا قبیلہ کی میراث نہیں ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور یہ معاملہ
توفیق کا ہے اور تمیز کا بھی — کیونکہ روشنی اُس ایمان کا حصہ ہے جو ہمیں خدا کی مخلوق سے محبت کرنا سکھاتا ہے اور
اس محبت میں کوئی تفریق نہیں، کوئی دیوار نہیں۔ کوئی حد نہیں کوئی فاصلہ نہیں — کیوں کہ یہ تفریق اور یہ فاصلے
تو انسان کے اپنے پیدا کردہ ہیں اور انسان انھیں اس لیے قائم کرتا ہے کہ ان کے ذریعہ وہ اس آفاقی روشنی کو روک
سکے جو تمام انسانیت کا مقدر ہے۔
آپ میں سے جن لوگوں نے یوسف چچا کو قریب سے دیکھا ہے محسوس کیا ہوگا کہ وہ ایک روشن ضمیر انسان تھے اور
ہمیں اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ انھوں نے اسی وجہ سے بعض اوقات دل پر زخم کھائے، ذہنی طور پر انھیں اذیت بھی
ملی مگر یہ ان کا ظرف تھا، حوصلہ تھا، ان کی رواداری اور وضع داری تھی کہ انھوں نے کبھی شکوہ نہ کیا۔ نہ اپنوں کی کدورت
کا نہ غیروں کی عداوت کا۔ میں نے یوسف چچا کے متعلق ہمیشہ یہی سنا، ایسا ہی دیکھا، انہیں ایسا ہی پایا، اور
رشتۂ خون کے باوجود میں یہ بات جذباتی طور پر نہیں کہہ رہا میں یہ بات حقیقت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ ان کی تمام
زندگی روشنی کا سفر تھی، خوشبو کا سفر، محبت اور صداقت کا سفر۔ ان کا یہ سفر ختم ہوا۔ یاد باقی ہے اور باقی رہے گی۔
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے۔

مولانا محمد علی بین اقوامی سیمینار

مولانا محمد علی مرحوم کا صد سالہ یوم پیدائش منانے کے لیے دہلی میں جو "محمد علی جوہر صدی کمیٹی" قائم کی گئی تھی، اس کے اہتمام میں ۲۷ اور ۲۸ جنوری کو دو روزہ بین اقوامی سیمینار منعقد ہوا جس میں برصغیر ہند و پاک کے مشہور ادیبوں نے شرکت کی اور مقالے پڑھے۔ افتتاحی جلسے کی صدارت، کمیٹی کے صدر جناب ذوالفقار اللہ صاحب مرکزی وزیر مملکت برائے فنانس نے کی نیز اس کا افتتاح مرکزی وزیر برائے پٹرولیم جناب ہیم وتی نندن بہوگنا نے فرمایا اور اس موقع پر طویل اور فکر انگیز تقریر کی۔ بالکل شروع میں جنرل سکریٹری ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صاحب نے رپورٹ پیش کی جس میں ۱۰ ر دسمبر ۱۹۷۸ء سے اس سیمینار کے انعقاد تک کی کارروائیوں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ان کارروائیوں کے بعد پاکستان کے سفیر جناب عبدالستار صاحب اور پاکستان کے معزز مہمانوں، پروفیسر ابواللیث صدیقی، پروفیسر عبادت بریلوی اور سید محمد تقی صاحب نے تقریریں کیں۔

اس افتتاحی اجلاس کے بعد سہ پہر میں پروفیسر آل احمد سرور صاحب کی صدارت میں سیمینار اور بعد مغرب ایک مختصر سا مشاعرہ منعقد ہوا۔ دوسرے دن سیمینار کے دو اجلاس منعقد ہوئے جن کی صدارت کے فرائض پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے انجام دئے۔ اس دو روزہ سیمینار میں حسب ذیل حضرات نے مقالے پڑھے:

۱۔	پروفیسر ابواللیث صدیقی	مولانا محمد علی اور میر محفوظ علی
۲۔	پروفیسر عبادت بریلوی	مولانا محمد علی کی شخصیت
۳۔	پروفیسر گوپی چند نارنگ	شعر جوہر اور واردات قتل
۴۔	جناب سید حامد	مولانا محمد علی کی انگریزی صحافت
۵۔	جناب عتیق صدیقی	محمد علی کی صحافت و سیاست

مولانا محمد علی نمبر۔ قارئینِ جامعہ سے ضروری گذارش

ماہنامہ جامعہ کا مولانا محمد علی نمبر اب کتابت کی آخری منزل میں ہے اور ہمیں پوری توقع ہے کہ انشاءاللہ وسط اپریل تک پوسٹ کر دیا جائے گا۔ ہم جیسا کہ پہلے کئی مرتبہ اطلاع دے چکے ہیں کہ اس خصوصی نمبر کی قیمت آٹھ روپے ہوگی اور صرف ان ہی خریداروں کو مفت ملے گا جن کا کم از کم ایک سال کا چندہ مبلغ چھ روپے اور رجسٹری فیس مبلغ دو روپے آخر مارچ یا زیادہ سے زیادہ اپریل کے پہلے ہفتے میں وصول ہو جائے گا۔ بعد میں یہ نمبر قیمتاً ملے گا اور محصول ڈاک میں خاصا اضافہ ہو جائے گا۔

ان مضمون نگاروں کو بھی دو روپے رجسٹری فیس ادا کرنی ہوگی جن کو رسالہ اعزازی طور پر جاری ہے، البتہ وہ مضمون نگار اس شرط سے مستثنیٰ ہوں گے جن کے مضامین اس شمارے میں شامل ہیں۔

ادارہ ماہنامہ جامعہ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

Regd. No. D(S) 110 Vol. 76 No. 3 March, 1979.

THE MONTHLY JAMIA

بیان ملکیت ماہنامہ جامعہ و دیگر تفصیلات

(فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸)

۱۔ مقام اشاعت :۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

۲۔ وقفۂ اشاعت :۔ ماہانہ

۳،۴۔ پرنٹر و پبلشر کا نام :۔ عبد اللطیف اعظمی

قومیت :۔ ہندوستانی

پتہ :۔ دفتر شیخ الجامعہ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

۵۔ اڈیٹر کا نام :۔ جناب ضیاء الحسن فاروقی

قومیت :۔ ہندوستانی

پتہ :۔ پرنسپل جامعہ کالج۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

۶۔ ملکیت :۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

میں، عبد اللطیف اعظمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں

دستخط پبلشر :۔ عبد اللطیف اعظمی

۸ مارچ ۱۹۷۹ء

آپ کا چندہ ختم ہوگیا ہے

نیچے دائرے کے اندر اگر سرخ نشان ٹِک مارک ✓ ہو تو سمجھئے کہ آپ کا چندہ ختم ہوگیا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ مارچ کے آخر تک یا اپریل کے پہلے ہفتے میں سالانہ چندہ مبلغ چھ روپے اور مولانا محمد علی نمبر کی رجسٹری فیس مبلغ دو روپے، کل آٹھ روپے ضرور بھیج دیجئے، ورنہ مولانا محمد علی نمبر آپ کو نہیں بھیجا جائے گا۔ اور بعد میں اس نمبر کی قیمت مبلغ آٹھ روپے ادا کرنی ہوگی اور محصول ڈاک بھی زیادہ ادا کرنا پڑے گا۔

ماہنامہ جامعہ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

۱
۲
۳
۴
۵

طابع و ناشر :۔ عبد اللطیف اعظمی

مطبوعہ :۔ جمال پریس دہلی

جامعہ

مولانا محمد علی نمبر

Jami : Muhammad Ali Number
Price Rs. 3/-

شمارہ ۴	بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۷۹ء	جلد ۷۶

فہرست مضامین

منظومِ خراجِ عقیدت

فہرست تصاویر

خط و کتابت کا پتہ:-

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

طابع و ناشر:- عبداللطیف اعظمی ★ مطبوعہ:- جمال پریس دہلی ★ ٹائٹل:- دیال پریس دہلی

مولانا محمد علی کی دو نایاب تصویریں
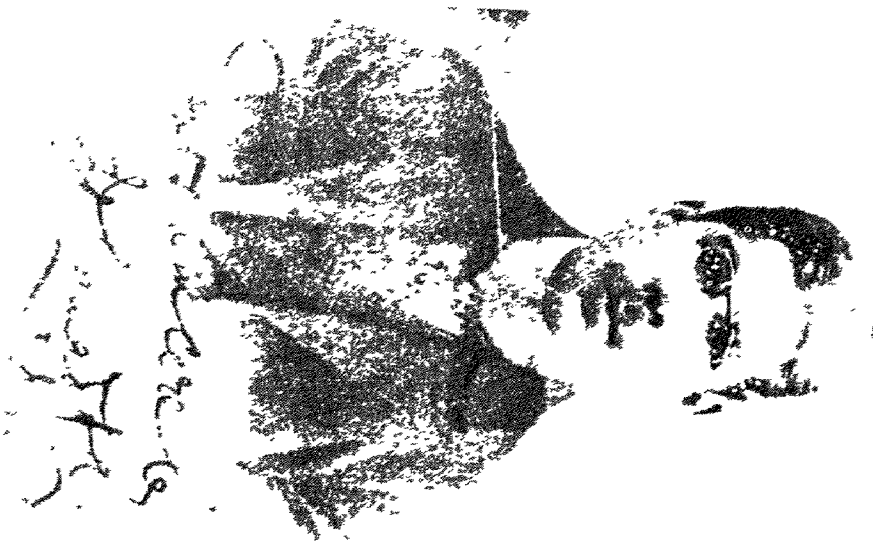
مولانا محمد علی اور دوسرے قومی رہنما
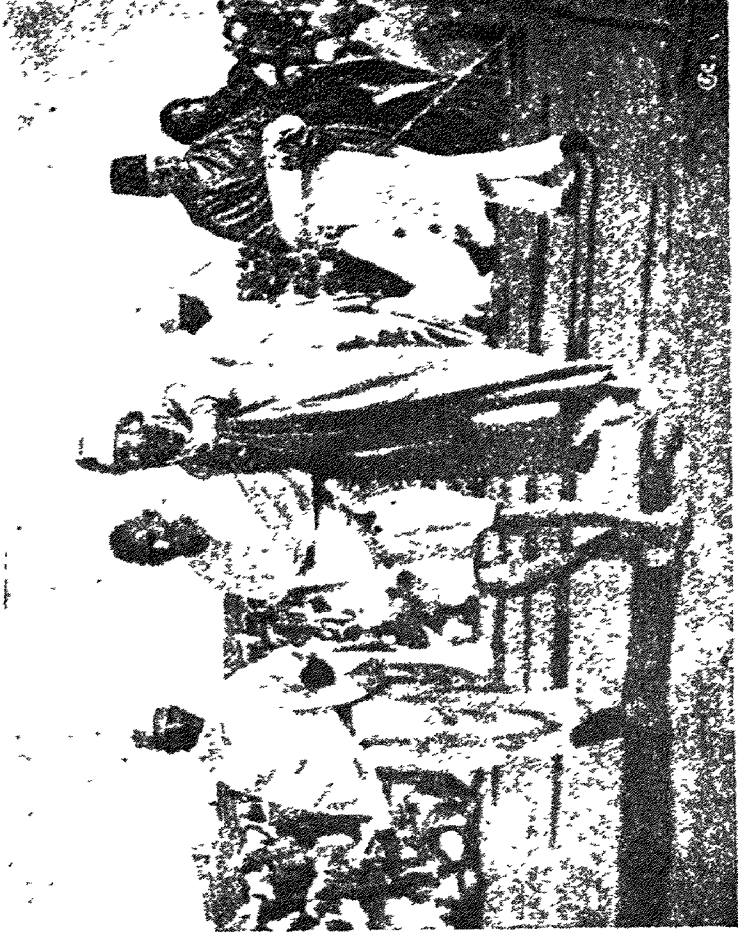
ماخوذ از روداد کانگریس ۳۹ واں اجلاس منعقدہ ۲۶، ۲۷ دسمبر ۱۹۲۴ء بہ مقام بلگام

شذرات

ماہنامہ جامعہ کا مولانا محمد علی نمبر اب قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ اسے پڑھیں گے اور اپنی ایک رائے قائم کریں گے، نہ صرف اس خاص شمارے کے بارے میں بلکہ اس دلآویز عظیم شخصیت کے بارے میں بھی جس کی یاد میں اسے ترتیب دیا گیا ہے۔ ہم یہ دعویٰ تو نہیں کرتے کہ اس خاص شمارے نے مولانا محمد علی مرحوم کی حیات اور کارنامے کے ہر پہلو کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے، لیکن یہ ضرور عرض کریں گے کہ ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ مولانا کی شخصیت کے نمایاں خد و خال ابھر کر سامنے آجائیں۔ اپنی اس کوشش میں ہم کہاں تک کامیاب ہیں، اس کا فیصلہ ناظرین کریں گے۔

شذرات میں اس کا موقع تو نہیں ہے کہ مولانا ئے مرحوم کے سلسلے میں کم و بیش وہی باتیں دہرادی جائیں جو اس شمارے کے مضمون نگاروں نے قلم بند کی ہیں یا جن کی طرف ان کے یہاں اشارے ملتے ہیں۔ البتہ دو باتوں کے لیے میں خاص طور پر قارئین کی توجہ کا طالب ہوں۔ ایک تو یہ کہ ابھی تک مولانا محمد علی کے کسی سوانح نگار نے جہاں تک مجھے علم ہے ان کی اس جد و جہد کا سیر حاصل اور تنقیدی جائزہ نہیں پیش کیا ہے جس کا مقصد ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ کو اس کے استعماری پرنسپلوں سے نجات دلانا تھا۔ بعض سوانح نگاروں کے یہاں اس سلسلے کی کچھ باتیں ملتی ہیں، لیکن وہ سرسری ہیں اور ان میں سے اکثر اپنی تائید میں معتبر دستاویزی شہادتیں نہیں رکھتیں۔ مولانا کو قدرت کی طرف سے حساس دل و دماغ ودیعت ہوا تھا اور وہ ذہین بھی غضب کے تھے، یہ میرا احساس ہے، بلکہ یوں کہیے کہ مولانا کی زندگی کے حالات پر غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اول روز سے جب مولانا نے علی گڑھ کی سرزمین پر پہلا قدم رکھا اس دن تک جب وہ ۱۹۲۰ء میں اولڈ بوائز لاج (علی گڑھ)

سے نکالے گئے، ایک لمحہ کے لیے بھی وہ علی گڑھ کی سیاسی و مذہبی زندگی سے مطمئن نہیں ہوئے لیکن اسی کے ساتھ اپنی مادر علمی سے ان کی محبت روز افزوں رہی۔ گویا جیسے جیسے بے اطمینانی بڑھتی تھی، محبت کا یہ رشتہ اور مضبوط ہوتا جاتا تھا، ابھی وہ اسکول ہی میں تھے کہ انھیں علامہ شبلی کے قرآن پڑھن لیکچرز کو سننے کا موقع ملا جو وہ علی گڑھ کالج کی بڑی جماعتوں کے طلباء کو صبح کے وقت دیا کرتے تھے، انھوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ "بے شک علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلباء کافی ترقی یافتہ تھے اور انھیں اپنے مسلمان ہونے پر بھی کافی فخر تھا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ مذہب کے معاملے میں کافی سے زیادہ جاہل تھے۔" طلباء کو "دینیات" کے نام سے جو تعلیم دی جاتی تھی وہ چند نہایت ہی ابتدائی درسی کتابوں کی تعلیم تھی (اور یہ صورت آج بھی کم و بیش جوں کی توں ہے) اور جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے وہ طالب علموں کے لیے ایک سربستہ کتاب ہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید کے علی گڑھ میں جو مذہب اور تہذیب و ثقافت سے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے اور عشق رسول ؐ میں سرشار تھے عام طلباء کے لیے قرآن پاک اور سیرت رسول ؐ کی تعلیم و تدریس کا کوئی انتظام نہ تھا۔ کیسی محرومی تھی یہ! اور اس محرومی کی چبھن کو محمد علی کے حساس قلب نے بُری طرح محسوس کیا اور اپنے اس احساس کو بعد میں انھوں نے اس طرح قلم بند کیا کہ "اس عام گھپ اندھیرے میں علی گڑھ میں ایک روشن نشان بھی تھا اور وہ شبلی نعمانی کی ذات گرامی تھی جو غیر معمولی خوبیوں اور بالکل نئے ادبی نقطۂ نظر کے حامل تھے اور جنھیں سرسید کالج میں کھینچ لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔" یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ علامہ شبلی ان حریت پسندوں میں تھے جو علی گڑھ میں انگریز کے آمرانہ اقتدار کو سخت ناپسند کرتے تھے اور تادم واپسیں آزاد مسلم سیاست کے حامل و حامی رہے۔

اپنی آپ بیتی میں مولانا نے اسی سلسلے کی ایک اور نہایت اہم بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "بے شک علی گڑھ میں طلباء کے درمیان گرما گرم بحثیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ لیکن اگر ان کا موضوع مغربی ادب اور فلسفہ و سائنس نہ ہوتا تو وہ زیادہ تر ہندوستان کی سیاسیات پر جس کا تعلق میرے اسکول اور کالج کے دنوں میں ملک کے ایک دوسرے سے برسرپیکار فرقوں کے اپنے اپنے مطالبات سے زیادہ اور برطانوی حکومت سے ہندوستان کے عوام کے مطالبات آزادی سے کم تعلق تھا، مرکوز ہوا کرتیں۔ چنانچہ واقعہ یہ

ہے کہ ان حالات کی وجہ سے اس زمانے میں ہمارا ملّی اور فرقہ وارانہ شعور مذہبی کم اور دنیوی زیادہ تھا۔" مجھے معاف کیا جائے اگر میں یہ کہوں کہ مجموعی اعتبار سے علی گڑھ کا یہ "ملی شعور" (یعنی مذہبی کم اور دنیوی زیادہ) ۱۹۴۷ء تک اسی طرح برقرار رہا اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان کا "سیاسی شعور" بھی اسی طرح کے ملّی شعور کا صحیح صحیح عکس ہے۔

سرسید کی زندگی میں علی گڑھ میں مسلم سیاست کے سربراہ مسٹر بیک تھے۔ ۱۸۹۹ء میں بیک کے انتقال کے بعد مسٹر ماریسن نے باگ ڈور سنبھالی، بیک کے زمانہ ہی میں جارحانہ ہندو فرقہ پرستی نے سر اٹھایا تھا اور یو۔پی میں ہندی اردو کا جھگڑا کھڑا ہو گیا تھا جس کے نتیجہ میں صوبہ کا لفٹنٹ گورنر نواب محسن الملک سے عمر بھر ناراض رہا۔ مسٹر ماریسن بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی کوئی الگ سیاسی انجمن بنا کر انگریزی حکومت سے مطالبات کریں۔ چنانچہ انھوں نے اس طرح کی باتیں کہنی شروع کیں کہ جمہوری حکومت نہ صرف مسلمانوں کے لیے مضر ثابت ہوگی بلکہ تمام ہندوستانیوں کے لیے بھی اس میں خطرات ہیں، "جمہوری حکومت اقلیتوں کو لکڑی کاٹنے والوں اور پانی بھرنے والوں کے درجے تک پہنچا دے گی اور مسلمانوں کا ملک میں نام و نشان نہ رہے گا۔" مسٹر ماریسن نے یہاں تک کہا کہ مسلمانوں کا نفع اس میں ہے کہ "وہ اپنی قسمت کو سر اینٹونی میکڈانل (گورنر صوبہ متحدہ) کے ہاتھوں میں چھوڑ دیں۔" یہ اور اسی طرح کے اور حالات تھے جو مسلمانوں کی عام زندگی کو متاثر کر رہے تھے۔ محمد علی کی آزاد طبیعت رہ رہ کر ان حالات پر پیچ و تاب کھاتی تھی، پھر وہ مسٹر ماریسن کے زخم خوردہ بھی تھے جنھوں نے محمد علی کی آزاد طبیعت کا اندازہ کرتے ہوئے نواب محسن الملک کے کہنے کے باوجود انھیں کالج اسٹاف میں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ گویا بیٹے کو ماں سے جدا کر رکھا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں جب ماریسن واپس اپنے وطن چلے گئے تو ان کی جگہ ایک اور انگریز پرنسپل آرچبولڈ آ گئے۔ محمد علی اگرچہ اب ریاست بڑودہ کی ملازمت میں تھے لیکن ملک کی سیاست اور خاص طور پر مسلمانوں کے مسائل سے غافل نہ تھے۔ اور کالج تو ان کی تمام توجہات کا مرکز تھا، جب بھی موقع ملتا وہ آرچبولڈ کی مخالفت کرتے، اسی دوران انھوں نے نواب محسن الملک کو ایک خط لکھا جس کا مندرجہ ذیل اقتباس محمد علی کے ذاتی اضطراب اور آزادی خواہ مسلم نوجوانوں کے موڈ کو ظاہر کرتا ہے:

"حال کے واقعات سن کر میں اپنے عزیز کی موت کو بھول گیا ہوں، اور کالج و قوم کی وفات پر اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلیہ راجعون پڑھ کر دو چار آنسو بہا لیتا ہوں۔ بہتر ہے کہ جو کچھ ہوا اب آپ اس مردہ قوم کو اس کے حال پر چھوڑ دیں، اور اپنی بوڑھی ہڈیوں کو آرام دے لیں۔ ساری عمر انھیں آرام نصیب نہیں ہوا۔ لاٹ (گورنر صوبہ متحدہ) صاحب آئے، لارڈ کچنر گئے، امیر صاحب (امیر کابل) آئیں گے اور لارڈ منٹو تشریف لائیں گے۔ مگر مارا چہ ازیں قصہ، نہ ان سے کالج کو فائدہ پہنچتا ہے نہ قوم کو، نہ آپ کو، مسلمانوں کو چند بڑی یا چھوٹی نوکریاں مل جائیں گی۔ آپ کو ایک ذلیل اور بے وقعت خطاب عطا ہوگا۔ مگر یوروپین اسٹاف کا نام بھی ہوگا، عزت بھی بڑھے گی اور ان کو قوم کا روپیہ بھی جس کو آپ نے خون بہا کر پیدا کیا ہے، ملے گا۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔"

نواب محسن الملک کے نام محمد علی کا یہ خط ۱۹۰۶ء کا ہے۔ ۱۹۰۷ء میں انگریز پرنسپل اور انگریز اسٹاف کی خودسری اور دراز دستیوں سے عاجز آکر کالج کے طلباء نے اسٹرائک کردی۔ اسٹرائک ہی کے دوران اولڈ بوائز کا ایک جلسہ ہوا، محمد علی بھی اس میں موجود تھے، انھوں نے سرسید کی تصویر کو مخاطب کرکے ایک نظم پڑھی جس کے دو شعر یہ تھے:

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو
تمہیں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علی گڑھ میں
اور اس پر یہ تماشا ہر طرف اور جابجا تم ہو

یہاں اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں کہ علامہ اقبال نے جو ان دنوں انگلستان میں زیر تعلیم تھے، اس اسٹرائک کو پسند نہیں کیا تھا اور ایک نظم "طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام" کے عنوان سے لکھ کر گویا انھیں نصیحت کی تھی اور کہا تھا کہ پہاڑوں سے یہ آواز آتی ہے کہ زندگی کا راز سکون میں ہے اور موج ناتواں کا کہنا یہ ہے کہ لطفِ خرام اور ہی چیز ہے۔ نظم کا آخری شعر بھی ملاحظہ ہو:

بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خُم کے سر پہ تم خشتِ کلیسا ابھی

کسی کو بھی معلوم تھا کہ چار پانچ برس کے اندر ہی بین الاقوامی اور قومی سیاست کی بھٹی اتنی گرم ہو جائے گی کہ جو بادہ نیم رس تھا اُس میں اِس زور کا ابال آئے گا کہ خُم کے سر سے خشتِ کلیسا اچھل کر دور جا پڑے گی اور نواب وقار الملک جیسا بزرگ مدبر بھی، اپنے تقویٰ اور پرہیزگاری کے باوجود اس "بادۂ پختہ" سے سرشار ہو اٹھے گا۔ داستان طویل ہے اور تفصیل کی گنجائش نہیں، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ۱۹۱۲ء تک یہ انقلاب دیکھنے میں آیا کہ علی گڑھ کالج کی انگریز پرستی کا سنگین حصار مسمار ہو کر رہ گیا اور سر آغا خاں جیسے لوگ ہمیشہ کے لیے ہندوستان کی مسلم سیاست سے رخصت ہو گئے، اب مسلم سیاست کو قیادت ملی محمد علی اور ابوالکلام جیسے حریت پسند اور انقلابی نوجوانوں کی اور شیخ الہند جیسے بوڑھے مگر روشن خیال عالم دین کی، جن کی تحریروں، تقریروں اور انقلاب آفریں سرگرمیوں سے عظیم الشان برطانوی سامراج کے ایوانوں کی دیواریں متزلزل ہو گئیں۔ بلاشبہ علی گڑھ کی اس قلب ماہیت میں محمد علی کی مسلسل جدوجہد کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ کیا اچھا ہو کہ ان کا کوئی سوانح نگار معروضی انداز میں ان کے اس کارنامے کا جائزہ لے۔

دوسری بات جو ہماری توجہ کی طالب ہے وہ "ملیت" اور "قومیت" کے بارے میں مولانا محمد علی کا موقف ہے۔ بلاشبہ مولانا محمد علی بہت بڑے محب وطن تھے، اپنے ملک سے انھیں بے پناہ محبت تھی، اس کے عوام کے وہ سچے بہی خواہ تھے۔ انگریزوں کی غلامی سے اِسے نجات دلانا اپنا مذہبی فریضہ تصور کرتے تھے، لیکن وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کی ملت اس ملک میں پسماندہ نہ رہے اور اس کے جو حقوق ہیں وہ اُسے ملیں، وہ اپنی ملت ہی کے لیے حقوق نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کی آرزو تھی کہ ہندوستان کی تمام ملتوں کو ان کے جائز حقوق ملیں۔ وہ ایک عرصہ کے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ "اس سرزمین میں جہاں کروڑوں کی تعداد میں بے شمار ملتوں، مذہبی فرقوں اور گروہوں کے لوگ آباد ہیں اور سب کو اپنے اپنے مذہب سے گہرا تعلق ہے، قدرت نے مختلف اجزاء کو باہم سمونے اور ان میں امتزاج پیدا کرنے کا ایک نادر موقع دیا ہے اور اس کی صورت سوائے مذاہب

کے وفاق یعنی فیڈریشن کے اور کوئی صورت نہیں۔ ان ملتوں اور مذہبی گروہوں کو آپس میں جدا کرنے والے خطوط اتنے زیادہ نمایاں ہیں کہ ان کو سوائے وفاق کے اور کسی طرح متحد نہیں کیا جاسکتا . . . چنانچہ ہفت روزہ "کامریڈ" کو جو "سب کا کامریڈ" (ساتھی) اور کسی کا بھی بیجا حمایتی نہیں، انھیں خیالات کا ترجمان ہونا تھا اور اس کا مقصد مسلمانوں کو اپنی ماورا ء وطن ہمدردیوں کے جوش و خروش میں جو کہ اسلام کا مقصود اصلی ہے، ذرہ برابر کمی کئے بغیر ان کو ملک اور وطن کی محبت میں اپنا مناسب حصہ پیش کرنے کے لیے تیار کرنا تھا" ابھی مولانا کے یہ خیالات تفصیل طلب تھے اور وہ اس اہم مسئلہ پر یقیناً وضاحت سے لکھتے لیکن انھیں جلد ہی سیاست نے اور خاص طور سے بیرون ہند کی اسلامی سیاست نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور پھر وقت نے اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ اس نظری بحث کے مختلف گوشوں میں دور تک جا سکتے۔

مولانا محمد علی کا ذہن اس سلسلہ میں 'بہر حال' بالکل صاف تھا کہ ملک کی مختلف ملتوں کے فرقہ وارانہ مفادات کو ہندوستان کے برتر و اعلیٰ مفادات سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے، اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ ملک کا جو بھی آئین بنے اس میں اس کلیہ کا بہر طور لحاظ رکھا ئے۔ مگر وہ اس بات کو بھی زور دے کر کہتے تھے کہ ملتوں کے جو مفادات ہیں ان میں اگر ہم آہنگی اور توازن ہوگا تو وہی باہم مربوط ہو کر ملک کے عمومی مفادات بن جائیں گے۔ اور اس کے علاوہ ملک کا عام مفاد اور کیا ہے؟ اور اسی کو، ۷ اکتوبر ۱۹۲۶ء کے ہمدرد میں اپنے ایک مضمون میں انھوں نے قومیت مشترکہ قرار دیا ہے۔ انھیں اپنے بعض ہم وطنوں اور مسلم احباب سے شکوہ تھا کہ وہ مغرب سے درآمد کی ہوئی قوم پرستی یا نظریۂ قومیت کو اصل قومیت سمجھتے تھے۔ کیا اس "قومیت" کے عفریتی مظاہر ان کی آنکھوں نے گزشتہ جنگ کی ہولناکیوں کی صورت میں نہیں دیکھے ؟ "ایک مسلمان اس 'قومیت' کا ہرگز طرف دار نہیں ہو سکتا جو اسے اپنے دینی بھائیوں کی تنظیم سے

(بقیہ صفحہ ۲۰۷ پر)

مولانا محمد علی مرحوم

ترجمہ:- پروفیسر محمد سرور

مولانا محمد علی کی آپ بیتی

مولانا محمد علی مرحوم جب ۱۹۲۳ء میں بیجاپور جیل میں قید تھے تو انھوں نے انگریزی میں ایک کتاب لکھنا شروع کی تھی جس کا عنوان تھا: "Islam : Kingdom of God" مگر یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی۔ اس کے شروع میں مولانا مرحوم نے مختصراً اپنے حالاتِ زندگی بھی لکھے تھے جنھیں پروفیسر محمد سرور صاحب نے ترجمہ کر کے اپنی مرتبہ کتاب: "مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے" میں شامل کیا ہے جو کتابی سائز پر ۴۴۴ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اگرچہ یہ آپ بیتی نامکمل ہے، اس میں صرف ۱۹۲۳ء تک کے حالات ہیں مگر اس کی اہمیت یہ ہے کہ خود مولانا مرحوم کے قلم سے ہے، اس لیے اس کی تلخیص یہاں پیش کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے تلخیص میں آپ بیتی کی سبھی اہم باتیں نہ آسکیں گی، مگر کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اہم باتیں اس میں آجائیں۔ تلخیص میں ترجمے کی اصل عبارت برقرار رکھی گئی ہے اور ذیلی عنوانات بھی وہی ہیں جو فاضل مترجم نے قائم کیے ہیں، البتہ حاشیے میرے ہیں۔ مولانا مرحوم کی یہ نامکمل کتاب جنوری ۱۹۴۲ء میں (My Life : A Fragment) کے نام سے لاہور سے شائع ہو چکی ہے، جسے جناب افضل اقبال نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مسودے کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ تلخیص کرتے وقت یہ انگریزی کتاب بھی پیش نظر رہی ہے اور غیر ملکی ناموں اور طباعت کی غلطیوں کے سلسلے میں اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ عبداللطیف اعظمی

بچپن

گذشتہ صدی کے آخری چوتھائی حصے میں ریاست رام پور کے ایک اچھے خاصے آسودہ حال اور تہذیب یافتہ گھرانے میں پیدا[1] ہونے کی بنا پر یہ ایک قدرتی بات تھی کہ میں بچپن میں مذہب اسلام کی تعلیم حاصل کرتا۔ چنانچہ اپنے ہم عمر اور اپنی حیثیت کے اور بچوں کی طرح، میں ابھی چھوٹا ہی تھا کہ میں نے عربی زبان میں، ظاہر ہے بغیر ایک لفظ کا مطلب سمجھے، قرآن مجید پڑھنا سیکھا اور اس کے ساتھ ساتھ بغیر کسی خاص کوشش کے میں نے ایک درجن کے قریب قرآن مجید کی آخری مختصر سورتیں بھی حفظ یاد کر لیں، تاکہ بعد میں انھیں روزانہ نمازوں میں پڑھ سکوں۔۔۔۔۔

اگر میں کسی ایسے خاندان کا فرد ہوتا جو مذہبی علوم میں مہارت رکھتا ہوتا تو مجھے بے شک اپنی نصف عمر قرآن اور اس کی تفسیر اور حدیث و فقہ کی تحصیل میں گذارنی پڑتی۔ نیز عقائد، کلام اور منطق پڑھنی پڑتی اور ان دینی علوم کی تمہید کے طور پر مجھے کئی سال تک عربی صرف و نحو اور اس کے ساتھ عربی ادب کا مطالعہ کرنا ہوتا اور اس طرح بیس تیس سال کی عمر تک میں وہ پورا نصاب تعلیم مکمل کرنا جو تمام شمالی اور مشرقی ہند میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے عربی مدارس میں رائج ہے، اس کے بعد میں کہیں جا کر "عالم دین" کے درجے پر فائز ہو سکتا اور پھر ان ہی درسی کتابوں کی دوسروں کو تعلیم دیتا، لیکن چونکہ میں ایسے کسی خاندان سے تعلق نہ رکھتا تھا، اس لیے اس سلسلے میں مجھے صرف اتنا کرنا پڑا کہ اپنے ایک سرخ ریش استاد سے جو ریاضی، تاریخ، جغرافیہ سے، علوم کیمیا و طبیعیات کا تو اس ضمن میں ذکر ہی نہ کیجیے بالکل عاری تھے، ایک درجن یا اس سے زیادہ فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں۔ جیسے شیخ سعدی کی گلستاں بوستاں، رقعات عالمگیر، سکندر نامہ از نظامی اور شاہ نامۂ فردوسی، اس کے علاوہ کچھ فارسی نثر کی کتابیں جو میرے لیے کم قابل فہم تھیں، لیکن ان کی زبان گلستانِ سعدی سے زیادہ دلکش تو نہیں لیکن اس سے زیادہ مرصع ضرور تھی، جیسے ظہوری کی سہ نثر اور اورنگ زیب عالمگیر

---

[1] ۱۷ر جون ۱۹۲۷ء کے "ہمدرد" میں مولانا نے "میری زندگی کے پچاس سال" کے عنوان سے اداریہ لکھا تھا جس میں اپنی تاریخ پیدائش ۱۵ر ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ لکھی ہے جو سنہ عیسوی کے مطابق ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۸ء ہے۔

اور اس کی دکن کی شیعہ سلطنتوں کی فتوحات کے بارے میں نعمت خاں عالی کی ہجو۔ . . . .

میں نے فارسی کی ان درسی کتابوں میں سے بہ مشکل چند ایک ہی ختم کی ہوں گی کہ مجھے رام پور کے ایک اسکول میں جو ابھی نیا ہی قائم ہوا تھا، بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے اپنے گھر سے چالیس میل دور بریلی کے ایک اسکول میں انگریزی اور اس کے ساتھ ساتھ معمول کے مطابق اسکول کے دوسرے مضامین حساب، تاریخ اور جغرافیہ پڑھنے کے لیے جانا پڑا۔ ہمارے اکثر ماموں اور چچازاد بھائیوں کے برخلاف جن کے والدین اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم سے پیدا ہونے والے بے دینی کے اثرات کا تختۂ مشق بنا کر ان کی نجات کو خطرے میں ڈالنے کے مخالف تھے، ہماری والدہ میرے دو بڑے بھائیوں کو پہلے ہی بریلی کے اسکول میں بھیج چکی تھیں۔

میری والدہ کی ستائیس برس کی عمر تھی کہ چند گھنٹے کی بیماری کے بعد ہمارے نوجوان والد[1] آناً فاناً بیضے کی نذر ہو گئے اور وہ بیوہ ہو گئیں۔ ہماری والدہ نے دوسری شادی کرنے سے انکار کر دیا اور اس مشورہ دینے والوں کو بظاہر مذاق میں لیکن بہ باطن دل کا تمام کرب و الم چھپاتے ہوئے کہا تھا کہ پہلے تو انھیں صرف ایک خاوند کا اتنے عرصے تک خیال رکھنا پڑا، لیکن اب انھیں پانچ خاوندوں اور ایک بیوی کا خیال رکھنا ہوگا۔ اس سے ان کی مراد ظاہر ہے اپنے پانچ لڑکوں اور ایک لڑکی سے تھی۔ جن میں سب سے بڑے کی عمر جو بیمار تھا، تیرہ برس کی تھی اور سب سے چھوٹا یعنی راقم الحروف ابھی دو برس کا نہ تھا۔ عورتیں بالعموم مردوں سے زیادہ مذہبی یا کم سے کم زیادہ توہم پرست ہوتی ہیں، لیکن ہماری والدہ جنھوں نے کسی دوسرے کی مدد کے بغیر ہماری تربیت کی، گو بہت مذہبی تھیں لیکن اس کے باوجود نمایاں طور پر تعصب اور توہم پرستی سے خالی تھیں، چنانچہ جب دو بڑے بھائیوں میں سے چھوٹے یعنی شوکت صاحب کو بھی والدہ صاحبہ نے انگریزی تعلیم دلوانے کا فیصلہ کیا تو ہمارے چچا نے جو ہماری جائداد کے منتظم تھے، ان کی تعلیم کے مصارف ادا کرنے کی اجازت دینے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ خاندان

---

[1] مولانا کے والد کا نام عبد العلی خاں تھا اور وہ نواب رام پور جناب یوسف علی خاں کے ہر دلعزیز اور ممتاز درباریوں میں سے تھے۔ ان کا انتقال ۳۲ سال کی عمر میں ۲۰ اگست ۱۸۸۰ء میں ہوا۔

میں ایک "ملحد" کا ہونا کچھ کم برا نہیں۔ ہمارے چچا نے یہ بات بڑے ہی خلوص سے کہی تھی اور ان کی اس بات میں وہ پوری تلخی موجود تھی جو نئی تعلیم کے متعلق اس زمانے کا اور خاص طور سے اس مقام کا اس وقت خصوصی رجحان تھا لیکن ہماری والدہ عزم بالجزم کر چکی تھیں، چنانچہ انھوں نے اپنا بعض ذاتی زیور اپنے ہندو ہمسائے کے ہاں جو سودی کاروبار کرتا تھا، اس کی نوکرانی کے ذریعہ چوری چھپے گروی رکھوا دیا اور خاندان کے دوسرے ہونے والے "ملحد" کو اس یقین کے ساتھ بریلی بھیج دیا کہ ان کے پاس کم سے کم کچھ عرصے کے لیے مصارف تعلیم ادا کرنے کے لیے کافی رقم ہے۔ جب ہمارے چچا ایک قوی ارادہ اور عزم صمیم رکھنے والی ایک خاتون سے جن کا اپنی پوری دکھوں اور تکلیفوں بھری طویل زندگی کے باوجود، خود اعتمادی کا جذبہ بھی اتنا قوی تھا، جتنا ان کا قدرتِ خداوندی کی لامحدود رحمت پر کامل اعتماد، اس طرح مات کھا گئے، تو انھوں نے مجبور ہو کر ساہوکار سے والدہ کے زیور چھڑوا دیے اور ہماری جائداد سے اپنے دونوں بھتیجوں کی تعلیم کے مصارف ادا کرنے پر راضی ہو گئے اور اس کے بعد جب ایک اور "ملحد" نے بھی اسی تباہی کی راہ ڈھونڈی تو چچا کو اس اٹل آفت کو قبول کیے بغیر چارہ نہ رہا، چنانچہ اس طرح میں بریلی روانہ ہو گیا اور میری والدہ کو اس سلسلے میں کسی ساہوکار کے پاس اس کی نوکرانی کے ذریعہ چوری چھپے اپنا زیور گرو رکھنے کی ضرورت نہ پڑی۔ بہرحال میری زندگی کے اور بہت سے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی شوکت صاحب ہی نے میرے لیے راستہ ہموار کیا اور اور اسے میرے لیے سہل بنایا۔......

انگریزی تہذیب اور انگریزی تعلیم کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کا یہ رجحان ہماری رام پور کی ریاست میں تو اور بھی زیادہ معاندانہ تھا۔ پورے صوبے میں زمین کا یہی ایک ٹکڑا تھا جو اب ایک ہندوستانی مسلمان حکمراں کے ماتحت رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس کی حیثیت اردگرد کے برطانوی ہند کے درمیان صحیح معنوں میں ایک نخلستان کی تھی۔ رام پور کے باشندوں کا اہم عنصر قسمت روہیل کھنڈ کے باقی اضلاع کی طرح ان روہیلوں کی اولاد پر مشتمل تھا جو کسی زمانے میں افغانستان سے ترکِ وطن کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ ان روہیلوں کے خلاف وارن ہسٹنگز نے صرف پیسے کی خاطر ایک بدنام ترین جنگ لڑی تھی جس میں کہ والیِ اودھ نے انگریزی فوجوں کو کرائے پر لیا اور ان سے روہیلوں پر حملہ کر دیا تھا۔ موجودہ ریاست رام پور روہیلوں کی آزاد

مملکت کا، جو کبھی از سنگ تا گنگ (ہمالیہ سے گنگا تک) پھیلی ہوئی تھی، بچا کچھا حصہ ہے۔ ان روہیلوں کے دلوں میں ظاہر ہے انگریزوں کے لیے جنھوں نے دوسرے سے پیسے لے کر ان پر چڑھائی کی تھی، زیادہ محبت نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ جب رام پور سے صرف ایک سو میل پر میرٹھ اور دہلی میں پورے زور شور سے غدر کا ہنگامہ شروع ہوا، تو وہ بہت جلد گرد و نواح کے روہیلوں کے علاقے میں بھی پھیل گیا، لیکن اس کے باوجود والیٔ رام پور نے اپنے اس الگ تھلگ مرکز سے اس بات کے علی الرغم کہ روہیلوں میں انگریزوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی، مصیبت میں بری طرح پھنسے ہوئے انگریزوں کی اس موقع پر بڑی مدد کی جس کی وجہ سے والیٔ موصوف جو اپنی فیاضی کی بنا پر اپنی رعایا میں بہت ہر دل عزیز اور اس لیے بہت محبوب تھے، کافی عرصے تک بدنام رہے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے خود اپنے محافظ سپاہی جو اُن کے سونے کے کمرے کے باہر کی حفاظت پر متعین ہوتے، جب رات کو پہرہ بدلتے "تو سپرد کی جانے والی قابل حفاظت چیزوں کو گناتے ہوئے نئے سپاہیوں سے ایک زریں پلنگ کا بھی ذکر کرتے اور آخر میں سامان کی فہرست کو اس تلخ جملے پر ختم کیا جاتا

" اور وہ ملحد جو اس زریں پلنگ پر سو رہا ہے "۔

غدر کے بعد جب مسلمانوں کے باقی ماندہ علم و فضل کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے نہ دہلی کا دربار شاہی رہا اور نہ لکھنؤ ہی باقی بچا، تو لے دے کے صرف ایک رام پور تھا جو اس کے لیے ایک سہارا اور پناہ گاہ بنا۔ چنانچہ رام پور کے دوسرے والی نے اپنے بعد میں آنے والے جانشینوں کے لیے عربی اور فارسی کے بہت سے نادر اور بیش قیمت مسودات کا، جن کا یہ جانشیں بڑی قدر کرتے تھے اور جن میں انھوں نے بہت کچھ اضافہ بھی کیا، ایک ایسا ورثہ چھوڑا جو ہندوستان بھر کا بہترین علمی ذخیرہ بن گیا، اور یہ والی خود بھی کوئی کم پایے کے عالم نہ تھے۔ یہ حالات تھے جنہوں نے رام پور کی تہذیبی قدامت پسندی کو اور بھی تقویت دی اور اسے باقی صوبے سے اگرچہ وہ بھی نئی تعلیم سے جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ کوئی زیادہ محبت نہیں رکھتا تھا، الگ کر دیا۔ انگریزی تعلیم سے رام پور کی عداوت کا اندازہ اس ایک دلچسپ واقعہ سے کیا جا سکتا ہے جو گذشتہ صدی کے اواخر میں پیش آیا۔ ہوا یوں کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ پرانے بے میل اور خالص ہندوستانی ریاست کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا ابھی ٹیلیگراف کی تاروں کے ذریعہ باقی ہندوستان

سے ملا دیا گیا اور اتفاق سے ایک دن ایک رام پوری پٹھان کو اپنی زندگی میں پہلی دفعہ یہ حیرت انگیز واقعہ پیش آیا کہ اس کے نام کہیں سے ایک تار آگیا۔ ظاہر ہے کہ یہ تار انگریزی میں تھا۔ جب وہ اور اس کے دوست اس حیرت انگیز واقعہ کے پہلے صدمے سے ذرا سنبھلے تو انھوں نے محسوس کیا کہ اب تو انھیں اس اٹل حقیقت سے عہدہ برآ ہونا ہی پڑے گا، چنانچہ اب سوال یہ تھا کہ کافروں کی دنیا سے آنے والے اس عجیب و غریب پیغام کے راز سربستہ کو کون کھولے۔ آخر کار ان میں سے کسی شخص کو اتفاق سے یاد آگیا کہ ہمارے خاندان کے بعض لڑکے انگریزی پڑھنے باہر بھیجے گئے ہیں اور اس نے یہ بات اس پریشان حال تار پانے والے پٹھان سے کی، لیکن جونہی اس ناشدنی مصیبت سے نکلنے کی یہ تجویز سامنے آئی، باقی سب لوگوں نے بڑے خلوص سے اس اطلاع کو ماننے سے انکار کر دیا اور ان میں سے ایک چلّا اٹھا: "استغفراللہ! تم کیا کہہ رہے ہو۔ ارے بھائی! وہ تو بڑے شریف لوگ ہیں۔"

گو ہم اپنے آپ کو "شریف لوگ" تو سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود ہم اتنے ناپاک ضرور ہو گئے کہ ہم نے انگریزی پڑھی، اگرچہ اس کے لیے ہمیں رام پور چھوڑنا پڑا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، اپنی ایک دفعہ کی لمبی چھٹیوں میں میرے بھائی ذوالفقار اور شوکت میرے انگریزی کے استاد بن گئے اور اس واقعہ پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس ترقی یافتہ ناظم نے، جس کے مشورے پر والدہ نے میرے دونوں بھائیوں کو انگریزی پڑھنے بریلی کے اسکول میں بھیجا تھا، خود رام پور میں اسی قسم کا ایک اسکول کھول دیا۔ میں نے اس اسکول میں چند ماہ پڑھا، جب میں اپنی عمر کے بارھویں سال میں قدم رکھنے والا تھا کہ مجھے اپنے بڑے بھائیوں کے ساتھ بریلی جانے کی اجازت دیدی گئی۔ شرفاء رام پور کے ضابطۂ آداب کی نظر میں ہمارے اس انحراف کا نتیجہ خواہ "الحاد" سے ہماری قربت کی شکل میں جیسا کہ ہمارے چچا نے کہا تھا، نہ بھی نکلا ہو، لیکن جہاں تک ہماری مذہبی تعلیم کا تعلق ہے، بے شک اس انحراف کی وجہ سے ہمیں نقصان ضرور ہوا۔

اسکول اور کالج کا زمانہ

مجھے اس اسکول میں زیادہ عرصہ نہ رہنا پڑا، کیونکہ جیسے ہی شوکت صاحب نے یہاں سے دسویں جماعت پاس کی، ہم دونوں اپنے بھائی ذوالفقار صاحب کے پاس چلے گئے، جو چند سال پہلے بریلی اسکول سے دسویں جماعت پاس کر کے علی گڑھ کالج میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ اس وقت ایک کافی مشہور اور ایک لحاظ سے بدنام درس گاہ تھی، جسے دس یا پندرہ سال پہلے انگلستان کے پبلک اسکولوں اور رہائشی کالجوں کے نمونے پر ایک "نیچری" مسلمان سر سید احمد خاں کے۔ سی۔ ایس۔ آئی نے قائم کیا تھا۔[3] غدر کے دوران میں جب کہ موصوف روہیل کھنڈ کے ایک فساد زدہ ضلع میں سب جج تھے، انھوں نے انگریزوں سے بڑی پر خلوص وفاداری کا ثبوت دیا تھا، اس کی بنا پر سرکاری حلقوں میں ان کا کافی اثر و رسوخ ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے ملک میں بھی ان کو نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی تھی اور جس کے وہ بہر حال اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور مفادِ عام کے کام کرنے کے لحاظ سے پوری طرح مستحق بھی تھے۔

سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے سے کافی پہلے انھوں نے ایک ایسی مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی ایک مکمل اسکیم بنائی جس کے دروازے سب مذاہب اور سب فرقوں اور ملتوں کے لیے کھلے ہوں اور وہ ہر قسم کے مذہبی اور نسلی تفرقوں سے کلیتاً آزاد ہوں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یونیورسٹی زیادہ تر اور بنیادی طور پر ان کی اپنی ملت اور اس کے نوجوانوں کے لیے ہو، جنھیں دنیوی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم دینا اس کا مقصد ہو گا۔ مزید برآں اس یونیورسٹی کے پیشِ نظر مسلمان نوجوانوں کے لیے ایک ایسا مرکز قائم کرنا ہو گا جس کی فضا خالص اسلامی ہو، تاکہ اس سے فارغ التحصیل ہونے والے صرف تعلیم یافتہ اور تہذیب و ثقافت سے بہرہ مند افراد ہی نہ ہوں، بلکہ وہ تعلیم یافتہ اور تہذیب و ثقافت سے بہرہ مند مسلمان بھی ہوں۔۔۔۔۔۔

ہمارا اسکول گو اپنی الگ عمارت میں تھا لیکن وہ عمارت تھی اسی احاطے میں، جس میں کہ کالج کے دار الاقامہ تھے، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ میں نے اسکول کی جس عمارت میں داخلہ لیا، اسے جگہ نہ ہونے کی

[3] مدرسۃ العلوم (ایم۔ اے۔ او کالج) علی گڑھ جس کا سنگِ بنیاد لارڈ لٹن نے ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو رکھا۔

وجہ سے، اسکول کی عمارت سے کالج کے ایک کمرے میں، جس کے ہال میں مولانا شبلی نعمانی تفسیر پر روزانہ لیکچر دیا کرتے تھے، منتقل کر دیا گیا۔ ایک صبح کا ذکر ہے کہ میں اتفاق سے اس ہال کے باہر کھڑا تھا کہ مولانا شبلی نے اپنا مقررہ درس شروع کر دیا، میں وہیں کھڑا رہا اور پورے غور سے سنتا رہا۔ اس کے بعد ہوا یہ کہ کوئی "بڑی عمر کا" کالج کا لڑکا اپنے کالج کے مقررہ گھنٹوں کے علاوہ اس پابندی سے اس درس میں حاضر نہیں ہوتا تھا جتنا یہ چھوٹا سا اسکول کا طالب علم جو بعض دفعہ خود اپنی جماعت سے شوقیہ غائب ہو جایا کرتا تھا۔ صبح کا ناشتہ میں اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ ڈائننگ ہال میں کرتا تھا اور وہاں سے ان کے ساتھ ہی باہر آتا۔ چنانچہ جب انھوں نے مولانا شبلی کا درس سننے کے متعلق میرا اتنا شوق دیکھا تو اس کا ذکر انھوں نے مولانا سے کیا جو مجھے اپنے درس میں دیکھتے دیکھتے میرے وجود سے باخبر ہو چکے تھے۔ میں جب پہلے پہل بریلی کے اسکول میں سے علی گڑھ آیا تو میں عربی بالکل نہیں جانتا تھا، لیکن ایک دن میں نے اپنے بھائی شوکت کو ان عربی اشعار کا جو وہ پڑھ رہے تھے، حیران کن صحت کے ساتھ ترجمہ کر کے اچنبھے میں ڈال دیا۔ انھوں نے پوچھا کہ مجھے ان اشعار کا کیسے علم ہوا اور بالخصوص میں نے ان کے معنیٰ کہاں سے معلوم کیے۔ میں نے انھیں بتایا کہ ان کی کتابوں میں مولانا شبلی کی تصنیف "المامون" پڑی ہوئی ہے، اور میں نے اس میں یہ عربی اشعار اور ان کے معنیٰ پڑھے ہیں۔ شوکت صاحب یہ جان کر کہ میں نے ان اشعار کو زبانی یاد کرنے کی کوشش کوئی خاص نہیں کی، بلکہ یہ محض پر اثر رقت اور سادگی کی وجہ سے میرے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں، اتنے متاثر ہوئے کہ اس واقعہ کا ذکر انھوں نے مولانا شبلی سے کیا، لیکن پروفیسر صاحب کو اس کا یقین نہ آیا اور ان کی حیرانگی یہ سن کر اور بھی بڑھ گئی کہ میں گیارہ سال کی ناپختہ عمر میں اردو شاعری میں بھی ٹانگ اڑاتا ہوں۔ انھوں نے بغیر اطلاع کے میرا امتحان لینے کی ٹھانی؛ چنانچہ ایک دن میں ان کے کالج کے کمرے میں پہنچایا گیا۔ وہ میرا امتحان لینے لگے۔ انھوں نے مجھ سے اپنی کتاب "المامون" کے بارے میں سوال پوچھے، میں نے اس کتاب کو بڑی جلدی میں اور وہ بھی محض وقت گزارنے کی غرض سے، جبکہ میرے بھائی کالج میں پڑھنے گئے ہوئے تھے اور میں ابھی اسکول میں داخل نہیں ہوا تھا، پڑھا تھا، لیکن میرا خیال ہے کہ میرے حافظے کا یہ امتحان اپنے نتیجے کے اعتبار سے اطمینان بخش رہا۔ اس کے بعد مجھے ایک مصرع طرح دیا گیا کہ میں اس پر غزل کہوں۔ مجھے ان اشعار کی بنا پر نہ تو شعر

کے لیے مخصوص قبرستان میں دفن ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ وہ اشعار ایسے تھے کہ میں آج بھی '' خود اپنی مرضی سے
انھیں مرنے نہ دوں '' اِس طرح 'مصرع پر جو شعر میں نے کہے ' وہ بہرحال فن و عروض پر پورے ضرور اترے
چنانچہ مولانا شبلی کے اس کڑے امتحان میں کامیاب ہونے کا مجھے پورا معاوضہ بھی ملا، یعنی یہ کہ اپنے دونوں
بھائیوں کے ساتھ مجھے بھی ایک شام انھوں نے اپنے ہاں کھانے پر بلایا، لیکن مجھے یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ
میں نے اس شام مولانا شبلی کی گفتگو کی دل آویزی کی داد دینے میں چنداں خوش مذاقی کا ثبوت نہ دیا۔ کیونکہ
جب کافی دیر بعد کھانا چنا جانے لگا تو انھوں نے اس ننھے شاعر کو کمرے کی سب سے بڑی آرام کرسی میں بڑے
آرام سے لوٹ پوٹ مارے سویا ہوا پایا اور بعد میں جب اسے شاعرانہ خیال آفرینیوں سے جگا کر غیر شاعرانہ
نثری حقیقتوں یعنی بریانی اور شاہی ٹکڑوں کی دنیا میں لایا گیا تو اس نے زور زور سے آنکھیں ملنی شروع کر دیں،
تاکہ وہ اپنے آپ سے نیند کے شبہے کو دور کر سکے۔ الغرض قرآن مجید کے درس کے سلسلے میں یہ جان کر کہ میں ان
کی باتوں کی داد دے سکا تھا اور یہ کہ میں ان کے لیکچر دروازے کے باہر کھڑا ہو کر برابر سنا کرتا ہوں، انھوں نے
مجھے از راہِ عنایت اندر آنے کی اجازت دیدی اور اس طرح مجھے اس غیر معمولی مسرت سے بہرہ مند
ہونے کا موقعہ ملا کہ میں پرنسپل کے ہال کے اندر بیٹھ کر ایک کالج کے انڈر گریجویٹ کی پوری شان کے ساتھ
مولانا شبلی کا درسِ قرآن سن سکوں۔ . . . .

مختصراً قرآن مجید کے معانی و مطالب سے اس طرح میرا پہلی بار تعارف ہوا، لیکن افسوس کہ اس کی
مدت چند ماہ سے زیادہ نہ تھی، کیونکہ بعد ازاں میری جماعت کو اسکول کی عمارت میں منتقل کر دیا گیا اور اس میں
اور کالج کی عمارت میں جہاں مولانا شبلی درسِ قرآن دیا کرتے تھے، اتنا فاصلہ تھا کہ میں مولانا کا درس
سن کر وقت پر اسکول نہیں پہنچ سکتا تھا اور اگر اب میں غلطی نہیں کر رہا تو شاید مولانا شبلی بھی اپنے اس
درس کو زیادہ عرصے تک جاری نہ رکھ سکتے تھے اور میرے خیال میں سوائے اس کے اور کوئی وجہ نہ ہوگی کہ
کوئی اہم ضرورت جیسا کہ ڈائننگ ہال کے منتظمین نے صبح کے ناشتے کا وقت ذرا بعد میں کر دیا ہو، اس میں
منتقل ہوگئی ہو اور اس بنا پر مولانا نے صبح کو یہ درس دینا، جس میں کہ میرے خیال میں کافی لوگ آتے تھے،
چھوڑ دیا ہو، تاہم یہ صبح کے مختصر سے نصف گھنٹے تمام عمر میرے حافظے میں محفوظ رہے ہیں۔ چنانچہ بعد میں

جب حکومت نے مجھے ایک ایسی کمیٹی میں نامزدگی کی عزت بخشی، جس کے ذمے ڈھاکہ میں ایک نئی طرز کی مقامی اور رہائشی یونیورسٹی کے سلسلے میں اور بالخصوص اس کے شعبۂ اسلامیات کے لیے نصاب کے تعین کا کام کیا گیا تھا اور وہ اس لیے کہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی بہت زیادہ تھی تو میں نے اس کمیٹی سے درخواست کی تھی کہ وہ مولانا شبلی کو آمادہ کرے کہ وہ ہمیں اس بارے میں اپنے خیالات سے مستفید کریں اور مولانا اس بات کے لیے بخوشی راضی ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب وہ اس سلسلے میں ڈھاکہ آئے تو میں نے ان کے نصف گھنٹے روز کے وہ قرآن مجید کے درس انھیں یاد دلائے، انھیں بڑی خوشی ہوئی کہ مجھے اب تک وہ درس یاد ہیں۔ مولانا شبلی کے ان درسوں کا جنہیں سنے اتنے برس ہو گئے تھے، ایک نتیجہ میری وہ بیزاری تھی جو نئے اور پرانے دونوں طرز کے مولویوں کی ان سطحی معلومات کے خلاف جنھیں کالجوں میں "دینیات" کا نام دیا جاتا تھا، مجھ میں پیدا ہو گئی تھی۔

آکسفرڈ میں

علی گڑھ میں آٹھ سال رہنے کے بعد، ان میں چار سال تو اسکول میں گزرے اور چار سال کالج میں ——— میں نے الہ آباد کی سرکاری یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری لی۔ یہ یونیورسٹی میرے صوبے اور اس کے علاوہ بعض دوسرے ملحقہ صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں کے تمام اسکولوں اور کالجوں کا امتحان لیا کرتی تھی۔ میں بی۔اے میں اپنے استحقاق سے بڑھ کر اچھے درجے میں پاس ہوا تھا[۱]۔ میری اس غیر معمولی کامیابی نے میرے بھائی شوکت صاحب کو ایک معجزہ دکھانے پر آمادہ کیا اور انھوں نے کسی نہ کسی طرح سے روپے کا انتظام کر کے مجھے آکسفرڈ بھجوا دیا۔ . . . انگلستان میں میری تعلیم کے لیے مصارف کا انتظام کرنا معجزہ سے کم نہ تھا، لیکن آج کے معجزات نہ ماننے والے دور میں یہ معجزہ آخر کار پورا ہو کر رہا۔ چنانچہ ابھی حیرت[۲] و استعجاب کے روایتی نو دن گزرنے نہیں پائے تھے کہ میں بحر ہند کے کھلے سمندر میں جہاز پر سوار برسات کے

---

[۱] یہاں اغلباً فاضل مترجم کی طرف سے نوٹ ہے کہ: "مولانا محمد علی نے ۱۸۹۶ء میں بی۔اے کیا اور صوبے میں اول آئے۔" یہ سنہ صحیح نہیں ہے۔ ۱۸۹۸ء صحیح ہے۔ (لطف:عفی)

طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے انگلستان جا رہا تھا اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ انگلستان تک میرا سمندر کے راستے ہی جانا طے ہوا تھا، تاکہ اس طرح میرے اعجاز آفریں بھائی کو (فرانس کے راستے) خشکی سے جانے کے مقابلے میں میرے سمندر کے راستے جانے کی وجہ سے ایک ہفتہ اور مل جائے جس میں وہ موعودہ رقمیں جمع کرکے بحری تار کے ذریعہ مجھے لندن بھجوا سکیں۔

آکسفرڈ میں، جہاں سے کہ میں نے تاریخ جدید میں آنرز کی ڈگری لی تھی، مجھے بہت اچھا موقع ملا کہ میں نے، جو اپنے اسکول کے لیے عام تاریخ کا مضمون لیا تھا، اس کے ضمن میں اپنے ہم مذہبوں کی تاریخ کے ایک حصے سے واقف ہو گیا، جو مشتمل تھا اسلامی سلطنت کے آغاز اور اس کے عروج پر اور اس میں شروع کی صلیبی جنگوں کا زمانہ بھی آتا ہے، لیکن اس کے باوجود میں مذہب کے بارے میں جو عہد قدیم کے مسلمانوں کے لیے تلوار اور ڈھال دونوں تھا، آکسفرڈ میں مزید کچھ نہ پڑھ سکا۔۔۔

کامریڈ کا اجراء

چار سال کے بعد میں ہندوستان واپس آ گیا۔ گویا میں نے آکسفرڈ سے ڈگری تو لے لی، لیکن انڈین سول سروس (آئی۔ سی۔ ایس)، کا جسے اس زمانے میں بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا جاتا تھا، میں رکن نہ بن سکا۔ اس میں کچھ تو انگریزوں کے موسم بہار کا دخل تھا اور کچھ ایک نوجوان کی تھوڑی بہت احمقانہ ترنگ کا۔ بہرحال اب میرے پاس مذہب کا مطالعہ نہ کرنے کا اور بھی زیادہ معقول عذر موجود تھا، کیونکہ جو نوجوان بڑودہ کے مہاراجہ گائیکوار جیسے چوکس اور باریک بین منتظم کے ماتحت سرکاری ملازمت میں امتیاز حاصل کرنے کا خواہش مند ہو، اسے ظاہر ہے کہ بڑی مشقت پسند زندگی گذارنی تھی۔ اپنی ریاست رام پور میں بہ تمام تعلیمات کے عہدے سے مستعفی ہونے کے کچھ عرصہ بعد میں مہاراجہ گائیکوار کی ملازمت میں آیا تھا اور رام پور میں بھی گھر کی محبت اور اس کے قابلِ محبت افراد کی الفت میرے جذبۂ امتیاز کے لیے مزید محرک بنی اور اس کی وجہ سے میں اپنے محکمے کے کام میں بے حد مصروف رہا۔۔۔ ۱۹۱۰ء کے آخر میں میں نے بڑودہ کی ملازمت بھی ترک کر دی اور کلکتہ سے اپنا ایک ہفتہ وار اخبار نکال کر میں صحافت میں آ گیا۔ یہ نئی راہ ایک حد تک

کافی سنگین تھی اور خاص طور سے اس شخص کے لیے جو بیکن Bacon کی پُرمعنی اصطلاح میں قسمت کے حضور میں اپنی بیوی اور بچوں کی صورت میں اتنے یرغمال پیش کر چکا ہو۔ بہر حال کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بڑودہ میں ایک افسر کی حیثیت سے اپنے کام کے سلسلے میں اچھی خاصی کامیابی حاصل کی تھی اور میں وہاں کی ملازمت سے صرف اس طرح علیحدہ رہ سکا تھا کہ میں نے پہلے اپنی علیحدگی کو دو سال کی بلا تنخواہ رخصت کی ظاہری شکل دی اور جب اس ظاہری شکل کے لیے کوئی اور صورت باقی نہ رہی اور میں نے مہاراجہ گائیکوار کے ہاتھ میں اپنا استعفا پیش کر دیا جسے وہ قبول کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھے اور بالآخر مجبوراً وہ مجھے مزید رخصت دینے پر راضی ہو گئے۔ بے شک یہ باتیں میری خود پسندی کے جذبے کے لیے بڑی تسکین دہ تھیں، نیز یہ کافی بڑا صلہ تھا میری ان محنتوں کا جن کا میری خلافِ معمول اچھی تندرستی پر بُرا اثر پڑا تھا لیکن دراصل اس وقت میرا یہ خیال تھا کہ مجھے اس ملازمت کے بجائے دوسرے دائرے میں کام کرنا چاہیے۔ میں ریاست بڑودہ ہی کی ملازمت میں تھا کہ مجھے دو اور ریاستوں کی پیش کش کو، جو بڑودہ کے عہدے سے زیادہ دیرپا تھی، مسترد کرنا پڑا اور اسی قسم کی ایک تیسری پیش کش کا جواب، جو ان سے بھی زیادہ اپنے اندر دل کشی رکھتی تھی، میں نے اس وقت دیا جب "کامریڈ" کا پہلا پرچہ نکل آیا۔[۵] درحقیقت نیلسن Nelson کے اس مشہور واقعے کی نیم سنجیدہ تقلید میں، جس میں اس نے اپنی اندھی آنکھ کے سامنے دوربین رکھ لی تھی، میں نے اس آخری ریاست[۶] کی پیش کش کے لیے چوڑے تار کو جس میں مجھے وزارت پیش کی گئی تھی، اس وقت تک نہ کھولا جب تک "کامریڈ" کا پہلا پرچہ چھپ کر بکنے کے لیے کلکتہ کے بازاروں میں نہیں پہنچ گیا، کیونکہ مجھے یہ شک تھا کہ یہ ان کھلا تار اُس نوجوان والیِ ریاست کا ہوگا جس کی باصرار پیش کش کی

---

۵ انگریزی کا یہ ہفتہ وار اخبار "کامریڈ" کا پہلا شمارہ کلکتہ سے ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء کو شائع ہوا۔ ۱۴ر ستمبر ۱۹۱۲ء کے شمارے کے بعد "کامریڈ" کا دفتر دہلی منتقل ہو گیا اور ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کو دلّی سے پہلا شمارہ شائع ہوا۔ ۲۶ر ستمبر ۱۹۱۴ء کے "کامریڈ" میں مولانا کا مشہور اداریہ "چوائس آف دی ٹرکس" شائع ہوا اور اس کی وجہ سے "کامریڈ" کی ضمانت ضبط ہو گئی جس کے نتیجے میں اخبار بند ہو گیا۔ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کو "کامریڈ" دوبارہ جاری ہوا اور ۲۲ر جنوری ۱۹۲۶ء تک شائع ہوتا رہا۔

۶ وسطی ہندوستان کی ریاست جاورہ کی طرف اشارہ ہے۔

سر مائیکل اوڈائر Sir Michael O'Dwyer جیسا آدمی بڑے زوروں سے نافذ

کر رہا تھا اور میں اس آخری لمحے میں بھی اس قسم کی تمام ترغیبات سے بچنا چاہتا تھا۔ صحافت کی نئی راہ اختیار کرکے مجھے ایک یقینی، گو بہت زیادہ نہ سہی، آمدنی اور مستقبل کی ترقی کے تمام مواقع سے دست بردار ہونا پڑا اور میں نے ایک جواری کی طرح وہ تمام روپیہ جو میں کہیں سے بھی اکٹھا کر سکا، ایک داؤ پر لگا دیا اور یہ داؤ تھا ایڈیٹر اور پروپرائٹر بننے کا، جس نے بعد میں ایک غیر مقدس لیکن بہت ہی گراں "تثلیث" یعنی ایڈیٹر، پروپرائٹر مع پرنٹر کی شکل اختیار کر لی۔

اور یہ سب کچھ میں نے اس لیے نہیں کیا تھا کہ میرے لیے صحافت میں کوئی خاص جاذبیت تھی، بلکہ طرفہ تر امر یہ تھا کہ مجھے اس وقت تک اس پیشے کا، جو اور پیشوں کی طرح کافی سخت ہے، تھوڑا سا بھی تجربہ نہ تھا، سوائے اس کے کہ میں کبھی کبھی "ٹائمز آف انڈیا" بمبئی کے لیے، جس میں مجھے سب سے پہلے مسٹر لوویٹ فریزر Lovat Fraser نے لکھنے کی دعوت دی تھی، کچھ لکھ دیا کرتا تھا دراصل جس چیز نے مجھے صحافت میں جانے پر اس ناقابل مدافعت حد تک مجبور کر دیا، وہ یہ تھی کہ اس وقت میں صحافت ہی کے ذریعہ اپنی ملت کے مسائل کے سلسلے میں کام کرکے ملت کے لیے ایک حد تک مفید بھی ہو سکتا تھا اور اس طرح اپنی روزی بھی کما سکتا تھا، لیکن اس کے باوجود میرا یہ کوئی مذہبی جذبہ نہ تھا جس کا عملی نتیجہ میرے مسلکِ حیات میں، جس پر میں اطمینان کے ساتھ عمل پیرا ہو چکا تھا اس فوری اور جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا، اس قدر اہم تبدیلی کی صورت میں نکلا، اس امر کے محرک زیادہ تر میری ملت کے دنیوی[1] مسائل تھے، جنھوں نے اس وقت میرے منصوبوں کا رخ بدلنے کا مطالبہ کیا تھا۔

لیکن جیسا کہ میں ۱۹۱۱ء میں، جب کہ میں صحافت کی اسٹیج نمار وشنیوں کے سامنے پہلا کورنش بجا لایا، بڑی امیدوں کے ساتھ منصوبہ بنایا تھا۔ آگے چل کر حالات بالکل اسی طرح رونما نہیں ہوئے

---

[1] یہ "دنیوی" لفظ "سیکولر" کا ترجمہ ہے، جسے آج سے ۶۶ سال پہلے مولانا محمد علی جیسے مذہب پرست نے استعمال کیا تھا۔

یہ سال اسلامی ملکوں کے لیے بڑا منحوس تھا، ترکی، ایران اور مراکش کی نئی حکومتوں کو اپنی اصلاح اور ترقی کی مسافت کی پہلی ہی منزل میں جھگڑوں سے دوچار ہونا پڑا اور ان جھگڑوں نے جلد ہی مستقل طور پر طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ . . . میں بلقان کی پُرمصائب جنگ کے دوران میں ایک وقت شدتِ جذبات سے اتنا بے قابو ہو گیا تھا [جس کا] میں آج یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اس وقت خودکشی کرنے تک کا سوچا۔ یہ بات بظاہر بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اس قسم کے اخلاقی بزدلی کے اقدام کے لیے کچھ ہمت کی ضرورت ہوتی ہے اور میں نے اس پر بعد میں کئی دفعہ غور کیا ہے کہ آیا میں اس وقت اپنے اندر اتنی ہمت بہم کر سکتا تھا کہ میں اس منحوس رات کو آخری اور قطعی قدم اٹھا سکتا۔ اس رات اس مضمون کا رائٹر کا آخری تار مجھے ملا تھا کہ بلغاری فوجیں قسطنطنیہ کی دیواروں سے صرف ۲۵ میل دور رہ گئی ہیں، وہ قسطنطنیہ جو گزشتہ پانچ صدیوں سے ہر مسلمان کے لیے اس کی سب سے اعلیٰ امیدوں کے مرکز ہونے کی وجہ سے مقدس تھا۔ میں آج پہلی دفعہ اس بات کا ' جس کو مجھے اپنی کمزوری نہیں کہنی چاہیے ' اعتراف کر رہا ہوں۔

مشکلات کا آغاز

اس زمانے میں پریس ایکٹ کے ماتحت اخبارات و رسائل کے ناشروں اور چھاپہ خانے کے مالکوں اور کیپروں Keepers کو اچھے چال چلن کے لیے حکومت کے ہاں نقد ضمانت داخل کرانی پڑتی تھی، لیکن جب ۱۹۱۰ء میں میں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا تو میرے اخبار کے انگریز طابعوں Printers کو اس بنا پر ضمانت داخل کروانے سے مستثنیٰ کرایا گیا کہ اس زمانے میں ہندوستانی مسلمان کی سیاست زیادہ تر انگریزی حکومت کے حق میں تھی، بلکہ ہندوستان کی دوسری زیادہ آگے بڑھی ملتوں کے مقابلے میں اس میں بسا اوقات خوشامد اور کاسہ لیسی کا شائبہ پایا جاتا تھا اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کو بہت حد تک بے ضرر سمجھا جاتا تھا۔ دو سال بعد جب میں کلکتہ سے دہلی منتقل ہوا تو ہندوستان کے اس نئے پرانے پایۂ تخت میں جہاں کلکتہ کی طرح طباعت کی سہولتیں

رہتیں، مجھے خود ایک چھاپہ خانے کا "کیپر" بننا پڑا۔ اس وقت تک میں انگریزی حکومت کی نظروں میں کچھ تھوڑا سا مشتبہ ہو چکا تھا، چنانچہ مجھے متعدد اعلیٰ افسروں سے ملنا پڑا، تب کہیں جاکر مجھے ضمانت داخل کرانے سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ اس بڑی عنایت کی سرکاری طور پر وجہ یہ بتائی گئی کہ دو سال پہلے کلکتہ میں میرے ساتھ عنایت کی گئی تھی اور یہ کہ میں نے امیدواری کا یہ دو سال کا عرصہ "شرافت" سے گزارا ہے، لیکن افسوس کہ میں زیادہ دنوں تک اپنی اس "شرافت" پر قائم نہ رہ سکا، کیونکہ مجھے ان دنوں ترکی سے بلقانی اتحادیوں کے مقدونیہ میں مظالم کے متعلق ایک پمفلٹ ملا تھا جس میں عیسائیوں اور بالخصوص انگریزوں سے جو کہ بہبا میں ترکوں کے پرانے حلیف اور برلن کانگریس میں ان کے دوست تھے، اپیل کی گئی تھی]۔ اس پمفلٹ کا عنوان تھا: "مقدونیہ میں آؤ اور ہماری مدد کرو۔"[9]

(مولانا کو جب یہ کتابچہ ملا تو مع تصاویر کے پورا کتابچہ ہفتہ وار "کامریڈ" میں ضمیمے کے طور پر قسط وار ۱۷ارمئی سے ۷رجون ۱۹۱۳ء تک شائع کر دیا اور اس کا اردو ترجمہ روزنامہ "ہمدرد" میں، جو ۱۳رجون ۱۹۱۲ء کو اور اس سے پہلے فروری ۱۹۱۳ء میں "نقیب ہمدرد" کے نام سے جاری ہوا تھا، ۶رجون سے ۲۰رجون تک شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کی وجہ سے پریس کی ضمانت ضبط ہو گئی۔ اب آگے کی کہانی خود مولانا کی زبانی سنئے۔ مدیر)

"دہلی کے مجسٹریٹ نے میرے چھاپہ خانے کے "کیپر" سے زیادہ سے زیادہ ضمانت جو وہ قانوناً مانگ سکتا تھا، فوری طور پر داخل کرنے کا مطالبہ کیا اور میرے اس وقت دہلی سے باہر کلکتہ میں ہونے کا بھی اس نے کوئی خیال نہ کیا۔ میرے وکیلوں نے اس ڈر سے کہ کہیں چھاپہ خانہ بند ہونے سے میری صحافتی سرگرمیاں ختم نہ ہو جائیں، تمام تر اپنی ذمہ داری پر ضمانت کی رقم جمع کرا دی۔ اس کے ایک سال بعد ٹھیک جس دن برطانیہ نے ترکی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا، یہ ضمانت ضبط کر لی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ اس سے پانچ گنا زیادہ دوسری ضمانت طلب کر لی۔ اب اگر اس کے بعد قانون کی خلاف ورزی ہوتی تو اس زر ضمانت کے علاوہ پچاس ہزار کا چھاپہ خانہ بھی ضبطی کے احکام کی نذر ہوتا۔ اس تازہ حکم ضمانت طلبی کا سبب ایک مضمون تھا جو "لندن ٹائمز" کے افتتاحیہ بعنوان "ترکوں کا انتخاب' The Choice of the Turks' سے برانگیختہ ہو کر "کامریڈ" میں لکھا گیا تھا اور جو ایک ماہ ہوا شائع ہوا تھا۔[10]

---

[9] کلکتہ سے "کامریڈ" کا دفتر ۱۴ستمبر ۱۹۱۲ء کو دہلی منتقل ہوا اور ۱۲ر اکتوبر (۱۹۱۲ء) کو "کامریڈ" کا پہلا شمارہ دہلی سے شائع ہوا

"Came over into M...

یہ مقالہ[11] ایک عظیم بحران کے زیر اثر لکھا گیا تھا۔ میں اس وقت تک ذیابطیس کی تکلیف سے، جس وجہ سے
سے چھ ہفتے پہلے پاؤں کی انگلی کے ناخن کے نیچے ایک پھوڑے کے لیے سرجن کی ضرورت پڑی تھی، صاحب فراش
تھا۔ اس مقالے کے بیس[12] فیصلہ کن کالم لکھنے کے لیے چالیس گھنٹے مسلسل بیٹھا رہا اور اس دوران میں نہ تو میں سویا
نہ میں نے آرام کیا اور نہ کچھ کھایا ہی، سوائے اس کے کہ میں بڑی تیز کافی پیتا رہا، جسے میں بہت کم پیا کرتا تھا۔ اس
مقالے کے پروف میں نے رام پور جاتے ہوئے چلتی گاڑی میں پڑھے، جہاں کہ میں اپنے بے حد عزیز بھائی، اپنی اکلوتی
بہن کے خاوند کی تدفین کے لیے، جس کا اچانک انتقال ہو گیا تھا، جا رہا تھا۔ "کامریڈ" کے اس شمارے کے
لیے ایک اور افتتاحیہ پہلے کمپوز ہو چکا تھا، لیکن اس شمارے کو روک لیا گیا، تاکہ یہ نیا مقالہ اس میں شائع
ہو سکے اور اس طرح وقت پر برطانیہ اور ترکی پہنچ سکے، تاکہ اس کے لیے اگر ممکن ہو تو یہ اس لڑائی کو چھڑنے
سے روک سکے، جس کی طرف "لندن ٹائمز"[10] کا افتتاحیہ کریمیا کے حلیفوں (ترکوں) کو دھکیل رہا تھا۔ جب
"کامریڈ" کے اس مقالے کی بنا پر چھاپہ خانے کی ضمانت ضبط ہوئی تو "ہمدرد" کو بھی، جو کبھی کسی کے لیے وجہ
پریشانی نہ بنتا تھا، اپنے دروازے بند کرنا پڑے۔ ضمانت کی ضبطی کے اعلان کے فوراً بعد ان لوگوں نے جنھیں
مجھ سے ہمدردی تھی، مجھے چندے بھیجنے شروع کر دیے، تاکہ میں دس ہزار روپے کی یہ ضمانت جمع کرا دوں
اور واقعہ یہ ہے کہ اس ضمن میں مجھے ضمانت سے زیادہ رقم چندوں سے آ گئی، لیکن اس کے باوجود ہر ایک دوست
نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ میں یہ ضمانت جمع نہ کروں، کیونکہ اگر یہ ضمانت ضبط ہوئی تو اس کے ساتھ چھاپہ خانے پر
بھی زد پڑے گی۔ میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جب تک جنگ رہے گی میں دوبارہ "کامریڈ" نہیں نکالوں گا، کیونکہ
حکومت ایسے قضیوں کے متعلق، جن کی حمایت میں کرتا تھا، کوئی بات صبر و تحمل سے سننے کے لیے آمادہ نہیں ہے

ایک طرف میری یہ پریشانی اور اس کے ساتھ اس قسم کے زائد کام تھے اور دوسری طرف مجھے کلکتہ اور
لاہور پریس ایکٹ کے مقدمے کی وجہ سے بار بار جانا پڑا۔ ان چیزوں نے میری صحت کو بالکل تباہ کر دیا اور میرے
ڈاکٹروں[13] نے بڑی آسانی سے اندازہ کی جانے والی مدت کے اندر اندر میری موت کی ضمانت دے دی۔ اگر میں نے

---

[10] "لندن ٹائمز" مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۱۴ء۔ [11] یہ مقالہ ۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کے "کامریڈ" میں شائع ہوا۔

[12] مولانا سے سہو ہوا ہے۔ یہ مقالہ "کامریڈ" کے بیس کالم میں نہیں، پونے اٹھارہ کالم میں شائع ہوا ہے اور
۸ صفحات میں ۲۳۳ سے ۲۴۰ صفحات تک ہے۔

[13] ڈاکٹر مختار احمد اور حکیم اجمل خاں

"لمبی چھٹی" نہ لی جو ایک عرصے سے میرے لیے بے حد ضروری ہوگئی تھی۔ چنانچہ "ہمدرد" کو دوبارہ نکالنے کے تین ماہ[12] بعد میں نے اس کی ادارت کی ذمہ داری اپنے معاون ایڈیٹروں[15] اور اس کے انتظامات کی ذمہ داری اپنے بھائی شوکت صاحب کے سپرد کردی اور خود میں رام پور چلا گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہی صوبجات متحدہ (یوپی) کے انسپکٹر جنرل پولیس، جس کے حاکم لارڈ مسٹن Lord Meston تھے جن سے ایک زمانے میں میرے بہت دوستانہ تعلقات تھے اور جو مسجد کانپور کے حادثے کے بعد کوئی دو سال سے میرے کھلم کھلا دشمن ہوگئے تھے، میرے پیچھے میرے اس ملجاو مامن میں پہنچ گئے اور انھوں نے ہزہائی نس نواب رام پور سے مل کر وہیں میری "نظربندی" کا انتظام کردیا[16]۔ لیکن چونکہ وہاں کی گرمی کی شدت کا اثر میری صحت پر ادھر بھی برا پڑا تھا، اس لیے ہزہائی نس نے مجھے پہاڑ پر جانے کی اجازت دے دی اور جونہی میں پہاڑ جاتا ہوا اپنے طبی مشیر اور دوست ڈاکٹر انصاری کی معیت میں جو سوری میں میرے ساتھ مکان میں شریک ہونے والے تھے، دہلی پہنچا[17] تو میرے پاس حکومت دہلی کی طرف سے "نظربندی" کا حکم آگیا[18]۔ اس حکم میں میرے بھائی شوکت صاحب بھی شامل تھے، جن کا حاجیوں کے لیے بڑی سرگرمی سے کام کرنے کے علاوہ صرف یہی ایک جرم تھا کہ میری دہلی کی غیر حاضری میں وہ پچھلے ایک ماہ سے میرے مالی انتظامات کی دیکھ بھال کر رہے تھے، نیز انھوں نے نظربندی کے اس حکم کی بڑی کامیابی سے پیروی کرکے جو ہزہائی نس نواب رام پور سے مجبوراً لیا گیا تھا، منسوخ کرادیا تھا۔

رہائی اور سیاسی مصروفیتیں

ایک صبح[19] کو جب کہ ابھی دن نہیں چڑھا تھا، ہمیں اپنے چھندواڑہ کے مکان سے، جسے پولیس نے پہلے سے گھیرے میں لے لیا تھا، دو پولیس افسروں اور چند مسلح سپاہیوں کی معیت میں موٹر کار میں اسی میل دور بیتول کے جیل میں منتقل کردیا گیا۔ چار چار سال کی نظربندی اور جلاوطنی کے بعد ہم نے اسٹیٹ قیدی کی حیثیت سے جیل کے اندر وسات مہینے اور گذارے تھے کہ اچانک دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخر میں حکومت کی طرف سے

---

[14] ۱۵ر اپریل ۱۹۱۵ء کو ڈھائی ماہ کی رخصت پر دہلی سے اپنے وطن روانہ ہوئے۔ [15] قاضی عبدالغفار اور سید جالب دہلوی۔ [16] نظربندی کا یہ حکم ۲۲ر اپریل ۱۹۱۵ء کو ملا۔ [17] ۱۴ر مئی ۱۹۱۵ء کو بروز جمعہ۔ [18] ۱۵ر مئی ۱۹۱۵ء کا یہ حکم نامہ ۱۶ر مئی کو علی برادران پر تعمیل کیا گیا اور ۲۱ر مئی ۱۹۱۵ء کو بعد نماز جمعہ علی برادران مہرولی کے لیے روانہ ہوئے، جہاں انھیں نظربند کیا گیا تھا۔ [19] ۸ر جون ۱۹۱۹ء

بذریعہ تار" لائن کلیر" (راستہ صاف ہے) کا پیغام ملا اور اس کے چند ہی گھنٹے بعد ہم پہلے کی طرح ایک بار پھر آزاد[۲۰] تھے اور بسرعت تمام امرتسر کی طرف، جہاں کہ انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ اور نئی بنی ہوئی خلافت کانفرنس کے اپنے اپنے اجلاس ہو رہے تھے یا ہونے والے تھے، جا رہے تھے۔

ہمیں امرتسر پہنچے ابھی دو دن بھی نہیں ہوئے[۲۱] تھے کہ میرے بھائی نے، جو خلافت کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کے لیے منتخب کئے گئے تھے، مجھ تک یہ چونکا دینے والی خبر پہنچائی کہ کانفرنس کے منتظمین کا اصرار ہے کہ میں یورپ جانے والے وفد خلافت کی قیادت کروں، چنانچہ ہوا یہ کہ ابھی ہمیں رہا ہوئے بمشکل ایک مہینہ نہیں گزرا تھا کہ میں اپنے تین ساتھیوں[۲۲] کے ہمراہ "آسٹرین لائڈ اسٹیمر Austrian Liyod Steamer" میں سوار سمندر میں سفر کرتا ہوا وینس کی طرف[۲۳] جا رہا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ جانے والے سامان کا بھی اس وقت پتہ چلا کہ جب جہاز کے اوپر میرے پرانے نوکر نے جو بچپن[۲۴] سے میرا ساتھی رہا ہے اور کچھ عرصے کے لیے مدرسے میں میرا ہم جماعت بھی رہ چکا ہے، مجھے اپنے بکسوں کی کنجیاں اور ان چیزوں کی فہرست دی، جن کی اس کے خیال میں مجھے یورپ میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں میں واپس ہندوستان پہنچا لیکن جیسا کہ میری بیوی اور بچیوں کو بعد میں معلوم ہوا کہ میں اپنے گھر نہ پہنچ سکا۔ مہاتما گاندھی، میرے بھائی اور میں پورے ہندوستان کے لیے مسلسل سفر پر رہے اور مجھے یاد نہیں پڑتا کہ بہت سے مہینوں کے بعد بھی دو یا تین دن متصل ایسے گذرے ہوں کہ ہم ایک جگہ رہے ہوں، چنانچہ ریل گاڑی ہی میرا گھر بن گئی۔ چنانچہ ہم نے کئی ماہ اسی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں سفر کرتے اکٹھے گزارے۔ ہم، مہاتما گاندھی اور اپنے ساتھی کارکنوں اور سکریٹریوں کی ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ ہم ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو والٹیر ریلوے اسٹیشن پر جب کہ ہم مدراس اور مالابار کے فساد زدہ علاقے کی طرف جا رہے تھے، مجھے گرفتار

---

[۲۰] ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہائی عمل میں آئی۔ [۲۱] ۳۰ دسمبر ۱۹۱۹ء کو اجلاس مسلم لیگ (منعقدہ امرتسر) کو اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء کو اجلاس کانگریس کو خطاب کیا۔ [۲۲] مولانا سید سلیمان ندوی، مسٹر سید حسین (جو اس وقت بمبئی کرانیکل میں تھے) اور مسلم یونیورسٹی کے نامور اولڈ بوائے حسن محمد حیات (وفد کے سکریٹری)

[۲۳] یہ وفد یکم فروری ۱۹۲۰ء کو غالباً لکھنؤ سے روانہ ہوا۔ [۲۴] محمد حسین جو مولانا کی وفات کے بعد ان کی سب سے چھوٹی صاحبزادی گلنا دبی، بیگم شعیب قریشی کی خدمت میں رہے۔

کرلیا گیا۔ اس وقت ہم پھر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے، لیکن یہ بات میرے لیے تسکین بخش ہے، جس میں کچھ میری حیرانگی اور استعجاب بھی شامل ہے کہ اب میری بیوی بھی سفر کر رہی ہے اور وہ بھی پبلک مصارف پر۔ ـــــ اور ان کا رفیقِ سفر میرا بھتیجا اور داماد بحیثیت سکریٹری کے ہے اور انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ اور خلافت فنڈ کے لیے کافی بڑی رقمیں جمع کی ہیں۔

والٹیر اسٹیشن پر ایک ایسے وارنٹ کے ذریعہ میری گرفتاری، جس میں اس ضلع کے مجسٹریٹ نے جہاں میں اب تک کبھی نہیں گیا تھا، مجھ سے اچھے سلوک اور امن قائم رکھنے کے لیے ضمانت چاہی تھی۔ دراصل جیسا کہ بعد میں واقعات سے ثابت ہوا، ایک تدبیر تھی مجھے اس وقت تک روکے رکھنے کی، جب تک کہ ایک اور وارنٹ دور دراز کراچی سے نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ میرے مدراس پہنچنے سے قبل ہی اور مالابار تو ابھی بہت دور تھا مجھے پکڑ کر ایک مقامی جیل میں بند کر دیا گیا۔ اس واقعہ پر تین دن گزرے تھے کہ میرے خلاف مقدمے کی کارروائی واپس لے لی گئی اور جونہی میں جیل سے باہر نکلا، احاطہ بمبئی کے ایک پولیس افسر نے کراچی سے جاری کردہ ایک وارنٹ پر مجھے گرفتار کر لیا۔ کراچی سے میرے خلاف یہ وارنٹ اس قرارداد کی بنا پر جاری کیا گیا تھا جو خلافت کانفرنس منعقدہ کراچی[25] نے میری زیرِ صدارت پاس کی تھی۔ میرے بھائی اور میرے علاوہ اس سلسلے میں پانچ اور دست[26] بھی کارکن، جن میں ایک بلند پائے کا مذہبی لیڈر ایک ہندو بھی تھا، ماخوذ تھے اور الزام یہ تھا کہ انھوں نے مسلمان فوجیوں کو حکومت کے خلاف ورغلایا ہے۔ ہم اس مقدمے میں عبور دریائے شور کی توقع کر رہے تھے لیکن جیوری نے، جس میں ایک یورپی، دو گوا کے عیسائی اور دو ہندو تھے، اس الزام سے ہمیں بالاتفاق بری قرار دیا، تاہم ایک بیان چھاپنے کے معمولی سے الزام میں جج نے چھ مسلمانوں کو دو دو سال قید با مشقت کی سزا دی اور ساتھ ہی ہندو ملزم کو بری کر دیا۔ ایک عرصے کے بعد اب کہیں جا کر کراچی جیل میں جائے امن ملی، جہاں کہ حکومت کی نظر میں "شریر تنگ کرنا چھوڑ دیتے ہیں" اور "شریروں" کی نظر میں تھکے ہوؤں کو کچھ آرام مل جاتا ہے۔

یہیں ـــــ موسم سرما کی طویل راتوں کے دوران میں مجھے یہ خیال آیا کہ جیل کی دن کی مشقت کے بعد

---

[25] مورخہ ۹ جولائی ۱۹۲۱ء

[26] علی برادران کے علاوہ دوسرے پانچ حضرات کے نام یہ ہیں: (۱) مولانا حسین احمد مدنی (۲) ڈاکٹر سیف الدین کچلو (۳) مولوی نثار احمد (کانپوری) (۴) پیر غلام مجدد مٹیاروی (سندھی) اور (۵) شری شنکر اچاریہ جی (شاردا پیٹھ)

مجھے کچھ فراغت اور سکون و اطمینان مل جاتا ہے جس کی مجھے لکھنے کے لیے ضرورت تھی، چنانچہ میں نے اپنی کتابیں منگوانے اور اپنے پیسوں سے لکھنے کا سامان خریدنے کی اجازت مانگی، تاکہ تھوڑا بہت تصنیف و تالیف کا کام کرسکوں میں جیل میں اپنی "سزا" کے چار پانچ مہینے گزار چکا تھا کہ مجھے ضروری اجازت مل گئی اور اس کے چند ماہ بعد مطلوبہ کتابوں کی فہرست بھی منظور کرلی گئی اور جن کتابوں کی مجھے ضرورت تھی، ان میں سے اکثر کتابیں بتدریج آنی شروع ہوگئیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیل کی مقررہ مشقت کرنے کے بعد سنجیدہ قسم کے ذہنی کام کرنے کے متعلق میں نے اپنی استعداد کا اس سے کہیں زیادہ فراخ دلی سے اندازہ لگایا تھا جتنی وہ تجربے کے بعد ثابت ہوئی میرا خیال تھا کہ اس عرصے میں رسول اللہ کی سیرت مرتب کرنے کے علاوہ آپؐ کے اس پیغام کی تشریح بھی کرسکوں گا، جو آپؐ انسانیت کے لیے لائے تھے۔ سیرت بیشتر مولانا شبلی کی معرکتہ الآراء تصنیف پر مبنی ہوتی، گو جن طبقوں کے لیے یہ دونوں کتابیں لکھی جاتیں، ان کی ذہنی استعداد کا ان کی ترتیب میں ضروری لحاظ رکھا جاتا، چنانچہ میں نے بڑی کتاب کو پہلے شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے ہر شام کو مطالعہ کرنے لگا۔ یہ کام کافی حد تک میری طبیعت کے مناسب تھا، لیکن باہر کی دنیا سے خط و کتابت کرنے میں ایک قیدی کو جو مشکلات پیش آتی ہیں، نیز اس پر جو پابندیاں عائد ہوتی ہیں، ان کی وجہ سے جن کتابوں کی مجھے ضرورت تھی، وہ بہت دیر میں مجھے ملیں، چنانچہ جب میری سزائے قید میں ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا تو میں نے محسوس کیا کہ ان حالات میں جن میں کہ میں اس وقت ہوں، رسول صلعم کی سیرت کو مرتب کرنے جیسا کام سرانجام دینا ناممکن ہے۔

مولانا شبلی کی سیرت النبی کی دو جلدوں کے بعد اس وقت تک کوئی جلد شائع نہیں ہوئی تھی اور دارالمصنفین اعظم گڑھ سے زیر ترتیب جلد کا مسودہ منگوانا، گو اس قدر طویل مسافت کے باوجود اسے بحفاظت بھیجا جا سکتا تھا، ممکن نہ تھا اور اس کی غیر موجودگی میرے لیے ایک کافی بڑی لائبریری تک رسائی جو اس سے کہیں بڑی ہوتی جتنی کہ موجودہ حالات میں میں فراہم کرسکتا تھا، ایک ناگزیر شرط تھی، مزید براں اس سلسلے میں ایسے اہل علم دوستوں سے جو مجھ سے زیادہ عربی جانتے ہوں، مستقل مشورہ کرنے کی بھی ضرورت تھی، ان اسباب کی بنا پر میں نے رسول اللہ کی سیرت مرتب کرنے کا خیال ترک کردیا اور اسلام کی تشریح و توضیح کے نسبتاً کم حوصلہ مندانہ کام پر جو رسول اللہؐ کی سیرت سے کہیں زیادہ ذاتی نوعیت کا ہو سکتا تھا، اکتفا کرنے کا فیصلہ کیا۔

جب سے میں نے قرآن مجید کا مطالعہ شروع کیا ہے اس وقت سے اب تک میں نے اسلام کے بارے میں

مسلمانوں اور اس کے علاوہ ان کے ناقدوں کے نقطۂ نظر سے لکھا ہوا ادب بہت کافی پڑھا ہے لیکن اس وقت تک جو کچھ بھی میں نے پڑھا ہے، اس میں کسی چیز نے کبھی میری نظروں میں اسلام کی اہمیت کو نہیں بدلا۔ قرآن مجید کا بنیادی موضوع اور اسی طرح جیسا کہ بعد میں مجھ پر منکشف ہوا، رسول اللہ صلعم کی صحیح احادیث کا بھی، خدا کی بادشاہت Kingdom of God اور اس کے خلیفہ و نائب کی حیثیت سے انسان کی خدمت ہے، اور اس وقت سے کہ اب تک جو کچھ میں نے پڑھا ہے، اس سے اسلام کے پیش کردہ حکومتِ الہٰی کے تصور ہی کی مزید تائید ہوتی ہے اور جیسا کہ میں اپنے ان شخصی تجربات کے بیان میں بالکل شروع ہی میں کہہ چکا ہوں کہ میں ایک ماہر کی حیثیت سے ماہروں کے لیے یہ کتاب نہیں لکھ رہا، بلکہ ایک "معمولی آدمی" اپنے جیسے "معمولی آدمیوں" کے لیے لکھ رہا ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ ایک غیر جانبدار غیر مسلم کے، جو اسی طرح اسلام کا مطالعہ کرے گا جیسے میں نے کیا ہے، میری طرح کے شخصی تجربات ہوں گے۔ میں دینیات کا عالم نہیں ہوں اور مجھے امید ہے کہ ایک عام غیر مسلم، جو اس نیت سے مسلمانوں کے دینی معتقدات کا مطالعہ کرتا ہے کہ وہ ان معتقدات کو پیش کرنے والے کی بات کا انکار کرنے کے لیے ہمہ تن تیار رہے گا، اس کتاب کو اس جذبہ کے تحت پڑھنے کی کوشش نہیں کرے گا لیکن یہاں ایک بات کی صراحت کر دینا ضروری ہے۔ میں نہ اسلام کے مسلمہ عقائد کا مخالف ہوں نہ کوئی بدعتی ہوں کہ میں اسلام کے متعلق ایسا نظریہ پیش کروں جو اب تک کبھی سننے میں نہیں آیا اور کوئی ایسی چیز خود خاص میری اپنی تخلیق ہو، اسے کروڑوں مسلمانوں کا عقیدہ قرار دے کر ان کے سر منڈھنے کی کوشش کروں۔ میرا راسخ الاعتقادی سے گہرا تعلق ہے اور یہ نہ صرف یہ کہ مجھے شک و شبہ کی نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ اس کے برعکس اس نے مجھے اپنے سینے سے بخوشی لگا رکھا ہے۔ البتہ بدقسمتی صرف یہ ہے کہ اس راسخ الاعتقادی نے اسلام کے زوال کے زمانے میں ان چیزوں پر زیادہ زور دیا، جو نسبتاً کم اہم تھیں اور ان کو زیادہ اہمیت نہیں دی جو اس کی مستحق تھیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مولانا محمد علی جوہر ــــــ چند نقوش و تاثرات

میرے شعور و تعقل کا آغاز سنہ ۱۹۲۱،۲۲ء سے ہوتا ہے، جب میری عمر مشکل سے ۸، ۹ سال کی تھی، انسانی شعور کا تعلق عمر، انسان کی اندرونی صلاحیتوں اور ذہانت ہی سے نہیں ہے، ماحول، واقعات اور خارجی دنیا سے بھی ہے، کبھی کوئی طوفانی بلاخیز کوئی خبر صاعقہ اثر، کوئی فتنۂ عالم آشوب یا شہر آشوب کسی کم سن بچہ کے شعور کو قبل از وقت بیدار کر دیتا ہے، اور وہ کام کرتا ہے جو ماہ و سال کی گردش اور تعلیم و تربیت کی مسیحائی نہیں کرتی، صور اسرافیل پر اگر مردے جی اٹھیں گے، تو ہنگامۂ رستخیز پر سوتوں کا جاگ جانا، شعور کا بیدار ہو جانا، اور بچوں کا بڑوں کے بہت سے احساسات اور گردوپیش کی دنیا کو واقعات سے باخبر ہو جانا اور ان کا اپنے سن و فہم کے مطابق اپنے بزرگوں کے رنج و غم کا ادراک کرنا محل تعجب نہیں۔

کچھ ایسا ہی واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ جنہوں نے سنہ ۲۱،۲۲ء کا زمانہ نہیں دیکھا ان کو کیا بتایا جائے کہ اس وقت ہندوستان کس طرح کوہ آتش فشاں بنا ہوا تھا، اتحادیوں کی فتح، سلطنت عثمانیہ کے خلاف ان کے منصوبوں اور خلافت کو ختم کر دینے کی کوششوں کی خبر نے سارے ہندوستان میں آگ لگا رکھی تھی، مسجدوں، مجلسوں، مدرسوں، گھروں، دکانوں اور خلوت و جلوت کہیں گویا اس گفتگو کے سوا کوئی گفتگو نہ تھی، ہمارا شہر لکھنؤ جو شروع سے سیاسی تحریکوں کا بڑا مرکز رہا ہے۔ اس تحریک میں بھی پیش پیش تھا، اسی تحریک کے ایک بڑے رہنما مولانا عبدالباری صاحب اسی شہر کے رہنے والے تھے، جن کا دولت خانہ محل سرائے فرنگی محل اس تحریک کے ہندو مسلم رہنماؤں کی لکھنؤ میں فرودگاہ تھی، اور خود گاندھی جی وہیں ٹھہرا کرتے تھے، اسی شہر میں چند سال پہلے مولانا شبلی نے اپنی وہ زلزلہ انگیز نظم

پڑھی تھی جو ہنگامہ طوفان کے نام سے سارے ہندوستان میں مشہور ہوئی اور جس کے پہلے دو شعر یہ تھے ؎

خلافت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک؟

زوالِ دولتِ عثماں، زوالِ ملک و ملت ہے
عزیزو! فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک؟

اس زمانہ میں ہر بڑے چھوٹے، بوڑھے بچے اور مرد و عورت کی زبان پر یہ شعر تھا ؎

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

معلوم نہیں یہ شعر کس کا تھا؟ لیکن اس کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ کم شعروں کو حاصل ہوئی ہوگی، یہ یاد نہیں کہ اس شعر سے پہلے یہ محبوب نام کان میں پڑ چکا تھا یا یہی شعر اس کا ذریعہ بنا۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ اس پوری بارات کا نوشہ محمد علی تھے۔ اور وہ اس وقت ہندوستان کے بے تاج بادشاہ معلوم ہوتے گھر سے نکلتا، اور کسی عزیز کے یہاں امین آباد تک جانا ہوتا تو اس سڑک کے دونوں کناروں پر جس کے دونوں جانب پارک ہیں چھوٹے چھوٹے رسالے جن میں اس طرح کی نظمیں ہوتیں، تصویریں جن میں دکھایا گیا ہوتا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان رسہ کشی ہو رہی ہے، ہندوستانیوں کی ٹیم میں مولانا محمد علی اور سب کے آخر میں مولانا شوکت علی اپنے بھاری بھرکم جثہ کے ساتھ ہیں اور انھیں کا پلہ بھاری ہے، شہر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت اٹھ گئی ہے، اور علی برادران اور گاندھی جی ہی کی حکومت ہے، پرنس آف ویلز کا لکھنؤ آنا بھی یاد ہے، میں کسی ضرورت سے گھر سے نکلا دیکھا تو شہر میں ہُو کا عالم ہے، بھرے بازار، چلتی ہوئی سڑکیں، ویران پڑی ہیں، امین الدولہ پارک (جھنڈے والے پارک) میں ولایتی کپڑوں میں آگ لگائی جاتی تھی، جو لوگ ولایتی کپڑوں میں ملبوس ہوتے وہ راستہ چھوڑ کر چلتے۔ پھر ایک مرتبہ اپنے شعور کے زمانے میں گاندھی جی اور علی برادران کی آمد بھی ہوئی، ایسا ہجوم ایسا جوش و خروش اور کسی لیڈر کی ایسی مقبولیت و محبوبیت نہ دیکھی، نہ دیکھنے کی امید ہے، ہمارے کئی عزیز انگریزی اسکولوں میں پڑھتے تھے، وہ تعلیم ترک کر کے اسکولوں سے نکل آئے، اور کسی نیشنل اسکول میں داخلہ لیا۔ جن لوگوں کو اعزازی یا امتیازی تمغے ملے تھے اور ان پر انگریز حکام کے نام یا انگریزی لکھی ہوئی تھی، ان کو پاؤں سے روندتے، اپنے عزیزوں اور محلہ والوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے انگریزی لباس بلکہ انگریزی معاشرت ترک کر کے دیسی لباس اور ہندوستانی معاشرت اختیار کر لی، تحریک نیم دینی، نیم سیاسی تھی۔ مگر اس کا محرک و جذبہ دینی تھا، اور اس کے قائد دینی مزاج اور دینی جذبات کے لوگ تھے، اس کی دلیلیں بھی مذہب سے لائی جاتی تھیں، اور خلافت کی حمایت کے ذریعہ مذہب اور مسلمانوں کی

عزت کو بچانے کا نعرہ دیا گیا تھا، اس لیے اس سے سویا ہوا مذہبی احساس جاگتا تھا، غیرت قومی انگڑائی لیتی تھی، اور خاکستر میں دبی ہوئی مجاہدانہ چنگاریاں سلگتی تھیں، کتنے بے نمازی نماز کے پابند ہو گئے، لوگوں نے داڑھیاں چھوڑ دیں، جیل جا کر کتنے آدمیوں کی زندگی سرتا سر بدل گئی، چونکہ علی برادران نے خود مغربیت سے اسلامیت کی طرف، جدید فیشن اور فراغت و تجمل سے فقر و درویشی اور سادگی و جفاکشی کی طرف ہجرت کی تھی، وہ "مسٹر" سے مولانا بن گئے تھے، اس لیے ہزاروں آدمی ان کی تقلید میں مغربی اور امیرانہ طرز معاشرت چھوڑ کر اس سطح پر اتر آئے تھے جو متوسط درجہ کے ہندوستانیوں کی تھی، اب وہ کوٹ پتلون کے بجائے کھدر کے کرتہ پاجامے میں نظر آنے لگے تھے، لوگوں نے ان جدید تعلیم یافتہ، آسودہ حال اور مغرب زدہ لوگوں کو جن کو سرکار میں قرب و رسائی اور اپنے عہدہ میں ترقی و اعزاز کے سوا کوئی فکر اور دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی، مسلمانوں کی زبوں حالی، عالم اسلام کے زوال و نکبت، اور خلافت اسلامی کی ذلت و شکست پر، ہچکیوں سے روتے ہو دیکھا ہے، اور اس تبدیلیٔ حال پر بڑے بڑے واقفوں کو کہتے ہوئے سنا ہے

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی؟!

یہ سب تحریک خلافت کے رہنماؤں، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، مولانا حسرت موہانی کی تقریروں، مضامین، نظموں اور قربانیوں کا نتیجہ تھا، لیکن اس میں اصل روح مولانا محمد علی کی کام کر رہی تھی جو ایک "شعلۂ جوالہ" بنے ہوئے تھے، جس نے گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ پھر کر پورے ملک کو حرارت ایمانی اور جوش آزادی سے مخمور بنا دیا تھا، دراصل انھیں نے گاندھی جی کو ان کے گوشۂ عزلت سے نکالا اور ان کے ساتھ دورہ کر کے اور ان کی "جیکار" لگوا کر ان کو عوامی لیڈر اور ملک کا محبوب رہنما بنا دیا۔ تحریک خلافت و آزادیٔ وطن کے ساتھ، تحریک ترک موالات کو ضم کر کے غیر ملکی حکومت کے خلاف نفرت و بغاوت کی آگ بڑکا دی، اور آزادیٔ وطن کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ سارے ملک یہاں تک کہ فوج و پولیس میں ایک جنبش اور مضبوط انگریزی حکومت میں ایک ارتعاش پیدا ہوگیا، ہندو مسلم اتحاد کا سماں سارے ملک میں نظر آتا تھا، اور سب اس نشہ میں سرشار تھے، پھر بار بار جیل جا کر اور مہینوں اور برسوں وہاں رہ کر جیل خانہ کو ایک ہنسی کھیل بنا دیا اور حکومت ہند کو ایک آزمائش میں مبتلا کر دیا۔

لیکن افسوس ہے کہ ۱۹۲۳ء میں جب وہ آخری بار جیل سے باہر آئے تو انگریزی حکومت (جس کی

نمائندگی اس وقت ایک یہودی النسل وائسرائے لارڈ ریڈنگ کر رہا تھا، سازش کامیاب ہو چکی تھی، ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو چکا تھا، شدھی سنگٹھن کی تحریک آندھی کی طرح چل رہی تھی۔ بڑے بڑے شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات وبا کی طرح پھوٹ پڑے تھے، مولانا محمد علی نے اپنی اسی سادگی اور مردانگی سے ان کی مذمت کی جو ایک مسلمان کا شیوہ اور ایک بہادر سپاہی کا مزاج ہے، لیکن ان کے زخمی دل کو اس سے بڑی چوٹ لگی کہ تحریک آزادی کے ہندو رہنماؤں نے (گاندھی جی کو مستثنیٰ کر کے) اس صاف دماغ اور کھلے دل سے ان فسادات کی مذمت اور اپنے فرقہ کے اس رجحان پر تنقید نہیں کی، اور وہ ان کے خلاف اس طرح صف آرا نہیں ہوئے جیسی وہ توقع رکھتے تھے۔ اس وقت سے مولانا محمد علی نے اس طرح سوچنا شروع کیا کہ شاید ان کی قسمت ان کے ہم خیال، اور ہم مذہب لوگوں ہی سے وابستہ ہے، اور رفتہ رفتہ انڈین نیشنل کانگریس سے وہ مایوس ہوتے چلے گئے، اور انھوں نے اپنی سرگرمیوں کا میدان مسلمانوں کو بنا لیا۔

اللہ نے محمد علی کو وہ سب صلاحیتیں اور کمالات عطا فرمائے تھے جو ایسے رہنماؤں کے لیے ضروری ہیں جو ملکوں اور قوموں میں انقلاب لاتے ہیں، سوتی بستی جگاتے ہیں، اور ممولوں کو شہباز سے لڑا دیتے ہیں۔ خلوص کا ایک دریائے بیکراں، پارے کی سیمابی اور بجلیوں کی بیتابی، خطابت کی جادوگری، شخصیت کی دلآویزی، خلقی و فطری محبوبیت و موہنی، اور سب سے بڑھ کر دل کی وہ چوٹ اور جگر کا وہ زخم جو اس درجہ میں (شیخ الہند مولانا محمود حسن کو مستثنیٰ کر کے) ان کے ساتھیوں میں سے کم کسی کے حصہ میں آیا تھا۔ یہی وہ احساس و یقین تھا جس نے ان سے یہ شعر کہلوائے جو ان کے حال کی سچی تصویر تھی ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے — پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے
پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو — خوش ہوں کہ وہ پیغامِ وفا میرے لیے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف — کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

پھر ان کی وہ قلندرانہ شان، اور مجذوبانہ ادا جس نے حق کہنے میں کبھی بڑے چھوٹے، دوست دشمن کی پروا نہیں کی اور جس کے نتیجہ میں وہ بعض اوقات میدان میں تنہا رہ گئے۔ لیکن انھوں نے اس تنہائی کی کبھی پروا نہ کی بلکہ اس کو وسیلۂ نجات اور شرطِ ایمان سمجھا اور ان کی زبان سے وہ (الہامی) شعر نکلا جو بڑے سے بڑے عارف و موحد کی زبان سے نکل سکتا ہے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

انھوں نے حق کہنے میں نہ اپنے شیخ طریقت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی پروا کی نہ اپنے سب سے محترم و محبوب تحریک کار او رجنگ آزادی کے رفیق کار ارگاندھی جی کی، نہ اپنے بعض محسنوں اور کرم فرماؤں مہاراجہ محمود آباد وغیرہ کی، نہ اس وقت کی سب سے بڑی سلطنت (برطانیہ) کے وزیراعظم او رعہدہ داروں مسٹر لائیڈ جارج اور ریمزے میکڈانلڈ وغیرہ کی، نہ سب سے زیادہ قابل احترام سرزمین کے فرماں روا اور بانی سلطنت سلطان عبدالعزیز بن سعود کی، انھوں نے ہر جگہ حق بات کہی اور صاف اور بے لاگ کہی: اقبالؔ کے اس شعر کے وہ صحیح طور پر مصداق تھے ؎

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی!

وہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے ملی خصائص اور مزاج کا نقطۂ عروج تھے، عقل پر محبت کی فرمانروائی شمع کی جاں گدازی اور پروانہ کی جاں نثاری، ذاتِ نبوی سے عشق و شیفتگی۔ عالم اسلام و ملت اسلامیہ کی حد سے بڑھی ہوئی فکر، عواقب و نتائج سے بے پروائی "حاتم دگراں و گدائے خویشتن" کی پرانی خو، فقیری میں شاہانہ خیالات، احتیاج میں خودداری و عزتِ نفس، استغنا اور دولت کی حالت میں خاکساری و انکساری وہ حضرت علیؓ کے مقولہ "احذروا صولۃ الکریم اذا جاع و اللئیم اذا شبع"[1] کی صحیح تصویر تھے

واقعہ یہ ہے کہ ان جیسا مخلص، جری اور نڈر، بہادر اور خدا پرست عاشقِ اسلام قائد اس ملت کو اس صدی میں نہیں ملا۔ لیکن بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ انھوں نے ایک ایسے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور اس کو اپنی سحر انگیز شخصیت کی توانائیوں اور قائدانہ صلاحیتوں کا محور بنایا تھا، جس کی زمام کار ان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ملک کے باہر سات سمندر پار ایک ایسی جماعت و فرد کے ہاتھ میں تھی جو ان کے مشوروں کا تابع اور ان کی ہدایتوں کا پابند نہ تھا، بلکہ اپنے مصالح اور مغربی طاقتوں کے چشم و ابرو کا غلام تھا، یعنی مسئلہ خلافت جس کو کمال اتاترک نے اتحادیوں کے اشارہ اور خاص طور پر برطانیہ کے مشورہ اور ہدایت پر بیک جنبش لب یا گردش قلم ختم کردیا۔ اور سارا عالم اسلام خاص طور پر ہندوستان کا مجروح و ستم رسیدہ مسلمان دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

پھر جب ہندوستان کے مسائل میں ان کی رہنمائی اور قیادت کا وقت آیا تو وہ اپنی بہترین توانائیاں صرف کر چکے تھے، ان کا دل زخموں سے چور چور تھا، اور ان کا جسم بیماریوں سے زار و نزار ملت کی خورده گیری، حساب طلبی، تنقید و ملامت، اندرونی انتشار، بیرونی مخالفت اور ساتھیوں کی بے وفائی سے اُن کا

---

[1] شریف آدمی کے دبدبہ اور طنطنہ سے ڈرو جب وہ بھوکا ہو، اور سفلہ طبیعت کی غل غش سے ہوشیار رہو جب وہ شکم سیر ہو

پیمانہ صبر لبریز ہوچکا تھا، وہ اپنی جوانی، طاقت و ہمت کے زمانے میں جن لوگوں کے ساتھ تھے اور جنہوں نے اس ملک کو آزاد کرانے کے لیے ان کے ساتھ قربانیاں دی تھیں، ان کو بعض تلخ تجربوں اور واقعات کی بنا پر چھوڑ چکے تھے اور اب جن لوگوں کی انھوں نے رفاقت اختیار کی تھی یا جو ان کے گرد جمع ہو گئے تھے، وہ ان کے خلوص، جذبۂ قربانی، قابلیت اور بلند عزائم میں ان سے کوئی نسبت نہیں رکھتے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ "یوسف بے کارواں" بن کر رہ گئے۔

آخر میں پھر ان کی مضطرب روح اور بے چین طبیعت نے اپنا جوہر دکھایا اور اس نے اپنے مرکزِ اصلی کی طرف پرواز کی۔ ۳۱-۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس لندن میں وہ شیر کی طرح گرجے اور بلبل کی طرح چہکے۔ انھوں نے اس وقت تک ہندوستان جانے سے انکار کر دیا جب تک ان کو اس ملک کی آزادی کا مکمل پروانہ نہ مل جائے، وہیں (۴ جنوری ۱۹۳۱ء) ان کے طائرِ روح نے قفسِ عنصری سے پرواز کی، مفتیٔ اعظم فلسطین الحاج سید امین الحسینی کی دعوت و تحریک پر ان کی نعش فلسطین لے جائی گئی، اور ان کے جسمِ خاکی کو سرزمینِ انبیاء اور معراجِ نبوی کی پہلی منزل بیت المقدس کے ایک گوشہ میں جگہ ملی، اقبالؒ نے خوب کہا ہے ؎

خاکِ قدس او را بآغوشِ تمنا می گرفت　　　سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

اور ان کا یہ کہنا بھی صحیح نکلا ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر　　　یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مجھے مولانا کی چند بار زیارت حاصل ہوئی، ایک مرتبہ میں نے ان کو ندوۃ العلماء کے جلسہ کانپور منعقدہ ۱۹۲۶ء میں قریب سے دیکھا۔ ایک مرتبہ امین آباد پارک میں سائمن کمیشن کی آمد کے موقع پر ان کی تقریر سنی۔ ایک مرتبہ امین الدولہ پارک میں ان کو اپنے عربی لباس میں ایک غیر مسلم دوست سے انگریزی میں گفتگو کرتے ہوئے قریب سے سنا۔ وہ ہر طرح سے ملت کے سردار معلوم ہوتے تھے۔ بلند و بالا قد، پُرگوشت اور موزوں جسم، متناسب اعضا، باوقار نورانی چہرہ، کھدر کے لباس پر عربی عبا۔ سر پر انور کیپ جس پر خنجر ہلال کا قومی نشان، ان کو تصویروں میں تو ہزاروں بار دیکھا تھا مجسم، زندہ اور متحرک شکل میں بھی کئی بار دیکھا۔

ان کی والدہ مرحومہ جو بی اماں کے نام سے سارے ہندوستان میں مشہور تھیں اپنے دورہ میں رائے بریلی بھی آئیں، ۱۹۲۳ء کا کوئی مہینہ تھا فروری کے بعد کا، اس لیے کہ ۱۵ فروری ۱۹۲۳ء میں میرے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کا انتقال ہوا تھا، اور بی اماں مرحومہ یہ سن کر والدہ صاحبہ سے ملنے جو عدت میں تھیں ہمارے

گھر تشریف لائیں۔ وہ ایک چوکی پر بیٹھی ہوئی تھیں اور خاندان کے بزرگ اس کو اٹھائے ہوئے تھے، یہ منظر ابھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

۳ جولائی ۱۹۵۸ء کو جب بیت المقدس میں پہلی بار حاضری ہوئی تو بڑی محبت و عقیدت کے ساتھ ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا، جو مسجد اقصیٰ کے احاطہ ہی میں نیچے کے حجروں میں سے ایک حجرہ میں تھی - وہاں ان کی قبر پر انھیں کا ایک شعر ہمارے ایک ہندوستانی بزرگ دوست فاروقی صاحب مقیم قاہرہ کا لکھا ہوا آویزاں دیکھا جو لسان الغیب سے نکلا ہوا واقعہ کی سچی تصویر تھا ؂

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلائی بہار
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

دنیا کی حافظہ کی کوتاہی، حقائق سے چشم پوشی اور زود فراموشی کی ایسی مثالیں کم ملیں گی جیسی ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ لکھنے والوں اور ہندوستانی عوام نے تحریک آزادی کے جانباز سپاہی اور اس کے ایک قافلہ سالار محمد علی کے معاملہ میں پیش کی، بعض مصنفین نے جن کی خورد بین اور دوربین نگاہوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات اور غیر اہم اشخاص کو بھی فراموش نہیں کیا، یا تو مولانا محمد علی کو یکسر نظر انداز کر دیا، یا ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑنے والوں کی بزم میں ان کو بادل نخواستہ اور کہیں کنارے پر جگہ دی۔ ان کے ساتھ اور ان کے ماتحت کام کرنے والوں اور ان کا ان کی زندگی میں ادب و احترام کرنے والوں نے بھی ان کے ساتھ فراخ دلی کا معاملہ نہیں کیا، خود ان کی ملت کا طرز عمل بھی ان کے ساتھ کچھ زیادہ جوہر شناسی اور منت پذیری کا نہیں رہا، اور یہ ملت بھی اپنی "زندہ فراموشی" و "مردہ پرستی" میں بدنامی کی حد تک نامور ہونے کے باوجود ان کے نام کو زندہ اور تابندہ نہ رکھ سکی، غنیمت ہے کہ ان کی پیدائش پر سو برس گذرنے کے موقعہ پر اس کو اپنی کوتاہی کا احساس ہوا اور اس پورے تحتی برا عظم میں جا بجا ان کی صدی منانے اور ان کے کارناموں کو دہرانے اور ان کی یادگاریں قائم کرنے کی تحریک پیدا ہو گئی ہے، خدا کرے اس سے اس کوتاہی کی تلافی ہو سکے جو ان کے معاملہ میں اس وقت تک پیش آتی رہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد علی کو بہت کم لوگوں نے پہچانا اور اس میں بھی شبہ ہے کہ انھوں نے خود بھی پہچانا یا نہیں، اور یہ کوئی عیب نہیں، ایک ایسی مختلف الحیثیات اور جامع صفات ہستی کی تعریف ہے جس کا ہر پہلو مرکزی اور بنیادی معلوم ہوتا ہے۔ اور تماشائی تصویر حیرت بن کر کہتا ہے ؂

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست!

یہ واقعہ بہت سے باکمالوں کے ساتھ پیش آیا ہے کہ ان کے کمالات کی کثرت و تنوع ان کے حقیقی کمالات کے لیے حجاب بن گیا، اور بعض اوقات وہ بھی آخر تک فیصلہ نہ کر سکے کہ ان کا جوہر اصلی کیا ہے، اور ان کو اپنی توانائیوں اور خداداد صلاحیتوں کو کس نقطہ پر مرکوز کر دینا چاہیے، ان کی انگریزی زبان پر اہلِ زبان کی سی قدرت اور کسی انگریز ادیب کے بقول "برکلے کی زبان اور میکالے کا قلم" صحافت میں جو اپنی بے اصولی کے لیے بدنام ہے، اصول پسندی، راست گفتاری، اہم مجلسوں اور نازک موقعوں پر حاضر دماغی و حاضر جوابی، جابر طاقتوں اور غالی معتقدوں دونوں کے سامنے کلمۂ حق کا اظہار، قوت ایمانی و عشق رسول، اسلام کے ساتھ وفاداری اور ملّت کا درد، اور سب سے بڑھ کر دینی حمیت اور اسلامی غیرت، کس چیز کو سراہا جائے، اور کس کو ان کا امتیازی وصف قرار دیا جائے، بحیثیت شاعر کے بھی ان کا مقام بلند ہے اور اس قابل کہ اس کو مستقل موضوع بنایا جائے، زبان کی سادگی، کلام کی تاثیر، جذبات کی گہرائی۔ ان کا کلام بھی (اگر بے ادبی نہ ہو تو خواجہ میر درد کی طرح) سراپا انتخاب اور "پیغام سروش" ہے۔

مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم کے ان اشعار میں جو انھوں نے ان کے مرثیہ کے طور پر کہے ہیں بڑی حد تک اس حقیقت کی نقاب کشائی کی ہے اور انھیں پر اس مختصر سے مقالہ کو ختم کیا جاتا ہے ؎

بدینِ مصطفےٰ دیوانہ بودی   فدائے ملّت جانانہ بودی
بہ بزم ما رئیس عشق بازاں   بہ رزم دشمناں فرزانہ بودی
بدل بودی فقیرے بے نوائے   بہ قالب پیکرِ شاہانہ بودی
سیاست را نقاب چہرہ کردی   دگر نہ عاشق مستانہ بودی
سیاست تہمتی بر حسن پاکت   ز آئین خرد بے گانہ بودی
چہ دانستی کجا سوزم ز سوزم   تو شمع دین را پروانہ بودی
بایماں ہاز توزورے و شورے   بجا نہا ہمت مردانہ بودی
رمیدی از رہِ اغیار تا یار   عجب مستے عجب دیوانہ بودی!

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

مولانا محمد علی ـــــ کچھ یادیں

میں دس گیارہ سال کا تھا ایک دن دیکھا کہ گاؤں[1] کی مسجد میں بہت سے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی طویل نظربندی کے بعد رہا ہوئے ہیں اس خوشی میں یہ جلسہ ہو رہا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے کان میں علی برادران کا نام پڑا۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد ایک تقریب کے سلسلے میں لکھنؤ جانا ہوا کچھ ساتھیوں کے ساتھ امین آباد کی سیر کو گیا چوراہے پر اخبار فروش طرح طرح کی خبریں بلند آواز سے سنا رہے تھے کچھ لوگ چھوٹی چھوٹی کتابیں پکار پکار کر فروخت کر رہے تھے کوئی کہہ رہا تھا "پولس کی گرگری" کسی طرف سے آواز آ رہی تھی "بول گئے مائی لارڈ ٹکڑوں کوں" کوئی صدا لگا رہا تھا "بہار جیل خانہ" میں نے بھی دو تین کتابیں خریدیں انھیں میں ایک کتاب "صدائے خاتون" تھی اس میں مولانا محمد علی کی والدہ "بی اماں" کی زبان سے اپنے بیٹے کو خلافت پر قربان ہو جانے کی ہدایت کی گئی تھی کتاب منظوم تھی ایک شعر یاد رہ گیا جو اس وقت بچے بچے کی زبان پر تھا ؂

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کے شباب کا زمانہ تھا ہندو مسلم اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ایسی فضا شاید ہی ملک میں کبھی ہوئی ہو۔ کچھ ہی عرصے کے بعد مولانا محمد علی مولانا شوکت علی اور ان کے ساتھ ڈاکٹر کچلو مولانا حسین احمد مدنی، مولانا نثار احمد کانپوری اور پیر غلام مجدد سندھی بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیے گئے۔ پھر گرفتاریوں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا بڑے بڑے لیڈروں کے علاوہ لاکھوں عوام بھی جیلوں میں پہنچا دیے گئے سارے ملک میں عجیب جوش و خروش کا عالم تھا۔ بچہ بچہ قربانی کے لیے تیار تھا۔ مولانا محمد علی اور ان کے ساتھیوں

---

[1] تھولینڈی ضلع رائے بریلی

23.1.81

کو دو دو سال کی سزا دی گئی۔ اس زمانہ میں ایک چھوٹی سی منظوم کتاب "ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو" بہت رائج تھی۔ اس طرح میں مولانا محمد علی کے نام اور کارناموں سے کچھ واقف ہو گیا۔ ہمارے اسکول کے ماسٹر بھی آزادی کی تحریک سے متاثر تھے ان میں مولوی ولی محمد اور ماسٹر گوری شنکر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ماسٹر گوری شنکر تاریخ کے سبق میں انگریزوں کے خلاف دل کا بخار نکالتے تھے اور مولوی ولی محمد بورڈنگ میں آزادی کا جذبہ لڑکوں کے دلوں میں پیدا کرتے تھے۔ مڈل اسکول سے فارغ ہو کر میں ندوۃ میں داخل ہوا لکھنؤ آنے کے بعد بڑے بڑے جلسے دیکھنے کو ملے اور مولانا محمد علی کی کئی تقریریں سننے کا موقع ملا۔ اس زمانہ میں ندوہ کے طلبا اور اساتذہ تحریک خلافت سے خاص طور پر متاثر تھے مولانا عبدالودود جیراجپوری مقامی خلافت کمیٹی کے سکریٹری تھے مولانا عبدالرحمٰن نگرامی اور مولانا محمد سلیم بڑی سرگرمی سے کام کرتے تھے طلبہ میں احمد حبیب شاہ اور مولوی حفیظ الدین ناظم الاصلاح خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

خلافت اور کانگریس کے جلسے شہر میں آئے دن ہوتے رہتے تھے ممتاز لیڈر دارالعلوم ندوہ میں آیا کرتے تھے مولانا محمد علی علامہ شبلی کے شاگرد تھے مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی سے بھی بڑا تعلق تھا اس لیے وہ خاص طور سے ندوہ آتے تھے اور طلبہ کو خطاب کرتے تھے۔ ایک مرتبہ طلبہ کی انجمن الاصلاح کی طرف سے رہنمایانِ قوم کو پر تکلف عصرانہ دیا گیا اس موقع پر مولانا محمد علی نے فرمایا کہ یہ شاندار دعوت ندوہ کے شایان شان نہیں ہے یہاں تو نان شعیر (جو کی روٹی) بھنے ہوئے چنے اور مونگ پھلی کے دانے کافی ہیں کتاب المعائنہ پر بھی یہی لکھ دیا۔ دوسری مرتبہ جب تشریف لائے تو طلبہ نے اس ہدایت پر پورا عمل کیا اتفاق سے مولانا کو اس وقت کان پور جانا پڑا اور دوسرے لیڈروں کو یہ روکھی پھیکی غذا حلق سے اتارنی پڑی آخر میں انجمن کے ناظم مولوی محمد شکیل عباسی نے معذرت کی اور کہا کہ ہم لوگوں کا یہ معمول نہ تھا کہ مہمانوں کے کام و دہن کو آزمائش میں مبتلا کریں مگر مولانا محمد علی کے حکم کی تعمیل میں یہ کرنا پڑا۔

سنہ ۲۳ء میں مولانا کانگریس کی صدر منتخب ہوئے ان کا کوکناڈا کا خطبۂ صدارت طوالت کے باوجود دلچسپ و پر اثر تھا اور گھر گھر اس کا چرچا تھا یہ سال ان کی بڑی مصروفیت کا تھا ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے بجائے ناچاقی شروع ہو گئی تھی انگریزی حکومت کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پھر زیر عمل تھی اور ہندو مسلمان جو پہلے شیر و شکر تھے اب دست بگریباں تھے اور ملک میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے مولانا محمد علی اور ان کے خلافتی اور کانگریسی دوستوں نے اس صورت حال کو بدلنے کی کوشش کی مگر یہ آگ بجھائے نہ بجھی اور ہندوستان

کے بڑے بڑے شہر فساد کی زد میں آگئے۔ ۱۹۲۴ء میں لکھنؤ بھی اس میں مبتلا ہو گیا اور چار دن تک قتل و غارت کا ہنگامہ برپا رہا ان حالات سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے ۲۱ دن کے برت کا اعلان کر دیا ان کے ضعف کی بنا پر مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور دوسرے لیڈروں نے ان کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ راضی نہیں ہوئے اور ۲۱ دن پورے کرنے کے بعد برت ختم کیا اس برت کے بعد کچھ عرصہ کے لیے فساد رک گئے مگر لڑانے والوں نے ایک دوسرے کے خلاف جو جذبات پیدا کر دیے تھے ان کی بنا پر رہ رہ کر ہنگامے ہوتے رہتے تھے۔

ہندو مسلم اختلافات کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ خود مسلمانوں کے درمیان جھگڑے شروع ہو گئے۔ پہلی جنگ عظیم میں ترک انگریزوں کے خلاف جرمنوں کے ساتھ تھے شام، مصر، فلسطین، عراق اور حجاز یہ سب علاقے ترکی حکومت کے ماتحت تھے ترک فرماں روا خلیفہ کہلاتا تھا اس بنا پر تمام دنیا کے مسلمانوں پر اس کا اثر تھا۔ لیکن انگریزوں کے اشارہ پر عرب صوبوں نے بغاوت کر دی اس کی وجہ سے ترکوں کو شکست ہوئی اس بغاوت کی قیادت حجاز کے گورنر شریف حسین اور ان کے لڑکوں نے کی اس حرکت کی بنا پر مسلمانانِ ہند ان سے بہت ناراض تھے لیکن احتجاج کے سوا ان کے بس میں کیا تھا اتفاق ایسا کہ ترکوں کی شکست کے سات برس بعد نجد کے فرماں روا سلطان ابن سعود نے شریف حسین کو شکست دیکر حجاز خالی کرا لیا اس سے مسلمانوں کو بڑی مسرت ہوئی مگر انگریزوں کے اشارہ پر ابن سعود کے خلاف وہابیت کا پروپیگنڈہ کیا گیا تھا، رائٹر نے یہ خبر بھیج دی کہ مدینہ منورہ کے محاصرہ کے دوران سعودی فوجوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر پر گولہ باری کی اس سے سارے ملک میں آگ لگی خلافت کمیٹی نے اعلان کیا کہ خبر غلط ہے مگر فتنہ بڑھتا ہی رہا مولانا محمد علی اور ان کے ساتھیوں کے خلاف ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا مگر مولانا نے بڑی ہمت سے اس کا مقابلہ کیا یہ وقت بڑا نازک تھا لوگ ان کی جان کے درپے تھے میں نے لکھنؤ میں یہ حالات خود دیکھے ہیں رفاہِ عام اور ممتاز دار الیتامیٰ کے جلسہ میں مولانا محمد علی کو تقریر نہیں کرنے دی گئی بعض تعلقہ داروں اور بدعت نوازوں نے ہزاروں لٹھ بند مولانا کے خلاف جمع کر دیے تھے مگر جب مولانا ان لوگوں کے سامنے آئے اور سر جھکا کر کہا مارنا چاہتے ہو تو مارو تو کسی نے ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں کی اور محمد علی زندہ باد کے نعرے بلند ہو گئے۔ یہ حالات صرف لکھنؤ ہی میں نہ تھے بلکہ سارے ملک میں یہی ہنگامے برپا تھے مگر مولانا نے ان غوغائیوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ پامردی کے ساتھ ان کو صحیح حالات سے باخبر کرتے رہے۔

ان حالات میں جب کہ شدھی سنگٹھنوں، تبلیغ و تنظیم اور شریفی و سعودی ہنگامے برپا تھے خلافت اور

کانگریس کے بھی بعض لوگ مخالف ہو گئے۔

اس فضا میں کان پور میں خلافت اور کانگریس کے اجلاس ہوئے خلافت کانفرنس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد اور کانگریس کی مسز سروجنی نائیڈو تھیں میں ان جلسوں میں موجود تھا مولانا کے لیے یہ وقت خاصا نازک تھا مگر انھوں نے حق کی خاطر دوستوں اور دشمنوں سبھی کا مقابلہ کیا کانگریس اور خلافت کانفرنس دونوں میں ان کی متعدد تقریریں ہوئیں مولانا بڑے خطیب نہ تھے مگر ان کا خلوص اپنا لوہا منوا تا تھا معلومات کی فراوانی اور خیالات کی روانی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ کئی کئی گھنٹے بولتے تھے مگر مجمع برابر گوش برآواز رہتا تھا۔

سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے شریف حسین کو شکست دینے کے بعد اعلان کیا تھا کہ میں حجاز میں حکومت کے لیے نہیں بلکہ تطہیر کے لیے آیا ہوں عالم اسلام کے لوگ جس طرح چاہیں یہاں کا انتظام کریں لیکن بعد کو اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ مولانا محمد علی خاندانی بادشاہت کے سخت مخالف تھے وہ ملوکیت کو قیصر و کسریٰ کی سنت سمجھتے تھے اور منہاج خلافت راشدہ پر حکومت قائم کرنا چاہتے تھے ان کے ذہن میں خلافت راشدہ کا واضح نقشہ تھا۔ سلطان کے اس اعلان سے ان کو بہت ناگواری ہوئی اور جس شدومد سے وہ ان کی موافقت کر رہے تھے اب اسی شدت سے مخالفت کرنے لگے مکہ معظمہ میں جو موتمر اسلامی منعقد ہوئی اس میں انھوں نے خاندانی بادشاہت کی سخت مخالفت کی مگر نہ سلطان نے اپنا ارادہ بدلا نہ دوسری مسلم حکومتوں نے مولانا کی تائید میں کوئی قدم اٹھایا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کا منصوبہ بروئے کار نہ آسکا انھوں نے دنیائے اسلام کے نمائندوں کو بار بار توجہ دلائی مگر کوئی اس مہم میں شریک نہ ہوا۔

حجاز میں جمہوری حکومت اور خلافت اسلامی قائم نہ ہو سکی مگر ہندوستان میں نئے اختلافات پیدا ہو گئے خود خلافت کمیٹی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، کل ہند مرکزی خلافت کے جلسے بڑے ہنگامہ خیز ہوتے تھے ان جلسوں کے دیکھنے کا مجھے موقع ملا ہے سالہا سال کے ساتھی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ تقریباً دو سال یہ ہنگامے برپا رہے اور مسلمانوں کی قوت آپس میں ٹکرا کر چور چور ہوتی رہی، مولانا ان حالات سے بہت دلگیر تھے، مگر ان کی کوششوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا بلکہ خود ان کے اوپر چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھار ہوتی رہتی تھی، ان پریشانیوں میں صحت بھی بگڑتی جا رہی تھی ذیابطیس کے دیرینہ مریض تھے اور بھی طرح طرح کی بیماریاں سر اٹھاتی جا رہی تھیں۔

مسلمانوں کے ان باہمی اختلافات کے ساتھ ہندو مسلم تنازعات کا بھی سلسلہ جاری تھا جن کی وجہ سے

آزادی کی جدوجہد میں دشواری ہو رہی تھی اب یہ مسئلہ بھی زیر بحث آنے لگا تھا کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی کیا پوزیشن ہوگی، حکومت برطانیہ چاہتی تھی کہ یہ مسئلہ اتنا ابھر جائے کہ آزادی کی جدوجہد کمزور ہو جائے اور ملک میں اختلافات کی خلیج اتنی وسیع ہو جائے کہ اس کا پر کرنا ناممکن ہو جائے مولانا محمد علی آزادی کامل کے طلبگار تھے وہ ملک کو اس جال سے نکالنا چاہتے تھے جو انگریزوں نے چاروں طرف پھیلا دیا تھا۔ آزادی سے محروم اور کاروبار سلطنت سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے لیڈر ایسے اوہام میں مبتلا تھے جن کی کوئی حقیقت نہ تھی ہندو زعماء کو یہ خطرہ تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد مسلمانوں کو پاس کے مسلم ممالک سے مدد مل جائے گی اور ہندوستان میں مسلم راج قائم ہو جائے گا۔ پنڈت مدن موہن مالوی جیسے جہاں دیدہ لیڈر افغانستان کے ہوّے سے خائف تھے پرانی تاریخ پڑھ کر ان کے ذہن میں محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کے حملوں کا خیال آجاتا تھا اور نہیں سمجھتے تھے کہ افغانستان کی کیسی کمزور حالت ہے اس کو اپنا وجود قائم رکھنا دشوار ہے ہندوستان پر حملہ کا خیال بھی اس کے دل میں نہیں آسکتا اس شیشی دور میں تلوار کیا کر سکتی ہے لیکن ناواقفیت کی وجہ سے لوگوں کا خوف دور نہیں ہوتا تھا آزادی کے بعد جب حالات سے براہ راست واقفیت ہوئی تو لوگوں کی غلط فہمی پر ہنسی آتی ہے لیکن اس وقت حالات کی صحیح تصویر سامنے نہیں تھی اور لوگ اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا تھے اس بنا پر آزادی کامل کے بجائے نوآبادیاتی طرز کی ایسی حکومت چاہتے تھے جس میں ہندوستان کی حفاظت انگریزوں کے ذمہ رہے مولانا محمد علی نے بار بار اعلان کیا کہ اگر آزادی کے بعد افغانستان کی طرف سے حملہ ہوا تو مسلمان ملک کا ساتھ دیں گے اور میں پہلا مسلمان ہوں گا جو افغانیوں کے مقابلہ میں نکلوں گا کانگریس کے دوسرے صاحب نظر لیڈروں نے بھی سمجھایا اور کہا کہ جب ہندوستانی انگریزوں جیسی طاقتور قوم کو شکست دے کر آزادیٔ کامل حاصل کر لیں تو پھر افغانستان سے نپٹنا کیا دشوار ہوگا مگر اکثریت کے دل میں یہ بات اترتی نہیں تھی اور وہ انگریزوں سے بالکل آزاد ہونا نہیں چاہتے تھے۔

ایک طرف ہندوؤں کے خوف کا یہ حال تھا اور دوسری طرف مسلمانوں پر ہندوؤں کا ہوا سوار تھا، وہ سوچتے تھے کہ انگریزوں کے جانے کے بعد اکثریت ہمیں فنا کر دے گی مولانا محمد علی ان سے کہتے تھے کہ تم کس غلط خیال میں مبتلا ہو اتنی بڑی قوم کو ہندو کس طرح ختم کر دیں گے لیکن برطانوی حکومت کے ہوا خواہ برابر اس کا پروپیگنڈہ کرتے تھے اور ادھر ادھر جو فسادات ہوتے تھے ان کا ذکر کر کے مسلمانوں کو خوف زدہ کرتے تھے، اس غلط اندیشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بھی انگریزوں سے بالکل بے تعلقی کو پسند نہیں کرتے تھے اور برطانوی

حکومت کے زیر سایہ اپنی حفاظت کے خواستگار تھے۔ مولانا محمد علی اور ان کے بہادر رفقاء جو آزادی کامل کے طلبگار تھے لوگوں کے اس وہم کو دور کرنا چاہتے تھے مگر حالات کچھ اس طرح کے تھے کہ کوئی ان کا مشورہ قبول نہیں کرتا تھا۔

آخر کار مولانا نے یہ رائے قائم کی کہ محض نصیحت اور ہمت افزائی سے کام نہیں چلے گا بلکہ آزاد ہندوستان میں دونوں قوموں کی کیا پوزیشن ہوگی اس کا واضح خاکہ بنانا پڑے گا اور باہمی معاہدے سے ہندوستان کا ایک دستور بنانا پڑے گا جس سے سب مطمئن ہو جائیں اور کسی کو مستقبل میں کوئی خطرہ محسوس نہ ہو۔ غور و فکر کے بعد ان کے سامنے یہ حقیقت آئی کہ صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور باقی صوبوں میں ہندو اکثریت میں ہیں اس کو سامنے رکھ کر انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ ہندوستان کا نظام حکومت وفاقی بنایا جائے صوبوں کو اندرونی معاملات میں پورے اختیارات دیے جائیں صوبہ سرحد اور بلوچستان کو دوسرے ہندوستانی صوبوں کی طرح حقوق دیے جائیں، سندھ کو احاطہ بمبئی سے الگ کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنایا جائے اور پنجاب و بنگال میں آبادی کے تناسب سے مجالس قانون ساز کے لیے نشستیں محفوظ کی جائیں مرکز کو باہمی مفاہمت سے کل ہند قسم کے امور مثلاً تعلقات خارجہ، دفاع، کرنسی، ریلوے، ڈاک و تار اور بین الاقوامی تجارت وغیرہ معاملات سپرد کیے جائیں اور باقی اندرونی معاملات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں مرکزی مجلس قانون ساز یعنی پارلیمنٹ میں مسلمانوں کو تہائی نشستیں دی جائیں اور ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے انتخابات مخلوط ہوں۔

ان تجاویز پر جب غور کر چکے تو یہ اسکیم اخبارات میں شائع کی پھر مختلف لیڈروں کے ساتھ تبادلہ خیالات کیا جب فضا سازگار معلوم ہوئی تو مختلف مکاتب فکر کے مسلمان رہنماؤں کو ۱۹۲۷ء میں شملہ میں جمع کیا اور سمجھا بجھا کر ان سے یہ تجاویز منظور کرالیں۔ کانگریس کے لیڈروں سے بھی انفرادی طور پر بات کر چکے تھے اب انھوں نے بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ میں اس اسکیم کو پیش کیا اس وقت سری نواس آئنگر پریسیڈنٹ تھے وہ کھلے ہوئے دل کے آدمی تھے گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو وغیرہ تمام لیڈروں نے اسے پسند کیا اور سب کی تائید سے یہ اسکیم منظور ہو گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صدارت میں مدراس میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا اس میں بھی یہ پیش ہو کر منظور ہو گئی، پنڈت مدن موہن مالوی نے بھی اس کی تائید کی مولانا اس کامیابی سے بہت خوش ہوئے اور امید بندھی کہ آزادی کی منزل قریب آگئی ہے۔

اسی زمانہ میں وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ، جنھیں مولانا بروکن ہیڈ کہا کرتے تھے، نے طنز و تعریض سے پر تقریر کی تھی اور کہا تھا کہ اگر ہندوستانی آزادی چاہتے ہیں تو ملک کا دستور کیوں نہیں بنا کر پیش کرتے ہیں؟ دراصل

ان کے درمیان ایسے اختلافات ہیں کہ وہ کسی دستور پر مطمئن ہو ہی نہیں سکتے ہندوستانی رہنماؤں نے اس اندازِ تقریر کو بہت ناپسند کیا اور کانگریس نے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک دستور ساز کمیٹی بنادی جس میں مختلف فرقوں کے نمائندے شامل تھے اس کمیٹی نے غور و فکر اور طویل صلاح و مشورہ کے بعد ایک دستور مرتب کیا جو نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہے اس پر غور کرنے کے لیے لکھنؤ میں ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی ڈاکٹر انصاری اس اجلاس کے صدر تھے قیصر باغ کی بارہ دری میں یہ کانفرنس ہوئی تھی راقم الحروف اس زمانہ میں ندوۃ العلما میں زیر تعلیم تھا چند دوستوں کے ساتھ تماشائی کے طور پر کانفرنس کی کارروائی دیکھنے کا موقع مل گیا تھا اس کانفرنس سے پہلے مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ ممتاز دارالیتامی کے قریب ایک عمارت میں ہوا مولانا محمد علی اس زمانہ میں علاج کی غرض سے یورپ گئے تھے خلافت کا جلسہ مولانا شوکت علی کی رہنمائی میں ہو رہا تھا نہرو رپورٹ سے مولانا شوکت علی کو بنیادی اختلاف تو یہ تھا کہ آزادی کامل کے بجائے اس میں نوآبادیاتی طرز حکومت پر اکتفا کر لیا گیا ہے۔ لیکن یہ اختلاف صرف نظری تھا عملی طور پر پنجاب اور بنگال کا مسئلہ پیچیدہ تھا مسلمان چاہتے تھے کہ آبادی کے تناسب سے ان کی نشستیں مجلس قانون ساز میں محفوظ کی جائیں پنجاب میں سکھ اپنی خاص اہمیت کی بنا پر کچھ مراعات کے طالب تھے ہندو اپنی نشستوں کی کمی کی وجہ سے گھبرا رہے تھے اسی طرح بنگال میں یورپین اپنی مخصوص اہمیت کی بنا پر تناسب سے زائد نشستوں کے طالب تھے اور ہندو اپنی برتر پوزیشن سے نیچے اترنے کو تیار نہ تھے مسلمانوں کی اکثریت زیادہ نہ تھی پنجاب میں اس وقت ۵۶ فی صد اور بنگال میں ۵۴ فی صد تھے اس لیے وہ اپنی نشستوں میں اتنی کمی پر تیار نہ تھے کہ ان کی اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائے جب باہمی گفت و شنید سے یہ مسئلہ طے نہ ہو سکا تو نہرو رپورٹ میں اس کا حل یہ نکالا گیا کہ پنجاب اور بنگال دونوں صوبوں میں نشستوں کا تحفظ ختم کر دیا جائے اور ہر فرقہ کو اختیار دیا جائے کہ وہ اپنی جدّ و جہد سے جتنی نشستیں حاصل کر سکے حاصل کرے مگر مسلمان اس پر راضی نہ تھے وہ کہتے تھے کہ پنجاب اور بنگال دونوں صوبوں میں ان کی حالت ایسی نہیں ہے کہ مالی اور تعلیمی اعتبار سے مضبوط فرقوں کے مقابلے میں وہ اپنی اکثریت قائم رکھ سکیں نہرو رپورٹ کے مرتبین اور ان کے ہم نواؤں نے اس خطرہ کا علاج یہ تجویز کیا کہ اس صورت کو صرف دس سال کے لیے منظور کر لیا جائے دس سال کے تجربہ کے بعد پھر نظر ثانی ہو سکتی ہے مگر مسلمان اس سے مطمئن نہیں ہوئے خلافت کمیٹی کے جلسہ میں مولانا شوکت علی نے پنجاب اور بنگال کے ممبروں سے کہا کہ آپ لوگ اس پر غور کر لیں جو فیصلہ آپ کا ہوگا ہم لوگ اس کی تائید کریں گے لیکن بنگالی اور پنجابی مسلمان دونوں نشستوں کے عدم تحفظ پر راضی نہیں ہوئے پھر گنگا پرشاد ہال میں عام جلسہ

ہوا اس میں بھی پنجاب اور بنگال کے مسلمان نمائندوں نے اپنی ناپسندیدگی کا برملا اعلان کیا راقم الحروف مرکزی خلافت کمیٹی اور گنگا پرشاد ہال کے جلسۂ عام دونوں جگہ سارے مباحثہ میں موجود تھا پنجاب کے بعض لیڈروں نے تو یہاں تک کہا کہ اگر یہ تجویز منظور کر لی گئی تو خون کے دریا بہہ جائیں گے۔

کچھ سربرآوردہ مسلمان ایسے بھی تھے جو ان اندیشوں کو بے بنیاد سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ مسلمان ہر حال میں اپنی اکثریت برقرار رکھیں گے اس لیے دس سال کے عدم تحفظ کے ساتھ اس حل کو تسلیم کر لینا چاہیے اس نزاع کے ختم ہونے کے بعد حکومت برطانیہ کے سامنے ہندوستان کی طرف سے متفقہ مطالبہ پیش کیا جا سکے گا اس سے حصول آزادی کے قوی امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ ان مسلمان راہنماؤں نے پنجاب اور بنگال کے مسلمان لیڈروں سے رات میں مزید گفتگو کی اور کسی طرح سمجھا بجھا کر ان کو راضی کر لیا۔ صبح دس بجے کے قریب جب آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا تو مولانا شوکت علی نے مجلس خلافت کی طرف سے نہرو رپورٹ کے مرتبین کو ان کی کوشش پر مبارکباد دی اور کہا آپ لوگوں نے لارڈ برکن ہیڈ کے چیلنج کا خوب جواب دیا البتہ آزادی کامل کے بجائے درجۂ نوآبادیات پر رضامند ہو کر ذرا کمزوری دکھائی۔ اس کے بعد پنجاب اور بنگال کے مسئلہ کا ذکر کیا اور کہا کہ تناسب آبادی کے مطابق نشستوں کا تعین ہونا چاہیے تھا اس کے ساتھ انھوں نے مجلس خلافت کی تجویز سنائی۔ اس پر پورے پنجاب کے بعض مسلمان رہنماؤں نے مولانا سے سوال کیا کہ آپ کی ذاتی رائے ہے یا مجلس خلافت کی، مولانا نے کہا کہ مجلس خلافت نے یہ طے کیا ہے اس پر ایک صاحب نے جو کل تک نہرو رپورٹ کی عدم تحفظ نشست والی دفعہ کے سخت مخالف تھے کھڑے ہو کر کہا لیکن ہم لوگوں کی یہ رائے نہیں ہے ہم نشستوں کے عدم تحفظ پر راضی ہیں ظاہر ہے کہ اس طرز عمل پر مولانا شوکت علی کو بہت ناگواری ہوئی اور مخالفت کی بنیاد پڑ گئی آل پارٹیز کانفرنس کی کارروائی جس طرح ہوتی رہی اس سے مولانا شوکت علی اور ان کے ہم خیال اصحاب کی ناگواری میں اضافہ ہوتا رہا اور سارے ملک میں مخالفت کا بازار گرم ہو گیا پنجاب اور بنگال کے وہ لیڈر جنہوں نے مولانا کے علی الرغم نشستوں کے عدم تحفظ کی تجویز منظور کی تھی ان کا مسلمانان ہند پر وہ اثر نہ تھا جو مولانا شوکت علی اور ان کے دوستوں کا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اندر نہرو رپورٹ سے سخت بیزاری پیدا ہوئی اور کسی تدبیر سے وہ اس سے متفق نہ ہو سکے۔

مولانا محمد علی اس زمانہ میں علاج کی غرض سے یورپ میں تھے ان کو وہاں ان واقعات کی اطلاع ہوئی مگر وہ حالات سے مایوس نہیں ہوئے اور جب یورپ سے واپس ہوئے تو بمبئی میں اخبار نویسوں کے سوال کے

جواب میں کہا کہ شام راج سے رام راج بہتر ہے اس سے ان کی وطن دوستی اور حریت پسندی ظاہر ہوتی ہے۔ ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر انصاری کا دورِ صدارت ختم ہوگیا اور پنڈت موتی لال نہرو نئے سال کے لیے صدر منتخب ہوئے۔ کلکتہ میں کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا تو مولانا محمد علی اس میں شریک ہوئے اور نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں اپنے خیالات پیش کیے مگر لوگوں نے حالات کا صحیح اندازہ نہیں کیا نہ اس اثر کو سمجھ پائے جو علی برادران مسلمانوں کی رائے عامہ پر رکھتے تھے اور تھوڑے سے ان مسلمان لیڈروں کے بھروسہ پر جو مسلم عوام پر زیادہ اثر نہ رکھتے تھے مولانا محمد علی کی باتوں پر دھیان نہ دیا بلکہ چشم دید شاہدوں کا بیان ہے کہ بعض لوگوں نے محمد علی کی تقریر پر ہوٹنگ کی۔ اس طرز عمل نے ناگواری میں اضافہ کر دیا اور مصالحت کے دروازے بند ہو گئے۔ وہ محمد علی جنھوں نے ساحل بمبئی پر قدم رکھتے ہی نہرو رپورٹ کے سلسلے میں شکوک و شبہات کے جواب میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ شام راج سے رام راج بہتر ہے اب ایسے آزردہ، دلگیر اور مایوس ہوئے کہ نہرو رپورٹ کے خلاف سارے ملک میں ایسی آگ لگادی کہ اسے ختم کرنے کے سوا اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ لاہور کانگریس نے پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں آزادیٔ کامل کا اعلان کر کے نہرو رپورٹ کو ختم کر دیا۔

یہ سب کچھ ہو گیا لیکن ہندوستان کی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال مولانا محمد علی کے دل سے نہیں نکلا اور ان تجاویز کو جنھیں شملہ کانفرنس میں مسلمان لیڈروں نے منظور کیا تھا پھر جنھیں بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے پاس کیا تھا اور جن کی مدراس کانگریس کے کھلے اجلاس نے تصدیق کی تھی نہرو رپورٹ نے اس اصول پر انھیں اختیار کیا تھا۔ مولانا محمد علی ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ کا یہی حل سمجھتے تھے انھوں نے بار بار اس خیال کا اظہار کیا اور جب لندن میں ہندوستان کے دستوری مسائل طے کرنے کے لیے گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کے سامنے بھی انھوں نے یہ تجاویز رکھیں وہ بڑے اخلاص کے ساتھ یہ یقین رکھتے تھے کہ یہ تجاویز منظور ہو جائیں تو ہندوستان کی ساری الجھنیں سلجھ جائیں گی اس خیال پر انھیں ایسا وثوق تھا کہ شدید بیماری کے باوجود وہ گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے مرض الموت میں ان تجاویز کی منظوری کی کوشش کی اور ایک ایسی مدلل اور پر اثر تحریر لکھی جس نے ہر طبقہ کو متاثر کیا لیکن افسوس ہے کہ کچھ حکمرانوں کی ساحری اور کچھ محکوموں کی کج دلی اور کوتاہ نظری نے مولانا کی اس مخلصانہ کوشش کو میاب نہ ہونے دیا ورنہ ملک نہ تقسیم ہوتا نہ عداوت و دشمنی کی وہ فضا پیدا ہوتی جس نے سارے ملک میں خون کے دریا بہا دیے۔

محمد علی کی یاد میں[*]

سید محفوظ علی بدایونی جنھیں لوگ محبت اور احترام سے "میر صاحب" کہتے تھے، مولانا محمد علی مرحوم کے دوستوں میں تھے اور ایسے دوست کہ جتنا وہ مولانا کو جانتے اور سمجھتے تھے، شاید کوئی اور نہ جانتا اور سمجھتا ہو۔ میر صاحب ۸ مئی ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئے، مولانا محمد علی کا سنہ پیدائش ۱۸۷۸ء ہے، گویا میر صاحب مولانا صاحب سے کوئی آٹھ برس بڑے تھے۔ میر صاحب نے لکھا ہے کہ "محمد علی کا اور میرا ساتھ سب سے پہلے ۱۸۸۸ء میں ہوا جب ان کی عمر دس برس کی تھی اور وہ ذوالفقار بھائی، نوازش مرحوم اور شوکت اپنے ان حقیقی بھائیوں اور امتیاز اور امجد اپنے عزیزوں کے ساتھ بریلی اسکول میں پڑھنے آئے اور بورڈنگ ہاؤس میں میرے کمرے سے دو کمرے چھوڑ کر مقیم ہوئے۔" مولانا مرحوم نے کل باون ۵۲ برس کی عمر پائی، میر صاحب کے قول کے مطابق اس باون برس میں سے ۲۱ برس نکال کر ۳۱ برس کی "مولانا کی کتاب زندگی"...... پوری میرے پیش نظر ہے، بلکہ اس کے اکثر باب میرے سامنے لکھے گئے ہیں۔" ایک ایسے "محرم راز" کے قلم سے جس کی خدا ترسی، شرافت نفسی، شائستگی، وضعداری، متانت اور معاملات کی صفائی کی شہادت مولانا ضیاء احمد بدایونی جیسے ثقہ بزرگ نے دی ہو، مولانا محمد علی کے اوصاف حسنہ کا بیان کتنا معتبر ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو خدا ترسی، متانت اور شائستگی کے معنی و مفہوم سے خوب واقف ہیں، مولانا بڑے نہ ہوتے تو میر صاحب جیسا دیانت دار اور فرائض شرعیہ کا سختی سے پابند شخص وہ سب کچھ نہ لکھتا جو اس نے اپنے دوست کی یاد میں جسے وہ اپنا بھائی سمجھتا تھا، لکھا ہے۔

یہاں یہ مقصود نہیں ہے کہ میر صاحب کے حالاتِ زندگی لکھے جائیں یا ان کے اخلاق حمیدہ بیان

---

[*] ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا محمد علی کے انتقال پر سید محفوظ علی نے اس عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو اس وقت کے کئی اخباروں اور رسالوں میں چھپا تھا۔ اس مضمون کے چند ٹکڑے 'تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را' کے بمصداق رسالہ جامعہ کے اس خصوصی نمبر میں شائع کیے جا رہے ہیں۔

کیے جائیں، ہاں، ان کے بارے میں ان کے معاصرین کی، بڑے ہوں یا چھوٹے، رائے ضرور قلمبند کروں گا کہ اس سے اس شخص کی عظمت کا کچھ پتہ ضرور چل جائے گا جس نے "اپنے عزیز بھائی (مولانا محمد علی) کی تربت پر محبت کے پھول" چڑھائے تھے۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں :

"مولانا محمد علی کو سید صاحب سے جو دلی شغف تھا وہ شروع سے آخر تک قائم رہا "کامریڈ" اور "ہمدرد" کا خواب دونوں نے مل کر دیکھا تھا اور اس کی تعبیر و تشکیل میں دونوں شریک رہے۔ ایک صحرا کو نکل گیا، دوسرا بدایوں کے گلی کوچوں میں بھی رسوا نہ ہوا۔ مولانا محمد علی کے مزاج میں جو بے پایاں شدت اور حرارت تھی، جس نے ان کو ہمیشہ نعل در آتش رکھا، جس کی وجہ سے کوئی شخص مولانا کے ساتھ یکسوئی اور استقلال کے ساتھ کام نہ کر سکتا تھا اور جس تپش و طوفان کے بالآخر وہ خود نذر ہو گئے، اس نے سید محفوظ علی کو کبھی متزلزل نہیں کیا۔ سید محفوظ علی نے اس مہر نیمروز سے روشنی اور حرارت بھی اکتساب نہ کی۔ محفوظ علی اپنے نظام شمسی خود تھے۔"

غلام رسول مہر رقم طراز ہیں :-

"مجھے سید محفوظ علی مرحوم بدایونی کی زیارت کا شرف حاصل نہ ہوا، لیکن مولانا ظفر علی خاں مرحوم، مولانا محمد علی مرحوم، شعیب قریشی مرحوم اور بہت سے اکابر و احباب کی زبانی ان کے اوصاف و محاسن سنتا رہا۔ ان کے بعض مضامین و مقالات مختلف رسالوں میں پڑھے میرا تاثر یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے بہترین لکھنے والوں میں سے تھے۔"

میر صاحب کے انتقال پر مولانا عبدالماجد دریابادی کے تاثرات ملاحظہ ہوں :-

"سید محفوظ علی اپنے دور کے بڑے اچھے لکھنے والوں میں تھے اور شوخ نگاری و ظرافت کے ایک طرز خاص کے موجد تھے۔ ظرافت ذرا اونچے اور علمی قسم کی تھی۔ عوام کی سطح سے بلند، قلم اور طبیعت دونوں کا جوہر خاص شرافت تھی۔ ہر ایک کے ہمدرد و غم خوار، بڑے صلح جو، ذاتی زندگی میں سخت متشرع اور پختہ دیندار . . . . .

"بچپن میں محمد علی کے استاد شفیق رہے اور جب وہ بڑے ہوئے تو ان کے رفیق۔ علی برادران کے حلقے کی ایک ممتاز شخصیت اور ان کے دور کی ایک اہم یادگار رخصت ہو گئی"

"مرحوم بڑے ہی مخلص، بڑے ہی شریف، وضعدار اور سچے دین دار تھے، اور ساتھ ہی بڑے محتاط ادیب و صاحب قلم اور نکتہ رس و متوازن نقاد اور بڑے ہی خوش ذوق بذلہ سنج، چہرہ ایسا مولویانہ کہ کسی کو گمان بھی ان کے گریجویٹ ہونے کا نہ ہوتا۔"

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے:

"میر محفوظ علی . . . . علم و آگہی میں اپنی ذات سے ایک دائرۃ المعارف یا انسائیکلوپیڈیا تھے۔ مذہب، تاریخ، ادب، شاعری، لغت، فلسفہ، کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر ان کی پوری نظر نہ ہو اور کوئی موضوع نہ تھا جس پر وہ اعتماد کے ساتھ گفتگو نہ کرسکتے ہوں۔ وہ خود اپنی وضع قطع سے مشرقی روایات کے زندہ نمونہ تھے اور اپنی تحریروں میں ان اقدار کے فروغ پر زور دیتے تھے جو ان کے خیال میں ان روایات کی اساس ہیں . . . ."

غرض کہ سید محفوظ علی خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، وہ ایک بڑے انسان تھے، کبھی شہرت نہ چاہی، چاہتے تو شہرت ان کے قدم چومتی، خود عائد کردہ گمنامی کو بھی وہ ایک اخلاقی قدر تصوّر کرتے تھے، یہ بھی ایثار اور ضبط نفس کی ایک صورت ہے، ایسے بے نفس مرد حق آگاہ نے اپنے دوست کی یاد میں جب لکھا تو وہی لکھا جسے وہ برحق سمجھتا تھا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں میر صاحب کے مراتب بلند سے بلند تر ہوتے رہیں۔

مدیر

محمد علی اوائل عمر میں بظاہر ان جذبات عالیہ سے بیگانہ نظر آتے تھے جنھوں نے آگے چل کر محمد علی کو محمد علی بنا دیا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ ذرہ جو بیابان اور وہ قطرہ جو سمندر بن کر ساری دنیا کو اپنے حدود کی پہنائی اور اپنے ساحل کو آغوش میں سمیٹ لینے والا تھا، شروع ہی سے ان کے دل کے کسی غیر آباد گوشے میں خاموش پرورش پا رہا تھا۔

جب وہ ولایت کو روانہ ہوئے تو ان کے دماغ پر عقل مآل اندیش کا قبضہ مگر ان کے دل پر عشق مصلحت ناشناس کا غلبہ تھا اور ان کے مستقبل کی تشکیل میں دونوں کی رقابت و مناقشت کارفرما تھی۔ عقل کی رائے

تھی کہ وہ مسٹر ایم۔ علی آئی سی۔ ایس بنائے جائیں مگر عشق کی صلاح کہ رئیس الاحرار مولانا حاجی محمد علی بنیں۔ عقل کی مرضی تھی کہ وہ انصاف کی کرسی پر بٹھائے جائیں مگر عشق کی خوشی کہ الزام کے کٹہرے میں کھڑے ہوں۔ عقل نے انھیں سزا دینے کا طریقہ مگر عشق نے سزا پانے کا سلیقہ سکھانا چاہا۔ عقل نے انھیں جج کا چغہ اور وزارت کا خلعت مگر عشق نے جیل کا کرتا اور حج کا احرام پہنانا چاہا۔ عقل کا مشورہ تھا کہ وہ بریڈلا اور انگرسال کے زمرہ شاگردی میں مگر عشق کا حکم کہ اویس اور بلال کے حلقہ غلامی میں آئیں۔ غرض کہ عقل کا فیصلہ تھا کہ وہ یزید مگر عشق کا فتویٰ کہ شہید ہوں۔ اس کشاکش میں 'پایانِ کار' عشق ہی کامیاب ہوا۔ یعنی محمد علی سول سروس کے امتحان میں ناکامیاب ہوئے، یہ اس میدان کی پہلی فتح اور اس مکتب کا پہلا سبق تھا۔ آگے آگے دیکھئے۔ اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را۔

۱۴ر جنوری ۱۹۱۰ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :

" تمہارے جانے کے بعد یہ ہوا کہ کونسل نے بالاتفاق رائے فیصلہ کیا کہ افیون کی کاشت میں کمی کے مسٹر محمد علی کسی طرح جواب دہ نہیں ہیں۔ اس کے بعد میں نے اپنی ترقی کی درخواست دی، ٹالم ٹولا ہوتی رہی۔ اس عرصہ میں مسٹر ڈٹ کا نزول ہوا۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ اُن کی رائے میری ترقی کے خلاف ہوئی۔ اس لیے مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اس عرصے میں ٹائمز آف انڈیا میں چند مضامین میرے شائع ہوئے جن میں مسلمانوں کے حقوق کی پیروی کی گئی تھی اور مسٹر گوکھلے کی دوستی نما دشمنی کا پردہ فاش کیا گیا تھا۔ مسٹر ڈٹ سخت ناراض ہوئے اور میرا جواب طلب کیا گیا۔ میں نے جواب اس قدر دنداں شکن دیا کہ کچھ بن نہ پڑی۔ کونسل میں جواب پیش ہوا اور کچھ نتیجہ نہ نکلا سوائے اس کے کہ ایک عام سرکلر شائع کیا جائے اور وہ بھی خفیہ کہ سرکاری عہدہ داروں کو ایسے مضامین لکھنا مناسب نہیں ہیں جن کی وجہ سے مختلف مذاہب و قوم میں مخالفت پیدا ہو........ ریاست سے سخت بیزار ہوں........ نوکری سے بیزار ہوں...... موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں "

آپ دیکھ رہے ہیں! ریاست سے بیزاری، نوکری سے بیزاری، یہاں تک کہ زندگی سے بیزاری! آخر یہ دنیا سے برداشتہ خاطری کیوں؟ کیا صاف نظر نہیں آتا کہ کوئی مصلحت ناشناس تعلقات کی بیڑیوں کو کاٹ کر، معلوم و متعارف و مستقل شاہ راہ سے جبراً ہٹا کر کسی نامعلوم و نادیدہ راستے پر چلنا اور کسی نئی جگہ پہنچنا چاہتا ہے؟ اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

اس کے بعد ملازمت سے بوضع رخصت لی جو استعفے کی محض نظر فریب شکل تھی۔ مذہب و ملک کی خدمت کے لیے کمر باندھی۔ کلکتے گئے۔ کامریڈ نکالا۔ دہلی آئے، کامریڈ کے ساتھ ہمدرد جاری کیا، جنگ طرابلس میں چندہ فراہم کیا، جنگ بلقان میں طبی مشن بھیجا، انجمن خدام کعبہ کی بنیاد ڈالی، مسجد کانپور کے سلسلے میں ولایت گئے، نظربند ہوئے، قید ہوئے، اخبار بند کرایا، گھربار لٹایا، حاجی ہوئے اور آخر میں دارالکفر میں جان دے کر دارالامان اور مدینۃ الانبیاء میں زندگی جاوید پائی۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح 'اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را۔

بڑودہ، بمبئی، کلکتہ اور دہلی میں مرحوم خفیف سی علالت میں بھی 'دیارِ غیر میں مار کر بیکسی کی شرم رکھ لینے' پر غالب کے الفاظ میں خدا کا پیشگی شکریہ ادا کیا کرتے تھے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ موت دیارِ غیر ہی میں آئی جہاں بیکسی کی شرم رہ گئی کیونکہ سوائے چند خاص عزیزوں کے نہ وہاں ہم نشیں تھے نہ ہم زباں اور نہ تیماردار تھے، نہ نوحہ خواں، مگر اس دیارِ غیر میں (بھی) عاشق کا جنازہ دھوم سے نکلا تھا.......

اسلام کی نصرت کا جذبہ مرحوم کی طبیعت میں پہلے شوق بنا، پھر ولولہ ہوا، آخر میں جنون۔ یہی جنون تھا جو کامریڈ کے صفحوں پر اور جامع مسجد کے منبر پر، قلم سے اور زبان سے اہلِ احتساب کو دعوتِ گیر و دار دیتا تھا ؂

طفلانِ شہر بے خبر انداز جنونِ ما !

یا ایں جنونِ ہنوز سزاوارِ سنگ نیست !

جنون کی سرکار سے سب سے بڑا انعام خلعتِ سہ پارچہ جو عطا ہوا وہ (۱) ارادہ میں پہاڑ کا سا استقلال، (۲) طبیعت میں دریا کا سا بہاؤ اور (۳) جذبات میں طوفان کا سا جوش تھا۔ اسی کی بدولت تو تھا کہ خدمت مذہب کی جو نوعیت ذہن میں آئی اس کی بجا آوری، پوری استقامت و استقلال، نہایت تیزی و روانی اور شدید جوش و انہماک سے کی۔

قید و بند کی جو جو سختیاں جھیلنی پڑیں وہ نہ تو کسی دوسرے شخص کے اعمال و افعال کی پاداش میں تھیں نہ ناگہانی افتادیں کہ بلا علم و اطلاع لغتۃً سر پر آپڑی ہوں بلکہ خود ان کی اپنی ہی تحریروں اور تقریروں کے جرائم کی سزائیں تھیں۔ اور یہ جرم وہ تھے جن کا ارتکاب انھوں نے کسی فوری جوش یا وقتی اشتعال کی حالت میں نہیں

بلکہ خوب سوچ سمجھ کر اور اچھی طرح جان بوجھ کر کیا تھا، چنانچہ ہر سزا بھگتنے اور ہر کڑی جھیلنے کے بعد ان کا رونگٹا رونگٹا یہی پکارتا تھا۔ ع

آں قدر زخمے کہ دل می خواست در پیکاں نہ بود

خدا کے خوف کے ساتھ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے بے خوفی، ایک مسلمان کی خصوصیت امتیازی اگر آج نہیں تو پہلے کسی زمانے میں تو تھی۔ دنیا کی بڑی طاقت سے ان کی بے خوفی کے واقعات تو دنیا بھر کے علم و ذہن میں ہوں گے مگر خدا کے خوف کے متعلق یہ آنکھیں آج اور اس وقت گواہی دینے کو موجود ہیں کہ ـــ ماضی قریب میں نہیں جب کہ محمد علی کی ہیئت کذائی خشوع و خضوع کی قد آدم تصویر بن گئی تھی بلکہ ماضی بعید میں جب کہ سوٹ بوٹ، منڈی داڑھی اور قیصری مونچھیں بظاہر خدا سے بے خوفی کا مجسمہ پیش کرتی تھیں، فجر کی قضا نماز کے بعد سجدے کی جگہ کو تر ہوتے، دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو کانپتے، سائل کو دینے کے لیے جیب سے رقم کے ساتھ آنکھوں سے آنسو نکلتے دیکھا ہے۔ دل کے اسی گداز نے دکھا دیا کہ دنیا کے خریدار مسٹر محمد علی تو معمورۂ لندن سے خالی ہاتھ آئے۔ مگر دین کے طلبگار مولانا محمد علی خرابۂ مہرولی سے جھولی بھرے گئے ؎

بستند رہِ جرعۂ آبے بہ سکندر
دریوزہ گرِ میکدہ صہبا بہ کدو برد

الہ العالمین! صدقہ اپنے حبیب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم کا محمد علی کی مغفرت کر، انھیں اپنے جوار قرب میں جگہ دے، انھیں اپنے مقبول بندوں کے ساتھ محشور کر، مجھ نامہ سیاہ سراپا گناہ کا خاتمہ بخیر کر اور ہم سب مسلمانوں پر رحم فرما۔ آمین یا رب العالمین۔

معین الدین حارث

عقیدت کے چند آنسو

ساٹھ پینسٹھ سال پرانی بات ہے۔ میں اپنے گاؤں سوپارہ میں جو بمبئی سے قریب تھانہ میں واقع ہے گاؤں کے مدرسے کا طالب علم تھا۔ ہمارے گاؤں میں اچھی خاصی مسلم آبادی تھی اور کئی مسجدیں تھیں۔ ہمارے محلے کی مسجد جامع مسجد کہلاتی تھی۔ ہر جمعہ کو اس مسجد میں دو تین ایسے خوش پوشش نوجوان نظر آتے تھے جو اس بستی کے نہیں تھے بلکہ ہر ہفتے صرف نماز جمعہ ادا کرنے وہاں آیا کرتے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ قریب ہی کے ریلوے اسٹیشن بھائندر سے آتے ہیں جہاں ان کا اپنا مکان اور کاروبار ہے مگر اس جگہ نہ مسلم آبادی ہے اور نہ کوئی مسجد۔ یہ نوجوان خوش حال خوش پوش اور تعلیم یافتہ تھے اور مذہب کے پابند بھی۔ اکثر مغربی لباس میں ملبوس ہوا کرتے تھے اور ان میں سے بڑے بھائی کے کوٹ کے کالر پر ایک خوشنما گول بیج BADGE لگا ہوتا تھا جس پر سرخ رنگ میں ہلال بنا ہوا تھا اور اس کے کنارے "نحن انصار اللہ" لکھا ہوا تھا۔ ہلال کے دائرے میں "خادم کعبہ" لکھا ہوا تھا۔

کسی صاحب کے یہ دریافت کرنے پر کہ یہ تمغہ کس بات کی علامت ہے انھوں نے بتایا کہ شوکت علی اور محمد علی نام کے دو بھائی ہیں دونوں علی گڈھ کے تعلیم یافتہ ہیں ان میں سے چھوٹے محمد علی ولایت میں بھی تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے اور ان کے اور ساتھیوں نے مل کے "خدام کعبہ" کے نام سے ایک انجمن بنائی ہے جس کا مقصد خانۂ کعبہ کی حفاظت اور اللہ کے اس گھر کی زیارت کے لیے جانے والے حاجیوں کی خدمت کرنا ہے اور جو صاحب اپنے کوٹ کے کالر پر خدام کعبہ کا بیج لگائے ہوئے ہیں وہ اسی انجمن خدام کعبہ کے رضا کار ہیں۔

یہ تھا علی برادران سے میرا پہلا غائبانہ تعارف۔ اس کے بعد چند سال اور بیت گئے میں گاؤں کے مدرسے کی ابتدائی تعلیم ختم کر کے ثانوی تعلیم کے لیے روزانہ ریلوے ٹرین سے اپنے گاؤں

سے بھی جانے لگا تھا۔ یہ بڑا پر آشوب زمانہ تھا۔ علی برادران جو ۱۹۱۴-۱۹۱۸ء کی پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں چھندواڑہ اور بیتول میں نظر بند رہے جنگ کے خاتمے پر رہا ہو چکے تھے۔ ایک روز یہ خبر ملی کہ یہ دونوں بھائی بمبئی آ رہے ہیں اور بوری بندر کے اسٹیشن پر شام کو ان کا استقبال ہوگا۔ اسکول کا وقت ختم ہونے پر میں بھی چند اور ساتھیوں کے ساتھ بوری بندر جا پہنچا۔ گاڑی کے آنے میں ابھی دیر تھی مگر اسٹیشن کے سارے پلیٹ فارم ہزاروں آدمیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ جب گاڑی اسٹیشن میں داخل ہوئی تو ساری فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ گاڑی کے رکتے ہی فرسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر دو نوجوان کھڑے دکھائی دئے۔ مغربی لباس پہنے ہوئے سر پر بالوں والی ترکیپ لگی ہوئی اور دونوں کے لباس پر وہی نحن انصار اللہ اور خادم کعبہ والا تمغہ لگا ہوا جو میں برسوں پہلے اپنے گاؤں میں ایک اور نوجوان کے کالر پر دیکھ چکا تھا۔ یہ تھی میرے لیے علی برادران کی پہلی دید۔

اسٹیشن پر شاندار استقبال کے بعد دونوں بھائی جلوس کے ساتھ اس جگہ لے جائے گئے جہاں ان کے قیام کا انتظام تھا۔ یہ زمانہ تحریکِ خلافت کے آغاز کا تھا آناً فاناً اس تحریک کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ اس تحریک میں سرکاری مدارس کے مقاطعے کا پروگرام بھی شامل تھا اس دور کے ہزاروں طلبا نے اس آواز پر لبیک کہا۔ میں نے بھی سرکاری اسکول کا مقاطع کر کے خلافت کمیٹی کے قائم کردہ ثانوی اسکول مصطفےٰ کمال پاشا ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ملحق تھا۔ دو تین سال بعد اسی اسکول سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے امتحانِ میٹرک میں کامیابی حاصل کی۔ یہ اسکول ڈونگری کے علاقے میں سلطان مینشن میں تھا اور اسی عمارت کی بالائی منزل پر مرکزی خلافت کمیٹی کا دفتر تھا۔ مولانا شوکت علی صاحب کا اسی جگہ مستقل قیام تھا اور مولانا محمد علی اور تحریک خلافت کے اور رہنما وقتاً فوقتاً وہاں آیا کرتے تھے اور ہم طلبا کو ان کی زیارت ہو جایا کرتی تھی۔ اسی زمانہ میں ناگپاڑہ کے علاقے میں مستان تالاب پر خلافت کے جلسے ہوا کرتے تھے اور ان جلسوں میں علی برادران، مولانا ابو الکلام آزاد اور تحریک خلافت کے اور لیڈروں کی تقریریں سننے کا بھی موقع ملا کرتا تھا۔

انہی دنوں علی برادران ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ان کے اور ساتھیوں پر کراچی میں مقدمہ ہوا اور وہ دو دو سال قید بامشقت کی سزا پا کر جیلوں میں بند کر دیے گئے۔ اس قید و بند سے ان کی جب رہائی ہوئی تو میں جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کے کالج میں داخلہ لے چکا تھا ادھر مولانا محمد علی نے دہلی سے اپنا اردو روزنامہ ہمدرد اور

انگریزی ہفتہ وار "کامریڈ" پھر جاری کر دیا تھا۔ ان کی بڑی صاحب زادی آمنہ مرحومہ شدید علالت کی وجہ سے علیگڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کرایہ کی عمارتوں میں سے ڈگی کوٹھی میں لائی گئی تھیں اور مولانا محمد علی کا قیام بھی انہی کے ساتھ تھا۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی انڈین نیشنل کانگریس کے کوکناڈا اجلاس کے صدر منتخب ہوئے اور یہ تاریخی خطبۂ صدارت علی گڑھ میں تیار کر کے وہیں سے کوکناڈا گئے۔ بیمار آمنہ کا علی گڑھ میں انتقال ہوا اور جس علی گڑھ کالج سے چند سال قبل علی برادران کو پولیس کی امداد لے کر نکالا گیا تھا اسی کے قبرستان میں مرحومہ کو سپرد خاک کیا گیا۔

۱۹۲۵ء میں گرمی کی تعطیلات شروع ہونے سے پہلے جامعہ میں یہ اعلان ہوا کہ جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کیا جا رہا ہے اور جن طلبا کو اپنا سلسلۂ تعلیم جامعہ میں جاری رکھنا ہے وہ چھٹیوں کے بعد بجائے علی گڑھ کے دہلی آ جائیں۔ میں اپنی کالج کی تعلیم کے دو سال علی گڑھ میں پورے کر چکا تھا۔ آخری دو سال کا کورس پورا کرنے کے لیے چھٹیوں کے بعد دہلی گیا جہاں قرول باغ کے علاقے میں کرایہ کی کوٹھیوں میں جامعہ کے ساتھ میں مدرسہ اور کالج بھی تھا اور ان عمارتوں کے بالمقابل لطیف منزل نامی ایک بڑی لمبی چوڑی عمارت میں کالج کے طلبا کا ہوسٹل تھا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی علی گڑھ سے دہلی کو منتقلی مولانا محمد علی کو ناپسند تھی اور ان دنوں اسی وجہ سے وہ جامعہ سے کچھ ناراض بھی ہو گئے تھے مگر ان کی یہ ناراضگی زیادہ عرصہ قائم نہ رہی اور جامعہ کے بانی کی حیثیت سے اس ادارے سے انھیں جو تعلق تھا، قومی تعلیم کے تخیل سے جو دل چسپی تھی اور جامعہ کے کارکنوں اور طلبا کے ساتھ انھیں جو تعلق تھا، وہ ان کی عارضی ناراضگی پر غالب آئی اور چونکہ ان کا قیام پرانی دہلی میں کوچہ چیلان میں تھا وہ اپنے دن بھر کے کام اور دیگر مصروفیات کے بعد اکثر اوقات شام کے وقت تانگے پر قرول باغ آ جایا کرتے تھے اور جامعہ کے کتب خانے کے چھوٹے سے ہال میں طلبا کے ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ مولانا محمد علی کی اس طرح آمد جامعہ کے طلبا کے لیے نوید مسرت بن جاتی تھی اور وہ پروانہ وار ان کے ارد گرد جمع ہو جاتے تھے اور ان کے درس اور مواعظ سے مستفید ہوا کرتے تھے۔

مولانا محمد علی مرحوم کو قریب سے دیکھنے کا اور ان کی باتیں سننے کا یہ موقع ان کی دلآویز شخصیت ان کا علم و فضل اسلام کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت قرآن مجید اور احادیث نبوی سے ان کا ربط اور سیرت نبوی اور تاریخ اسلام پر ان کی گہری نظر کا وہ نمونہ پیش کیا کرتا تھا جس کی یاد کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ مولانا محمد علی

خود اچھے شاعر تھے اور شعر و سخن سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ قدیم شعرا میں ان کے محبوب شاعر غالب تھے اور خود اپنے دور کے شعرا میں اقبال کی شاعری کا ان پر غیر معمولی اثر تھا اور اپنی تقریروں میں وہ غالب کے اشعار اور اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی سے فارسی کلام اس انداز سے پیش کرتے تھے کہ سامعین کے دلوں میں گھر کر جاتا تھا اور ان کی تقریر میں اور زیادہ زور اور اثر پیدا کرنے کا باعث بن جاتا تھا۔

قرول باغ میں جامعہ کی ان یادگار صحبتوں کے علاوہ مولانا محمد علی کی تقریریں سننے کا ایک اور موقع بھی اس زمانے میں فراہم ہو گیا تھا اور وہ ہر جمعہ کو ان کا بیان تھا جو وہ پابندی کے ساتھ بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں شاہجہانی دور کے ممبر کے قریب بیٹھ کر کیا کرتے تھے ان کی طول بیانی کی عادت کی وجہ سے بعض اوقات بیان کا یہ سلسلہ اتنا طول کھینچتا تھا کہ عصر کی نماز کا وقت آ جاتا تھا مگر اس طول بیانی کے باوجود ان کے بیانات اس قدر دلآویز اور علم و ادب کی چاشنی سے اتنے مملو ہوتے تھے کہ سننے والوں پر بار نہیں گزرتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس دو سال کی مدت میں میں نے شاید ہی ان کے اس قسم کے بیانات سے مستفید ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دیا ہو۔

مولانا محمد علی پر ان دنوں مذہبی رنگ بہت زیادہ غالب تھا اور اس لیے ان کی ہر تقریر کلام مجید کی تفسیر احادیث نبوی کی تشریح اور سیرت نبوی پر تبصرہ ہوا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ وہ وقتاً فوقتاً اہم سیاسی مسائل پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے مگر وقت کے سیاسی مسائل سے بحث کرتے وقت بھی وہ اپنے سامعین کو یہ یاد دلاتے رہتے تھے کہ بحیثیت مسلمان کے ان کا نقطۂ نظر اس باب میں کیا ہونا چاہیے۔ قرآن و حدیث کے حوالے اور سیرت نبوی اور اسلام کے دور اول کی تاریخ ہر وقت ان کے پیش نظر رہتی تھی اور اسی کی روشنی میں وہ وقت کے مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ تقریر کا موضوع خواہ کوئی بھی ہو اور بات کتنی بھی طویل کیوں نہ رہی ہو ان کے بیان کے خاتمے پر سامعین پر، طلبا کا گروہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہتا تھا کہ ان کے بیان سے اس کے علم و معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

اسی زمانے میں جو مولانا محمد علی کی زندگی کا آخری دور تھا بعض ایسے علمی اور سیاسی معرکے پیش آئے جن پر مولانا محمد علی کا اپنے پرانے رفقائے کار کے ساتھ شدید اختلاف ہوا اور چونکہ انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا ایک ذریعہ روزنامہ ہمدرد کی صورت میں حاصل تھا اس لیے ایسے معرکوں میں وہ اپنی بات پوری تفصیل کے ساتھ پیش کر سکتے تھے اور کرتے بھی تھے۔

۲۴ء میں اتاترک مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں خلافت عثمانی کا خاتمہ، حجاز میں آل سعود کے ہاتھوں شریف حسین کی شکست اور مکہ مکرمہ میں موتمر اسلامی کا انعقاد یہ اس دور کے اہم سیاسی واقعات تھے۔ ملکی امور میں سرحد کی سرزمین میں آئینی یا علاقہ غیر میں چند قادیانی مبلغین کا قبائلیوں کے ہاتھوں ارتداد کے الزام میں سنگسار کیا جانا اور اس پر ایک طویل مذہبی بحث کا چھڑ جانا تھا۔ انہی دنوں خواجہ حسن نظامی مرحوم سے بھی مولانا محمد علی کی قلمی جنگ چھڑ گئی جو ہفتوں جاری رہی۔ ہمدرد میں مولانا محمد علی کی تحریروں کا جواب خواجہ حسن نظامی اپنے پندرہ روزہ منادی میں دیتے رہے اور اس کو ناکافی سمجھ کر ان کے اور طرف دار بھی اس بحث میں کود پڑے تو دوسری طرف سے منادی کے جواب میں "سنادی" اور "اڑادی" جیسے پرچے شائع ہونے شروع ہوئے اور ہفتوں کی اس قلمی جنگ کے بعد یہ میدان بھی پوری طرح مولانا محمد علی مرحوم کے ہاتھ رہا۔

اپنی طالب علمی کے دور میں اور بالخصوص جامعہ ملیہ کی طالب علمی کے زمانے میں مولانا محمد علی کی ذات سے اور ان کی تحریروں کے مطالعے اور تقریروں کی سماعت سے استفادہ کا جو موقع ملا وہ میری طالب علمانہ زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ ان دنوں کی یاد پوری نصف صدی گذر جانے کے بعد آج بھی تازہ ہے جیسی اس وقت تھی۔ اس قسم کے تجربات کا اس دور کے طلبا کی کردار سازی میں بھی بڑا دخل رہا اور ان میں بعض بلند اقدار کو اپنانے کا وہ جذبہ پیدا ہوا جو ان کے مستقبل کو بنانے اور سنوارنے میں مددگار ثابت ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض امور میں اور سیاسی مباحث میں ان سے اختلاف ہو جانے پر بھی ان کے لیے دل میں عقیدت و احترام کا جو جذبہ تھا اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔

اس یادگار دور کے قابلِ ذکر واقعات کی تفصیل بہت طویل ہو سکتی ہے مگر طوالت سے بچنے کی خاطر صرف دو ایک واقعات کے ذکر پر اکتفا کرنا ہوگا۔

مولانا محمد علی مرحوم غالب کے اشعار ٹھیک موقع پر اس طرح استعمال کرتے تھے کہ نہ صرف ان کی تقریروں کا اثر بڑھ جاتا تھا بلکہ بعض اوقات وہ پورا معرکہ جیت لیتے تھے۔ ایک بار دہلی کی جامع مسجد میں ان کی تقریر سے پہلے یہ خبر ہوئی تھی کہ آج اگر مولانا نے لب کشائی کی تو ہنگامہ ہوگا۔ خود مولانا کو اس کی اطلاع ہو چکی تھی وہ حسب معمول نماز جمعہ میں شریک ہوئے اور بعد نماز مکبر کے پاس بیٹھ کر پورے اطمینان کے ساتھ غالب کے اس مشہور شعر سے اپنی تقریر شروع کی ؎

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

ظاہر ہے کہ اس شعر کے پڑھنے کے بعد سارا مجمع مولانا کی گرفت میں آگیا تھا اور ایسی حالت میں ہنگامہ کرنے کی جرات کون کر سکتا تھا۔

ایک اور موقع پر تاریخ اسلام کے دور اول کی اسلامی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے اور اپنے سامعین کے دل گرمانے کے لیے اندلس پر جواں سال مسلم سپہ سالار طارق کے حملے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے ؂

طارق چوں بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم
ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دست خویش بہ شمشیر بُرد و گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

اس واقعے پر پوری نصف صدی گذر جانے کے بعد بھی جب کبھی جامع مسجد دہلی میں حاضری اور نماز جمعہ کی ادائگی کا اتفاق ہوتا ہے جب اس تاریخی منبر پر نظر پڑتی ہے تو میری آنکھوں میں مولانا محمد علی کی تصویر پھر جاتی ہے اور کانوں میں ان کی وہ بھرائی ہوئی آواز گونجنے لگتی ہے جس میں انھوں نے اقبال کے یہ اشعار سنائے تھے۔ مجھے یہ بھی یاد آتا ہے کہ جب آخری شعر کے لفظ ''خندید'' پر پہنچے تھے تو ان کے اپنے چہرے پر ایک عجب مسکراہٹ لہرائی تھی اور'' دست خویش بہ شمشیر برد'' کہتے ہوئے ان کا دایاں ہاتھ بائیں طرف گیا تھا اور ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ بھی میان سے شمشیر باہر لا رہے ہیں۔

مولانا محمد علی احرار ہند کے رؤسا میں سے تھے اور اسی بنا پر رئیس الاحرار کہلاتے تھے ان کے انتقال پر بھی اب تقریباً نصف صدی گذر چکی ہے۔ وہ محمد علی جنھوں نے گول میز کانفرنس کی اپنی یادگار تقریر میں برطانوی حکومت سے اپنے وطن عزیز کے لیے آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں غلامی کی حالت میں اپنے وطن واپس جانا نہیں چاہتا۔ وہ واقعی اس سفر سے واپس نہیں آئے بلکہ قیام لندن ہی

میں سفر آخرت اختیار کیا اور بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کے احاطے میں دفن ہونے کی سعادت انھیں نصیب ہوئی۔

۱۹۵۷ء میں جب حکومت ہند کے حج ڈیلی گیشن کے رکن کی حیثیت سے حجاز مقدس جانے کا اتفاق ہوا تو حج کے بعد میں نے مشرق وسطیٰ کے چند ممالک کا سفر کیا اور قبلۂ اول کی زیارت کے شوق میں بیت المقدس میں حاضری دی، وہاں کے ہفتہ بھر کے قیام اور مسجد اقصیٰ پر نماز جمعہ کی ادائگی کے بعد مولانا محمد علی کی قبر پر فاتحہ خوانی کی سعادت حاصل کی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ان کی قبر جس کمرے میں ہے اس کی دیوار پر ان کے کسی عقیدت مند نے انہی کا یہ مصرعہ لکھا ہے ؎

مرکے جو ہم آپ کے جوہر کھلے

کہا جاتا ہے کہ یہ مصرعہ ہندوستانی انقلابی فاروقی صاحب نے لکھا ہے جو برسوں قاہرہ میں مقیم رہے اور وہیں ان کا انتقال بھی ہوگیا۔ ۱۹۵۸ء میں سفر یورپ سے واپسی پر جب کئی ہفتے قاہرہ میں گذارنے کا اتفاق ہوا تو ہندوستان کے اس انقلابی سے کئی بار ملاقات ہوئی اور انہی کے ساتھ آزادی ہند کے ایک اور مجاہد اور قاہرہ میں آزاد ہند کے پہلے سفیر سید حسین مرحوم کی قبر پر فاتحہ خوانی کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ اس قیام قاہرہ میں مراقش کی آزادی کے لیے فرانس اور اسپین کے خلاف مسلسل جہاد کرنے والے بطل جلیل امیر عبد الکریم ریفی سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور پورے اکیس سال فرانس کی حراست میں گذارنے کے بعد جب وہ پانی کے جہاز سے کود کر مصر کے ساحل پر آن پہنچے اور اس وقت کی مصری حکومت نے انھیں پناہ دے دی تو قاہرہ میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کی تھی۔

اس طرز پر تاریخی واقعات اور تجربات جنہوں نے حافظے کی روح پر کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں ہمیشہ یاد آتے رہیں گے اور یہ سلسلۂ زندگی کے آخری لمحات تک جاری رہے گا۔ جب یہ واقعات اور انہی کے ساتھ اس دور کی وہ بلند و بالا شخصیتیں یاد آتی ہیں جنہوں نے اپنی ساری قوتیں آزادئ ہند کے حصول کی خاطر صرف کیں تو زبان پر ان کے لیے دعائے مغفرت جاری ہو جاتی ہے۔ آزادئ ہند کے ان مجاہدین کے سالار قافلہ مولانا محمد علی مرحوم تھے جن کی صد سالہ سالگرہ ہمارے دلوں میں ان کی اور ان کے ساتھ اس گذرے ہوئے قافلے کی اور بلند و بالا شخصیتوں کی یاد تازہ کرتی ہے گذرنے والے گذر چکے اللہ تعالیٰ ان کو جو ابھی باقی ہیں اور اس نئی نسل کو جس نے خواہ انھیں دیکھا نہ ہو مگر جن کا ذکر

سناہوگا یہ توفیق دے کہ وہ ان کی زندگیوں کا مطالعہ کریں اور ان کی خوبیاں اپنے اندر جس حد تک بھی ممکن ہو پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ولادت تو عام طور پر حادثہ ہوتی ہے لیکن محمد علی کی موت خانہ زاد تھی۔ عام طور پر موت اپنا انتخاب خود کرتی ہے لیکن محمد علی نے خود موت کا انتخاب کیا اور یہی وہ چیز ہے جس نے محمد علی کی زندگی اور موت دونوں کو ایک حقیقت بنا دیا۔ سنگین اور صالح!

محمد علی کی زندگی اور موت دونوں ان کی انفرادی اور شخصی افتادِ طبع کی ایک جلوہ گری تھی اور شخصیت کی اسی جلوہ گری کا نام آرٹ ہے — صحیح اور گراں مایہ!

محمد علی کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز تھے۔ کس کی زندگی میں نہیں ہوتے، لیکن ان کی موت نے ہر نشیب کو فراز اور ہر فراز کو پُر شوکت بنا دیا۔

محمد علی کی ذہانت اور فطانت کہاں ملے گی۔ وہ تیغِ اصیل تھی جو رزم میں بے پناہ تھی اور بزم میں ایک جلوہ گری۔

کس بلا کے بولنے اور لکھنے والے تھے، بولتے تو معلوم ہوتا کہ ابوالہول کی آواز اہرام مصری سے ٹکرا رہی ہے، لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کرپ کے کارخانے میں توپیں ڈھلنے والی ہیں یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔ میں نے ان کو اسٹیج پر آنے اور بولتے ہوئے سنا ہے اور خود محمد علی کو داد دینے سے پہلے انیس کو داد دی ہے:

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے!

پروفیسر رشید احمد صدیقی (گنج ہائے گرانمایہ)

جناب رانا جنگ بہادر سنگھ

ترجمہ: جناب شہاب الدین انصاری

مولانا محمد علی
ایک دلآویز قدآور شخصیت

[جناب رانا جنگ بہادر سنگھ، جامعہ ملیہ کے قدیم طالب علم اور مولانا محمد علی کے عقیدتمند شاگرد ہیں۔ موصوف نے مولانا محمد علی پر انگریزی میں ایک طویل مضمون لکھا تھا جو نومبر ۱۹۷۶ء میں انگریزی کے موقر ہفتہ وار اخبار "مین اسٹریم" میں تین قسطوں میں شائع ہوا تھا، اس کا ترجمہ ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ چونکہ مضمون کافی طویل ہے اس لیے کچھ حصے حذف کر دیے گئے ہیں۔ (ادارہ)]

اپنی نوجوانی کے ایام میں جن قدآور سیاسی شخصیتوں کی قربت کا فخر مجھے حاصل رہا ہے ان میں سب سے دلآویز شخصیت مولانا محمد علی کی تھی۔ سر پر ہلال سے مزین ٹوپی، لمبی عبا پہنے ہوئے ایک باوقار جسم پر خوش نما داڑھی کے ساتھ مولانا ایک ایسی تصویر معلوم ہوتے تھے جو خلفائے راشدین کے دور کی کسی البم سے نکالی گئی ہو۔ تحریک خلافت کے ایک ممتاز قائد کی شخصیت کے لیے ان کا بھاری بھرکم جسم اور لباس دونوں موزوں تھے۔ انھوں نے اسلامی شریعت اور روایات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ قیادت کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لیے روحانی طور پر تیار تھے۔ وہ ان رجعت پسند "ملاؤں" سے مختلف تھے جن کی صلاحیت ان کی تنگ نظری کا شکار ہو جاتی ہے۔ آکسفورڈ کے ایک ذہین گریجویٹ ہونے کے ناطے وہ مغربی افکار اور انگریزی ادب سے بخوبی واقف تھے۔ اور اس وجہ سے ان کے نظریات اور خیالات پر منطق عقلیت پسندی کی چھاپ تھی۔

اگر ان کی ٹوپی میں چاند لگا ہوا تھا تو ان کے ہاتھوں میں ترنگا جھنڈا بھی تھا۔ ملک میں آزادی کی تحریک

کے عظیم رہنما مہاتما گاندھی خلافت کی تحریک کی حمایت کر رہے تھے۔ تحریک آزادی کو ترکی میں دوبارہ خلافت قائم کرنے کی تحریک کے ساتھ فطری مناسبت تھی کیونکہ دونوں کا ہدف برطانوی سامراج تھا مولانا کی ذات سامراج دشمن جذبات اور امنگوں کے ملاپ کا نمونہ تھی جس میں دو مختلف محرکات شامل تھے۔ اور جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو علیحدگی پسندی کے رجحانات سے الگ کر کے انھیں قومی زندگی کے دھارے میں کھینچ لیا تھا۔ اس طرح ہندو مسلم اتحاد کی دیرینہ خواہش کے پورا ہونے کے ساتھ ساتھ آزادی کے حصول کے لیے مشترک تحریک کا آغاز ہوا۔

اتحاد کے اس دور میں مولانا محمد علی اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کی شخصیتیں باہمی میل جول کا سب سے ممتاز ستون تھیں اگرچہ بعد کے سالوں میں پیدا ہونے والے حالات کے دباؤ کے باعث یہ اتحاد قائم نہ رہ سکا۔ شوکت علی دیکھنے میں محمد علی سے بھی زیادہ پر شکوہ شخصیت کے مالک تھے۔ علی برادران کی حیثیت مہاتما گاندھی کی انگریزوں کے غلبہ کے خلاف لڑی گئی جنگ میں بڑی اہم تھی۔ چنانچہ گاندھی جی یہ کہتے ہوئے کبھی نہ تھکتے تھے کہ وہ علی برادران کی جیب میں ہیں۔ علی برادران کا قوم پرست قوتوں کی صف میں موجود ہونے کا تصور بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ پبلک پلیٹ فارم پر مہاتما گاندھی کا اپنے منحنی جسم کے ساتھ قوی الجثہ علی برادران کے درمیان موجودگی کا منظر ایک ایسی شمع کا تھا جو ہر طرح سے محفوظ رہ کر روشنی اور قوت کا انعکاس کر رہی ہو اس طوفانی دور میں میرے لیے یہ منظر بڑا ہی دلچسپ تھا۔

میں مہاتما گاندھی کی ۱۹۱۹ء کی تحریک میں اپنے میٹریکولیشن کے امتحان کے دنوں میں ہی شریک ہو گیا تھا۔ کانستھ پاٹھ شالہ کالج میں تین سال گذارنے کے بعد ۱۹۲۲ء میں شہر کے تمام کانگریسی لیڈروں جن میں نہرو خاندان کے افراد بھی شامل تھے، کی گرفتاری نے میرے دل کے تاروں کو جھنجھوڑ دیا۔ میں نے عدم تعاون کیا اور اپنے ساتھ بہت سے نوجوانوں کو لے کر سیاست کے میدان میں جو ستیہ گرہ کے نعروں سے گونج رہا تھا پہنچ گیا۔ ... ہم ستیہ گرہی جو جیل سے باہر تھے ابھی جد و جہد کے لیے تیار ہی تھے کہ چوری چورا کے قریب ایک اتفاقی تشدد کے واقعہ سے متاثر ہو کر مہاتما گاندھی نے لگام کھینچ لی اور تحریک یکایک بند ہو گئی۔ میرے دل میں اگرچہ دوبارہ تعلیم شروع کرنے کی خواہش موجود تھی لیکن عملی سیاست میں کود پڑنے کے بعد گاندھی جی کے حکم کی وجہ سے ہم مجبور تھے کہ بدیسی حکومت کے ذریعہ چلنے والے تعلیمی اداروں میں دوبارہ واپس نہ جائیں میں نے اپنے لیے ایک مناسب کالج کی تلاش میں ان قومی کالجوں پر نظر ڈالی جو کانگریس کی تحریک پر

اور اس کی نگرانی میں ملک میں قائم کیے گئے تھے اور کاشی ودیا پیٹھ میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا لیکن ڈاکٹر بھگوان داس اور آچاریہ نریندر دیو جیسے جو اس کے روح رواں تھے اپنی بے پناہ عقیدت کے باوجود میں بنارس میں کچھ بے چینی محسوس کرتا تھا وہاں کے ماحول میں کچھ ایسی بات تھی جو مجھے پریشان کر رہی تھی۔ چاہے قدیم رشیوں نے جن اقدار کو جنم دیا ہے وہ اپنی جگہ درست سہی لیکن ہماری فطرت ہے کہ اوپری پرت سے مطمئن ہونے کے بجائے حقیقت کی تہ کو تلاش کریں۔ کاشی میں مختصر قیام کے بعد میں علی گڑھ چلا آیا جہاں مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بی، اے کی کلاس میں داخلہ مل گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ بہت سے انقلابات سے گذر کر اب نئی دہلی میں اوکھلا میں اپنے مستقل مستقر پر آگیا ہے۔

مولانا محمد علی کے قریب آنے کا شرف مجھے علی گڑھ میں حاصل ہوا۔ اس قومی درسگاہ کے چانسلر طب یونانی کے مشہور طبیب اور محب وطن حکیم اجمل خاں تھے۔ مولانا اس کے صرف شیخ الجامعہ نہ تھے ان کا شمار اس ملی تعلیم گاہ کے بانیوں میں ہوتا تھا بلکہ اس کے خاص بانی وہی تھے کیونکہ یہ مولانا کی گولہ باری تھی جس نے علی گڑھ یونیورسٹی کی دیواروں میں، جو رجعت پسند علی گڑھ کا گڑھ تھی رخنے ڈال دیے تھے اور یہاں سے طالب علموں کو ابھرتی ہوئی ہندوستانی قوم پرستی کے دائرہ میں کھینچ رہی تھی۔

جامعہ وہ جگہ تھی جہاں مجھے اپنے مستقبل کو ایک جرنلسٹ کے سانچے میں ڈھالنے کی سہولت ملی۔ مولانا خود ایک مثالی صحافی تھے اور غالباً انھیں کی سربراہی میں صحافت کا ایک شعبہ کھولا گیا تھا۔ مسٹر اپسن (Mr. Upeen) ایک نومسلم اینگلو انڈین اس شعبے کے پروفیسر تھے اور ایک پارسی جی کا نام ماسٹر تھا ان کے معاون تھے۔ میں نے جو مضامین اپنے لیے منتخب کیے تھے ان میں صحافت بھی تھی کیونکہ یہ میری افتادِ طبع کے مطابق تھا۔ مجھے انگریزی اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھنے کا شوق تھا۔ انگریزی میں میرے مضامین اور ایک نظم کالج کے میگزین میں اور دوسری جگہوں پر چھپ چکے تھے۔ میرے ہندی مضامین مختصر کہانیاں اور نظمیں ملک کے ممتاز ہندی جرائد میں جگہ پا چکی تھیں۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کے التوا میں پڑنے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخل ہونے کے بیچ کی مختصر مدت میں لکھا ہوا میرا ایک سیاسی ناول بنارس کی ایک فرم نے چھاپا تھا۔ میری خواہش تھی کہ میری زندگی اعلیٰ مقاصد سے معمور رہے کیونکہ مجھے احساس تھا کہ اس کے بغیر یہ ایک پر فریب اور ناکام زندگی ہوگی اور میں چاہتا تھا کہ میرا قلم جو ابھی تک ایک ناتجربہ کار قلم تھا ایک پختہ کار مصنف کا قلم بن کر میرے اس نصب العین کے حصول کا ذریعہ بن جائے۔ جامعہ ملیہ میں مجھے احساس ہوا کہ

اپنے خواب کو حقیقت کا جامہ پہنانے کا ذریعہ مجھے مل گیا تھا۔

مولانا محمد علی کی شخصیت کی مقناطیسیت نے جامعہ میں چند بہترین اور لائق ترین استادوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ ان میں عبدالمجید خواجہ تھے جو مولانا کی عدم موجودگی میں شیخ الجامعہ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، کیلاٹ صاحب، طاہر صاحب، اور آکسفورڈ یا کیمبرج کے سند یافتہ حبیب صاحب تھے۔ یہ اساتذہ جدید تعلیمی رجحانات کے حامل تھے۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی مخالفت میں قائم کیے گئے تعلیمی اداروں میں ایک غیر صحت مند اور رجعت پسندانہ ماحول ابھر رہا تھا جامعہ ملیہ کے اساتذہ میں جدید تعلیمی رجحانات اس بات کی ضمانت تھے کہ یہاں وہ ماحول نہیں ابھر سکے گا۔ جامعہ کے طالب علموں نے تحریک آزادی اور بعد کی قومی زندگی میں جو نمایاں رول ادا کیا اور زندگی کی جن اعلیٰ منزلوں پر پہنچے اس میں جہاں ان کی اپنی صلاحیتوں کو دخل تھا وہیں جامعہ کے ایک بامقصد طریقۂ تعلیم کا بھی اثر تھا۔

جامعہ میں طالب علمی کے دور میں بھی میں ایک فعال صحافی تھا اور لکھنؤ سے چھپنے والے ایک انگریزی روزنامہ میں سیاسی جدوجہد اور واقعات کی رپورٹیں بھیجا کرتا تھا۔ مولانا محمد علی کا انجمن اتحاد کے جلسے میں طلبا کے بھرے مجمع کے بیچ عظیم اعتدال پسند لیڈر سری نواس شاستری کے ساتھ کامیاب مباحثہ کا جس کا چشم دید گواہ تھا۔ دونوں انگریزی زبان و ادب کے ماہر تسلیم کیے جاتے تھے اور بے پناہ مقرر تھے۔ اسی طرح میں مدن موہن مالویہ جیسے پختہ کار لیڈر کا سوالات کی بوچھاڑ سے زچ ہونا دیکھ چکا تھا وہ علیگڑھ کے حلقہ سے کانگریس کی مخالفت میں کھڑے ہوئے لیڈر پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کی حمایت میں تقریر کر رہے تھے۔ میں نے اس واقعہ کی رپورٹ اخبار کو بھیجی تھی۔ مالویہ جی کی ہزیمت کی خبر جلی عنوان سے صفحہ اول پر چھپی تھی۔ محمد علی کی قیادت میں جامعہ کا علی گڑھ میں اتنا اثر تھا کہ کوئی بھی کانگریس مخالف پروپیگنڈہ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

مولانا محمد علی کے کام کرنے کے مخصوص طریقہ کار سے میری واقفیت جامعہ ملیہ کی طالب علمی کے زمانے میں ہوئی انھیں جوش و اضطرار کی حالت میں کام کرنے کی عادت تھی۔ تلون مزاجی میں چھپی ہوئی بے پناہ تخلیقی قوت مجھے رجھا لیتی ہے۔ مولانا کے کام کرنے کے طریقہ سے متاثر ہونا میرے لیے قدرتی بات تھی۔ ان کی تخلیقی قوت کے آخر وقت میں رونما ہونے کی ایک بہترین مثال ان کے اس خطبہ کی تیاری تھی جو انھوں نے ۱۹۲۳ء میں کوکناڈا میں ہونے والے کانگریس سیشن کے صدر منتخب ہونے کے بعد لکھا تھا۔

آج جب میں اس واقعہ پر غور کرتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ ابتدائی دنوں میں مولانا نے کس طرح اپنا وقت ضائع کیا اور جب وقت گذر گیا تو اسے مٹھیوں میں پکڑنے کی ریس شروع کی - وہ ہیجانی انداز سے کام کر رہے تھے اور ہم لوگ جو انہیں اضطراری کیفیت میں قلم گھسیٹتے دیکھ رہے تھے انگشت بدنداں تھے کہ باوجود اپنی تمام تر کاوشوں کے ایک مختصر وقت میں یہ کیونکر کام کو مکمل کر سکیں گے - لیکن اپنے بے پناہ حافظہ اور زور فصاحت کے سہارے وہ اپنا خطبہ انگریزی زبان میں وقت پر تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے - لیکن ابھی اس کا اردو اور ہندی ترجمہ ہمارے تین ساتھیوں یوسف حسین خاں صاحب، سعید انصاری صاحب اور سنسکرت زبان کے پروفیسر سوریہ کانت شاستری صاحب کو مکمل کرنا باقی تھا۔[1]

ضمناً یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ یہ تینوں ساتھی خوش قسمتی سے ہنوز حیات ہیں[2] تینوں تعلیم حاصل کرنے ملک سے باہر گئے، وہاں کی جامعات سے اعلیٰ تعلیمی اسناد حاصل کیں اور ملک میں واپس آکر تعلیمی میدان میں اہم مقام حاصل کیا۔ تینوں اپنی زندگی کے باقی دن ایک بامقصد انداز سے گذار رہے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی محض اپنے پچھلے کارناموں پر زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ مجھے بھی ایک امریکن یونیورسٹی سے داخلہ کی یقین دہانی موصول ہوئی تھی لیکن پیسے کی کمی کے باعث میں امریکہ نہیں جا سکا۔ جامعہ کی سند جسے برطانوی حکومت تسلیم نہیں کرتی تھی یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں وقار کی نظروں سے دیکھی جاتی تھی - ہاں بعد کی بلکہ یوں کہنا

---

[1] مولانا نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم کو اپنے خطبے کے اردو ترجمے کے لیے علی گڑھ طلب فرمایا تھا، وہ ۱۴ دسمبر (۱۹۲۳ء) کی رات میں علی گڑھ پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ "خطبۂ صدارت ابھی تک صرف نصف ہو پایا ہے۔" وہ لکھتے ہیں: "مولانا کو ۲۴ کو کوکناڈا پہنچنا لازمی اور اس کے لیے علی گڑھ سے ۲۰ کو شب میں براہ دہلی روانہ ہونا لازمی اور یہاں ۱۵ کی صبح تک تصحیح و نظر ثانی ہونا الگ رہا، مسودہ کی تکمیل تک ابھی ۵۰ فیصدی باقی، طباعت اور پھر ترجموں کے مرحلوں کا ذکر ہی نہیں۔" (محمد علی - ذاتی ڈائری کے چند ورق (حصہ اول) صفحہ ۱۴۳)

[2] ترجمے کے بارے میں مولانا دریا آبادی نے لکھا ہے کہ: "جامعہ ہی کے چند ہونہار اور سینیر طلبہ کے درمیان ایڈریس کے مختلف اجزا تقسیم کر دیے گئے، نظر ثانی اور اصلاح کا کام اس خاکسار اور میر محفوظ علی کے سر رہا، اصل ترجمہ ان ہی بیچاروں نے کیا، ہم لوگ نظر ثانی تک رہے اور وہ بھی جی کھول کر نہ کر سکے۔" (ایضاً صفحہ ۱۴۶)

[3] افسوس کہ اس اردو ترجمے کی اشاعت سے قبل ان تینوں میں سے ایک ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کا ۱۲ فروری ۱۹۷۹ء کو انتقال ہو گیا۔ (مدیر معاون)

چاہیے کہ بہت بعد کی زندگی میں اہم مقاصد کے تحت میں درجنوں بار بیرونی ملکوں میں گیا اور میرے یہ سفر میرے لیے بے حد معلوماتی تھے۔

مولانا کے خطبہ کا ہندی ترجمہ پنڈال میں اس وقت پہنچا جب کہ مولانا انگریزی خطبہ کا بیشتر حصہ پڑھ چکے تھے خطبہ کے کاغذات سیاہی کی وجہ سے گیلے تھے اور اچھی طرح سلے ہوئے نہیں تھے جس کی وجہ سے ان کا تقسیم کرنا مشکل ہوگیا۔ اس میں شک نہیں کہ خطبہ نے جس میں مولانا کا وسعت مطالعہ اور ان کی علمیت جھلک رہی تھی بڑے پیمانہ پر خراج تحسین وصول کیا۔ کانگریس کے خطبۂ صدارت کی تاریخ میں یہ طویل ترین خطبہ صدارت تھا۔ اس کے باوجود اس کا انداز اور اس میں موجود مواد ایسے پرکشش تھے کہ حاضرین نے شروع سے آخر تک توجہ سے سنا۔ آزادی کی جنگ کی شدت قدرے کم کر دینے کی رائے غالب ہوتی جارہی تھی اس لیے کوکناڈا سے واپس آکر مولانا نے اپنے مشہور انگریزی ہفتہ وار اخبار کامریڈ کو دوبارہ جاری کرنے کی ضرورت پر شدت کے ساتھ سوچنا شروع کر دیا تھا۔ جیسے ہی مجھے یہ خبر ملی میرے اندر اس اخبار کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں کام کرنے اور مولانا کی نگرانی میں صحافت کی عملی تربیت حاصل کرنے کی خواہش جاگ اٹھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ کاتب تقدیر نے ازراہ شفقت یہ لکھ دیا تھا کہ میری یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔

جامعہ سے بی۔ اے کرنے کے بعد میں اخبار میں سب ایڈیٹر کی آسامی کی تلاش میں تھا اور انگریزی روزناموں کے مدیروں کو درخواستیں بھیج چکا تھا۔ ان میں ہندوستان ٹائمس کے ایڈیٹر سردار کے۔ ایم پانیکر بھی تھے۔ جامعہ کے ایک ہونہار طالب علم کی حیثیت سے میں نے مولانا کے دل میں بھی گھر کر لیا تھا۔ اس لیے میں نے ان سے بھی گذارش کی۔ لیکن مولانا اور سردار پانیکر دونوں کے اثباتی جواب نے مجھے ایک عجیب الجھن میں گرفتار کر دیا۔ پانیکر صاحب نے سب ایڈیٹری کی پیشکش ۱۲۵ ماہانہ پر کی تھی۔ جبکہ مولانا پچاس روپیہ ماہانہ کا وظیفہ دے رہے تھے اس زمانے میں جہاں وہ تنخواہ کافی تھی، وظیفہ کی رقم بھی خاطر خواہ تھی لیکن دونوں کے درمیان فرق غیر معمولی تھا۔ اس کے باوجود مجھے اپنا انتخاب کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی میں نے وظیفہ کی تھوڑی رقم کو بڑی تنخواہ پر ترجیح دی کیونکہ وظیفہ کے ساتھ ساتھ مجھے مولانا محمد علی جیسی باوقار سیاسی شخصیت کی رہنمائی اور سرپرستی حاصل ہو رہی تھی

کامریڈ کے ساتھ ساتھ دہلی سے ۱۹۲۴ء میں مولانا نے اپنے دوسرے اتنے ہی مقبول اخبار، اردو

روزنامہ ہمدرد بھی جاری کیا۔ "کامریڈ" اس سے پہلے کلکتے سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ ان دنوں جسے دہلی شہر کہتے تھے تو اس سے مراد فصیل کے اندر کا شہر تھا۔ نئی دہلی ابھی مستقبل کی کوکھ میں تھا۔ دریا گنج کے علاقہ میں کوچہ چیلان کی ایک بڑی کوٹھی میں مولانا نے اخبار کا دفتر اور پریس قائم کیا۔ کوٹھی میں ایک وسیع صحن بھی تھا۔ مولانا مع اپنے خاندان کے اسی کوٹھی میں فروکش ہو گئے۔

۱۹۲۴ء کی دہلی میں فاصلے بہت کم تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ لوگ پیدل جا سکتے تھے۔ جو لوگ پیدل نہیں چل سکتے تھے اُن کی خاص سواری تانگہ تھی۔ تانگے کی بہت سی قسمیں ہوتی تھیں۔ اگر بڑے بھائی شوکت علی کو کہیں جانا ہوتا تھا تو ملازم کو ایسا تانگہ تلاش کرنے کی ہدایت کی جاتی تھی جس کی پچھلی سیٹ کھلی ہوئی اور کشادہ اور جس کی کمانیاں مضبوط ہوں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جلد پہنچنے کا واحد ذریعہ ٹرام تھی۔

مولانا کو کسی کام کو نظم کے ساتھ کرنے کی عادت نہ تھی جس کی وجہ سے مجھے اکثر "کامریڈ" کے دفتر سے گھر دعہد آنا جانا پڑتا تھا۔ میں ہر بار یہ فاصلہ پیدل ہی طے کرتا تھا۔ دوپہر کا کھانا میں راستے کے ایک ڈھابے میں کھاتا تھا اور رات کا کھانا، جو دودھ ڈبل روٹی پر مشتمل ہوتا تھا میں ایک حلوائی کی دوکان سے لیتا تھا۔ چونکہ اخبار کی ضرورت کی وجہ سے اکثر رات میں جاگنا پڑتا تھا اس لیے میرے لیے یہ غذا بہت مناسب تھی۔ مولانا کے مسحور کن برتاؤ اور حصول مقصد کے جذبہ کی سرشاری کی بدولت مجھے یہ تنگدستی اور سختی جو میں نے اپنے اوپر عائد کر لی تھی، گوارا تھی۔

کامریڈ کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شرکت کی غرض سے دہلی پہنچنے پر چند روز کے لیے میں اپنے ایک جامعی دوست ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا کے پاس ٹھہرا۔ ڈاکٹر ٹوپا عثمانیہ یونیورسٹی کے رجسٹرار کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر حال ہی میں مرحوم ہوئے ہیں۔ میرا قیام سیتارام بازار میں ایک دوکان کے اوپری حصہ پر تھا۔ میرے مکان کے ٹھیک سامنے سڑک کی دوسری جانب میرے جامعہ کے دوسرے کشمیری دوست کیلاش ناتھ کول کا مکان تھا۔ کیلاش ناتھ کول پنڈت نہرو کے رشتے کے بھائی تھے جنھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور یکے بعد دیگرے ممتاز خدمات انجام دینے کے بعد اب کانپور کی زرعی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ کول صاحب کی والدہ مجھ سے بڑی محبت کرتی تھیں انھوں نے اپنی محبت کی نشانی کے طور پر مجھے اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی دلائی کی شکل میں ایک بیش قیمت تحفہ دیا تھا۔ برسوں بعد جب

میری پنجابی بیوی شریمتی گیان دیوی ستیہ گرہ میں حصہ لینے پر گرفتار ہو کر لاہور کے اسی جیل میں رکھی گئیں جہاں پنڈت نہرو کی ساس تھیں اس عظیم المرتبت خاتون نے میری اہلیہ سے میری خیریت معلوم کی۔ میری بیوی نے انھیں بتایا کہ میں نے ان کی دی ہوئی دلائی کو بڑے شوق اور بڑے جتن سے سنبھال کر رکھا ہے۔

شروع کے دنوں کی پریشانیوں کے بعد کامریڈ اور ہمدرد پوری آب و تاب کے ساتھ نکلنے لگے۔

کانگریس پارٹی اس وقت چینجرز و نوچینجرز دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ چینجرز کے قائد کانگریس کے بڑے لیڈر موتی لال نہرو تھے اس جماعت میں پارٹی کے اور بھی چوٹی کے لیڈر شامل تھے۔ وہ برطانوی سامراج کے خلاف لڑی جانے والی جنگ عوامی محاذ کے ساتھ ساتھ پارلیمانی محاذ پر بھی لڑنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے کانگریس کے اندر ایک جماعت سوراج پارٹی کے نام سے قائم کی تھی۔ نوچینجرز کو مہاتما گاندھی کی رہبری کا وقار حاصل تھا اور وہ ایک دوسرے محاذ کو کھولنا بے سود سمجھتے تھے۔ انھوں نے ستیہ گرہ پر آس لگا رکھی تھی۔

مولانا محمد علی "نوچینج" کی پالیسی کے بڑی فصاحت کے ساتھ وضاحت کرنے والوں میں تھے اور نوچینجرز کے پرجوش قائد تھے۔ مولانا کے اخبار نے نوچینجرز کے ترجمان کی حیثیت سے ان کی بڑی خدمات انجام دیں۔ قلم چرکے بھی لگا سکتا ہے اور زخم بھی بھر سکتا ہے۔ اپنے حریفوں کو چرکہ لگانے کے واسطے اپنے قلم کو بیرحمی سے استعمال کرنے میں مولانا نے ذرا بھی تامل نہیں کیا۔ اسی طرح اپنے حلیفوں کے زخموں پر پھایا رکھنے سے بھی انھوں نے دریغ نہیں کیا۔ قلم کو کب زہر میں ڈبولیں، کب امرت میں، یہ فن انھیں آتا تھا۔ وہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں پیکر تراشی اور فقرہ بازی کے ماہر تھے اور انھیں ہر طرح توڑ مروڑ لیتے تھے۔ میں انھیں کامریڈ کو ادبی مینا کاری سے سجاتے دیکھ چکا تھا۔ یہ ایسے شہ پارے ہوتے تھے جن میں فارسی کے اشعار انگریزی کے قالب میں نگینہ کی طرح جڑے ہوتے تھے۔ اور ایسے خاردار جملے بھی ساخت کرتے دیکھ چکا تھا جن کی چوٹ وہ اپنے حریف پر انتہائی بے رحمی سے مارتے تھے۔

ہندوستان ٹائمز کے اسسٹنٹ ایڈیٹر جی، سی، راگھون نے ایک بار ان پر تنقید میں بے احتیاطی کرکے انھیں سخت برافروختہ کر دیا۔ جواب میں مولانا نے کامریڈ میں ایک شعلہ بار سخت نوٹ لکھا اور اس میں درجنوں بار راگھون کو سفلہ پرور اور دروغ گو کہہ ڈالا۔ مولانا کے شرر بار غیض و غضب نے راگھون کے پندار کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اسی طرح ایک دوسرے موقع پر چند انگریز صحافی مولانا سے ملاقات کرنے آئے اور ان کی

ضیافت سے لطف اندوز ہوئے۔ واپس جاکر ایک رپورٹ میں انھوں دونوں بھائیوں کا ذکر "خوبصورت شیطان" کے نام سے کیا۔ ان کی اس رپورٹ کے پیچھے ان کی بدطینتی اور ناشکری صاف جھلک رہی تھی۔ نتیجہ میں وہ مولانا کی غضب سے بھری ہوئی جوابی تنقید کا ہدف بنے۔ مولانا ان پر جھپٹے اور اپنے پراثر قلم کو خونخوار پنجہ کی طرح استعمال کرکے دونوں کی تکا بوٹی کردی۔ خفیف معاندانہ تنقید کو تو وہ کبھی کبھی برداشت کرلیتے تھے لیکن کسی ایسی تنقید کو جو ان پر بدنیتی سے کی گئی ہو وہ نہیں برداشت کرتے تھے۔

مولانا کی نجی اور عوامی دونوں زندگیاں ان کی ذہانت کی روشنی، ان کی جذباتیت اور نغمہ سنجی سے معمور تھیں۔ لیکن ان کی یہ صفات کبھی ان کے لیے سدِّراہ نہیں ثابت ہوئیں۔ ان کی بوالعجبی جہاں کچھ لوگوں کو ان سے برگشتہ کردیتی ہے وہاں ان کے لیے اوروں کے دل میں محبت پیدا کردیتی تھی، لیکن سیاسی و سماجی سطح پر ان کی بداحتیاطی اور تلوّن مزاجی نے آخری دنوں میں ان کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں بڑی غلط فہمی پیدا کردی۔ اعلیٰ مقاصد کے لیے ان کی بے داغ ایمانداری اور وطن کے لیے ناقابل تردید دیانت داری کے باوجود ان کا اثر کم ہوتا گیا اور وہ تنہا رہ گئے۔ لیکن یہ گفتگو بعد میں آئے گی۔

کامریڈ اور ہمدرد کے دفتر میں ان کے کام کرنے کے انداز، پابندی اوقات کی جانب ان کی بے پروائی اور بے ضابطگی نے آہستہ آہستہ ادارہ کو کمزور کردیا۔ اسی طرح گھر کے اندر ان کے لاابالی پن اور اصول حفظانِ صحت اور کھانے پینے میں احتیاط کے لیے ایک حقارت آمیز لاپرواہی نے دھیرے دھیرے ان کی صحت کو خراب کردیا۔ ان میں غالباً انسانی صفات کا عنصر ضرورت سے زیادہ تھا اس لیے وہ سلیقہ سے چلنے والی مشین کی طرح کام نہیں کرسکتے تھے۔ ان کے مزاج میں بچوں سے مشابہ اضطراری کیفیت تھی۔ گاندھی جی جب بھی ان کے گھر آتے تو فوراً جذبات میں تمام چیزوں کو پس پشت ڈال کر گاندھی جی کو خوش آمدید کہنے کے لیے ان کا دوڑ پڑنا قدرتی بات تھی۔ ایک بار گاندھی جی کا غالباً ڈاکٹر انصاری کے گھر سے پیدل چل کر آنا مجھے یاد ہے۔ اگر ان کے لکھنے کے کمرے میں کبوتر گھس آتے تو سامنے پڑے اخبار کے کام کے ڈھیر کو چھوڑ دیتے اور فاؤنٹن پین کی نب کبوتر کی جانب اس طرح کرلیتے گویا بندوق ہو جس سے گولی ماردیں گے اور ان کے پیچھے دوڑتے اور چلاتے "نکل جاؤ ورنہ گولی ماردوں گا"۔ اسی طرح ایک بار ہجوم کا رسے ایڈیٹر کی کرسی چھوڑ کر کھڑے ہوگئے اور بانس کے زینے پر چڑھے رنگ کرنے والوں کے ہاتھ سے برش چھین کر انہیں رنگ کرنے کا طریقہ بتانے لگے۔ نتیجہ میں دیوار پر ایک بڑا سا دھبہ پڑگیا۔ یہ تمام حرکتیں ان کی بچوں کی سی

سیمابی کیفیت کا نتیجہ تھیں اور ان کی بھاری ذمہ داریوں کی ادئیگی میں آڑے آتی تھیں۔ لیکن مزاج کی اسی خصوصیت نے انھیں ہم لوگوں کی نظروں میں عزیز کر دیا تھا۔

ان کی عرب کی عبا کے پیچھے جسے وہ پہنے رہتے تھے ایک سادہ دل انسان تھا، جس میں زندگی سے لطف اندوز ہونے کی علامت تھی اور جو اپنے کو ناتواں اور فانی انسانوں میں شمار کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ میں نے ان کے اس پہلو کا مظاہرہ کئی بار دیکھا لیکن یہاں قارئین کے سامنے وہ مثال پیش کروں گا جو میرے جامعہ کے پرانے دوست یوسف حسین خاں نے دی ہے کیونکہ وہ ان کی شخصیت کے اس دلنشین پہلو کو نہایت واضح انداز میں پیش کرتی ہے۔

مولانا محمد علی، یوسف حسین اور میرے ایک اور جامعی دوست اشرف کے ساتھ لندن میں ایک فلم دیکھنے گئے۔ فلم کی کہانی میں ایک عرب کردار کو ابھارا گیا تھا۔ مولانا اپنے پرانے انداز میں جبہ و عبا سے آراستہ تھے۔ فلم میں وقفہ کے دوران جب وہ ہلکے ناشتہ کے لیے باہر نکلے تو چند شوخ نوخیز دوشیزاؤں نے مولانا کو کسی عرب ملک کا شیخ سمجھ کر ان کا محاصرہ کر لیا اور ان پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ مولانا ان سے زندہ دلی کے ساتھ گفتگو میں مگن ہو گئے۔ وہ ان سے نہایت بے تکلفی کے ساتھ لندن کی مقامی زبان میں بات کر رہے تھے۔ مولانا نے یہ زبان اپنے آکسفورڈ کے قیام کے دوران شاہی انگریزی کے ساتھ سیکھی ہو گی۔ اس موقع پر مولانا نے اپنے لباس کی سنجیدگی کو پس پشت ڈال کر ان چہکتی ہوئی لڑکیوں سے ایک انسان کی طرح بے تکلفی سے گفتگو کی۔ یہ قصہ ان کے کامریڈ کے بعد کے دور کا ہے جب وہ لندن آرام اور علاج کی خاطر گئے تھے۔ ان کی عظیم شخصیت انھیں ایک مکمل انسان بنے رہنے کی راہ میں کبھی مانع نہیں ہوئی۔

ان کی شخصیت کا اتنا ہی دلچسپ پہلو ایک اور ہے۔ ایک بگڑے ہوئے بچے کی طرح وہ اپنے کھانے پر کسی قسم کی پابندی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ذیابیطس کے مریض تھے اور ان کے خون میں شکر کی مقدار خطرے کے نشان تک پہنچ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے انھیں میٹھی چیزیں کھانے سے سختی کے ساتھ منع کر رکھا تھا۔ لیکن اشرف کو جو لندن میں ان کے میزبان تھے ان کے بستر کے نیچے چاکلیٹ کے ٹکڑے ملے جو مولانا چپکے چپکے کھاتے تھے غالباً مولانا کا خیال تھا کہ کسی خواہش کو زیر کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے پورا کر دیا جائے۔

مولانا محمد علی بہت خوش خوراک تھے اور لذیذ کھانے ان کی بڑی کمزوری، چنانچہ ڈاکٹروں کو کبھی یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ ان کی بتائی ہوئی خوراک کی ہدایات پر عمل ہو گا۔ بیماری کا شدید حملہ بھی ان کو

[illegible] تھے لیکن ان کے ... پر کسی پابندی کی تلاش
[illegible] بھی نفرت تھی۔
[illegible] کے ساتھ ساتھ کام کرنے کے طریقے میں بھی بہت بڑا احتیاط
[illegible] ایک منتظم انسان تھے اور بغیر بیچ میں آرام کیے ہوئے کام کرتے تھے۔ بذات خود
[illegible] تھی جتنی پریشانی ... کام کرنے کا انداز تھا ادارہ کے لیے کسی نقصان دہ ثابت
[illegible] میں انھوں نے کام کو نہایت نظم و ضبط کے ساتھ کیا چنانچہ ایک مختصر وقفہ میں کامریڈ
[illegible] ہوگیا۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد مدیر کی ذمہ داریوں کو وہ اپنی متلون مزاجی کے ساتھ ادا
کرنے لگے۔ ان کے مزاج کا اثر سب سے زیادہ ان کے انگریزی ہفتہ وار پر پڑا جسے وہ تن تنہا چلا رہے تھے۔
ہمدرد روزنامہ ہمدرد کے لیے بھی وہ کبھی کبھار ایڈیٹوریل لکھ لیا کرتے تھے۔ لیکن وہ ان کی مستقل اور
یکسو توجہ کا محتاج نہیں تھا کیونکہ اس کا مدیر ایک لائق شخص تھا اور اس کا ادارتی عملہ بھی لائق اشخاص پر
مشتمل تھا۔ اس میں ہمارے دوست جعفری صاحب بھی شریک تھے جو جامعہ کے ہونہار گریجویٹ تھے۔
مولانا کے دفتر میں ایک کلیدی عہدہ پر ایک دوسرے جامعی مامور تھے۔ یہ پارسی تھے اور ان کا نام
ماسٹر تھا۔ وہ کامریڈ پریس کے منیجر کے عہدہ پر فائز تھے۔ یہ صاحب مولانا کی خوش ذوقی سے پوری طرح
واقف تھے اور اپنی نگرانی میں عمدہ کاغذ اور چھپائی کا بندوبست کر دیتے تھے۔ لیکن مولانا کی لاابالی کا
جو دباؤ پریس پر پڑ رہا تھا اس کی وجہ سے پریس کو قابو میں رکھنا مشکل اور اخراجات کو پہلے سے متعین کردہ
حدود میں رکھنا ناممکن تھا۔ دن میں مولانا اکثر غیر ادارتی ذمہ داریوں میں الجھے رہتے تھے۔ کانفرنس میں شریک
ہوتے، جلسوں میں تقریریں کرتے اور ملک کے مختلف مقامات کے دورے کرتے تھے۔ یہاں مجھے ان کا
لیجسلیٹو اسمبلی جانے کا مشہور واقعہ یاد آتا ہے۔ وہ نو چینجرز کے بہترین حامیوں میں شمار ہوتے تھے۔
چنانچہ اسمبلی کے اسپیکر وٹھل بھائی پٹیل نے جو اس دور کے کانگریس کے چینجرز گروہ میں ممتاز شخص تصور
کیے جاتے تھے، اسمبلی کی کارروائی شروع ہونے سے ذرا پہلے جب مولانا کو اوپر ممتاز سامعین کی گیلری میں
رونق افروز دیکھا تو انھیں مولانا کو چھیڑنے کا خیال آیا۔ وہ تیز آواز میں تاکہ صاف سنائی دے بولے۔ "آپ
جبکہ آپ یہاں تک آگئے ہیں کیوں نہ اتر کر ہمارے ساتھ شریک ہو جائیے"۔ مولانا نے برجستہ جواب دیا
"نہیں بلندی سے تمہاری پستی کا مشاہدہ کر رہا ہوں" اور فوراً پہلی منزل سے ان کی طنزیہ مسکراہٹ چمک اٹھی۔

[illegible] مضامین بھی لکھ چکے تھے۔ [illegible] گزرا مگر یہ بہت مفید تھا زندگی کے مختلف [illegible] پایا جاتا لیکن سوائے [illegible] پڑھنے والوں کا مذاق دو تھا اور پھر جب [illegible] ہو۔ ان کا سبب [illegible] یہ تھا کہ مولانا کی صحت اور کامریڈ کا مستقبل دونوں خطرات کا اور بے ضابطگی کی وجہ سے خطرے میں پڑتے جا رہے تھے۔ باوجود کامریڈ کا حلقہ وسیع تھا اور سیاسی رجحانات رکھنے والوں میں مولانا کے مداحین کی تعداد بہت وسیع تھی۔ جذباتی مسلمانوں کے باوجود علمی حلقوں میں لوگ ان کے معترف تھے اور ادب کے رسیا انھیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن یہ سب باتیں کامریڈ کی زندگی کا ذمہ کیوں کر لے سکتی تھیں جب کہ اس کی اشاعت میں پابندی کا فقدان تھا کوئی عمل جو پابندی سے حرکت نہ کرتا ہو کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔

آخر کار اشاعت کی یہ بے ضابطگی اب اتنی باضابطہ ہو گئی کہ ہفتہ وار کامریڈ پندرہ روزہ ہوا پھر ماہانہ اور آخر میں غالباً سہ ماہی۔ مولانا نے ان افسوس ناک حالات کے لیے قارئین سے معذرت کرتے ہوئے لکھا کہ وہ پابندی اوقات پر قادر نہیں ہیں کیونکہ "انھیں صرف تاریخ نگاری ہی نہیں تاریخ سازی بھی کرنی ہے۔" دراصل ان کے لکھنے کا یہ بے مثال انداز تھا۔ بعد میں جب حالات اور زیادہ خراب ہوئے تو انھوں نے اخبار میں ایک طویل مضمون لکھا جس میں اپنی خرابی صحت کو اشاعت میں بے قاعدگی کا اصل ذمہ دار ٹھہرایا اور قارئین کو یقین دہانی کے لیے انھوں نے اپنے خون اور پیشاب کی ڈاکٹری رپورٹ کے تفصیلی نتائج بھی چھاپ دئے۔

کام کرنے کے طریقہ کی بے قاعدگی اور بے ضابطگی سے جب مجھ سے مضبوط کاٹھی کے آدمی کی جو ابھی اپنی جوانی کے ابتدائی دور میں تھا صحت متاثر ہو رہی تھی تو مولانا کی صحت کا بتدریج گرتے جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ لیکن مولانا نے میرے چہرے پر بیماری اور تھکاوٹ کے آثار جلدی ہی دیکھ لئے۔ وہ ایک اتنی عظیم شخصیت تھے کہ انھوں نے فوراً مجھے انگریزی طریقہ علاج کے مشہور معالج ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور پھر طب یونانی کے عظیم طبیب حکیم اجمل خاں کے پاس اعلیٰ طبی معائنہ اور علاج کے لیے بھیجا۔ مجھے ان لوگوں کے علاج سے خاطر خواہ فائدہ ہوا لیکن مولانا مطمئن نہیں تھے انھوں نے مجھے کسی پہاڑی مقام

پر جاکر آرام کرنے اور صحت بہتر بنانے کا مشورہ دیا۔ ان کی اس ہمت اور عالی ظرفی سے میں بہت متاثر ہوا۔ [illegible] کے قیام ہی میں مجھے ان کا ایک خط ملا جس میں مجھے اپنی صحت کی دیکھ بھال کرنے کی تاکید تھی۔ ایک ایسے شخص کی طرف سے جو اپنی صحت کی جانب سے بے پروا ہو یہ بہت بڑی بات تھی۔ خط میں [illegible] چھوڑ کر چلے جانے کی اجازت تھی۔ مولانا نے لکھا تھا کہ "خس کم جہاں پاک" لیکن میرے لیے یہ بات کامریڈ کے وسائل کے مسلسل گھٹتے رہنے کی وجہ سے پیدا شدہ مخدوش حالات کی جانب اشارہ تھی۔ شروع میں مولانا نے اپنے ساتھ جامعہ سے اپسن (Upson) کو بھی لانا چاہا تھا تاکہ وہ کامریڈ میں مولانا کی نیابت کر سکیں۔ اپسن جو ادھیڑ عمر کے تھے بڑے لائق صحافی تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ آجاتے تو مولانا کے ایڈیٹوریل بوجھ کو بڑی حد تک ہلکا کر دیتے اور کامریڈ کی اشاعت میں پابندی بھی پیدا کر دیتے۔ لیکن میں اب جب ان واقعات پر غور کر رہا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اپسن نہیں آئے تو اچھا ہی ہوا۔ وہ مولانا کے لیے بہت مہنگے ثابت ہوتے اور مولانا یہ سوچ کر اپنی زندگی اجیرن کر لیتے کہ ان سے نجات کیونکر ہو۔

کسی کو نوکری سے نکال دینا مولانا کے لیے بڑا مشکل کام تھا۔ اپنی صحت کی بازیابی کے بعد واپس آنے پر میں نے دیکھا کہ حالات بد سے بدتر ہو چکے تھے۔ انتظامی ڈھانچے میں پڑی دراڑ اور وسیع ہو چکی تھی۔ مولانا جیسی شخصیت کا ستون بھی ہل چکا تھا۔ مولانا پر جو عوامل مضرت رساں اثر ڈال رہے تھے ان میں اندرونی حالات کے دباؤ کے ساتھ ملک میں سیاسی اور سماجی اتھل پتھل کا دباؤ بھی شامل تھا۔ میں مولانا کا بے حد معتقد تھا اور میری ان کے تئیں وفاداری اتنی مستحکم تھی کہ میں کامریڈ کے ساتھ مضبوطی سے چپکا رہا۔ مولانا مستقل طور پر بضد تھے کہ مستقبل کو میں جس طرح سنوارنا چاہتا تھا اس کی راہ میں کامریڈ روکاوٹ نہیں بننا چاہتا اور جیسے ہی مجھے کہیں اور بہتر مواقع حاصل ہوں مجھے ضرور چلا جانا چاہیے آخرکار ۱۹۲۵ء میں میں لاہور میں دیوان چمن لال کے ہفتہ وار اخبار "نیشن" کی ادارت سنبھالنے کے لیے میں نے بے دلی کے ساتھ کامریڈ کو خیرباد کہا۔ میرے لیے یہ خلش زہرناک تھی لیکن مولانا کی دعائیں شریک حال تھیں۔

اب جب کہ میں مولانا کے اس قلمی خاکہ کو آخری شکل دے رہا ہوں مجھے اس کے اطمینان بخش ہونے پر شبہ ہے۔ مولانا کی شخصیت اتنی گوناگوں اور تابناک تھی کہ اس کے مختلف پہلو کا سچا اور صحیح خاکہ بنانا صرف ایک بڑے فن کار کے بس کی بات ہے۔ کامریڈ سے میرے علحدہ ہونے سے پہلے ہی سے ہندوستان کے سیاسی افق پر بڑی افراتفری بھی ہوئی تھی، جیسے جیسے وقت گذرتا گیا یہ افراتفری اور پیچیدہ ہوتی گئی۔

[illegible] تھی۔ اسکے
[illegible] یہ لوگ سوراجیہ پارٹی کی
[illegible] شروع
[illegible] باقاعدہ ممبر تھے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے خلافت کو ختم کرکے خلافت تحریک کے
بادبان [illegible] نکال دی تھی۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے [illegible] اسلام [illegible] کی حیثیت سے
منظر عام پر آئے تھے۔ مسلمانوں کے لیے ان کے الفاظ قانون کی حیثیت رکھتے تھے اور کوئی مسلمان ان کی
مخالفت میں آواز نہیں اٹھا سکتا تھا۔

خلافت تحریک کے مردہ ہو جانے سے ہندو مسلم اتحاد کا سب سے مضبوط عنصر ختم ہو گیا۔ عام مسلمانوں کا کانگریس کی حمایت میں جوش و خروش اپنے عروج پر پہنچ کر نفی میں بدل گیا۔ نیشنلسٹ مسلمانوں میں اختلافات رونما ہو گئے۔ جس کی ایک علامت احرار تحریک تھی۔ لیکن ان سب سے زیادہ قابل ملامت یہ بات ہوئی کہ رجعت پسندی جو سرد پڑ چکی تھی بہت جلد دوبارہ نقطۂ عروج پر پہنچ گئی، فرقہ پرستی اور علیحدگی پسندی کی لہر خطرناک انداز میں ابھری اور تفرقہ بندی کے رجحانات قومی تحریک کی تمام بنیادی کامیابیوں کے لیے تباہ کن خطرہ بن گئے۔ شدھی اور تبلیغ کی مضرت رساں تحریکوں کے باعث جو جنونی انداز میں پھیل رہی تھیں ہندو و مسلمان دونوں کے لیے وہ پیالہ جس میں انھوں نے اتحاد کے سنہرے دور میں مل کر پانی پیا تھا زہر ہلاہل سے بھرا ہوا پیالہ بن گیا۔ وہی سوامی شردھانند جنھوں نے ایک زمانے میں علما کی دعوت پر جامع مسجد کے منبر سے مسلمانوں کے ایک بڑے جلسے کو خطاب کیا تھا ایک جنونی کے ہاتھوں اپنے گھر پر قتل کر دیے گئے۔ حالات کی کیا ستم ظریفی تھی کہ مولانا محمد علی قاتل کی مدافعت میں شریک ہوئے۔ نتیجہ میں نیشنلسٹ ہندو حلقوں میں بھی ان کے خلاف غصہ کے جذبات پیدا ہوئے۔ یہ بات میرے لیے باعث رنج ہے کہ حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ زندگی میں پہلی بار مجھے کسی ارتکاب جرم کے بغیر مولانا کے غصہ کا ہدف بننا پڑا۔

یہ بات اوپر آ چکی ہے کہ رانا جنگ بہادر صاحب نے کامریڈ سے الگ ہو کر لاہور کے ہفتہ وار نیشن کی ایڈیٹری سنبھال لی تھی۔ یہ دیوان چمن لال کا اخبار تھا۔ اس میں ایک مضمون شائع ہوا، جس کا عنوان تھا ("The Maulana Shows His Teeth".) مولانا محمد علی نے

[illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] کی [illegible] احترام [illegible] [illegible]
[illegible] کیا کہ راناصاحب ایڈیٹر کی حیثیت سے [illegible]
[illegible] راناصاحب نے مضمون نگار کا نام نہیں چھاپا اور اپنے جواب
میں اسے تسلیم کرتے ہوئے کہ "غضون" میں جو کچھ چھپا ہے اس کے وہی ذمہ دار ہیں
انھوں نے تمام آداب و احترام کو ملحوظ رکھا۔ انھوں نے افسوس کیا ہے کہ اس خط
کی نقل ان کے پاس نہیں ہے۔)

مضمون دیوان چمن لال کا لکھا ہوا تھا جو موتی لال نہرو کے بڑے زبردست حامی
تھے۔ اب جب کہ مولانا اور دیوان صاحب اس دنیا میں نہیں رہے، راناصاحب نے
اس راز کو افشا کرنا نامناسب نہیں سمجھا ہے۔ انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ
اگر وہ اس وقت ذرا سے پختہ کار اور ہوشیار ہوتے تو مضمون کا عنوان بدل دیتے اور
اس طرح وہ ڈنک باقی نہ رہتا جس سے مولانا کو تکلیف پہنچی۔ ان کا خیال ہے کہ
دیوان چمن لال بھی تبدیلی عنوان کے لیے تیار ہو جاتے۔

راناصاحب نے اپنی صفائی میں جو کچھ جواب تحریر کیا تھا اس سے مولانا محمد علی کے مجروح دل
کو تسکین نہ ملی۔ اس کے جواب میں مولانا نے انھیں اپنے بستر علالت سے، غصہ سے بھرا
ایک طویل خط لکھا۔ راناصاحب نے پھر اس کا جواب بھیجا۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ مولانا
نے راناصاحب کے دلائل کو کتنا درخور اعتنا سمجھا، مولانا کے لیے ان کے دل میں محبت
اور احترام کا جو جذبہ تھا (بقول ان کے)، اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ راناصاحب نے لکھا
ہے کہ قسمت نے اس قدآور شخصیت کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ طوفان خیز سیاست کے
ہچکولوں میں ان کی کشتی لنگرگاہ سے دور جا پڑی۔ لیکن یہ مولانا کی بڑائی تھی کہ اگرچہ وہ
کانگریس کی طرف سے بدظن ہو گئے تھے، گاندھی جی سے ان کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں
پڑا اور مسلم لیگ کے قریب بھی وہ نہیں پھٹکے۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں حب الوطنی کے
جذبے سے معمور ان کی تقریر درحقیقت عالم نزع کا نغمہ تھا۔ اپنے وطن سے دور [illegible]

[illegible] عبدالغفار [illegible] نے اپنے آپ کو اس وقتی انجمن سے بچانے
کی کوشش [illegible] اور اخیر کی الجھنوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔ ظاہر ہے کہ رانا
صاحب کی یہ خواہش اس وجہ سے تھی کہ انھیں مولانا سے حقیقی محبت اور بے پناہ عقیدت تھی۔
رانا صاحب نے راقم الحروف سے بھی گفتگوؤں میں بارہا مولانا سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار
کیا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب وہ مولانا کا ذکر کرتے ہیں تو دورانِ گفتگو ان کی آنکھیں اکثر
نم ہو جاتی ہیں۔ ایک انسان کا ایک انسان سے، ایک شاگرد کا اپنے استاد سے، مذہب و
ملت کے کسی امتیاز کے بغیر محبت کا یہ رشتہ وہ رشتہ ہے جو اس دور میں بہت ہی کمیاب ہے]

(مرتب)

ہندوستان جدید میں جو انگریزی تعلیم اور مغربی خیالات کا مولد ہے، مولانا محمد علی مرحوم
"عجیب و غریب" شخص ہوئے ہیں۔ وہ مختلف، متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔
اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان
دونوں میں عظمت و شان ہے، لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی موجود ہے۔
وہ انگریزی کا بہت بڑا ادیب، زبردست انشا پرداز اور اعلیٰ درجے کا مقرر تھا لیکن جب
لکھنے اور بولنے پر آجاتا تو اعتدال اور تناسب دونوں نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے اور انمول
جواہر پاروں کے ساتھ کنکر اور روڑے بھی بے تکلف چلے آتے تھے۔ وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و
استبداد کا پکا دشمن تھا لیکن اگر کبھی اس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔
وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا لیکن بعض اوقات
ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی......"

مولوی عبدالحق (چند ہم عصر صفحہ ۱۵۲)

مولانا محمد علی کی سیاسی زندگی

تاریخ میں ایسی شخصیتیں بہت کم گذری ہیں، جن کی ذات گوناگوں کمالات اور متعدد صفات کا مجموعہ رہی ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کا شمار ایسے ہی عظیم لوگوں میں ہوتا ہے۔ موصوف ایک اچھے سیاست داں، ماہر نقاد، بہترین صحافی، اعلیٰ درجے کے انشا پرداز، کامیاب شاعر اور سحر بیان مقرر تھے۔ رشید احمد صدیقی کے بیان کے مطابق (جب وہ) "بولتے تو معلوم ہوتا ہو انہوں کی آواز احرام مصری سے ٹکرا رہی ہے۔ لکھتے تو معلوم ہوتا کروپ کے کارخانے میں توپیں ڈھل رہی ہیں یا پھر شاہ جہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔" ان کی موت پر ایچ۔ جی۔ ویلز نے اپنے تاثرات کا جن الفاظ میں اظہار کیا ہے اس سے ان کی شخصیت کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا۔ اس کی زبان برک کی زبان تھی اور اس کا قلم میکالے کا قلم تھا"

ان کے اوصاف و کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے جب مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار عاجز آگئے تو بے ساختہ یہ کہہ کر اپنا قلم روک لیا کہ:

- میں اس کے حق میں اس کے سوا اور کیا کہوں　　ہندوستان میں آپ وہ اپنی مثال تھا

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا محمد علی جوہر نہایت دلیر، بے باک اور جری انسان تھے، وہ حق بات کا بلا خوف و خطر اعلان کرتے تھے، انھیں ملت اسلامیہ سے بے حد عشق تھا، وہ اسلام کے سچے عاشق اور جاں باز سپاہی تھے۔ انھوں نے اس کی خدمت کے لیے اپنی تمام زندگی وقف کر دی تھی، وہ مسلمانوں کو مصیبت زدہ پا کر بے قرار ہو جاتے تھے اور ظلم کے ہر وار کے بالمقابل اپنے سینے کو سپر کے طور پر

پیش کر دیے تھے۔ وہ خود تحفظ آزادی کی لڑائی لڑتے لڑتے میدان جنگ ہی میں اپنی جان دے دی اور پوری زندگی ایک بہادر سپاہی کی طرح انگریزوں سے مقابلہ کرتے رہے۔ آزادی کی جنگ لڑتے ہوئے وہ جیل گئے، ان حکومت کی سختیاں برداشت کیں۔ اپنوں سے دشمنی مول لی مگر غیروں کی غلامی میں رہنا گوارہ نہیں کیا ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ غلامی کو لعنت سمجھتے تھے چنانچہ کہتے ہیں :

" اسلام کے مطابق انسان صرف اللہ کی غلامی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ انسان ایک دوسرے کے غلام نہیں ہو سکتے۔ خدا وحدہٗ لاشریک کی غلامی نے ہر قسم کی قید و بند سے آزاد کر دیا ہے۔"

وہ ہمیشہ اسی اصول پر جنگ آزادی لڑتے رہے اور کسی بھی وقت اپنے قدم کو پیچھے نہیں ہٹایا۔ اسی طرح وہ ملوکیت کے بھی شدید مخالف تھے۔ گول میز کانفرنس میں اپنی تقریر کے دوران صدر جلسہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :

" میں طبعاً اور عقیدۃً جمہوریت پسند واقع ہوا ہوں۔ میرے نہاں خانۂ تصورات میں شاہوں اور شہزادوں کا وجود نہیں ہے۔"

یہی وجہ تھی کہ وہ وطن کی کامل آزادی کے لیے ہمیشہ جد و جہد کرتے رہے اور اپنی تمام زندگی اسی مقصد کو حاصل کرنے میں گذار دی۔ گول میز کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے :

" میں آپ سے مستعمراتی حکومت مانگنے نہیں آیا ہوں اور نہ میں اس کے حصول پر یقین رکھتا ہوں۔ صرف ایک چیز ہے جس کا میں عہد کر چکا ہوں اور وہ کامل آزادی ہے۔"

ہندوستان مختلف اکائیوں، تہذیبوں اور مذہبوں کا سنگم ہے۔ یہاں دو ملتوں کے درمیان تصادم ایک معمولی سی بات ہے۔ مولانا کی دوررس نگاہوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر آزادی کو حاصل کرنا ناممکن ہے چنانچہ انھوں نے دونوں قوموں کے درمیان تعصب و نفرت کی خلیج کو پاٹنے کی بھرپور کوششیں کیں اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں لوگوں کو اتحاد و اتفاق کا درس دیا۔ ان کا قول تھا :

" سب جانتے ہیں کہ میں اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لیے ہندو مسلم اتحاد کو ضروری سمجھتا ہوں اور ہمارا مذہب بھی ہمیں یہی تعلیم دیتا ہے "

دوسری جگہ کہتے ہیں :

[illegible] یعنی دعا ہے کہ خدا ہندو مسلمانوں کو اپنے اتحاد و اتفاق کی ایک جھلک پھر نصیب کرے۔
میری [illegible] دونوں قوموں میں اتحاد کی وہ تصویر اور یگانگی کا وہ منظر سامنے رکھیں جو اتحاد قومی کی
[illegible] سکتے ہیں"

ان الفاظ میں کتنی حسرت، تڑپ اور درد ہے۔ کاش! مولانا کی یہ آرزو پوری ہو جاتی تو ہندوستان
اس وقت [illegible] بن جاتا؛

"اے اتحاد تو ضرور آئے گا، آدمیوں کو باہم ملا دے گا اور قوموں کو متحد کر دے گا۔ لیکن
ہمارے سامنے نہیں جو تیرے انتظار کی تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ تو آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ لیکن
کب؟ ایک عرصے کی مصیبتوں، صبر آزما التجاؤں، تکلیف دہ انتظار اور ہمت شکن انکار کے بعد"

غرض کہ ان کی تمام زندگی اسلام کی خدمت، آزادیٔ وطن کے حصول اور ملک میں اتحاد و اتفاق کی فضا قائم
کرنے میں گذری اور اسی جد و جہد میں انھوں نے اپنی جان جانِ آفریں کو سپرد کر دی۔ کیا خوب کہا ہے
شاعر [illegible] نے:

سلام ایسے مجاہد، نیک سیرت، پاک طینت پر
جو اپنی جان تک قربان کر دے ملک و ملت پر

انھیں طالب علمی کے زمانے ہی سے مضمون نگاری کا شوق تھا اس لیے ادب و شاعری پر اکثر
مضامین لکھا کرتے تھے۔ جب شعور اور زیادہ پختہ ہوا تو غلامی کی لعنت ان کے لیے صدمات کا باعث
بن گئی اور ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ لہٰذا خالص سیاسی عنوان پر
مضامین لکھنا شروع کیا جو "ٹائمز آف انڈیا" میں شائع ہوئے ہیں۔ اس سے حکومت کو تشویش ہونے
لگی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ ریاست بڑودہ کی ملازمت میں تھے۔ ریاست کی کونسل نے کوشش کی
کہ وہ اس قسم کے مضامین نہ لکھیں جس سے متاثر ہو کر انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ جب بیگم بھوپال
اور نواب جاورہ کو ان کے استعفے کی خبر ملی تو ان ریاستوں نے چیف سکریٹری اور وزارت کے عہدے
پیش کیے مگر انھوں نے ان عہدوں کو قبول نہیں کیا اور کلکتہ سے جنوری ۱۹۱۱ء میں انگریزی اخبار کامریڈ
جاری کیا۔ یہیں سے ان کی زندگی میں ایک نیا موڑ آتا ہے اور وہ سیاست کے میدان میں قدم رکھتے
ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں جب دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل ہوا تو کامریڈ بھی دہلی منتقل کر دیا گیا۔

۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو ایک خاص ضمیمہ ہمدرد بھی جاری کیا گیا۔ ان پرچوں کے ذریعے مولانا نے ہندوستان میں آزادی کا علم بلند کیا۔ دراصل ان کا دورِ صحافت کی تاریخ میں ایک عظیم الشان انقلاب کی حیثیت رکھتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جنگ بلقان عروج پر تھی اور مولانا کی توجہ اور مصروفیت کا مرکز تھی۔ اس سلسلے میں نہ صرف مضامین لکھے بلکہ ترکوں کی امداد کے لیے ہمدرد اور کامریڈ میں اپیل بھی شائع کی اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں زخمیوں کے علاج کے لیے ایک طبی وفد بھیجا۔ اسی زمانے میں ۳؍ اگست ۱۹۱۳ء کو کانپور مچھلی بازار کی مسجد کا خونی حادثہ پیش آیا۔ مولانا اس واقعے سے تڑپ اٹھے۔ اور سر جیمس مسٹن گورنر صوبہ متحدہ سے خط و کتابت کی اور جب کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو وزیر حسن کے ہمراہ انگلستان روانہ ہوگئے اور انہدام مسجد کے متعلق وزیر ہند اور ارکانِ کابینہ سے گفتگو کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سر جیمس لاٹوتھی رکن مجلس وزیر ہند نے لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند کو فوراً ہدایت کی کہ مسجد کے منہدم حصوں کو دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی جائے اور تمام مقدمات واپس لے لیے جائیں۔ اس کامیابی کے بعد مولانا محمد علی کو مسلمانوں میں بے انتہا مقبولیت حاصل ہوگئی اور جب دسمبر کے آخر میں وہ ہندوستان واپس آئے تو ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔

ابھی جنگِ بلقان کا سلسلہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اگست ۱۹۱۴ء کی ابتدا میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہوگئی جس میں ترکی نے اتحادیوں کے بالمقابل جرمنی کا ساتھ دیا۔ اس پر انگلستان کے چند اخباروں نے ترکوں کو مشورہ دیا کہ وہ اتحادیوں کا ساتھ دیں۔ لندن کے مشہور اخبار "ٹائمز" کا بھی یہی مشورہ تھا۔ مولانا محمد علی اسے ترکوں کے مفاد کے خلاف سمجھتے تھے، اس لیے ۴۰ گھنٹوں کی مسلسل محنت سے کامریڈ کے لیے "چوائس آف دی ترک" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو ۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے حکومت برطانیہ پر سخت تنقید کی تھی جس کو وہ برداشت نہ کر سکی اور کامریڈ اور ہمدرد کی ضمانت ضبط کرلی۔ اس واقعہ کے کچھ عرصے کے بعد ۱۵ مئی ۱۹۱۵ء کو مولانا کو دہلی کے قریب مہرولی میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہاں سے لینسڈاؤن، پھر چھندواڑہ اور آخر میں بیتول منتقل کیے گئے۔ تقریباً پانچ سال کی نظر بندی کے بعد ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہوئے۔ رہائی کے فوراً بعد ۲۹ دسمبر کو سیدھے امرتسر پہنچے جہاں کانگریس کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے اجلاس بھی ہو رہے تھے۔ امرتسر میں ہندو اور مسلمانوں نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور پنڈت مدن موہن مالوی نے انھیں کانگریس کا ڈیلیگیٹ بنایا۔ یہی وہ دور تھا جبکہ

ہفتہ وار کامریڈ کے پہلے شمارے کا ٹائٹل (ملاحظہ ہو مضمون صفحہ ۱۸۵)

The Comrade.

A Weekly Journal. Edited by Mohamed Ali.

Stand upright, speak thy thought, declare
The truth thou hast, that all may share
Be bold, proclaim it everywhere
They only live who dare!

—*Morris.*

Vol. 1.
No 1.

Calcutta: Saturday, January 14, 1911.

Annual Subscription
Indian Rs. 12.
Foreign £1.

[illegible] اختتام پر مولانا محمد علی مصر کے راستے ہندوستان واپس آئے تو گاندھی جی نے بمبئی میں ان کا استقبال کیا۔ خلافت تحریک سے گاندھی جی کی دلچسپی کے پیشِ نظر مولانا نے اس کی باگ ڈور گاندھی جی کے سپرد کردی۔ تحریک خلافت اور ترکِ موالات کی کامیابی سے ہندو مسلم اتحاد کی ایک خوشگوار فضا ہندوستان کے طول و عرض میں قائم ہوگئی۔ مولانا محمد علی نے گاندھی جی کو ساتھ لے کر پورے ملک کا دورہ کیا اور ان کا جگہ جگہ پرجوش استقبال کیا گیا اور "مہاتما گاندھی کی جے ہو" اور "محمد علی کے جے ہو" کے نعرے لگائے گئے۔ ان دونوں کی آواز پر لوگوں نے اپنے خطابات واپس کر دیے، بہت سے لوگوں نے انگریزی حکومت کی ملازمت چھوڑ دی، وکلاء نے وکالت ترک کردی اور بدیشی مال کا کامیاب مقاطعہ کیا گیا۔

اسی ہنگامی دور میں مولانا محمد علی کی صدارت میں ۸ جولائی ۱۹۲۱ء کو لاہور میں خلافت کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا جس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی شریک تھے۔ اس اجلاس میں علماء نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ برطانوی حکومت کی فوج میں ملازمت کرنا بدترین گناہ ہے آخر میں یہ قرارداد جس پر پانچ سو علماء کے دستخط تھے، باتفاق رائے منظور کی گئی:

"یہ جلسہ اس امر کا صاف اعلان کرتا ہے کہ مذہبی نقطۂ نظر سے بحالت موجودہ ہر مسلمان کے لیے حرام ہے کہ وہ برطانوی فوج کی ملازمت میں رہے یا دوسروں کو فوج میں داخل ہونے کی ترغیب دے اور جو مسلمانوں کا عموماً اور علماء کا خصوصاً یہ فرض ہے کہ وہ دیکھیں کہ یہ مذہبی احکام فوج کے ہر مسلمان تک پہنچائے جاتے ہیں۔"

اس تجویز کے منظور ہوتے ہی حکومت میں ایک کھلبلی مچ گئی اور ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی کو والٹیر کے اسٹیشن پر گرفتار کرلیا گیا۔ ان کے ساتھ شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حسین احمد، مولوی نثار احمد، پیر غلام مجدد سندھی اور جگت گرو شری بھارتی کرشن تیرتھ شنکر آچاریہ جی کو بھی گرفتار کیا گیا۔ ان تمام علماء اور قائدین نے کراچی کانفرنس میں تقریریں کی تھیں۔ ان پر تشدد اور فوج میں بغاوت کو پھیلانے کا الزام لگا کر تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۰، ۱۳۱، [illegible]، ۵۰۵ اور [illegible] کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمے کی ابتداء ۲۶ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ہوئی اور یکم نومبر کو شنکر اچاریہ جی کو چھوڑ کر باقی سب کو دو دو سال کی سزا سنائی گئی۔ اس مقدمے کے دوران مولانا نے عدالت میں جو بیان دیا تھا وہ سیاسی، ادبی اور

ترکی [illegible] اہمیت کا حامل ہے۔ اس بیان سے ایک طرف معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] پیدا شدہ [illegible]
پالیسی [illegible] دنیا کی مختلف قوموں اور ملکوں کی سیاسی [illegible] ترکوں کے متعلق [illegible]
ہوتی ہے [illegible] بیان مولانا کی جرأت اور دلیری کا منہ بولتا ثبوت ہے [illegible] حق گوئی کی [illegible]
تھی [illegible] مولانا کی گرفتاری اور سزا کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں [illegible] کانگریس اور
خلافت کمیٹی کے جلسے منعقد کیے گئے جن میں کراچی کے اسیروں کو [illegible] پیش کیا گیا [illegible]
میں منظور کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں کئی نظمیں منظر عام پر آئیں جن میں اگرچہ کوئی خاص ادبی خوبی نہیں تھی
مگر بے پناہ جذبات کی وجہ سے بچے بچے کی زبان پر تھیں، خاص طور پر:

ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو — کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی

اور

جان بیٹا خلافت پہ دے دو — بولیں اماں محمد علی کی

ان نظموں نے لوگوں کے دل و دماغ پر جو تاثرات ڈالے تھے اس کا نقشہ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے بڑے ہی دلچسپ انداز میں کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"۱۹۲۲ء کا ایک منظر۔ شام کا وقت ہے۔ امین آباد لکھنؤ کے چوراہے پر یہی 'صدائے شوق' دو دو پیسے کو بک رہی ہے۔ خدا جانے کتنی تعداد میں روز نکلتی رہتی ہے۔ لڑکے وہ دلگیر آواز میں گا گا کر پڑھ رہے ہیں۔ اکثر نواب مرزا شوق کی مثنوی "زہر عشق" کی دھن میں۔ مسافر راہگیر کھڑے سن رہے ہیں۔ پولیس کی لاری آئی، بہتوں کو پکڑ پکڑ کر جیل خانے پہنچا دیا۔ دوسرے پہر سے لے کر رات گئے تک یہی تماشا رہتا ہے۔ جیل جانا ایک ہنسی کھیل ہو گیا ہے۔ پہلے جس کے نام سے لوگ تھراتے تھے، سہمے جاتے تھے اب خود اس کا جیل لے جانا مذاق سا معلوم ہونے لگا ہے۔ محمد علی جب کانگریس میں آئے تو قوم کی قوم کو ساتھ لے کر آئے۔ محمد علی جیل گئے تو یہی آگ قوم پر گلزار ہو گئی۔ سیکڑوں نہیں ہزاروں مسلمان اچھے اچھے عالی خاندان وذی رتبہ گریجویٹ اور رئیس، بیرسٹر، ڈاکٹر، عالم، فاضل، ہنسی خوشی خلافت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جیل بھرنے چلے گئے۔"[1]

---

[1] محمد علی ـــ ذاتی ڈائری کے چند ورق، حصہ اول (۱۹۵۲ء) صفحہ ۶

مولانا محمد علی اگست ۱۹۲۳ء میں جیل سے رہا ہوئے تو ہندوستان کی سیاسی فضا بالکل بدل چکی تھی۔ انگریزوں نے [illegible] ہندو مسلم کے درمیان نفرت کا جو بیج بویا تھا وہ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا چنانچہ مولانا نے دونوں فرقوں کے درمیان اتحاد و اتفاق قائم کرنے کی کوششیں کیں مگر ناکام رہے۔ ان حالات میں دسمبر ۱۹۲۳ء میں کوکناڈا میں مولانا محمد علی کی صدارت میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا، جس میں مولانا نے جو خطبۂ صدارت پڑھا اس میں بھی لوگوں کو جذباتی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کا پیغام دیا لیکن فرقہ پرستی کے زہر کے لیے یہ تریاق بھی بے سود ثابت ہوا۔ اس کے بعد مولانا کی ہمت نے ساتھ چھوڑ دیا اور پنڈت جواہر لال نہرو[1] کے بیان کے مطابق:

"اپنے زمانۂ صدارت کے بعد محمد علی رفتہ رفتہ کانگریس سے دور ہونے لگے یا شاید ان کے الفاظ میں کانگریس ان سے دور ہونے لگی۔ یہ صورت بہت آہستہ آہستہ واقع ہوئی۔"

فرقہ وارانہ فسادات میں دن بدن جو اضافے ہو رہے تھے، ان کو دیکھ کر چند صلح پسند رہنماؤں نے دہلی میں یونٹی کانفرنس کا ایک جلسہ طلب کیا تاکہ فسادات کو روکنے کا حل نکالا جا سکے لیکن یہ کانفرنس بھی ناکام رہی۔ اس سے مولانا بہت مایوس ہوئے اور انھوں نے ملک میں اتحاد قائم کرنے کے لیے متعدد شہروں کا دورہ کیا لیکن فسادات کی جو آگ بھڑک اٹھی تھی اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اسی اثناء میں وہ کانگریس کے اجلاس اور آل پارٹیز کانفرنس میں بھی برابر شریک ہوتے رہے اور جنگ آزادی کی لڑائی میں بھی شد و مد کے ساتھ حصہ لیتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۸ء میں جب سائمن کمیشن ہندوستان آیا تو اس کے خلاف ہمدرد میں مضامین لکھے اور مسلمانوں کو اس کا بائیکاٹ کرنے پر آمادہ کیا۔ ان مضامین میں انھوں نے حکومتِ برطانیہ پر کڑی نکتہ چینی کی اور کمیشن کے بانی ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ کی مخالفت میں رام جی میکڈانلڈ کے عنوان سے مضامین لکھ کر اس کی دروغ گوئی، بدعہدی اور کینہ پروری کا راز فاش کیا۔

شب و روز کی محنت، جانفشانی اور ذہنی پریشانیوں کے باعث ان پر مختلف امراض کے حملے ہونے لگے جن کے علاج کے لیے مہاراجہ الور نے انھیں یکم جون ۱۹۲۸ء کو پیرس روانہ کیا۔ ابھی زیر علاج تھے کہ مولانا شوکت علی اور مولانا شفیع داؤدی کے حکم پر ہندوستان چلے آئے اور صوبۂ بہار آل پارٹیز کانفرنس

---

[1] میری کہانی جلد اول صفحہ ۲۴

کی حمایت کی۔ پھر ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صدارت میں کلکتہ میں آل پارٹیز کنونشن منعقد ہوا تو اس میں شریک ہوئے اور ڈومینین اسٹیٹس کے خلاف ایک پرزور تقریر کی جس سے جلسے میں ہنگامہ ہوگیا۔ تقریر کے دوران چند سرپھرے لوگوں نے ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کی اور بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ کے نعرے بھی لگائے۔ جس سے مجبور ہو کر انہیں بیٹھ جانا پڑا۔ اس اہانت کے بعد انھوں نے کانگریس اور کنونشن کے اجلاس میں پھر کبھی شرکت نہیں کی۔ البتہ دسمبر ۱۹۲۹ء کے قومی ہفتے میں شریک ہوئے جو لاہور میں منایا گیا تھا۔ یہیں انھوں نے گاندھی جی سے بھی ملاقات کی اور سیاسی معاملات پر گفتگو کی۔

اگرچہ امراض کی شدت کے باعث مولانا بہت کمزور ہو چکے تھے اس کے باوجود تحریک آزادی کا ساتھ دینے میں کبھی کمزوری محسوس نہیں کی اور ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اسی زمانے میں لندن میں گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تو مولانا شدید علالت کے باوجود اس میں شریک ہوئے اور اپنے وطن کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے اس کانفرنس میں جو تقریر کی تھی اس کے ایک ایک جملے سے ان کی وطن دوستی اور حب الوطنی کا ثبوت ملتا ہے۔ انھوں نے پہلے اپنی بیماریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

"جب میں شملہ کے اسپتال میں داخل ہوا تو میں نے ایک خاتون اور ایک فوجی افسر کو، جن کی جلد ہی شادی ہونے والی تھی، بڑی دانش مندی سے ایک دوسرے سے علحٰدہ رکھا۔ دونوں بیمار تھے اور میں نے دونوں کے بیچ کا کمرہ لے لیا۔ جب اس خاتون نے ایک عجیب وضع کے ہندوستانی کو یورپین کوارٹر میں آتے دیکھا تو اس نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ اس بوڑھے کو کون سی بیماری لاحق ہے؟ جواب دیا کہ مجھ سے یہ پوچھیے کہ اس کو کون سی بیماری نہیں ہے۔ میری کیفیت یہ ہے کہ قلب کی حالت درست نہیں ہے، بینائی میں فرق آگیا ہے، پاؤں متورم ہیں۔ ذیابیطس کا عارضہ ہے۔ امراض کی اس طویل فہرست سے جو میں نے پیش کی ہے، میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں کرنل گڈنی ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے تشریح امراض کے معاملے میں مجھے اپنا رقیب نہ سمجھ لیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ کوئی صاحب عقل ان امراض کے ساتھ سات میل کا سفر کرنا پسند نہیں کرے گا مگر میں سات ہزار میل کا بری اور بحری سفر طے کر کے یہاں آیا ہوں، کیوں کہ جہاں اسلام اور ہندوستان کا معاملہ آجاتا ہے وہاں میری حالت پاگلوں اور دیوانوں کی طرح ہو جاتی ہے۔"

پھر صدر جلسہ کو مخاطب کر کے جو الفاظ کہے ہیں وہ آزادی کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے لائق ہیں۔ وہ

کہتے ہیں :-

" آج میں جس مقصد سے یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اپنے ملک کو ایسی حالت میں واپس جا سکتا ہوں جبکہ میرے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ ہوگا - ورنہ میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا میں ایک غیر ملک میں جو اگر آزاد ہے مرنے کو ترجیح دوں گا اور اگر آپ نے مجھ کو ہندوستان کی آزادی نہیں دی تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی "

آخر کار ایسا ہی ہوا ' ۴ رجنوری ۱۹۳۱ء کو شمع آزادی کے اس پروانے نے دیار غیر میں جان دے دی - اور ۲۳ رجنوری کو بیت المقدس کی مسجد عمر کے صحن میں سپرد خاک کیے گئے - مہاتما گاندھی نے ان کی وفات پر اپنے تاثرات کا بالکل صحیح اظہار فرمایا تھا - وہ لکھتے ہیں :

مولانا محمد جوہر کی موت اس وقت واقع ہوئی جب کہ ہمیں ان کی ضرورت تھی - انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے زبردست کام کیا ہے - اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتے تو وہ برطانوی سامراج کے خلاف لڑنے والوں کی ایک بار پھر رہنمائی کرتے اور پورا ملک ان کے دوش بدوش ہو کر لڑتا -

پروفیسر محمد مجیب
ترجمہ۔ انور صدیقی

مولانا محمد علی
آپ اپنی شکست کی آواز!

مولانا محمد علی خالصتاً مسلم عوام کے آدمی تھے ــــ شدید طور پر جذباتی، سرگرم، فعال، صاعقہ بردوش کسی کے روکے نہ رکنے والے! ہمدردی حاصل کرنے پر آجائیں تو اپنا دل کھول کر رکھ دیں، جب جی چاہے رونے لگیں اور جب جی میں آئے لوگوں کو ہنسا دیں۔ انھیں خدا اور اس کی رحمتوں پر کچھ ایسا بھرپور یقین تھا کہ کبھی کبھی ان سے ایسی باتیں سرزد ہوتی جاتی تھیں جو بعض لوگوں کو سیاسی اعتبار سے غیر ذمہ دارانہ محسوس ہوتی تھیں

وہ ۱۸۷۹ء میں ریاست رام پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور پھر ۱۹۰۲ء میں لنکن کالج آکسفرڈ سے بی، اے آنرز پاس کیا۔ انھوں نے کچھ ایسی تعلیم پائی تھی جو اس زمانے کے ایک ہندوستانی مسلمان کو خود اطمینانی میں مبتلا کر دینے کے لیے کافی تھی۔ اس تعلیم نے مولانا محمد علی میں یہ احساس پیدا کر دیا تھا کہ وہ دنیا میں کسی سے کم نہیں ہیں، یہاں تک کہ برطانیہ کے وزیر اعظم اور ہندوستان کے وائسرائے سے بھی۔ اسی تعلیم نے ان میں ہر ایک سے بے تکلف اور بے محابا گفتگو کرنے اور مذاق اڑانے کی جرأت پیدا کی۔ یہ کیا کم ہمت کی بات تھی کہ انھوں نے ریاست بڑودہ کی آٹھ سالہ ملازمت، صحافت کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے ترک کر دی اور کلکتہ سے ایک ہفت روزہ اخبار کامریڈ (جنوری ۱۹۱۱ء) نکالا وہ بھی ایسی حالت میں کہ اس کام کے لیے ان کے پاس مالی وسائل نہ تھے۔ اس سے پہلے ہی وہ ہندوستانی اور برطانوی جریدوں میں اپنے بعض مضامین کی وجہ سے خاصی شہرت پا چکے تھے۔

اور اب کامریڈ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انھیں اپنی اصل صلاحیت کو نمایاں کرنے کا موقع تھا۔ ان کا یہ خیال مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا کہ ان کی اوقعاتیت شدی ہندوؤں میں اپنے مطالبات کے سلسلے میں اعتدال پیدا کر سکتی ہے اور انھیں ملک کی فلاح و بہبود کی خاطر منصفانہ بنیادوں پر مسلمانوں کے ساتھ تعاون پر آمادہ کر سکتی ہے۔ مسلمان اس بات سے بہت متاثر تھے کہ مولانا محمد علی انتہائی روانی اور بے ساختگی سے انگریزی لکھتے ہیں اور برطانوی معاشرت اور ادب سے براہ راست واقفیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے ذہنوں میں وہ کچھ اس طرح چھا گئے تھے کہ انھیں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ آتا کہ وہ انتہائی پیچیدہ جملے لکھتے ہیں، اصل موضوع سے برابر بھٹکتے رہتے ہیں اور اپنے مضامین میں بار بار خود اپنا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ان کے مضامین میں بذلہ سنجی، فقرے بازی اور دلچسپ واقعات کی کچھ ایسی فراوانی ہوتی تھی کہ پڑھنے والوں کو یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ وہ ایک ایسی تحریر پڑھ رہے ہیں جو ادبی تنظیم کے وصف سے عاری ہے۔ مولانا محمد علی کے پاس مزاح کا کبھی نہ ختم ہونے والا سرمایہ بھی اتنا ہی تھا جتنا کہ ان کا ذخیرۂ الفاظ۔

کہا جاتا ہے کہ جب کامریڈ نکلا تو بہت سے اونچے درجے کے انگریز عہدے داروں نے بھی اس کی خریداری قبول کر لی تھی اس لیے کہ وہ یہ چاہتے کہ کوئی تو ایسا ہو جو مسلمانوں کے کاز کی حمایت کرے اور ہندوؤں کی مخالفت مگر جلد ہی اخبار کے ان خریداروں کو مایوسی ہوئی جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ کامریڈ کا بنیادی مقصد اپنے موقف کا اظہار تھا اور اس کی زد میں کوئی بھی آسکتا تھا۔ جب جنگِ بلقان شروع ہوئی تو یہ اخبار دہلی منتقل ہو گیا جو اب کلکتہ کی جگہ ملک کی دارالحکومت بن گئی تھی۔ جگہ کی اس تبدیلی کی وجہ سے اخبار کا لب و لہجہ بھی بدلا۔ مولانا محمد علی شروع سے ہی پکے مسلمان تھے۔ ان کے دل میں دنیا کے تمام مسلمانوں کے لیے بیکراں محبت کا جذبہ تھا۔ اب وہ پورے مسلمان بن چکے تھے، اپنے ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی۔ انھیں ان علاقوں کے مسلمانوں سے خاص طور پر لگاؤ تھا جو مغربی اقوام کی ہوس ملک گیری کی زد پر تھے، خاص طور سے ترکی اور طرابلس کے مسلمان (جن پر اس وقت یوروپین سامراج کی زد برابر پڑ رہی تھی) ان کی توجہ کے مرکز تھے۔ اس زمانے میں ایسے لوگ کم تھے جو کھل کر ترکی کی حمایت کی ہمت کر سکتے ہوں اور ایسے لوگوں کی تعداد تو اور بھی کم تھی جن کی حمایت کی زبان پر زور اور موثر انگریزی ہو۔ مولانا محمد علی کی اس جرأت مندانہ حمایت نے انھیں نوجوان ترکوں کے حلقے سے متعارف کرایا۔ کبھی کبھی ان پر حقیقت سے نفسیاتی گریز کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، اور وہ یہ سمجھنے لگتے تھے کہ وہ نہ صرف یہ کہ ترکی اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان رابطے کا وسیلہ ہیں بلکہ باقی دنیا سے بھی

[illegible] انہیں کے رہین منت ہیں۔ مئی ۱۹۱۵ء The Choice of the Turks (ترکی کے [illegible]) لکھنے کے جرم میں انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ ان کی نظر بندی کا سلسلہ ۱۹۱۹ء کے اواخر تک چلتا رہا۔ جیل کی تنہائی نے ان کی مذہبیت کو اور بھی چوکھا کر دیا۔ ان کے شدید شعوری احساس میں جنگ کے بعد کے ترکی کے [illegible] کا تاثر بھی شامل ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ شہادت ان کا مقدر بن چکی ہے۔ ۱۹۲۰ء میں وہ جب ترکی کے ساتھ معاہدے کے سلسلے میں ہندوستانی مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے لندن گئے تو اس وقت وہ ایک شائستہ، خوش لباس اور خوش گفتار سیاست داں تھے۔ وہاں انھوں نے برطانوی سامعین کو سیاسی دانش مندی کا درس دیا، ان پر چبھتے ہوئے فقرے کسے اور دلچسپ لطیفے سنائے۔ انھوں نے برطانیہ میں سوائے سامراجی اخبارات اور لائڈ جارج کے سبھی کو متاثر کیا اور ظاہر ہے کہ اگر لائڈ جارج متاثر ہوتے تو کوئی بات بھی تھی۔ (اور لائڈ جارج متاثر نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ کنزرویٹو پارٹی کے سربراہ اور برطانوی سامراج کے نمائندے تھے۔ مدیر)

ہندوستان واپس آکر مولانا محمد علی نے اپنے آپ کو مکمل طور پر خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کے سپرد کر دیا۔ اب وہ قومی اہمیت اور حیثیت کے رہنما تھے۔ ان کی فعال شخصیت، حیرت انگیز بے خوفی اور بے ساختہ بذلہ سنجی ان کے کام آئی مگر وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو اپنے مذہبی جذبات کے وفور پر قابو پا لیتے ہیں۔ انھوں نے قرآن، رسولؐ اور شریعت کو اپنے سیاسی موقف کی سچائی کی دلیل بنا لیا۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں کراچی میں اپنے خلاف مقدمے کے دوران انھوں نے جس طرح اور جس خود اعتمادی کے ساتھ جج اور جیوری کا مذاق اڑایا تھا، اس سے متاثر نہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ انھیں اس تجویز کو پاس کرانے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ برطانوی فوج میں بھرتی ہونا اسلامی شریعت کی بنیادی روح کے خلاف ہے۔ مقدمے میں ان کی دفاعی دلیل یہ تھی کہ انھوں نے ایسا کر کے قرآنی احکام کی پابندی کی تھی جس کا حق انھیں ملکۂ معظمہ کے ۱۸۵۸ء کے اعلان کی رو سے حاصل تھا۔ اسی سال، ذرا کچھ پہلے، انھوں نے اس مسئلے پر عوامی پلیٹ فارم پر گفتگو کر کے کہ وہ کن شرائط پر افغانوں کے خلاف جنگ میں شریک ہو سکتے ہیں، خاصی پریشان کن صورت حال پیدا کر دی تھی۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ حکمت اور مصلحت سے کام لینے کو اسلام پر اپنے ایمان کی کمزوری کی دلیل سمجھتے ہوں۔

یہ حقیقت ہے کہ اب سے پہلے ہندوستانی مسلمانوں کے موقف کو مکمل اور موثر طور پر پیش بھی نہیں کیا

گیا تھا۔ ایک طرف مغربی طاقتیں مشرق وسطیٰ میں آزادی اور خود مختاری کی تمام باقیات کو مٹا دینے پر تلی ہوئی تھیں، دوسری طرف ہندو اکثریت تھی جو مذہبی ذہن رکھنے والے اور سیاسی طور پر باشعور مسلمانوں کے خیال کے مطابق ہندوستانی مسلمانوں کو اس لیے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھی کہ انھوں نے اسلام سے اپنی دستبرداری کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی جس میں بالعموم مذہبی ہیجان کو فروغ حاصل ہوتا ہے ہر اس شخص نے جو ذرا سا بھی اس قسم کے ہیجان کی طرف مائل تھا، اسلام کی نمائش کو اپنا نشانِ امتیاز بنا لیا تھا اور یہ سمجھنے لگا تھا کہ بس یہی اپنے تحفظ اور بقا کی واحد صورت ہے۔ ایسی ذہنی فضا میں ہر وہ شخص جو سیاسی پلیٹ فارم سے اسلام کا اعلان کرتا تھا، خوب سراہا جاتا تھا۔ مولانا محمد علی ایسے ہی مسلمانوں کی عقیدت و ارادت کا مرکز و محور بنے۔ اگر سنجیدگی کے ساتھ اس معاملے پر غور کیا جائے تو غالباً معلوم ہوگا کہ اس طرح مولانا محمد علی نے بالآخر اپنی حیثیت بھی کمزور کر لی اور ان مقاصد کو بھی نقصان پہنچایا، جن کے حصول کے لیے وہ کوشاں تھے۔

مولانا محمد علی نے ہندوستانی مسلمانوں کو یہ باور کرادیا کہ عالم اسلامی ایک ہم آہنگ وجود ہے اور اخوت کے ایک عالم گیر رشتے میں بندھا ہوا ہے۔ ایسے لوگوں کی اُس دور میں کمی نہیں تھی جو مولانا محمد علی کے اس خیال سے متفق تھے۔ مولانا محمد علی نے چندے کی اپیل کی اور عوام سے ایثار و قربانی کے طالب ہوئے۔ اُن کی اس اپیل کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا لیکن ترکوں نے سلطنت بھی ختم کر دی اور خلافت بھی۔ اب مولانا محمد علی کو جو اخوت اسلامی کے زبردست علم بردار تھے یہ نہیں سمجھ میں آ رہا تھا کہ اپنی مایوسی اور اذیت کو کس طرح چھپائیں۔ اس صدمے پر قابو پانے کے لیے انھوں نے مصطفےٰ کمال کو تار بھیجے اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ایک وفد کے ساتھ ان سے ملنا چاہتے ہیں اور خلافت کے مسئلے پر ان سے تبادلۂ خیال کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی تلخی اور مایوسی کا اندازہ لگانا مشکل ہے جنہوں نے خلافت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں چندے کے خرد برد کیے جانے کی افواہیں بھی گشت کرنے لگیں جن کا اثر یہ ہوا کہ وہ جوش و خروش جو خلافت تحریک کے شباب کے دور میں پیدا ہوا تھا خاصا سرد پڑ گیا۔

لیکن مولانا محمد علی تھے کہ مسلمانوں کے کاز کی برابر نمائندگی کرتے رہے۔ انھوں نے نہرو رپورٹ کی مخالفت کی۔ شارہ ایکٹ سے اختلاف کیا جس کا مقصد بچپن کی شادی کے رواج کو ختم کرنا تھا شادی کی کم سے کم عمر کا تعین کرنا تھا۔ اس ایکٹ کی رُو سے لڑکے کی شادی کی عمر اٹھارہ سال اور لڑکی کی چودہ سال قرار

پائی۔ ہندوؤں ہی میں نہیں گاؤں میں رہنے والے مسلمانوں میں بھی بچپن کی شادی کا رواج عام تھا۔ شہروں میں پس ماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والے مسلمان گھرانوں میں بھی یہ رسم رائج تھی۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دور کے ایک چیلنج کی توقعات کو بھی پورا نہیں کیا تھا۔ مولانا محمد علی اس بات کی کوشش کر سکتے تھے کہ اس ایکٹ میں کچھ ایسی ترمیم ہو جائے جس سے شریعت کے تقاضے پورے ہو جائیں۔ اور وہ یہ بات سمجھتے بھی تھے کہ اس ایکٹ کے ذریعے شریعت کے منشا کی تکمیل ہوتی ہے، مگر وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو لیے جو اس بات کا مطالبہ کر رہے تھے کہ مسلمانوں کو اس قانون کے نفاذ سے الگ رکھا جائے اس وجہ سے کہ اسلامی شریعت اس سلسلے میں عمر کا تعین نہیں کرتی اور معاملے کو مسلمانوں کے صوابدید پر چھوڑتی ہے۔ اس قانون کے مخالفین نے اس بات کی دھمکی بھی دی کہ اگر مسلمانوں پر اسے نافذ کیا گیا تو بغاوت پھوٹ پڑے گی۔ اس بحث میں رسولؐ اور ان کے صحابہؓ کچھ اس طرح بیچ میں لائے گئے کہ گویا اس جھگڑے میں ان کی حیثیت ایک فریق کی ہو۔ اس ایکٹ کے مخالفین نے جو رویہ اپنا رکھا تھا اس سے کچھ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ان لوگوں نے اپنے بزرگوں کے دفاع کو اپنے اوپر فرض کر لیا ہو۔

۱۹۲۳ء میں جب مولانا محمد علی، مہاتما گاندھی سے دور ہونے کے بعد ایک ایسے فرقے کے رہنما بن گئے جس کے رد عمل اور مزاج کا کوئی بھروسہ نہیں تھا اور جو ہر لمحہ جھگڑوں میں کود پڑنے پر آمادہ رہتا تھا۔ مولانا محمد علی کی فعالیت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اگرچہ وہ بڑی حد تک اپنی معنویت کھو چکی تھی۔ اب وہ اپنی موقف کا معروضی محاکمہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھیں برطانوی حکومت نے ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس کے آخری اجلاسوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے موقف کی ترجمانی کے لیے مدعو کیا تھا۔ اس موقع پر برطانوی حکومت سے ان کی یہ اپیل کہ وہ ہندوستان کو آزادی دے ورنہ وہ ایک غلام ملک کو زندہ واپس نہیں ہوں گے، ایک اذیت ناک شکست کا اعتراف تھی۔

(پروفیسر محمد مجیب کی کتاب "دی انڈین مسلمس" سے)

ضیاء الحسن فاروقی

محمد علی اور ابو الکلام

(مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے پس منظر کی ایک جھلک کے ساتھ)

سرسید احمد خاں نے مدرستہ العلوم کے قیام کے ساتھ ہی ایک آزاد مسلم یونیورسٹی کے قیام کا خواب بھی دیکھا تھا۔ لیکن انسان خواہ کتنا ہی بڑا نصب العین اپنے سامنے رکھے اور خواہ کتنا ہی دلکش و دل فریب خواب دیکھے، ضروری نہیں ہے کہ اس نصب العین کی تکمیل یا اس خواب کی تعبیر اس کے سوچے ہوئے نہج کے مطابق ہی ہو۔ سرسید مرحوم کے عزائم کا المیہ یہی تھا کہ "علی گڑھ" اپنی تمام برائیوں، خوبیوں اور کامرانیوں کے باوجود ان کے خواب کی سچی تعبیر نہ ثابت ہو سکا۔ لیکن یہ موضوع اپنے اندر کئی جہتیں اور بڑی وسعتیں رکھتا ہے اور یہاں اس کا بالکل موقع نہیں کہ اس داستان کو چھیڑا جائے، یہاں تو مجھے اُن دو بڑی شخصیتوں کے "خصوصی" تعلق کی محض ایک جھلک دکھانی مقصود ہے جو مسلم یونیورسٹی تحریک کے نشیب و فراز کے آئینے میں نظر آتی ہے۔ اور وہ بھی بڑے اختصار کے ساتھ، ورنہ تفصیل میں جائیے تو "افسانہ در افسانہ خیزد" کے بمصداق ایک بڑی داستان بن جائے۔ یہ دو بڑی شخصیتیں تھیں، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد۔

دیگر دوسرے شواہد سے قطع نظر، سرسید تعلیم کے معاملہ میں کتنی اور کیسی آزادی چاہتے تھے۔ اس کے لیے ان کی ایک وہی شہادت کافی ہے جو انھوں نے ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے سامنے دی تھی، انھوں نے کہا تھا۔

> "جب تک خود لوگ اپنی تعلیم کا تمام اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے، اس وقت تک مناسب طور پر ان کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں ہے، پس ملک کے لیے یہ زیادہ تر مفید ہوگا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام اہتمام لوگوں پر چھوڑ دے اور خود اس میں دست اندازی سے بالکل علاحدہ ہو جائے۔"

[illegible] ان کے رفقاء کار کا بھی نصب العین تھا۔ چنانچہ ان کی وفات کے چند ماہ بعد دسمبر ۱۸۹۸ء
میں ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے لاہور کے اجلاس میں "محمڈن یونیورسٹی" کی ضرورت سے متعلق ریزولیوشن
پاس کیا اور مسلمانوں سے اس مقصد کے لیے دس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا گیا، اس کے بعد ۱۹۱۰ء تک یہ
تحریک آہستہ آہستہ نشوونما پاتی رہی، یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۱۰ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے ناگپور اجلاس
میں حسب ذیل تجویز بڑے جوش و خروش کے ساتھ منظور کی گئی:-

"اس کانفرنس کی رائے میں اس ملک کے مسلمانوں کی حقیقی ترقی اور کامل بہبودی ان کی اعلیٰ
تعلیمی ترقی پر منحصر ہے جس کے لیے مجوزہ مسلم یونیورسٹی کا قیام ازبس ضروری ہے اور اب وقت
آگیا ہے کہ قوم کی اس دیرینہ تجویز کی تکمیل کے لیے عملی تدبیر اختیار کرنے میں پوری سعی کی جائے"

اجلاس کانفرنس کے بعد ۱۰ر جنوری ۱۹۱۱ء کو علی گڑھ میں نواب وقار الملک کی صدارت میں ایک
جلسہ ہوا جس میں "کمیٹی تکمیل محمڈن یونیورسٹی" کے نام سے ایک مستقل کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔
سر آغا خان اس کمیٹی کے صدر تھے اور سکریٹری نواب وقار الملک، اس کے بعد ۱۶ر فروری ۱۹۱۱ء کو
ایک کمیٹی مجوزہ مسلم یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن مرتب کرنے کے لیے بنائی گئی جس کے صدر راجہ صاحب
محمود آباد اور سکریٹری ڈاکٹر سید علی بلگرامی منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر سید علی بلگرامی کا دو ماہ بعد انتقال ہو گیا
تو ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اس کمیٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس کے بعد حکومت ہند سے کچھ بے ضابطہ اور
کچھ باضابطہ گفت و شنید شروع ہوئی کہ یونیورسٹی محض مقامی ہوگی یا الحاقی بھی، حکومت کے اختیارات
کیا ہوں گے اور یونیورسٹی کے اپنے اختیارات کیا ہوں گے، اس کے نام کے ساتھ مسلم ہوگا یا نہیں، ریگولیشن اور بائی لاز کے معاملہ
میں یونیورسٹی کتنی بااختیار ہوگی، وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک لمبا قصہ ہے، جسے ہم چھوڑتے ہیں، لیکن اتنا یاد رکھئے کہ حکومت سے
یہ ساری گفت و شنید اول اول بصیغۂ راز رکھی گئی، کچھ تو اس کی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے بھی
کہ مسلمانوں کو یہ امید دلائی گئی تھی کہ متعینہ رقم جمع ہوئی نہیں کہ ایک آزاد مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں
آیا نہیں، مسلمانوں نے دل کھول کر چندہ دیا اور مقررہ رقم جمع ہو گئی، لیکن حکومت اس کے لیے آمادہ ہوتی
نظر نہیں آتی کہ وہ مسلمانوں کی یہ آرزو پوری کر دے کہ چارٹر کے ذریعہ ایک ایسی آزاد مسلم یونیورسٹی
قائم ہو جائے جسے ملک بھر کے مسلم کالجوں اور اسکولوں کا الحاق کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ ملک میں
طرح طرح کی افواہیں پھیل رہی تھیں اور قوم کے رہنماؤں پر نکتہ چینیاں بھی ہونے لگی تھیں، ادھر نواب

وقار الملک برابر اپنے بیانات اور مضامین کے ذریعہ صحیح صورت حال سے مسلمانوں کو باخبر رکھنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ وسط جولائی ۱۹۱۲ء کے آخری عشرہ میں شملہ سے حسب ذیل سرکاری اعلان شائع ہوا:

"یہ قطعی طور پر فیصلہ ہو گیا ہے کہ علی گڑھ اور بنارس کی یونیورسٹی کا دائرہ داثر اسی مقام تک محدود ہو جس میں کہ وہ (یونیورسٹی) قائم ہو۔"

یہ اعلان برق رفتاری کے ساتھ پورے ملک میں پھیل گیا اور لوگوں میں مایوسی اور بددلی کے ساتھ غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ نواب وقار الملک قوم کے اس غم و غصہ میں برابر کے شریک رہے، مسلمانوں کے اخبارات بھی ان کے ہمنوا تھے، اسی دوران کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے صدر راجہ صاحب محمود آباد کو گورنمنٹ کا ایک مراسلہ بذریعہ تار ۹ اگست ۱۹۱۲ء کو شملہ سے چلا تھا، ملا جس میں گورنمنٹ کے پہلے اعلان کی مزید تصدیق تھی، اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ "ہز میجسٹی کے وزیر ہند کانسٹی ٹیوشن کے متعلق مع اس کی جملہ تفصیلات کے اور علی الخصوص یونیورسٹی کی جماعت ہائے ترکیبی کے درمیان تقسیم اختیارات کے متعلق اپنے فیصلے کو ہنوز محفوظ رکھتے ہیں۔" مراسلہ کے آخر میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ "یہ یونیورسٹی اسٹذہ علیگڑھ یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہوگی۔"

ظاہر ہے کہ اس مراسلہ سے مسلمانوں کی مایوسی میں اور اضافہ ہوا۔ ۱۱ر اور ۱۲ر اگست ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ میں کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا جو جلسہ ہوا، اس میں بڑی جارحانہ تقریریں ہوئیں اور حکومت کی شرائط کو ماننے سے صاف صاف انکار کر دیا گیا۔ چھ اصحاب پر مشتمل جن میں مولانا محمد علی (جو اس وقت عام طور پر مسٹر محمد علی آکسن کہے جاتے تھے) بھی شامل تھے، ایک سب کمیٹی مقرر کی گئی جو ممبر تعلیمات سر ہارکورٹ بٹلر کے مراسلہ کا جواب تیار کر کے اور کمیٹی کی منظوری لے کر اسے ان کے پاس بھیج دے، چنانچہ ۱۴ر اگست کو یہ جواب بھیج دیا گیا۔

اس کے بعد صورت حال یہ ہوئی کہ حکومت کے خلاف عام ناراضگی کی ایک فضا پیدا ہو گئی اور مسلم اخباروں نے اس مسئلہ پر خوب خوب لکھا، ملک میں ایک قسم کا ایجی ٹیشن پھیل گیا۔ نواب وقار الملک پر جن کی صحت پہلے ہی سے خراب چل رہی تھی، ان تمام واقعات کا بہت اثر تھا۔ وہ تبدیلی آب و ہوا کے لیے دہرہ دون چلے گئے۔ وہاں انھوں نے یونیورسٹی سے متعلق ایک اسکیم تیار کی جو اخبارات کے

علاوہ ایک [illegible] چالیس صفحے شائع ہوئی، اسکیم کے دو حصے تھے، پہلے حصے میں مجوزہ یونیورسٹی سے متعلق حکومت کے خیالات و تجاویز پر بحث کر کے انھیں مسلمانوں کے لیے مضر بتایا تھا اور الحاقی یونیورسٹی کی ضرورت ثابت کر کے مسلمانوں کو جدوجہد جاری رکھنے کی تاکید کی تھی۔ دوسرے حصے میں انھوں نے یہ بحث کی تھی کہ اگر باوجود کوشش اور جدوجہد کے حکومت سے معاملہ طے نہ ہو اور آزاد یونیورسٹی کا قیام ناممکن نظر آئے تو [illegible] یونیورسٹی کے لیے جمع ہوا ہے اس کا بہترین مصرف کیا ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ دوسرے حصے میں نواب صاحب نے ایک جدید تخیل جامعہ اسلامیہ کا پیش کیا جس کے لیے حکومت کے چارٹر کی ضرورت نہ تھی۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جس جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ہاتھوں رکھا گیا، اس کا تخیل آٹھ برس پہلے ہی نواب صاحب نے پیش کر دیا تھا بلکہ ایک موقع پر پروفیسر ہارون خان شروانی نے راقم الحروف کو یہ بھی بتایا کہ نواب بھوپال کی مدد سے اس "آزاد جامعہ ملیہ اسلامیہ" کو دہرہ دون میں قائم کرنے کا منصوبہ بھی تیار ہو گیا تھا۔ نواب صاحب نے اپنی اس اسکیم میں نہایت تفصیل سے جامعہ اسلامیہ کی ضرورت، خصوصیات اور طرز تعلیم پر بحث کی تھی، ان کی رائے تھی کہ جامعہ اسلامیہ میں تمام علوم کی تعلیم اردو زبان میں ہو اور انگریزی بطور ثانوی زبان پڑھائی جائے، انھوں نے یہ بھی تجویز کیا تھا کہ اب چونکہ مسلمانوں کو ان کی حسب منشاء یونیورسٹی چارٹر ملنے کی امید نہیں ہے، اس لیے وہ تمام سرمایہ جو مسلم یونیورسٹی کے واسطے جمع ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ اس جامعہ اسلامیہ کے سپرد کر دیا جائے۔

نواب وقار الملک کی یہ اسکیم نومبر ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی اور اخبارات میں از سر نو بحث شروع ہو گئی، لیکن اب چونکہ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے مشورہ کے مطابق قطعی فیصلہ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی پر چھوڑ دیا گیا تھا اس لیے اس کمیٹی کا جلسہ طلب کیا گیا جو ۲۷ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو قیصر باغ کی بارہ دری میں نواب رام پور کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس دن تو کچھ طے نہ ہو سکا اور ۲۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس رکھا گیا تھا، اس لیے فاؤنڈیشن کمیٹی کی دوسری نشست ۲۹ر دسمبر کو ہوئی۔ کمیٹی کا یہی وہ جلسہ تھا جس کی "معرکہ آرائیوں" سے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے "حدیث الغاشیہ" کے خاص عنوان اور "نشۂ نیم شبی کا صبح خمار" کے تحتی عنوان سے فروری اور مارچ کے الہلال میں اپنا وہ طنزیہ مضمون شائع کیا تھا جس میں طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے بھی وہ ایک بلند مقام پر نظر آتے ہیں، لیکن قبل اس کے کہ ہم مولانا ابوالکلام آزاد

اور مولانا محمد علی جوہر کی بھی ایک جھلک سے لطف اندوز ہوں، ضروری ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کی ایک نظم کے چند اشعار پیش ہیں۔ علامہ شبلی فاؤنڈیشن کمیٹی کے اجلاس میں موجود تھے اور وہاں جو کچھ ہوا اس سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ نظم لکھی تھی۔

ہوا یوں کہ فاؤنڈیشن کمیٹی کے ۲۷ر دسمبر کے جلسے میں میجر سید حسن بلگرامی اور مسٹر محمد علی آکسن اور بعض دوسرے حضرات نے بڑی گرما گرم تقریریں کیں ان کے خلاف بھی تقریریں ہوئیں، جلسے میں دو فریق صاف نظر آئے جو ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرا تھے، اور ان میں چند بنیادی اختلافات تھے، غرض اس دن کچھ طے نہ ہوسکا اور جلسے میں بڑی بدنظمی رہی۔ ۲۹ر دسمبر کو دوسرا اجلاس ہوا، اس درمیانی وقفہ میں کارکن قوتیں برابر اپنا کام کرتی رہیں، یہاں تک کہ ۲۸ر اور ۲۹ر دسمبر کی درمیانی شب میں صبح کے اجلاس میں پیش کرنے کے لیے ایک ریزولیوشن مرتب کیا گیا، اس کے بعد اس ڈپوٹیشن کے بعد کی ایک فہرست جسے وائسرائے کے پاس جاکر مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنا تھا اس غرض سے مرتب کی گئی کہ جلسے میں کمیٹی سے اس کی منظوری حاصل کرلی جائے گی۔ اس فہرست کی ترتیب میں نواب وقارالملک بھی شریک تھے، لیکن نواب صاحب کے اٹھ جانے کے بعد ایک مختصر صحبت میں ایک بجے شب کے بعد یہ فہرست بدل دی گئی اور گویا مجموعی طور پر فریقین میں جو ۲۷ر دسمبر کے اجلاس میں ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے، رازداری میں سمجھوتہ ہوگیا۔ اب صبح ہوئی، اجلاس منعقد ہوا، لیکن اس اجلاس کا رنگ دوسرا تھا، نہ جوش و ہنگامہ، نہ بحث و تکرار، تمام کارروائی بڑے سکون اور خوش اسلوبی سے عمل میں آئی، لوگوں کو حیرت تھی کہ ماجرا کیا ہے، دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا، آخرکار لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ لیڈروں نے خفیہ طور پر باہم سازش کرلی اور قوم کو احمق بنایا۔

اجلاس کے بعد اخبارات نے اجلاس کے واقعات پر مضامین لکھے، ذمہ دار اشخاص نے نکتہ چینیاں کیں، نواب وقارالملک کے متعلق بھی بدگمانیوں کا اظہار کیا جانے لگا، مجبور ہوکر انھوں نے ۵ر فروری ۱۹۱۳ء کو ایک مفصل مضمون لکھا اور کہا کہ "میرے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں ہے کہ بعض اہم واقعات پر جو پردہ پڑا ہوا ہے اس کو اٹھاؤں۔" اور انھوں نے ایسا ہی کیا کہ صحبت نیم شبی کے تمام واقعات ایک ایک کرکے ظاہر کردئے اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام مجبوریاں اور معذوریاں بھی وضاحت سے بیان کردیں جن کی وجہ سے ان کو اجلاس میں خاموش رہنا پڑا۔"

[illegible] اس مضمون کو یہیں ختم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ قارئین نے پس منظر کو اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا، [illegible] بیان کرتے ہیں کہ" فاؤنڈیشن کمیٹی کے اس اجلاس کا تماشا میں نے بچشم خود دیکھا ہے [illegible] اس اجلاس میں شریک تھے اُن پر ان واقعات کا جو اثر پڑا اس کو دوسرے روز ایک نظم میں ادا کیا"۔ اس نظم کے مندرجہ ذیل اشعار مسلم یونیورسٹی تحریک کی تاریخ کا ایک اہم ورق ہیں۔

اب کے جو لکھنؤ میں دکھایا گیا سماں — سچ پوچھئے تو مضحکۂ روزگار ہے
دیکھا یہ پہلے دن کہ ہر اک گوشۂ بساط — میدانِ رزم و عرصہ گہِ گیر و دار ہے
غل ہے کہ وہ مقدمۃ الجیش آگیا — اب انتظارِ فوج یمین و یسار ہے
احرار کی صفوں کی صفیں ہیں جمی ہوئی — مجلس تمام عرصہ گہِ کارزار ہے
اسٹیج پر ہر ایک بپھرتا ہے اس طرح — گویا حریفِ رستم و اسفندیار ہے
ہاتھ اٹھ رہے ہیں یا علمِ فتح ہے بلند — چلتی ہوئی زبان ہے یا ذوالفقار ہے
ہر نوجوان ہے نشۂ آزادگی میں مست — جو ہے وہ حریت کا سرِ پُرخمار ہے
احرار کہہ رہے ہیں نہ مانیں گے ہم کبھی — ویٹو کا ویسرائے کو کیا اختیار ہے
الحاق گر نہیں ہے تو ہر سعی ہے عبث — مسلم کا لفظ خاص ہمارا شعار ہے
جو والیانِ ملک کہ تھے زیبِ انجمن — سب دم بخود سے تھے کہ یہ کیا خلفشار ہے

یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں — نے وہ خروش و جوش نہ وہ گیر و دار ہے
ٹوٹی ہوئی صفیں ہیں علم سرنگوں ہیں سب — بازوئے تیغ گیر جو تھا رعشہ دار ہے
"سازش" کا ایک جال بچھایا ہے ہر طرف — ہر شخص اس کی فکر میں مصروفِ کار ہے
سرمستیاں ہیں دورِ قدح ہائے راز کی — ہر شخص "حکمتِ عملی" کا شکار ہے

خود آپ اپنے ہاتھ سے کھائی ہے گو شکست — کہتے ہیں پھر "یہ فتح مبیں یادگار ہے"
حیران تھے عوام کہ کیا ماجرا ہے یہ — یہ کیا دورنگیٔ چمن روزگار ہے
احرار کا طریقِ عمل ہے اگر یہی — پھر کامیابیوں کا عبث انتظار ہے

مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال جب نکلا تو مسلم یونیورسٹی کی تحریک شروع ہو چکی تھی چنانچہ الہلال نے اول روز ہی سے اس تحریک سے متعلق لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یکم ستمبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں مولانا آزاد نے مسلم یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر مولانا محمد علی سے چند امور کی وضاحت چاہی تھی۔ الہلال کی اسی اشاعت میں مولانا آزاد کے اس مضمون کی دوسری آخری قسط بھی چھپی تھی جس کا عنوان تھا "نشۂ شام کی نصف شب"

مولانا آزاد نے "مسلم یونیورسٹی کونسٹی ٹیوشن کمیٹی" کے عنوان کے تحت لکھا :

"ہم کو معلوم ہے کہ ہمارے دوست وہی محمد علی ہیں جنھوں نے نواب محسن الملک مرحوم کے زمانے میں اپنے کالج سے نئے نئے خطابات حاصل کئے تھے اور پھر یہ وہی محمد علی ہیں جنھوں نے ہمیشہ کالج کی زرپرستی کی مخالفت کی اور ٹرسٹیوں کی دائمی حکمرانی کے مسئلے کو بار بار چھیڑا۔ وہ گو ہمیشہ علی گڑھ میں رہے مگر ہم نے تو ہمیشہ ان کو اس کے باہر ہی دیکھا ہے اور اب تو میلوں دور دیکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے جب چاہا تھا کہ آذر کے بتکدے کو توڑے تو خود اسی کے گھر میں خلیل بت شکن کو پیدا کر دیا تھا۔ ہم کو یقین ہے کہ مسٹر محمد علی بھی علی گڑھ سے اسی لیے اٹھائے گئے ہیں تاکہ اپنے گھر کی دیواروں سے بت پرستی کے نقوش مٹا دیں۔ ...

" مسٹر محمد علی کے ہمارے تعلقات اب صرف دوستانہ ہی نہیں بلکہ ایسے قریب کے عزیزانہ ہیں کہ ان کی نسبت رائے قائم کرنے کا پورا موقع رکھتے ہیں۔ ہم نے اچھی طرح اندازہ کر لیا ہے کہ ان کے دل میں آزادی اور جوش دونوں چیزیں ہیں۔ یونیورسٹی کمیٹی کے متعلق عام طور پر موجودہ حالات نے بے اعتمادی اور شکوک پیدا کر دیے ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر وہ حق گوئی اور بے لاگ سچائی کی قدر و قیمت کو پیش نظر رکھ کے مندرجہ ذیل امور پر اپنی معلومات ظاہر کر دیں۔ وہ ابتدا سے شریک کار رہے ہیں اور ہم کو شکوک اور سوءِ ظن سے نجات دے سکتے ہیں۔"

۸ ستمبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں مولانا محمد علی نے الہلال کے دونوں مضمونوں کا جواب دیتے ہوئے اپنا ایک مکتوب شائع کرایا جس کے چند ٹکڑے درج ذیل ہیں۔ اسی اشاعت میں مولانا آزاد نے ترکی بہ ترکی لکھا۔ مولانا محمد علی نے لکھا تھا :-

۳ ماہ کے ہلال آفتِ عالم پر اس وقت نمودار ہوا تھا مگر آزادی کے بدر کامل کو یہ کیا گہن لگا
تھا کہ آج کامل ایک سال بعد ظلمت علی گڑھ پر نورِ ایمان غالب آیا ہے۔"

"آنجناب نے صرف سرہارکورٹ بٹلر کی ۹ر اگست ۱۹۱۳ء کی تحریر کا ترجمہ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں پڑھا اور اس میں جو فقرہ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۳ء سے ماخوذ تھا اس کی غلط تاویل فرما کر بلا غور و فکر اور بے تامل پچاس ساٹھ مسلمانوں کو کاذب اور فریبی ٹھیرا دیا اور (آگے آیت) کلام الٰہی سے اپنے فتوے کی تصدیق بھی حسبِ معمول فرمادی، شاید ظن مومن کی یہی تعریف ہو۔ مگر یہ مسائل مذہبی ہیں اور میں محض سگِ دنیا، البتہ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ یہ طریقۂ اخبار نویسی خواہ لکھنے والے کے لیے کتنا ہی دل خوش کن اور عوام کے لیے کیسا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، جن پر سب و شتم کی بوچھار پڑتی ہے ان کے لیے ضرور بہت کچھ دل شکن ہے۔

"کچھ ہی سہی مگر آنجناب نے مضمون کا عنوان اچھا سوچا تھا۔ "نشۂ شب کی نصف شب" کی سرخی شانِ نزول کے لیے نہایت موزوں ہوتی مگر ذرا قبل از وقت ثابت ہوئی۔
معلوم ہوتا ہے رمضانی نے اصل وقت سے کچھ گھنٹے قبل ہی یہ کہہ کر چونکا دیا کہ
"زلفش بہ کمر رسیدہ باشد"

مولانا آزاد نے جواب میں قلمبند فرمایا:-

"آپ نے "آزادی کا بدر کامل" اگر محض "ہلال" کا ضلع نبھانے کے لیے لکھا ہے تو اس زورِ عبارت سے خود بھی مزہ لیتا ہوں، لیکن اگر طنزاً ہے تو مزاح سے الگ ہو کر مجھے کہنے دیجئے کہ آزادی اور آزاد بیانی کے درجہ کو تو اپنی بساط سے بہت بلند سمجھتا ہوں۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے جن قربانیوں اور خود فروشیوں کی ضرورت ہے وہ ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں ہو سکتیں۔ میرے دل میں تو ایک لمحہ کے لیے بھی اس دعوے کا خطرہ نہیں گذرا مگر میری محرومی سے آزادی کی آواز دنیا سے معدوم نہیں ہو سکتی۔ اس کو مجھ میں نہ ڈھونڈیئے

البتہ اس کی آواز سے تو کانوں کو بہرہ بھی نہ کیجئے۔

منکر نتواں گشت اگر دم زنم از عشق

ایں نشہ بمن گر نبود با دگرے ہست

"آپ متعجب ہیں کہ "ظن المومنین خیرا" کی کیا یہی تعریف ہے کہ کسی کو ایسے سخت الزام دیے جائیں؟ لیکن آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ آخر حسن ظن کی کوئی حد بھی تو ہونی چاہئے۔ برسوں مسلمانوں نے اپنے لیڈروں کے ساتھ حسنِ ظن سے کام لیا لیکن اس حسن ظن کا جو نتیجہ نکلا وہ آپ کے دل میں اور میری زبان پر ہے۔ اب تو کچھ دنوں سوءظن ہی سے کام لینے دیجئے۔ آپ نے "سگ دنیا" کے لقب کی ٹوپی خود ہی اپنے سر اوڑھ لی حالانکہ جن سروں کے لیے قطع کی گئی تھی ان کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں گو آپ اس طرف اشارہ نہ کریں۔ حیران ہوں کہ آپ کو کسی خیال میں اپنے سے مختلف نہیں پاتا، لیکن پھر دیکھتا ہوں تو بہت دور ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ جام تو آپ کے ہاتھ میں بھی ہے مگر "فسق" کے الزام کے لیے میرا ہی وجود موزوں ہے:

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر ما نام فسق"

"جناب نے عنوان مضمون "نشۂ شام کی نصف شب" کی داد دی ہے۔ لیکن اب میں خود اس عنوان کو قابلِ داد نہیں سمجھتا کیونکہ "نصف شب" کی جگہ "صبح خمار" نظروں کے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ البتہ "زلفش بکمر رسیدہ" کا مصرع جناب نے اچھا یاد دلایا اگرچہ یونیورسٹی کمیٹی کی رازداری کی زلف نیم شبی کمر تک نہیں بلکہ اب تو صبح تک کی جمع شدہ شبنم میں بھیگ رہی ہے۔"

۵؍ اور ۲۶؍ فروری ۱۹۱۳ء اور ۵؍ اور ۱۲؍ مارچ ۱۹۱۳ء کی الہلال کی اشاعتوں میں مولانا آزاد کا وہ معرکۃ الآرا مضمون ہے جس کا پہلا عنوان "حدیث الغاشیہ" ہے اور تحتی عنوان "نشۂ نیم شبی کا صبح خمار" مولانا کا یہ مضمون اتنا تیکھا اور طنز و مزاح کا ایسا شاہکار ہے کہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اس میں مولانا محمد علی کے "انقلاب حال" پر پھبتیاں ہیں اگرچہ بادہ و ساغر کی زبان میں ہیں، کہیں کہیں صاف صاف نام بھی لے لیا ہے اور "ہمارے شیوہ طراز دوست مسٹر محمد علی" اور "ہمارے عشوہ فرما دوست مسٹر محمد علی" کہہ کر ان کی

شبِ مہتاب کی رنگ رلیاں وذاتی مشاہدے کے مطابق، روشنی ڈالی ہے۔ آپ ابھی ابھی علامہ شبلی کی نظم کے کچھ اشعار پڑھ چکے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ مولانا آزاد کے اس مضمون کے چند ٹکڑے بھی ملاحظہ کرلیں۔ دیکھئے دونوں میں کتنی مطابقت ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں :-

"اصل یہ ہے کہ پہلے اجلاس میں جن بعض زبان آوران آزادی نے سرگرم تقریریں کی تھیں، ان کی نسبت لیڈروں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ ابھی ان سنہری ٹکڑوں کے لیے آگ کی آزمائش باقی ہے۔ ۲۷ دسمبر کے جلسے میں جبکہ لفظوں کی جگہ زبان سے شعلے نکل رہے تھے تو راجہ صاحب محمود آباد ہمارے مجلس طراز دوست مسٹر محمد علی کو مخاطب کرکے دل ہی دل میں ضرور کہتے ہوں گے:

مجلس طرازیوں کے چکھاؤں گا سب مزے
تم اتفاق سے کہیں تنہا اگر ملے

بالآخر انتظار میں زیادہ دیر نہیں لگی اور بہت جلد تنہائی کا "گوشۂ خلوت" ہاتھ آگیا......
کہا جاتا ہے کہ راجہ صاحب نے کہا تھا کہ "جب تک مسٹر محمد علی رام نہیں کئے جائیں گے، کچھ نہیں ہوگا۔" یہی سبب ہے کہ اس "خلوت شب" کی باماث کا دولہا انہی کو بنایا گیا ....

خیر یہ تو اس "شب وصل" کی شام تھی، اس کے ذکر کو کہیں جلد نبٹائیے کیونکہ اصل پر لطف حصہ تو اس کے بعد آتا ہے جبکہ رندان بادہ گسار نے "جلسۂ ہم شبی" آراستہ کیا اور موٹر کاریں بھیج بھیج کر ایک ایک شریک پیمان کی قسمتِ خفتہ کو مژدۂ بادہ گساری سے بیدار کیا گیا:-

وقت آں نیست کہ در حجرہ بخوابی تنہا!

"چشم تصور سے کام لیجئے کہ دسمبر کے آخری ہفتے کی سرد راتیں ہیں، لیلائے شب کی زلف کمر سے گزر چکی ہے، ایک کنج خلوت میں صحبت بادہ پرستی گرم ہے اور گرم گرم سازشوں کی:

دھری شراب ہے، بیٹھے ہیں جا بجا ساقی

قبل اس کے کہ آپ کسی مدعی زہد کو الزام دیں، آپ ہی کو منصف بناتے ہیں کہ بھلا ایسی توبہ شکن اور ولولہ انگیز صحبت میں اگر ہمارے کسی "دوست" کی توبہ نے لغزش کھائی اور اس جام عہد فراموشی

کو منہ سے لگاتے ہی بہکی بہکی کے "دعوت ملال" نے پیش کیا تھا تو انصاف کیجئے، آخر پہلو میں دل کس کے نہیں ہے؟ ......

"خود صحبت آزمایانِ شیفتہ کا بیان ہے کہ یہ بادہ گساری رات کے دو بجے تک جاری رہی تھی، اللہ اللہ! چاندنی کی راتیں اور پچھلے پہر کی پراسرار صحبتیں!! آپ الزام و اعتراض کی فکر میں ہیں اور "رات کے دو بجے" کے لفظ سے نہیں معلوم کیسے کیسے خیالات میرے دماغ میں گذر رہے ہیں؟ رات کی تاریکی، پچھلا پہر، رندانِ شاطر و کہنہ مشق کا ہجوم اور بعض نوجوان و نوآموز مدعیانِ حریت، پھر شغل مے پرستی کا یہ عالم، اب کیا کہوں کہ کیا کہنا چاہتا ہوں!

مست بر بسترِ من افتد و رندان دانند
حالتِ مست کہ بر بستر ہشیار افتد"

مولانا نے غالباً مولانا محمد علی ہی کو ذہن میں رکھ کر اپنے اس مضمون میں بڑے چبھتے ہوئے شعر لکھے ہیں اور ایسے تیر چلائے ہیں جن کا نشانہ خطا نہیں کرتا۔ دو تین شعر آپ نے ابھی پڑھے، چند شعر اور ملاحظہ ہوں، بس کسی کی "تاراجِ متاع" کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، مثلاً:

تو شبانہ می نمائی، بہ بر کہ بودی امشب؟
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس وہ دل رُبا ادائیں

اور پھر یہ اشعار

یہ لوگ بھی غضب ہیں کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا، سحر آہن بنا لیا

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

معشوقِ ما بہ شیوۂ ہر کس موافق است
با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ مولانا محمد علی نے جب یہ مضمون دیکھا ہوگا تو جیسا کہ ان کا مزاج تھا کہ خوشی میں بھی اور غصہ میں بھی قابو سے باہر ہو جاتے تھے، انھوں نے "رقصِ بسمل" کا ساسماں باندھ دیا ہوگا، میر محفوظ علی بدایونی نے اپنے ایک مضمون "محمد علی" میں مولانا پر "حدیث الغاشیہ" کے عنوان والے مضمون کا جو اثر ہوا اسے بیان کیا ہے، ہم میر صاحب کے اس مضمون کے متعلقہ حصے کو نقل کر کے اپنی بات ختم کرتے ہیں۔ میر صاحب لکھتے ہیں:

"مسلم یونیورسٹی کے سلسلے میں قیصر باغ لکھنؤ میں جلسہ ہوا۔ اس وقت یونیورسٹی کے متعلق (پنجابی اربابِ صحافت کے محاورہ میں) "نرم" اور "گرم" جماعت میں تصادم آرا تھا۔ راجہ محمود آباد "نرم" جماعت کے قائد تھے اور محمد علی "گرم" جماعت کے روحِ رواں۔ مگر شب درمیاں، صبح کو ان کی رائے میں "نرمی" آ گئی۔ اس پر الہلال مرحوم نے "حدیث الغاشیہ" کے عنوان سے ایک دھواں دھار مضمون لکھا جس میں (الہلال کی غیر موجودگی میں حافظہ پر بھروسہ کر کے لکھتا ہوں) شب تار اور تاراجِ متاع کا سماں باندھ کر آخر میں یہ چبھتا ہوا شعر لکھ دیا

معشوقِ ما بہ مذہب ہر کس مطابق است[1]
با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

"محمد علی کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ واپس آ کر جب یہ مضمون دیکھا تو چونکہ (ان کے خیال سے) واقعات کو الٹ پھیر کر کے دکھایا گیا تھا، لہٰذا غصہ سے عجب حالت تھی۔ کہنے لگے، محفوظ! اس کے جواب میں کوئی شعر بتاؤ۔

"میں نہ شاعر ہوں، نہ شعراء کے کلام کا حافظ، بھلا ایک منٹ میں شعر کیا بتا سکتا تھا، مگر ان کی حالت دیکھ کر کہہ دیا۔ اچھا ابھی بتاتا ہوں۔ اتفاق کی بات، سعدی کا ایک شعر ذہن میں آ گیا۔ اگرچہ بے تکلف مناسب موقع ہو سکتا تھا، مگر اس وقت اقتضائے مصلحت یہی تھا کہ شعر پڑھ دیا جائے،

---

[1] اصل مصرع اس طرح نہیں ہے بلکہ یوں ہے۔ ع معشوقِ ما بہ شیوۂ ہر کس موافق است

چنانچہ میں نے کہا!

درکفے جام شریعت، بر کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

" یا تو وہ حالت تھی کہ غصے میں آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے یا دفعتہً منہ سے پھول جھڑنے لگے، مسکرائے، ہنسے، قہقہہ لگایا، پھڑک اٹھے اور جوش میں آکر مجھے گود میں اٹھاکر سارے ہال میں گھومتے پھرے۔ لاہور سے کسی جلسے میں شرکت کی دعوت آئی تھی جس کا جواب دفتر سے جارہا تھا کہ کام کی کثرت کے باعث شرکت سے معذوری ہے۔ شعر سننے کے بعد فوراً حکم دیا کہ وہ جواب نہ دیا جائے بلکہ تار دیا جائے کہ آج شام کو چل کر کل لاہور پہنچوں گا۔ چنانچہ جلسے میں پہنچ کر دوران تقریر میں الہلال کے الزام کا نہایت مشرح مسکت جواب دیا، اپنی بظاہر تبدیلی کی توجیہہ کی اور معشوق والا شعر پڑھ کر اس کے جواب میں سعدی کا شعر نہایت مزے لے لے کے پڑھا کہ ہم پر الزام دیا جاتا ہے کہ ہم نے دونوں فریق کا دل رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جس طرح دونوں رایوں میں تطابق کیا اور جام و سنداں کو لڑا کر ترنم پیدا کیا۔ ہر ہوسناک کا دماغ نہیں کہ اسے سمجھ بھی سکے۔"

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی

مولانا محمد علی اور علامہ سید سلیمان ندوی

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر (پیدائش ۱۸۷۸ء) جدید ہندوستان کی سیاست ملی کے ایک اہم ستون، قافلۂ حریت کے سالار، تحریک خلافت کی جان، ترک موالات کے روح رواں اور شمع اسلام کے ایک دیوانہ وار پروانے تھے۔ وہ مبدأ ازل سے بڑی مختصر مدتِ حیات (۵۲ سال) ساتھ لائے تھے، اور اس میں بھی، ان کی سیاسی زندگی کی عمر کل بیس سال (۱۹۱۱ء تا ۱۹۳۱ء) پر مشتمل تھی۔ اور اس کا بھی کچھ حصہ[1] قید و بند کی نذر ہوا۔ لیکن اس مختصر عرصۂ حیات میں انھوں نے ملکی و ملی سیاست میں جو تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے وہ بلاشبہ عدیم النظیر ہے۔

محمد علی کو شہرت عام محض ایک عظیم قومی و سیاسی لیڈر کی حیثیت سے حاصل ہوئی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑی جامع اور ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی ذات بیک وقت سیاست و قیادت، شعر و سخن، ادب و انشا، اور خطابت و صحافت کا سنگم تھی۔ وہ صحیح معنوں میں مومن کامل تھے جس کا عقیدہ تھا کہ "دنیا کے تمام اہل ایمان جسد واحد کے مانند ہیں، اگر اس کے کسی ایک عضو کو بھی اذیت پہنچے تو تمام جسم درد و تکلیف محسوس کرے" چنانچہ محمد علی کی پوری زندگی اس عالم ارضی کے گوشے گوشے کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جد و جہد میں گذری۔ ان کی تمام تگ و دو کا محور اور حاصل صرف اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی تھا۔ واقعات شاہد ہیں کہ دنیا کے کسی حصے میں اگر کسی مسلمان کے پھانس بھی چبھی تو محمد علی نے اپنے دل میں اس کی نشتریت محسوس کی اور پھر وہ دیوانہ وار

---

[1] مولانا کو دو مرتبہ قید و بند کی سزائیں ملیں: پہلی مرتبہ تقریباً پونے پانچ سال کی، وسط مئی ۱۹۱۵ء سے آخر دسمبر ۱۹۱۹ء تک اور دوسری مرتبہ دو سال کی، ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء سے ۹ اگست ۱۹۲۳ء تک (مدیر معاون)

اس کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔

پیش نظر مضمون میں راقم کا مقصد مولانا محمد علی کی فعال اور سراپا عمل شخصیت اور ان کی وسیع الاطراف سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ لینا نہیں ہے کہ اس بحر بیکراں کے لیے تو ایک سفینے کی ضرورت ہے۔ بلکہ ان محدود صفحات میں مولانا محمد علی اور سید سلیمان ندوی کے باہم قلبی تعلقات کی یاد تازہ کرنی ہے تاکہ مرحومین کی شخصیت اور انسانی محاسن کے بعض مستور گوشے روشن ہو سکیں۔

علامہ شبلی اور محمد علی

علامہ سید سلیمان ندوی (پیدائش ۱۸۸۴ء) کو مولانا محمد علی سے جو گہرا قلبی تعلق تھا اس کی بنیاد علمی و سیاسی ذوق کی ہم آہنگی کے علاوہ مولانا شبلی سے تلمذ کا اشتراک بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کے تمام احباب و تلامذہ کو ان کے علمی جانشین سید سلیمان ندوی اور دار المصنفین سے ہمیشہ قلبی لگاؤ رہا ہے۔ مولانا محمد علی کو علامہ شبلی سے تلمذ کا شرف اس زمانے میں حاصل ہوا تھا، جب وہ علی گڑھ میں اسکول کے طالب علم تھے اور علامہ موصوف کالج میں دینیات کے استاذ تھے۔ محمد علی نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں ایک جگہ اپنے زمانے کے علی گڑھ کالج میں دینیات کی تعلیم کے پست معیار اور زبوں حالی کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

> "اس عام گھپ اندھیرے میں علی گڑھ میں ایک روشن نشان بھی تھا۔ یہ ایک غیر معمولی خوبیوں اور بالکل نئے ادبی نقطہ نظر کے مالک کالج کے پروفیسر تھے۔ جنھیں سرسید احمد خاں کالج میں کھینچ لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ موصوف کا اسم گرامی شبلی نعمانی تھا۔ اور آپ عربی و فارسی کے پروفیسر تھے نیز شاعری اور تاریخ اسلام سے انھیں بے حد لگن تھی۔ آپ علی گڑھ میں فارسی اور عربی پر روزانہ جو عام لکچر دیا کرتے تھے، وہ بڑے جاذب توجہ ہوتے تھے"[۲۰]

محمد علی کو علامہ شبلی کے باضابطہ درسی لکچر سننے کا تو موقع نہ مل سکا، مگر اسکول کے زمانۂ طالب علمی میں علامہ کے ان لکچروں میں ایک عرصے تک باقاعدہ شرکت کی جو وہ ہر روز صبح کو تقریباً نصف گھنٹہ کالج کے بیشتر طلبہ کے سامنے قرآن کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے۔ ایک دن اتفاق سے محمد علی نے درس گاہ

---

۲۰ مولانا محمد علی، بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز۔ مرتبہ محمد سرور ص ۸۷

کے باہر کھڑے ہو کر علامہ شبلی کا درس قرآن سن لیا، اور پھر اس سے انھیں اتنا شغف اور دلچسپی پیدا ہوئی کہ وہ پابندی کے ساتھ روزانہ باہری کھڑے ہو کر درس سننے لگے۔ مولانا شوکت علی نے، جو باضابطہ سینئر طالب علم کی حیثیت سے اس درس قرآن میں شریک رہتے تھے، اپنے چھوٹے بھائی کے اس غیر معمولی شوق و شغف اور ساتھ ہی ان کی موزوں گوئی و سخن فہمی کا ذکر علامہ شبلی سے کیا۔ ان کو یقین نہ آیا اور حیرت ہوئی کہ گیارہ سال کا بچہ شعر گوئی کا ذوق رکھتا ہے۔ بہرحال انھوں نے محمد علی کا امتحان لینے کے لیے ایک مصرعہ دیا اور اس پر اشعار موزوں کرنے کو کہا۔ چنانچہ انھوں نے عروض کی پوری پابندی کے ساتھ تعمیل حکم کر دی۔ پھر جب علامہ شبلی کو اپنے درس قرآنی سے محمد علی کی غیر معمولی دلچسپی کا علم ہوا تو انھوں نے ان کو کلاس کے اندر بیٹھ کر سننے کی اجازت دے دی۔ اور خود محمد علی کے الفاظ میں "اس طرح مجھے اس غیر معمولی مسرت سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا کہ پرنسپل کے ہال کے اندر بیٹھ کر کالج کے ایک انڈر گریجویٹ کی پوری شان کے ساتھ مولانا شبلی کا درس قرآن سن سکوں"[سے]

محمد علی کو قرآن مجید سے جو غیر معمولی عشق اور اس کے معانی و مطالب کے فہم و مطالعہ کا جو شوق عمر بھر رہا اس کی تخم ریزی دراصل علی گڑھ میں مولانا شبلی کے مذکورہ فیضان درس سے ہو گئی تھی۔ اسی خود نوشت سوانح میں ایک جگہ رقم طراز ہیں :-

"یہ صبح کے مختصر سے نصف گھنٹے تمام عمر میرے حافظہ میں محفوظ رہے۔ چنانچہ بعد میں جب حکومت نے مجھے ایک ایسی کمیٹی میں نامزدگی کی عزت بخشی جس کے ذمہ ڈھاکہ میں ایک نئی طرز کی مقامی اور رہائشی یونیورسٹی کے سلسلے میں اور بالخصوص اس کے شعبۂ اسلامیات کے نصاب کے تعین کا کام کیا گیا تھا۔ تو میں نے اس کمیٹی سے درخواست کی تھی کہ وہ مولانا شبلی کو آمادہ کرے کہ وہ ہمیں اس بارے میں اپنے خیالات سے مستفید کریں۔ اور مولانا اس بات کے لیے بخوشی راضی ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب وہ اس سلسلہ میں ڈھاکہ آئے تو میں نے ان کے نصف گھنٹہ روز کے وہ قرآن مجید کے درس انھیں یاد دلائے، انھیں بڑی خوشی ہوئی کہ مجھے اب تک ان کے وہ درس یاد ہیں۔ چنانچہ ہماری سب کمیٹی نے فیصلہ کیا شعبۂ اسلامیات کے نصاب میں ترجمہ قرآن کو بھی رکھا جائے۔"

اس کے بعد محمد علی لکھتے ہیں :-

سے ایضاً صفحہ ۸۰

"جب جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی اور میں اس کا شیخ الجامعہ مقرر ہوا تو پہلے ہی دن سے میں نے اس امر کا اہتمام کیا کہ اس میں مولانا شبلی کے سے درس قرآن کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ ہمارے ہاں تعلیمی دن کا آغاز ایک گھنٹہ کے روزانہ درس قرآن سے ہوتا ہے جس میں قرآنی آیات کی مختصر تشریح کی جاتی ہے۔ لیکن افسوس اس وقت یہ درس دینے کے لیے مولانا شبلی موجود نہ تھے۔"[ے۱]

مولانا محمد علی تا عمر علامہ شبلی سے اپنے تلمذ کی سعادت کا ذکر بصد افتخار و ناز کرتے رہے۔ استاد کا نام لیتے ہی ان پر جذبہ تشکر اور سرشاری کی عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ شبلی کی وفات کے بعد انھوں نے اپنے احباب کے نام جو خطوط لکھے ان میں نہایت والہانہ انداز میں "میرے استاد مرحوم" اور "استاذی و مولائی مرحوم" لکھتے ہیں۔ مثلاً ایک خط مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۱۸ء میں بیتول جیل سے سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

"جب چھوٹوں گا ضرور روضۂ استاذ کے پھولوں کی خوشبو سے دماغ و روح کو معطر کروں گا ع
اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری"[ش]

۱۹۱۱ء میں کامریڈ کے اجرا کے بعد محمد علی ایڈیٹری کے زینہ سے لیڈری کے ایوان میں داخل ہو گئے اور ان کی شہرت و مقبولیت ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ علامہ شبلی اس وقت ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم اور رسالہ الندوہ کے مدیر اعلیٰ تھے۔ ایک عظیم محقق اور ادیب کی حیثیت سے ملک میں ان کا طوطی بول رہا تھا۔ اس زمانہ میں بھی استاد و شاگرد میں غیر معمولی ربط و اخلاص قائم تھا۔ محمد علی نے سید سلیمان ندوی کے نام چھندواڑہ کے زمانہ نظر بندی میں ۱۰ اگست ۱۹۱۸ء کو ایک تفصیلی خط لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شبلی کو سیرت نبوی اور عالمگیر، محققانہ کتابیں تالیف کرنے کی ضرورت و اہمیت کی طرف سب سے پہلے محمد علی ہی نے توجہ دلائی تھی۔ چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

"نہ معلوم میں نے آپ سے اس کا ذکر کبھی کیا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں مولانا و استاذنا شبلی مرحوم بڑودہ میری دعوت پر تشریف لائے اور میرے ہی پاس مقیم تھے۔ تو میں نے اورنگ زیب کے متعلق کچھ لکھنے کی تحریک کی تھی اور مولانا کو بالآخر اورنگ زیب کے متعلق مزید تحقیق و تحریر پر راضی کر لیا تھا۔ اس زمانہ میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تو فرمائیے کہ سیرت نبوی کا کیوں انتظام نہیں فرماتے

ے۱ محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز۔ مرتبہ محمد سرور ص ۸۱ - ۸۲
ش خطوط محمد علی صد ۶۹

[illegible] کون [illegible] کفار کے پے در پے مگر بے بہا سبب جارحملوں کا جواب دے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

[illegible] قبل مولانا مرحوم کو کتنے بار اس مقدس کام کا خیال آیا ہوگا مگر طرزِ گفتگو سے تو یہی

[illegible] میری تقریر نے اثر کیا اور آخری فیصلہ کم از کم شروع ہی میں رد کر دیا گیا۔ اس [illegible]

محبت کا ثمرہ لیں اور تھک زیب کے متعلق الندوہ کے مضامین کا سلسلہ تھا جو مولانا نے مجھ ہی کو

انگریزی جامہ پہنانے کے لیے خود اپنے قلم سے درست کر کے ارسال فرمائے تھے۔ اور میری ضد

کے باعث کہ انگریزی میں میں ہی ترجمہ کروں گا مگر کہہ نہیں سکتا کہ کامریڈ کب فرصت دے۔

مولانا نے باوجود شکایت بہیم کے کسی دوسرے سے یہ کام نہیں لیا"[1]

سید صاحب سے تعلقات کا آغاز

غرض علامہ شبلی اور مولانا محمد علی کے یہی گوناگوں روابط حضرت سید صاحب اور محمد علی کے لیے نقطۂ اتصال ثابت ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے بڑے قدر داں تھے۔ محمد علی کو سید صاحب سے بڑی جذباتی عقیدت تھی، جس پر ان کے خطوط شاہد ہیں۔ اس طرح حضرت سید صاحب بھی ان سے دلی محبت رکھتے تھے اور ان کی ذہانت، قابلیت، اخلاص اور دینی جذبے کے بڑے مداح اور معترف تھے، دونوں کی سب سے پہلی ملاقات ۱۹۱۳ء میں کلکتہ میں دفتر الہلال میں ہوئی تھی حضرت سید صاحب اُس وقت الہلال کے ادارتی اسٹاف میں شامل تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کامریڈ اور اس کے جادو نگار ایڈیٹر کے شباب کی بہار تھی، طرابلس اور بلقان کی جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ مولانا محمد علی نے کامریڈ میں ترکوں کی حمایت میں ایک مضمون "مقدونیہ آؤ اور میری مدد کرو" شائع کیا تھا۔ جسے حکومت نے قابل ضبطی قرار دیدیا۔ ماہرین قانون کے مشورے پر محمد علی اس حکم کے خلاف کلکتہ ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کرنے کے سلسلہ میں کلکتہ آئے تو الہلال کے دفتر میں بھی تشریف لائے۔ حضرت سید صاحب اس پہلی ملاقات کے وقت کا ان کا حلیہ تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں " دیکھا تو بالکل صاحب۔ کوٹ پینٹ، بوٹ، نکٹائی، داڑھی صاف، بڑی بڑی اٹھی ہوئی مونچھیں، سر پر ترکی ٹوپی، لمبا قد، گداز بدن، بھرا ہوا جسم، خندہ جبیں"[2] اس کے بعد سنہ ۱۹۱۶ء میں

---

[1] خطوط محمد علی ص ۵۹ [2] یاد رفتگاں ص ۱۵۷

جب دارالعلوم ندوہ میں طلبہ کی مشہور زمانہ اسٹرائیک کا ہنگامہ برپا ہوا تو اس سلسلہ میں سید صاحب کو علی برادران میں محمد علی سے خصوصیت سے سابقہ پڑا۔ اور ان ملاقاتوں سے دونوں کے روابط برابر گہرے ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۶ء میں جب محمد علی چھندواڑہ میں نظر بند تھے، دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

علامہ سید صاحب علی برادران کی چھندواڑہ میں نظر بندی کے زمانہ میں خاص ان سے ملنے کے لیے سفر کی صعوبت اختیار کرکے اور سیاسی فضا کی ناسازگی کے باوجود وہاں گئے تھے۔ اس سفر کی تفصیل خود سید صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

> "آخر مارچ ۱۹۱۸ء میں ندوۃ العلماء کا اجلاس ناگپور میں تھا۔ میں شریک تھا۔ وہیں سرراہ ایک گمنام لیکن ہمہ تن راز سفیر نے علیحدہ لے جاکر نظر بندوں کا پیام سنایا، یہ وقت بڑا ہی سخت تھا جس کو آج قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال میں اور برادرم مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے بڑی احتیاط سے چھندواڑہ کا رخ کیا۔ صبح کو اس مسجد میں پہنچ کر جس میں یہ نظر بند نماز پڑھتے تھے ان کو ڈھونڈھا تو نشان نہ پایا۔ مسجد کے مکتب میں کچھ لڑکے تھے ان سے پوچھا انھوں نے پتہ دیا تو ان کو لے کر ان کے بنگلے تک پہنچے۔ دیکھ کر دونوں بھائی نہال ہوگئے۔ گلے سے لگایا، ہاتھ چومے، منہ چوما، بلائیں لیں۔ غرض ہر انداز کا پیار کیا۔ دونوں صاحبوں کی زبان پر اس وقت یا قرآن شریف کی آیتیں تھیں یا اقبال کی مثنوی کے شعر۔ اور چق مق چقماق چق چق یعنی گویا ترکی زبان بول رہے تھے۔ کیا زمانہ تھا رات کو مسجد میں میری ایک مختصر تقریر ہوئی اس متن کی شرح میں محمد علی نے ایک لمبی تقریر کی۔ اس زمانہ میں ان کو کسی مہمان کو اپنے پاس شب باش ہونے کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے دن تو ان کے پاس گزرا اور رات کہیں اور بسر ہوئی[۱]۔"

سید صاحب کا مضمون "نظر بندانِ اسلام"

اس کے بعد تعلقات برابر بڑھتے اور گہرے ہی ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ ۱۹۱۹ء میں سید صاحب نے مولانا حسرت موہانی کی رہائی کی تقریب سے "معارف" کے کئی نمبروں میں "نظر بندانِ اسلام" کے

۱؎ یادِ رفتگاں

مضمون [illegible] سپرد قلم کیا، جس میں ترکان یوسفی سے لکر تاتاریوں کے سیلاب بلاخیز تک کے
عہد بعہد اسیران اسلام کی قید و بند اور عزیمت و استقامت کے واقعات نیز جرأتِ
و آزادی کی پوری تصویر ان کو پہنچنے والی حبس و زنجیر کی صعوبتوں پر نہایت موثر انداز میں روشنی ڈالی تھی
اس طویل سلسلۂ مضمون کی تیسری قسط (مارچ ۱۹۱۸ء) بعنوان "موجودہ نظر بندان اسلام، علمی و مذہبی اور
اخلاقی نقطۂ نظر سے" کو سید صاحب نے خاص سرزمین ہند پر دعوت و عزیمت کے علم بلند کرنے والے اسیرانِ
اسلام کے لیے وقف کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے شیخ الہند مولانا محمود حسن، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی
مولوی محی الدین اور علی برادران کی آزادی وطن کے لیے بطیب خاطر قید بند کی تفصیلات قلم بند کی ہیں۔
اس مضمون کا مقصد و محرک آزادیٔ ہند کے لیے جد و جہد کرنے والے ابنائے وطن کو تسکین قلبی کا سامان بہم
پہنچانا تھا کہ اسلام کی پوری روشن تاریخ ہر عصر و عہد میں مردان حق آگاہ کے ابتلاء و محن کے واقعات سے
معمور ہے۔

مذکورہ بالا مضمون میں سید صاحب نے علی برادران کی نظر بندی اور استقامت و عزیمت پر بھی اظہار
خیال فرمایا ہے جو چھندواڑہ کے مذکورۃ الصدر سفر کے چشم دید واقعات اور ذاتی مشاہدات پر مشتمل
ہے۔ لکھتے ہیں کہ :-

"ان دونوں بھائیوں کی سوانح زندگی کا ایک ایک حرف اخبار بیں طبقہ کے سامنے ہے۔
جذبۂ ملت اور راہ میں سرفروشی اور جانبازی اگر علماء کرام سے ظاہر ہو تو ہم کہیں گے کہ
انبیائے اولوالعزم، اصحاب کبار اور بزرگان دین کے کارنامے ان آنکھوں میں ہیں۔ بچپن سے
جوانی تک اپنی تعلیم و تربیت کا زمانہ علماء و صالحین کے آغوش میں بسر کیا۔ لیکن ہماری حیرت
کی انتہا نہیں رہتی جب ہم وہی جذبہ ملت پرستی وہی ذوق و شوق خدمت دینی، وہی جذبۂ
اخلاق نبوی ہم ان میں بھی پاتے ہیں۔ جنھوں نے نہ صرف غیر علماء کی گودوں میں تربیت پائی، بلکہ
نامسلمانوں کے دامن تربیت میں پل کر جوان ہوئے اور ہمیشہ اس تعلیم و تعلم کے زیر سایہ رہے جس
کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی قومی و مذہبی روح کے قتل کرنے کا مسموم آلہ ہے۔"

"دلی کی جامع شاہجہانی میں جمعہ کے دن ان کے وداع عام کا منظر جن آنکھوں نے دیکھا ہے
وہ اس کیف کو اب تک بھولے نہیں ہیں۔ چھندواڑہ ممالک متوسط کا وہ مقام تھا جہاں آغاز تخلیقِ علم

جب تک ... روحانی مناظر کا کوئی جلوہ طلوع ختم نہیں ہوا۔ نہ صرف اس پچھلے ضلع میں بلکہ ممالک متوسطہ کے پورے احاطہ میں اسلام تنِ مردہ تھا۔ مسلمانوں میں بے کسی، بیچارگی اور موت تھی۔ لیکن ان دونوں بھائیوں کے ورود کے بعد نہ صرف چھنڈواڑہ بلکہ تمام احاطہ میں ایک لاشئی سی جھلک اٹھی ہے۔ ان دونوں بھائیوں کے نشۂ صحبت نے ننھے بچوں سے لے کر ضعیف العمر بڈھوں تک کو سرخوش بادۂ طہور بنا دیا۔ اور جس بے باکی اور بہادری کے ساتھ وہ اپنے فرائض ادا کرتے ہیں وہ ان ہی کا حصّہ ہے۔"

" محترم محمد علی کا زیادہ تر وقت کتابوں اور رسالوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ قوت فنا نہیں ہوتی۔ اگر یہ سچ ہے تو وہ قوت نطق جس کے استعمال پر ان کو قابو نہیں ہے، نغمات موزوں کی شکل میں نکل رہے ہیں۔ ان کی نظربندی سے پہلے شاید یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ تلمذ رحمانی کا بھی شرف اور سخن سنجی کا بھی جوہر رکھتے ہیں۔ ان کے حبسیات میں ہم کو وہ لطف ملتا ہے جو ابو فراس حمدانی (برادر سیف الدولہ حمدانی ملک الشام) کے رومی حبسیات میں ہے۔"

" محترم شوکت علی کا وہ زمانہ ہم کو یاد ہے جب سب سے پہلے ہم دونوں کو مدراس ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریب سے ریلوے سفر نے اتفاق سے یکجا کر دیا تھا۔ کچھ دیر کی بات چیت کے بعد جب میں نے نماز کی تیاری کی تو فرمایا کہ نماز پڑھنے کو میرا بھی دل چاہا کرتا ہے لیکن دقت یہ ہے کہ وضو سے قمیص کے کف خراب ہو جاتے ہیں۔ پھر سفر میں ہیٹ لگانے کی وجہ بیان کی کہ اس عجیب و غریب شے سے ریلوے دائرۂ حکومت میں رعب و استیلا خوب ہوتا ہے۔ لیکن وہی شوکت علی ہیں کہ خدام کعبہ کے بعد بمبئی میں حاجیوں کے جہاز کے قلیوں کے دھکے کھاتے پھرتے تھے۔ پانچ چھ برس کے بعد دیکھا تو وہی خدام کعبہ کا سبز کوٹ جس میں جا بجا قدامت اور فرسودگی کے گل بوٹے کترے ہوئے ہیں، ان کے جسم پر ہے۔ وہ کف اور کالر جس کے ضائع ہو جانے کا خوف وضو سے مانع تھا، وہ ان کے لیے اب حلقۂ زنجیر ہے۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ کا واقعہ مجھے یاد آیا کہ یہ وہ تھے جو اسلام سے پہلے حریر و اطلس کی پوشاک پہنتے تھے۔ لیکن اسلام کے بعد ان کے جسم مبارک پر صرف موٹے کمبل کا ایک ٹکڑا تھا۔"

چھندواڑہ میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے اور جو ہے وہ مفلس ہے۔ تاہم جس اسلام کے دو پیرو یہاں اس کا نام چل رہا ہے۔ ان دونوں بھائیوں کی کوششوں نے یہاں ایک عظیم الشان جامع مسجد کی بنا ڈالی جس کو نیم تعمیری حالت میں دیکھنے کی عزت مجھے بھی حاصل ہے۔ ان دونوں بھائیوں کو تعمیر مسجد، بنجر راستوں اور گلیوں میں غریب و مفلس مسلمانوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے کا منظر جن آنکھوں نے دیکھا، اس بادۂ سرشار کی مستی اب بھی ان میں باقی ہے۔ اس مسجد کا نام لوگ نہ جانے کیا رکھیں گے۔ میں تو اس کو "شوکت الاسلام" کہتا ہوں۔"

"مذہبی پابندی، عام اخلاقی محاسن اور غربا کے ساتھ مساوات پسندی نے ان بھائیوں کو محبوب القلوب بنا دیا تھا۔ مسلمان اور ہندو دونوں ان سے محبت کرتے ہیں۔ راستہ میں ایک طرف سے السلام علیکم کی آواز آتی ہے، تو دوسری طرف سے بندے ماترم کا ترانہ سنائی دیتا ہے۔ حافظ ہوتے تو دیکھتے کہ ان کا خیالی فلسفہ پانچ سو برس کے بعد عمل ہو گیا ع

با مسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام

ان کی مذہبی وارفتگی اور ایمان کی تصویر دیکھنا چاہو تو ان کے سفینہ تحریر کی وہ چند سطریں پڑھو جو اپنی مشروط آزادی کے وقت حکومت کو دی تھیں۔ یقیناً یہ طرۂ امتیاز ان کے ناصیہ محاسن پر ہمیشہ کے لیے یادگار رہ جائے گا۔"[9]

دسمبر ۱۹۱۹ء میں اس طویل قید قفس سے رہائی کے بعد علی برادران بیتول جیل سے سیدھے امرتسر پہنچے، جہاں مجلس خلافت، مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس تینوں کے اجلاس ہو رہے تھے۔ کانگریس کی یہی وہ تاریخی کانفرنس ہے جس میں مولانا محمد علی نے اپنی تقریر میں کہا "میں جیل سے واپسی کا ٹکٹ لے کر آیا ہوں" اور یہ اثر آفریں فقرہ تمام ہندوستان میں اتنا مشہور ہوا کہ عرصہ تک اس کی گونج سنائی دیتی رہی۔ امرتسر سے فارغ ہو کر وہ اپنے پیر و مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے ملنے لکھنؤ آئے اور اسی موقع پر علی برادران کو فرنگی محل سے "مولانا" کی باقاعدہ اعزازی سند عطا ہوئی تھی۔[10] اور حقیقت یہ ہے کہ محمد علی نے اس

---

[9]۔ معارف مارچ ۱۹۱۹ء [10] مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے اس "اعزازی ڈگری" کے واقعہ کے بارے میں "غالباً" کے ساتھ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں: "لکھنؤ کا غالباً یہی سفر تھا جب دونوں بھائیوں کو "مولانا" کی باقاعدہ آنریری ڈگری فرنگی محل (یا اس کے مدرسۂ عالیہ) سے عطا ہوئی۔" محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق (حصہ اول) صفحہ ۸۳۔ (مدیر معارف)

انگریزی ڈگری کی اعلیٰ تکمیل۔ اور دینی مطالعہ کرکے خود کو بڑی حد تک مولانا بنا لیا تھا۔

وفدِ خلافت کے ساتھ

جلیانوالہ باغ کے خونیں واقعہ (اپریل ۱۹۱۹ء) کے بعد پورا ملک کوہ آتش فشاں بن گیا تھا۔ مجلس خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکیں اپنے عہد شباب میں داخل ہو چکی تھیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی نسیم پورے ہندوستان میں چل رہی تھی۔ اللہ اکبر کے نعرے ہندوؤں تک کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ علی برادران نے گاندھی جی کے ساتھ ہندوستان کا طوفانی دورہ کرکے پورے ملک کو ترکِ موالات کے غلغلہ سے پرشور کر دیا تھا۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ سے مسلمانوں میں سخت بے چینی تھی۔[11] ان حالات میں مجلس خلافت نے اپنے اجلاس امرتسر (دسمبر ۱۹۱۹ء) میں طے کیا کہ ۱۰ جنوری ۱۹۲۰ء تک مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب کے متعلق مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنے کے لیے مولانا محمد علی کی سرگردگی میں ایک وفد انگلستان بھیجا جائے۔[12] اس وفد کے سکریٹری حسن محمد حیات مقرر ہوئے۔ دوسرے ارکان میں سید حسین اور مولوی ابو القاسم بنگالی کے ساتھ خلافت کی مذہبی ترجمانی کے لیے علامہ سید سلیمان ندوی کا انتخاب ہوا۔

بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید صاحب اس وفد میں شرکت سے بوجوہ اجتناب کر رہے تھے۔ مگر مولانا محمد علی کے پیہم اصرار اور ملّی مصالح کے پیش نظر بالآخر تیار ہو گئے۔ دراصل سید صاحب کا بنیادی ذوق خالص علمی تھا اور ظاہر ہے سیاست کی ہنگامہ آرائیاں علمی مشاغل کی دشمن ہیں۔ اس لیے وہ عملی سیاست سے کنارہ کش رہنے کی کوشش کرتے تھے، چنانچہ بقول محترم مولف "تذکرۂ سلیمان" خود سید صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"میں نے کبھی اس خرقۂ آلود (یعنی سیاست) کو از خود نہیں پہنا۔ کبھی محمد علی نے پہنا دیا کبھی شوکت علی نے۔ اور جب کسی نے پہنایا بھی تو میں فوراً اتار پھینکا ؎

حافظ از خود نہ پوشید ایں خرقۂ آلود
اے شیخ پاک دامن معذور دار ما را"[13]

---

[11] شاہ معین الدین، حیات سلیمان ص ۱۷۵۔ [12] رئیس احمد جعفری، علی برادران ص ۶۳۴
[13] غلام محمد، تذکرۂ سلیمان ص ۵۸

اسی طرح جب علامہ سید صاحب کانگریس کے اجلاس ناگپور (۱۹۲۰ء) میں آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے تو اپنے ایک عزیز کو لکھا کہ "بلا توقع یہ عزت میری قسمت میں آئی مگر سچا اعتراف ہے کہ مجھے ایک ذرہ خوشی نہیں ہوئی۔ اور ہر وقت اپنے رقیبوں کے لیے اس جگہ کو خالی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر صرف محمد علی کی وصیت اور ڈاکٹر انصاری کا امتثال امر ہے۔"[۱]

بہرحال ۱۹۲۰ء کا "انڈین خلافت ڈیلیگیشن" پورے آٹھ ماہ تک یورپ کے مختلف ملکوں میں سرگرم عمل رہا۔ لندن میں وزیر اعظم لائڈ جارج، لارڈ فشر اور دوسرے ممتاز لیڈروں سے ملاقاتیں کر کے خلافت و جزیرۃ العرب کے مسائل اور ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات و مطالبات کی وضاحت کی۔ اس وفد کی کارگزاری کی تفصیلات طوالت طلب ہیں اور ہمارے موضوع سے خارج بھی اس لیے انہیں قلم انداز کیا جاتا ہے۔ اس اجمال کا مقصد صرف بتانا ہے کہ وفد خلافت کی اس آٹھ ماہ کی ہم سفری اور شب و روز کی مصاحبت نے مولانا محمد علی اور حضرت سید صاحب دونوں کو ایک دوسرے کا بے حد گرویدہ اور قدردان بنا دیا تھا۔ لندن کے دوران قیام میں جب سید صاحب نے مشہور انگریزی مجلہ "فارن افیرز" میں مسئلۂ خلافت پر ایک مدلل اور جامع مضمون لکھا تو مولانا محمد علی نے بار بار اس کی تعریف و تحسین کی۔ اسی طرح وفد خلافت جب ہندوستان واپس آیا تو یہاں کے بعض حلقوں میں مولانا محمد علی اور ان کے رفقائے وفد کی یورپ میں فضول خرچیوں اور قومی دولت کے اسراف بے جا کے الزامات کا ہنگامہ گرم ہوا۔ اس وقت مرکزی خلافت کمیٹی نے "حسابات وفد خلافت" کے نام سے ایک مختصر کتاب شائع کی۔ جس میں خلافت ڈیلیگیشن کے واقعی مصارف کی پوری تفصیلات درج ہیں۔ اس کے شروع میں علامہ سید سلیمان نے ایک مقدمہ سپرد قلم کیا ہے۔ جس میں وہ ایک جگہ مولانا محمد علی کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"ہمارے رئیس وفد کو حسابات کی ترتیب اور درستگی میں اس قدر اہتمام بلکہ غلو تھا کہ کبھی کبھی ان کے ساتھ کے (طلا) کو غصہ آجاتا تھا۔ ان کے ہاتھ سے جو اخراجات ہوتے تھے وہ روزانہ ان کو اپنی نوٹ بک میں درج کر لیتے تھے۔ اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی فرض تھا کہ اپنے بے پرواہ رفقائے سفر کے اخراجات کو یاد رکھیں اور رات کو سوتے وقت

---

[۱] مکتوب بنام سید عبد الحکیم دسنوی معارف ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۲۳۰

[illegible] کا حساب شمار کرنے بیٹھتے تھے تو حقیقت یہ ہے کہ ان کی یاد [illegible] پر تعجب ہوتا تھا۔

محمد علی اور دارالمصنفین

دارالمصنفین کا قیام ۱۹۱۴ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس وقت پہلی جنگ عظیم کا ہنگامۂ کارزار گرم ہو چکا تھا۔ مولانا محمد علی کے شہرۂ آفاق انگریزی اخبار "کامریڈ" اور اردو روزنامہ "ہمدرد" کی ہر طرف دھوم مچی ہوئی تھی۔ ہمدرد اخبار بلاشبہ اردو صحافت کی تاریخ میں ظاہری و معنوی دونوں حیثیتوں سے ایک نئے باب کا اضافہ تھا۔ دارالمصنفین کی تاسیس تک مولانا محمد علی صحافت کی راہ سے مسلمانوں کی عوامی قیادت کی زمام سنبھال چکے تھے۔ اور ان کی گوناگوں و متنوع مصروفیات روز افزوں ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر ۱۹۱۵ء کا وسط ہوتے ہوتے وہ قید و بند کی آزمائشوں میں مبتلا ہو گئے جس کا سلسلہ تقریباً پانچ سال تک ممتد رہا۔ اس دوران میں مولانا محمد علی کے دل میں اپنے استاذ کی علمی یادگار دارالمصنفین کی زیارت کی تمنا برابر پیدا ہوتی رہی، جس کا اندازہ سید صاحب کے نام چھندواڑہ سے ان کے نام ایک خط مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۱۷ء کے درج ذیل اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے۔

> "آپ کو تو غالباً معلوم ہوگا کہ دارالمصنفین کی تحریک میں نے ہی کانفرنس میں بمقام راولپنڈی کی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ مجھے اس تحریک سے کس قدر دلچسپی ہے۔ افسوس ہے کہ جب یہ پودا لگایا گیا میں نظر بند ہونے کے قریب ہی تھا اور اب جب کہ یہ بار آور ہو رہا ہے اسی طرح نظر بند ہوں۔ تاہم اس کے حالات اور ضروریات سے مطلع فرماتے رہیں۔ میں جن تصانیف یا تراجم کی ضرورت محسوس کروں گا اس کے متعلق لکھتا رہوں گا۔ تاکہ آپ حضرات کو فرصت ہو تو اس طرف متوجہ ہوں۔"[۱۵]

اسی طرح بیتول جیل سے مولانا شوکت علی اپنے ایک خط مورخہ ۵ نومبر ۱۹۱۷ء میں مولوی مسعود علی ندوی کو لکھتے ہیں:۔

---

[۱۴] رئیس احمد جعفری: سیرت محمد علی ص ۲۰۷

[۱۵] خطوط محمد علی ص ۵۵

"... کا مستقل ارادہ ہے کہ جب خدا کی دی ہوئی آزادی ہم کو ملے گی تو وہ اس کی خدمت ضرور ... سے جلد تر فارغ ہو کر سیدھے اعظم گڑھ آئیں اور وہاں قیام کر کے پوری محنت کے ساتھ اپنی انگریزی کی قابلیت ادبی راہ میں صرف کریں۔ سیرت نبوی کو انگریزی جامہ پہنا کر پیام حق یورپ کے کانوں تک پہنچائیں"۔[۸۸]

مولانا محمد علی نے سید صاحب کے نام متعدد خطوط میں اپنی اس آرزو کا اعادہ کیا ہے کہ "جب چھوٹوں گا ضرور رفقائے استاد کے پھولوں کی خوشبو سے دماغ و روح کو معطر کروں گا"۔ حضرت سید کے برابر انھیں ان کا یہ وعدہ یاد دلاتے رہے اور بالآخر مارچ ۱۹۲۱ء میں محمد علی کی یہ دیرینہ آرزو شرمندۂ تکمیل ہوئی۔ دار المصنفین میں ان کی آمد و روانگی کا ذکر سید صاحب نے معارف کے شذرات میں بڑی اہمیت اور عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

"یکم مارچ ۱۹۲۱ء کو سالہا سال کے وعدوں کے بعد محترم محمد علی[۸۹] نے شبلی منزل کو رونق بخشی وہ اس وقت سے جب نظربند تھے یہ وعدہ کر چکے تھے کہ آزاد ہو کر وہ سب سے پہلے دار المصنفین میں آئیں گے اور چھ مہینے اس گمنام مقام کے کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر عربی کی تکمیل اور سیرت نبوی کا انگریزی ترجمہ کریں گے۔ لیکن آزادی کے ساتھ جو اطمینان شکن اور امن کش واقعات پیش آئے وہ سب کے سامنے ہیں۔"

"بہر حال یہ پرانا وعدہ کسی نہ کسی صورت میں یکم مارچ کو پورا ہوا۔ ہزارہا آدمی استقبال کے لیے شاہ گنج سے اعظم گڑھ (۲۳ میل) اور شہر اعظم گڑھ کے ناکہ سے شبلی منزل تک (۲ میل) موجود تھے۔ شبلی منزل پہنچ کر سب سے پہلے وہ استاذ مرحوم (مولانا شبلی) کی قبر پر گئے اور پھولوں کے وہ ہار جو قدردانوں نے ان کے گلے میں ڈالے تھے قبر کے ایک گوشے میں ڈال دیے۔ اس کے بعد انھوں نے دار المصنفین کی "خانقاہ" میں ایک دن ٹھہر کر مختلف شعبوں کو دیکھا اور دوسری شام کو علی گڑھ واپس چلے گئے"۔[۹۰]

دار المصنفین سے اسی غایت تعلق کے باعث اس کی علمی سرگرمیوں سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ اپنی

---

۸۸ معارف اکتوبر ۱۹۱۸ء ص ۲۷   ۸۹ سید صاحب کی خواہش تھی کہ "مسٹر کی جگہ اس لفظ کو رواج دیا جائے"۔ معارف مارچ ۱۹۲۱ء   ۹۰ شذرات معارف مارچ ۱۹۲۱ء ص ۱۶۲

گوناگوں قومی و سیاسی مصروفیات کے ہجوم میں جب بھی انھیں فرصت کے لمحات میسر آتے وہ دارالمصنفین کی جدید مطبوعات کا بہت شوق سے مطالعہ کرتے۔ رسالہ معارف سے انھیں ایک خاص انس تھا۔ اس کی مجلدات محفوظ رکھنے کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ سید صاحب کو خطوط لکھ کر تحقیق و تالیف کے جدید عصری تقاضوں اور نئے نئے میدانوں کی نشان دہی کرتے۔ علمی مشورے دیتے اور یہاں کی نئی کتابوں کے غائرانہ مطالعہ کے بعد اپنی بے لاگ مگر منصفانہ رائے سے مطلع کرتے۔ چنانچہ جس وقت ارض القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے مولانا محمد علی چھندواڑہ میں نظربند تھے۔ سید صاحب نے ان کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کے لیے وہیں یہ کتاب بھیج دی۔ اس کی رسید دمولیابی میں وہ سید صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اس زمانے میں ارض القرآن جیسی کتاب کی سخت ضرورت درپیش تھی۔ میرا تو گمان ہے کہ خداوند کریم نے آپ کو صرف میری ضرورت کے دور کرنے کے لیے اس کی تصنیف پر آمادہ کیا۔ جب یہ ہے تو مجھ سے زیادہ کون مشکور دممنون ہوگا۔ یہ محض بیعانہ ہے۔ اصل قیمت پڑھنے کے بعد ادا ہوگی۔"[1]

پھر ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

"مسعود صاحب سے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ صحابۂ کرام کے متعلق ایک تالیف تیار ہے مگر طباعت میں کیوں دیر ہے۔ بھائی یہ تعویق تو ہم لوگوں پر جبر ہے۔ کیا ایسی کتابوں کے بکنے میں دقت پیش آتی ہے۔ واللہ ارض القرآن جیسی کتاب کے لیے تو ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو جس کی آمدنی سو دو سو روپے ماہوار کی ہے کم از کم پچیس روپیہ دینا ضروری ہے اور سیرت کے لیے تو ہر شخص کو ایک ماہ کی آمدنی دینا لازمی ہے۔ ہم لاکھ نادار سہی مگر اتنے بھی نادار نہیں ہیں کہ سال میں بیس پچیس روپیہ ایسی کتابوں کی خریداری کے لیے نہ نکال سکیں۔"[2]

۲۴ ستمبر ۱۹۱۶ء کو بیتول جیل سے مولوی مسعود علی ندوی کو سید صاحب کی کوتاہ قلمی کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"برادرم سید سلیمان صاحب کے محبت نامہ کا اب تک انتظار ہے۔ مگر شکایت نہیں۔

نمبر ۱ خطوط محمد علی ص ۵۴

نمبر ۲ خطوط محمد علی مرتبہ محمد سرور ص ۸۴

کیجئے، اس عرصہ میں میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد بھی ختم کر ڈالی۔ سلیمان صاحب اسی طرح کتابیں لکھتے رہیں اور ساری عمر بھی خط نہ لکھیں تب بھی شکایت کا موقع نہ ہوگا بلکہ مشکوریت کا سلسلہ جاری رہے گا۔"[22]

سیرت النبی جلد اول کی اشاعت کی خبر ملتے ہی اس کی دید و مطالعہ کے اشتیاق سے بے تاب ہوکر سید صاحب کو لکھتے ہیں :۔

"کل تمام ہی معارف دیکھنے میں آیا۔ اور سیرت کی پہلی جلد تیار ہو جانے کا مژدہ سنایا اب بھی اگر آپ ایک جلد ارسال نہ فرمائیں گے تو یقین کیجئے میں رسیل تڑا کر خود اعظم گڑھ آکودوں گا اور دار المصنفین میں وہ ہڑبونگ مچاؤں گا کہ آپ حضرات اہل قلم کی محبوب یکسوئی کا خاتمہ ہو جائے گا۔"[23]

وہ رسالہ معارف کے بلند علمی و تحقیقی معیار کے دل سے معترف تھے۔ اس کی مکمل فائلوں کو جلد کرانے کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ ۴ر ستمبر ۱۹ء کو ایک خط میں سید صاحب کو تحریر کرتے ہیں :۔

"اب تک میرے متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں اور ممکن ہے میرے عزیز دوست اور سارق کتب سید جالب صاحب ان میں سے اکثر پر قبضہ بھی کر چکے ہوں یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرالی جائیں۔"[24]

دار المصنفین کے اولین ناظم امور انتظامی مولوی مسعود علی ندوی تحریک خلافت کے ممتاز کارکنوں اور علی برادران کے مخصوص مخلصین میں تھے۔ ۴۲ر ستمبر ۱۹ء کو مولانا محمد علی نے بیتول جیل سے ایک طویل خط لکھا تھا۔ اس کی ہر سطر دار المصنفین کی حاشیہ نشینی پر احساس فخر اور سید صاحب کے گوناگوں فضائل و کمالات کے ذکر سے معمور ہے۔ اسی خط میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"دار المصنفین کسی ایک شخص کا نام نہیں۔ اور اگر نام بھی ہو تب بھی شبلی مرحوم میں ان کی تمام علمی ذریت شامل ہے۔ اور اب اسی طرح سید سلیمان ندوی میں سارا دار المصنفین

---

[22] خطوط محمد علی مرتبہ محمد سرور ص ۸۵

[23] ایضاً ص ۵۸

[24] ایضاً ص ٦٠

اور تمام ہندو خاموش ہے۔ [25]"

معارف اور محمد علی

حضرت سید صاحب نے دار المصنفین کے ماہانہ آرگن "معارف" کے شذرات کو علی برادران کی سیاسی و اخلاقی حمایت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ چنانچہ جب مولانا محمد علی تقریباً پانچ سال (مئی ۱۹۱۵ء تا دسمبر ۱۹۱۹ء تک) ملک کے مختلف مقامات مثلاً مہرولی، لینسڈون، چھندواڑہ اور بیتول میں قید و بند کی آزمائشوں میں مبتلا رہے اور ان کی جاں نثاری کا دم بھرنے والے مسلمانوں میں عزت و حمیت کی کوئی حرکت نہ پیدا ہو سکی۔ تو سید صاحب نے اکتوبر ۱۹۱۷ء کے معارف میں بڑی جرأت اور دکھ کے ساتھ لکھا کہ:۔

"مسلمانوں کی ترقی اور تنزلی کا ایک ہی سبب ہے۔ اور وہ ہے ان کا وقتی اور فوری جوش۔ وہ سیلاب کے مانند پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں۔ لیکن کوہ کن کی طرح ایک ایک پتھر جدا کر کے راستہ صاف نہیں کر سکتے۔ وہ بجلی کی شل ایک آن میں خرمن کو خاک سیاہ کر سکتے ہیں۔ لیکن چیونٹی کی طرح ایک ایک دانہ نہیں ڈھو سکتے۔ وہ ایک مسجد کی مدافعت میں اپنا خون پانی کی طرح بہا سکتے ہیں۔ لیکن ایک منہدم مسجد کو دوبارہ بنانے کے لیے مسلسل کوشش جاری نہیں رکھ سکتے ہیں۔ یہ ان سے ممکن تھا کہ محمد علی اور ابو الکلام کے دائیں بائیں گر کر جان دے دیتے۔ لیکن یہ ان کے بس کی بات نہیں کہ وہ مسلسل آئینی جدّ و جہد سے ان اسیرانِ اسلام کو چھڑا لائیں ؎

ما بہ طینت آدم زخمیرِ دگر است تو توقع زگِل کوزہ گراں میداری

مسز اینی بیسنٹ چھوٹ سکتی ہیں کہ ان کی آزادی کے لیے وہ قوم بیتاب تھی جو اپنی مسلسل اور پائیدار کوششوں سے برطانیہ کے پرعظمت اور ذخار سمندر کے کناروں کو ہلا سکتی ہے اور اس وقت تک ہلاتی رہ سکتی ہے جب تک گوہرِ مقصود اس کے ہاتھ نہ آ جائے۔ لیکن مسلمان دو ہی کام کر سکتے ہیں یا اس پُرخطر دریا میں کود کر اپنی جان گنوا دیں یا اس میں پیل کر پانی کی صاف و شفاف سطح کو گدلا کر دیں [26]۔"

---

[25] خطوط محمد علی مرتبہ محمد سرور ص ۸۵

[26] شذرات معارف اکتوبر ۱۹۱۷ء ص ۲۴۲

اس طرح "ہمدرد" مالی خسارے کے باعث بند ہوگیا تو سید صاحب نے اسے ایک عظیم المیہ قرار دیتے ہوئے دردِ دل کے ساتھ اس کا ماتم کیا اور ہمدرد کی قومی و صحافتی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ لکھتے ہیں:۔

"ملک کے تمام لوگوں نے اس خبر کو افسوس کے ساتھ سنا ہوگا کہ مولانا محمد علی نے اپنا روزنامہ اخبار ہمدرد اس بنا پر بند کر دیا کہ اس کے خریداروں کی تعداد اس قابل نہیں رہ گئی تھی کہ وہ اخبار کی اشاعت کا بار اٹھا سکتی۔ مولانا محمد علی کے مسلک اور مشرب سے جس کسی کو بھی اور جس قدر بھی اختلاف ہو تاہم اس اظہار میں بیک نہیں کہ ہمدرد تنہا اردو کا روزنامہ تھا جس کا اصول عوام پرستی کے سیلاب میں بہنا نہیں، بلکہ اپنے مسلک پر عوام کو چلانا تھا۔ وہ تفریح و قہقہہ کا اخبار نہ تھا بلکہ عوام اور اردو دانوں کو سیاسی مسائل سکھانے والا نصاب درس تھا۔ اس میں خبریں اپنی تبلیغ، پروپیگنڈے اور خریداری بڑھانے کے اصول پر نہیں شائع ہوتی تھیں۔ بلکہ ملک کو حقیقت و واقعیت سے باخبر رکھنے کے لیے اس کے مضامین صرف دور از کار انشاپردازی اور بے معنی لفاظی سے پاک ہوتے تھے۔ اس کے مقالے معلومات سے لبریز، دلائل سے معمور اور سنجیدگی و متانت کے معیار پر پورے ہوتے تھے، بازاری لطائف و ظرائف، عامیانہ چٹکلوں اور بے سلیقہ الفاظ سے وہ پاک ہوتا تھا۔ اس کی ناکامی نے یہ افسوسناک حقیقت ثابت کر دی کہ مسلمان اب تک سنجیدہ متین اور باوقار لٹریچر کی قدر دانی کے لیے تیار نہیں۔[۲۷]"

حضرت سید صاحب معارف میں وقتاً فوقتاً مولانا محمد علی جوہر کا کلام بھی شائع کرتے رہتے تھے چونکہ بقول سید صاحب "محمد علی کی شاعری کا جوہر قید خانہ میں جا کر کھلا[۲۸]" تھا۔ اس لیے ان کا بیشتر کلام حبسیات پر مشتمل ہے۔ یعنی قفس بجس میں ان کے جو واردات قلبی نغمات موزوں بن کر اشعار کا روپ اختیار کر لیتے تھے انھیں وہ سید صاحب کی خدمت میں ارسال کر دیتے تھے۔ مثال کے طور پر ۱۹۱۷ء میں جب وہ بیتول جیل میں تھے تو وہ ماہ رمضان المبارک میں "الوداع" کے عنوان سے تیرہ اشعار کی ایک نظم لکھ کر بھیجی اور اس کے ساتھ یہ بھی تحریر کیا کہ "چند اشعار بے ساختہ زبان پر آگئے۔ نذر خدمت کرتا ہوں۔ یہ شب قدر کی بیداری اور یوم وداع کا تحفہ ہے۔" سید صاحب نے یہ نظم معارف اکتوبر ۱۹۱۷ء میں "زندانیوں کا وداع رمضان" کے عنوان سے شائع کی۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

۲۷؎ معارف اپریل ۱۹۲۹ء ص ۲۴۲

۲۸؎ معارف فروری ۱۹۲۲ء ص ۱۵۶

الوداع اے ماہِ رمضان الوداع   بہترین غم گساراں الوداع

تجھ میں اترا آخری پیغام حق   تو ہی تھا شایانِ قرآں الوداع

قیدِ تنہائی کی رونق تجھ سے تھی   اے شریکِ بزم زنداں الوداع

دور کر دی تو نے ظلمت قید کی   تجھ سے ہر شب تھا چراغاں الوداع

کاروانِ خیر و برکت چل دیا   رہ گئے سب دل میں ارماں الوداع

اسی طرح دسمبر ۱۹۲۲ء کے معارف میں "عاشق رسول قیدی کی فریاد - زندانِ بیجاپور میں" کے عنوان سے جوہر کی سات اشعار کی ایک نظم شائع کی، جس کے نمونے کے اشعار یہ ہیں ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں   اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت   اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ ہیں ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجیں!   بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

بیٹھا ہوا توبہ کی تو خیر منا یا کر   ٹلتی نہیں جوہر اس دیس کی برساتیں

پھر نومبر ۱۹۲۳ء کے معارف میں سید صاحب نے بیس اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم "کلام جوہر" کے عنوان سے شائع کی جس پر اک سطری یہ ادارتی نوٹ بھی تحریر فرمایا:-

"جناب جوہر کا یہ کلام ان کی آزادی سے پہلے آزاد ہو کر ہمارے پاس پہنچا تھا۔"

اس طویل نظم کے چند منتخب اشعار پیش خدمت ہیں:-

یاں تو ہے نام عشق کا لینا   اپنے پیچھے بلا لگا لینا

ہم پھریں تجھ سے یہ نہ ہو یارب   اس سے پہلے ہمیں اٹھا لینا

آج جی بھر کے دیکھ لینے دو   کل کو دل کھول کر سُنا لینا

وصل کی شب نہ چھیڑ قصۂ ہجر   یہ کسی اور دن سنا لینا

ان کے در سے زکوٰۃِ حسن اگر   گالیاں بھی ملیں تو کھا لینا

تم کو زیبا نہ تھا وداع کے وقت   آنکھ جوہر سے یوں چرا لینا

وفد حجاز میں معیت اور اختلاف رائے

مولانا محمد علی اور حضرت سید صاحب کے درمیان یہ مثالی تعلق خاطر موتمر اسلامی کے انعقاد تک قائم رہا۔ سلطان عبدالعزیز بن سعود نے ۱۹۲۶ء میں یہ موتمر حجاز میں جمہوری حکومت کے قیام اور اس کے نظام پر صلاح و مشورے نیز حرمین کی حفاظت و اہل حرمین کی خدمت اور حجاج کرام کی راحت و آسائش کے وسائل پر غور و فکر کے لیے طلب کی تھی۔ ہندوستان سے بعض دوسری سیاسی و مذہبی تنظیموں کے ساتھ خلافت کمیٹی کے نام بھی دعوت نامہ آیا تھا۔ چنانچہ اس موتمر میں شرکت کے لیے سید صاحب کی قیادت میں مجلس خلافت کا چار رکنی وفد تشکیل پایا۔ دوسرے ارکان وفد میں علی برادران اور شعیب قریشی شامل تھے۔ وفد کے مکہ پہنچنے تک اس کے تمام ارکان حرم کے آثار و مشاہد کے انہدام اور مسائل حجاز میں بظاہر فکری طور پر ہم آہنگ تھے۔ لیکن موتمر کے دوران میں یہ اتفاق رائے قائم نہ رہ سکا۔ اور حضرت سید صاحب کی رائے ابن سعود کی ملوکیت اور انہدام مقابر کے بارے میں وفد کے دوسرے ارکان سے مختلف ہوگئی۔ جانبین کا موقف مدلل اور مبنی براخلاص تھا۔ اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ سید صاحب نے اپنی طبعی شرافت و مروت کے باعث اس امر پر برملا اختلاف و کشاکش پیدا کرنے کے بجائے ہندوستان کی واپسی کے بعد سیاست ہی سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

مولانا محمد علی نے اس سلسلہ میں بعض ایسے مضامین لکھے اور بیانات دیے جن سے سید صاحب کو اتفاق نہ تھا۔ لیکن اس کا جواب دینے کے بجائے وہ خاموش رہے۔ محترمی صباح الدین صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:۔

> "اسی زمانے میں سید صاحب دہلی تشریف لے گئے تو مولانا محمد علی سے ملاقات ہوئی۔ سید صاحب نے اثنائے گفتگو میں ان سے کہا کہ آپ چاہے جیسے بھی مضامین لکھیں یا بیانات دیں میں خاموش ہی رہوں گا۔ مولانا محمد علی نے برجستہ کہا یہ مضامین اور بیانات تو آپ کو خاموش کرنے ہی کے لیے شائع کیے جا رہے ہیں۔ اس حاضر جوابی سے سید صاحب خود بھی محظوظ ہوئے اور کئی تاریخی صحبتوں میں اس کو دہرایا" (معارف سلیمان نمبر ص ۲۰)

تعلقات کا حسن خاتمہ

لیکن اس اختلاف رائے کے باوجود علامہ سید صاحب کے دل میں مولانا محمد علی کی محبت و گرویدگی اور محاسن وخوبیاں بدستور پیوست رہیں اور وہ آخر تک ان کی ذہانت وصلاحیت، دینی حمیت، اخلاقی جرأت، جذبۂ حق اور سیاسی بصیرت کے بے حد مداح اور معترف رہے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۱ء میں جب انہیں ملت اسلامی کے اس صدی خواں کے انتقال کی خبر ملی تو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ سید صاحب آبدیدہ ہو کر غایت اضطراب میں ٹہل ٹہل کر سکون پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور پھر اپنے خونِ جگر کی سرخی سے معارف کے صفحات پر وہ دردانگیز ماتم بپا کیا کہ اس کو پڑھ کر سخت سے سخت دل والے کا کلیجہ بھی منہ کو آگیا۔

سید صاحب تقریباً نصف صدی تک اپنے احباب اور مشاہیر فضل وکمال کی وفات پر داستان غم رقم کرتے رہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ محمد علی کا ماتم ادب وانشا کا شاہکار، وفور جذبات کی معراج، اور غم واندوہ کا ایک طوفان ہے۔ یہ صرف چند نثری سطور نہیں بلکہ فی الواقع سید صاحب کے دل وجگر کے ٹکڑے اور ان کے رشک رواں کا ایک سمندر ہے۔ ذیل میں اس مرثیہ منثور کے چند اہم اقتباسات کو مضمون کا حسن خاتمہ بنایا جاتا ہے، کیونکہ یہی درحقیقت مولانا محمد علی اور حضرت سید صاحب کے اٹھارہ سالہ تعلقات کا خاتمہ بالخیر بھی ہے:۔

" افسوس وہ پُر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ وہ بیقرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بیتاب ہو ہو جاتا تھا اور اوروں کو بے تاب کرتا تھا ذریعتاً کہ قیامت تک کے لیے ساکن ہوگیا۔ وہ اشک آلود آنکھیں جو دین وملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں، حسرتا کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی۔ وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوشنوا بلبل بن کر چہکتے تھے ان کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے۔ وہ آتشیں زبان جو ہر رزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی اس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی۔ وہ پرجوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہالے جاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ کے لیے تھم گیا وہ پرزور دست وبازو

جو طبی مشغلہ نشست گاہوں اور سبزہ آرائی میں معروف تھے وہ اب ایسے تھکے کہ پھر نہ اٹھیں گے۔ اور
افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعدا کے نرغے میں تنہا لڑ رہا تھا آخر زخموں سے چور
ہوکر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہو سکا۔ الوداع محمد علی الوداع! والسلام الیٰ یوم القیامہ۔"

"تو امت کا عزادار تھا، حق ہے کہ ساری ملت تیری عزادار ہو۔ تو امت محمدیہ کا سوگوار تھا۔
فرض ہے کہ پوری امت محمدی تیرا سوگ کرے۔ تو نے دنیائے اسلام کا ماتم کیا تھا۔ سزاوار ہے کہ دنیائے
اسلام تیرا ماتم کرے۔ ہندوستان کا ماتم دار، طرابلس کا سوگوار، عراق کے لیے غمزدہ، بلقان کے لیے
مضطرب، شام پہ گریاں، انگورہ پہ مرثیہ خواں، حجاز کا سوختۂ غم اور بیت المقدس کے لیے وقف الم، سے
ہند کے آہ و بکا و ماورا، تیرا حق سرزمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا۔ مناسب یہی تھا کہ تیرے لیے اولین
قبلۂ اسلام کا سینہ پھٹ جائے اور تو اس میں سما جائے۔"

"وہ مشرق کی زمین میں پیدا ہوا، لیکن مغرب کی آب و ہوا میں نشو و نما پائی۔ مشرق کی مٹی سے اس
کا جسم بنا، لیکن مغرب کے ہتھیاروں سے اس نے اپنا جسم سجایا۔ اس کا دماغ مغربی مگر دل مشرقی تھا۔
وہ مشرق کی حمایت میں بار ہا مغرب سے مغرب کے ہتھیاروں سے لڑا اور اس نے اس کا لوہا منا لیا۔ وہ
مشرق کا آفتاب تھا۔ یہ آفتاب بھی اگر مشرق میں طلوع ہوکر مغرب میں ڈوبا تو دنیا کا کوئی نیا واقعہ
نہ ہوا۔ اور اس لیے حق تھا کہ مشرق و مغرب کا متحدہ مرکز (بیت المقدس) اس کا مدفن بنے۔ اے
مشرق و مغرب کے مالک! تو اپنی رضامندیوں کے پھول سے اس کا دامن بھر دے۔"

(یادِ رفتگاں ص ۱۵۵-۱۵۶)

جوہرِ ہند اور جوہریِ مصر

مولانا محمد علی جوہر نے دکھی دنیا اور درد مند انسانیت کے لیے جس طرح اپنا دل دکھایا اور مشرقِ وسطیٰ کے مصائب و مشکلات میں گھرے ہوئے قافلہ کی جس جرأت و حوصلہ مندی سے قیادت کی اس کی نظیر آپ کے ہم عصروں میں کم ملے گی۔

آپ کی مثالی موت نے شاندار زندگی کو عظیم سے عظیم تر بنا دیا۔ مولانا کی اس خود پسندیدہ "موت و زیست" نے بعض انسانوں پر اتنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، جو رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔ اردو و انگریزی میں مولانا پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے اکثر جوہر شناس واقف ہیں۔ عربوں نے جس طرح مولانا کی یاد کو سینہ سے لگا رکھا ہے اس سے مولانا کے اہلِ وطن کم آشنا ہیں۔ عرب دانشوروں میں مولانا کے مداح سیکڑوں تھے۔ مخالفین کی تعداد بھی کم نہیں تھی، مولانا اور علامہ رشید رضا ایڈیٹر "المنار" میں ہمیشہ چلتی رہی۔

مولانا کے انتقال کے بعد جس طرح عرب دانشوروں خصوصاً علامہ طنطاوی جوہری نے ان کو خراجِ تحسین پیش کیا، وہ تاریخ اسلام میں اپنی مثال آپ ہے۔ اور ہندوستانیوں کے لیے باعثِ فخر! قبل اس کے کہ میں علامہ طنطاوی جوہری کے نظریات مولانا کے متعلق بیان کروں، اچھا ہوگا کہ کچھ طنطاوی کے بارے میں بتا دیا جائے۔

طنطہ مصر کا مشہور علمی شہر ہے اس شہر کی شہرت میں سید احمد بدوی علیہ الرحمۃ کے مزار طنطہ[1] یونیورسٹی اور علامہ طنطاوی جوہری کی جائے پیدائش نے چار چاند لگا دیے ہیں۔

---

[1] آج کا مصر، از پروفیسر محمد حسن اعظمی مطبوعہ لاہور ۱۹۴۱ء صفحہ ۵۴، صفحہ ۵۵

مفتی محبوب عالم[1] اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں:

"اسکندریہ سے قاہرہ تک راستہ میں آٹھ دس اسٹیشن پڑتے ہیں جن میں طنطا سب سے بڑا ہے ...... یہ جگہ مصریوں کی نظر میں وہ کچھ قابل احترام ہے جیسے ممالک مشرق کے مسلمانوں میں شیخ عبدالقادر جیلانی کا مزار ہے۔"

مصر میں علامہ طنطاوی جو حریت پسند بھی تھے اور اسلام دوست بھی، اس شہر کی عظمت کی یادگار بنے۔ علامہ مفتی عبدہ کے شاگرد رشید تھے۔ اور ان کے نظریات کو پھیلانے میں آپ نے تن من دھن کی بازی لگادی تھی۔ ہندوستان سے آپ کو بے پناہ محبت تھی۔ چنانچہ اپنی اکثر تصانیف میں علماء ہند اور ان کے نظریات کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ "ہندوستانی تہذیب یونان کے مقابلہ میں قدیم بھی ہے اور عظیم بھی۔" وہ اپنے شاگردوں میں ہندوستانی طلبہ کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ علامہ کے ہندوستانی شاگرد حسن الاعظمی جو مصر یونیورسٹی میں پروفیسر بھی رہ چکے ہیں، اپنی کتاب "پان اسلامزم[2] اور محمد عبدہ" کا انتساب ان کے نام اس طرح کرتے ہیں۔ "علامہ طنطاوی جوہری مفسر قرآن کے نام جنھوں نے تحریک اخوت اسلامیہ مصر میں نمایاں حصہ لیا اور مجھے اپنا روحانی فرزند بنانے کا شرف عطا کیا۔"

اس کتاب میں حسن الاعظمی صاحب صفحہ ۲۰۴ پر لکھتے ہیں:-

"جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی دعوت و تحریک فطری اور عصری اصولوں پر قائم تھی۔ اور جس حقیقی اسلام سے انھوں نے اہلِ علم کو روشناس کیا ان اصول اور نظریات کی اشاعت کے سلسلہ میں علامہ طنطاوی جوہری اور ان کی تصانیف کافی مشہور ہیں۔"

ڈاکٹر چارلس ایڈمز[3] اور پروفیسر ہارٹمان نے آپ کی تین کتابوں۔ التاج المرصع بجواہر القرآن والعلوم مطبوعہ ۱۹۱۱ء۔ جمال العالم مطبوعہ ۱۹۱۱ء۔ اور النظام والعالم کو عبدہ و جمال الدین افغانی کے سلسلہ کی تصانیف قرار دیا ہے۔

---

[1] سفرنامہ مفتی محبوب عالم مطبوعہ لاہور صفحہ ۹۱۴

[2] مطبوعہ ۱۹۴۸ء کراچی

[3] اسلام اور تجدد مصر میں از ڈاکٹر چارلس ایڈمز۔ مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور، ۱۹۵۸ء صفحہ ۲۴۹

علامہ کی دیگر کتابوں میں "الانسان" اور "تفسیر القرآن" کافی مشہور ہیں۔ طنطاوی مصری کی تعلیمات کے اصل موضوع مذہب ہیں۔

علامہ طنطاوی نے اس تفسیر کے اغراض و مقاصد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

" میں نے یہ تفسیر خدا کے بھروسہ پر اس امید کے ساتھ لکھی ہے کہ عام مسلمانوں کی آنکھوں سے پردہ ہٹ جائے۔ اور وہ علوم کونیہ " سائنسی علوم " پر غور و فکر کریں۔ یہی ان کی ترقی اور برتری کا راز ہے۔ یہ تفسیر مسلمان نوجوانوں میں آسمان و زمین کے عجائب و غرائب سے واقفیت کا شوق پیدا کرے گی۔ اور کتاب فطرت کے قوانین کی معرفت کی دعوت دے گی۔ اور اس امت میں ایسے افراد پیدا ہونے کا ماحول فراہم کرے گی جو یورپ والوں سے زراعت، طب، معدنیات، حساب، انجینئرنگ اور دیگر علوم و فنون اور صنعت و حرفت میں ترقی کر جائیں گے۔ اور کیونکر ایسا نہ ہو کہ قرآن میں وہ آیتیں جن میں علوم کا ذکر، یا ان سائنسی علوم کی طرف اشارے ہیں، ساڑھے سات سو سے زیادہ ہیں اور خالص فقہی احکام کی آیتیں سو سے زیادہ نہیں، میں نے اس تفسیر میں وہ تمام باتیں بیان کی ہیں جن کی ضرورت مسلمانوں کو ہے۔ انشاء اللہ یہ تفسیر آئندہ لوگوں کی ترقی کا سبب بنے گی جو آج زمین میں کمزور سمجھے جاتے ہیں۔

علامہ انور شاہ صاحب کشمیری اس تفسیر کے بے حد مداح تھے۔ آپ فرماتے ہیں :-

اس میں آیات کریمہ سے متعلق جدید علوم و مسائل پوری تفصیل سے بیان کر دیے گئے ہیں۔

سید سلیمان ندوی صاحب اس تفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

حقیقت یہ ہے کہ اس تفسیر کی تالیف سے شیخ طنطاوی نے علوم عصریہ کے مقابلہ میں وہی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے جو آج سے ساڑھے سات سو برس پیشتر امام فخرالدین رازی نے قدیم یونانی علوم کے مقابلہ میں انجام دی تھی۔ اور اسی لیے یہ کہنا غیر موزوں نہ ہوگا کہ یہ تفسیر چودھویں صدی کی تفسیر کبیر ہے۔ آپ کا شمار اپنے وقت کی تاریخ ساز شخصیتوں میں ہوتا ہے۔

مولانا عبدالشاہد خاں شروانی "کاروانِ خیال" میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"مصر کا طنطاوی ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شکل میں نمودار ہوا تھا۔ لیکن ابھی وقت نے اس کو پہچانا نہیں ہے۔"[1]

علامہ طنطاوی جوہری عرب علمی و سیاسی شخصیتوں میں سب سے زیادہ "مولانا محمد علی جوہر" سے متاثر تھے۔ آپ نے اپنی تقریروں و تحریروں میں جوہر کی بے حد مدح کی ہے۔

مولانا محمد علی کا جب انتقال ہوا تو آپ اپنی کتاب تفسیر قرآن مکمل کر رہے تھے اور اسی وقت جلد نمبر ۲۱ سورہ الزخرف زیرِ تکمیل تھی۔

جب ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء میں یہ جلد شائع ہوئی اور اس میں لوگوں نے مولانا محمد علیؒ کی تصویر اور واقعات تدفین کو دیکھا تو علامہ سے حیرت زدہ ہو کر سوال کیا کہ آپ نے یہ کیا جدت کی ہے اس پر علامہ طنطاوی نے جواب دیا۔ میں نے محمد علی کی دو تصویریں اپنی تفسیر میں شامل کی ہیں مجھے یہ احساس ہے کہ بعض لوگ اس پر معترض ہوں گے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ملت اسلامیہ کو "مقام محمد علی سمجھنے کی توفیق عطا کرے۔ مولانا محمد علی کے بارے میں انھوں نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ، یہ عنوان قائم کیا ہے۔

الفصل السادس

فی ذکر أمر عظیم اسلامی فی اَیامنا هذه

"وَهُوَ دفن فقید الاسلام محمد علی بفلسطین وَهذا حادث لم نظیرة فی التاریخ"

"۲۰۰ ألف یشیعون الجنازة وَ ۱۰۰ ألف یشهدون الصلٰوة"

حفلة التأبین فی المسجد الاقصیٰ

آپ نے صفحہ ۲ تک محمد علی کی حیات، کارنامہ، روداد تجہیز و تکفین پر طویل بحث کی ہے۔ اور پھر ان الفاظ پر اختتام کیا ہے :-

---

[1] "کاروانِ خیال" صفحہ ۲۱" اور "باغی ہندوستان" مطبوعہ ۱۹۴۷ء صفحہ ۷۷"

أصبحت الهند وأبناء العرب اليوم صفاً واحداً في مقابلة من يعتدي على بيت المقدس أو بلاد فلسطين، فهذا مصداق لهذه الآية ونور من أنوار النبوة المحمدية والحمد لله رب العالمين

(انتهى الفصل السادس)

مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد علی کی موت ہمارے زمانے کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ کبھی کبھی کائنات میں ایسے واقعات ظہور پذیر ہوجاتے ہیں کہ جن کی وجہ سے عام رسم و رواج اصول ضوابط بالائے طاق رکھنا پڑتے ہیں۔ میرے نزدیک محمد علی کی حیات و موت بھی ان ہی واقعات میں سے ایک ہے۔ جن کی وجہ سے تاریخ میں نئے موڑ آتے ہیں۔ محمد علی نے تنہا اس زمانے میں ایشیا کی آزادی ملت اسلامیہ کی برتری، عرب کا ز و مسئلہ فلسطین کی جو خدمت انجام دی ہے، وہ قوم ترک و فارس بھی انجام نہ دے سکیں۔ میرے نزدیک اس عظیم "قائد ہند" کو اہل عرب کی طرف سے خراج تحسین کی ایک صورت یہ تھی کہ میں ملت اسلامیہ کی ہمیشہ باقی رہنے والی کتاب جس کو محمد علی نے اپنا نصب العین بنالیا تھا، اس میں محمد علی کو جگہ دے کر حیات دوام عطا کروں۔ اور محمد علی کی یاد کو ہمیشہ کے لیے قائم کردوں میں نے اس مرد مجاہد کو قرآنی کسوٹی پر کس کے دیکھا تو محمد علی کو قرآن کی آیت جہاد کی عملی تفسیر پایا۔ محمد علی جیسے افراد قدرت بوقت ضرورت کبھی کبھی ہی پیدا کرتی ہے۔ وہ ایک مجاہد تھا جو انسانی آزادی کے لیے سامراجی طاقتوں سے لڑا۔ اور میدان جہاد میں مرا۔ محمد علی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے عرب اور ہند کے فاصلے کو ختم کرکے دونوں کو ایک صف میں کھڑا کردیا۔

علامہ طنطاوی نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ محمد علی کو ان کی حسب وصیت ہندوستانی کھدر کے کفن میں دفن کیا گیا۔ محمد علی سے اپنی خوش عقیدگی کا آخری اظہار علامہ طنطاوی نے اس طرح کیا کہ اپنا قیمتی پورا کتب خانہ مصر میں ہندوستانی طلبہ کی انجمن "جماعت الاخوۃ الاسلامیۃ" کے حوالہ کردیا۔

اس خیال سے کہ شاید پھر کوئی ان طلباء میں سے محمد علی جیسا پیدا ہو اور ان کی تعلیم و تربیت میں میرا بھی حصہ ہو حسن الاعظمی لکھتے ہیں :۔

"یہ بیش قیمت کتب خانہ ہے۔ جس میں علامہ کے سارے مسودات اور قلمی کتابیں شامل ہیں۔

تفسیر بیس جلدوں میں ہے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی ہوگیا ہے۔ طنطاوی کی حسبِ وصیت آج بھی جلد بیس صفحات ۱۱۲ پر محمد علی کی تصویر "سوانح علمائے عرب" کے تاثرات "تفسیر جوہری" میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

علامہ جوہری جوہر شناس تھے۔ انھوں نے شعوری طور پر ملّت عربیہ کو مقام محمد علی جوہر سے روشناس کرد یا۔ کیا عجب ہے کہ جوہر کے ہم نوا دبیر الہند مرزا دبیر کو قدرت نے تفسیر جوہری کے بارے میں یہ اشعار القا کیے ہوں۔ تاکہ ہم ہندوستانیوں پر ناشکری کا الزام نہ آئے۔

دبیر کہتے ہیں ؎

نکلی غلاف نور سے "تفسیر جوہری"	یا آکے دست بوس سلیماں ہوئی پری
یا حجلہ سے عروس نے کی جلوہ گستری	یا ہے یہ شاخ میوہ طوبیٰ ہری بھری

مولانا محمد علی کے انتقال پر عربی کے مشہور و جلیل شاعر احمد شوقی بک نے ۲۲ اشعار کا ایک مرثیہ کہا تھا جس کے چند اشعار کا ترجمہ ذیل میں شائع کیا جاتا ہے، ترجمہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب کا کیا ہوا ہے

رہنمائے قوم محمد علی سے کہہ دو کہ نیل پر اور اس کے سنگ ریزوں پر غم و اندوہ چھا گیا ہے

وہ تمہاری طرف اپنی پلکوں اور اپنے آنسوؤں سے چل رہا ہے اور تمہارے بھائی کی طرف اپنے قلب اور جذبات تعزیت و غم خواری لے کر

تم نے اسے عبور کیا تو اس کے کناروں نے تمہیں اپنے آغوش میں لے لیا، اگر تم ذرا ٹھہر جاتے تو وہ تمہیں اپنے سینے میں چھپا لیتا۔

تمہیں اس کی زمین سے اس طرح گزرنے کی عادت رہی ہے جیسے بادل اپنا سایہ و پانی لے کر گزرتا ہے

تم جس گھر کے بیٹوں میں سے ہو اس کے سائے میں اور اللہ کی آغوش میں سو جاؤ، یہاں تمہارے لیے پردیس نہیں ہے

(ہماری زبان ـ مولانا محمد علی نمبر صفحہ ۷)

ڈاکٹر نیر سلطان

مولانا محمد علی کا ارادۂ خودکشی

چند سال قبل مجھے مولانا محمد علیؒ کی خودنوشت سوانح حیات "میری زندگی ــ ایک جزو"[1] کے مطالعے کا موقع ملا۔ اس میں جس واقعے نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا اس کا تعلق مولانا کے ملّی احساس کے اس وفور سے تھا جس کو صدمہ پہنچنے کے نتیجے میں انھوں نے آخر ۱۹۱۲ء کی ایک رات بالاخانے سے گر کر خودکشی کر لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اس شدید ردعمل کے پس منظر میں دراصل ترکوں کی وہ شکست تھی جو انھیں اکتوبر نومبر ۱۹۱۲ء میں بلقان کی جنگ میں برداشت کرنا پڑی تھی۔ ترکوں کے خلاف یورپی قوموں کی مورچہ بندی کی باضابطہ ابتدا تو ۱۹۱۱ء میں ہو چکی تھی جب ۲۶ ستمبر کو اٹلی نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا اور اس کے بعد بلغاریہ، سرویا، یونان اور مانٹی نیگرو میں ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ اعلان جنگ کے بعد اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا تھا اور بالآخر مارچ ۱۹۱۲ء میں اس پر اٹلی کا قبضہ ہو گیا تھا۔ طرابلس کی جنگ نے ہندوستانی مسلمانوں کو بے چین کر دیا تھا اور وہ بڑی تشویش سے ترکی کو درپیش خطرات کو دیکھنے لگے تھے۔ طرابلس پر اٹلی کی فتح سے بلقان کی دوسری ریاستوں کو بھی حوصلہ ملا۔ یونان نے بڑھ کر کریٹ پر قبضہ کر لیا۔ ادھر فرانس میں روسی سفیر کی کوششوں سے ترکوں کے خلاف ایک ساتھ مل کر جنگ کرنے کے واسطے بلغاریہ اور سرویا کے درمیان معاہدہ ہوا جس پر مارچ ۱۹۱۲ء ہی میں دستخط ہو گئے۔ مئی ۱۹۱۲ء میں بلغاریہ اور یونان نے بھی ایک دفاعی معاہدہ کر لیا اور اگست ۱۹۱۲ء میں مانٹی نیگرو کو بھی بلقان ریاستوں کی لیگ میں شامل کرنے کے لیے آمادہ کر لیا گیا۔ اس کے

---

[1] My Life: A Fragment

فوراً بعد [illegible] شروع ہوئے اور ۸ اکتوبر کو مانٹی نیگرو نے ترکوں کے خلاف
اعلان جنگ کر دیا۔ ۱۷ اکتوبر کو بلغاریہ اور سرویا نے اور ۱۸ اکتوبر کو یونان نے بھی ایسے ہی اعلانات
کر دیے۔ [illegible] لیبیا (طرابلس) پر قابض تھا تو ترکوں کو بھی اسی جنگ کو ختم کرنا پڑا اور ترکی کو بلغاریہ،
سرویا، [illegible] اور یونان کے خلاف بیک وقت چار محاذ کھولنا پڑے۔ ظاہر ہے اس جنگی لڑائی
کو سنبھالنا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ ترکوں کو پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ۲۲ اکتوبر کو بلغاریوں
نے ترکی [illegible] کو شکست دی۔ ۲۶ اکتوبر کو سرویا کو مینورہ کو فتح کر کے [illegible] میں گھس آیا۔
ترکوں نے [illegible] سے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن ۸ نومبر کو یونانی فوجیں سالونیکا میں داخل ہو گئیں اور
اس طرح ترکوں کو ہر طرف سے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔[1]

ترکوں کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی جو ہمدردیاں تھیں وہ طرابلس کی جنگ کے آغاز سے بہت بڑھ
گئی تھیں۔ بلقان کی جنگ کے دوران ان ہمدردیوں نے ایک شدید ذہنی اور جذباتی کرب کی شکل اختیار
کر لی تھی۔ مولانا محمد علی اپنے اخبار "کامریڈ" کے صفحات کے ذریعے جنگ کی تازہ ترین اطلاعات اور
ان پر اپنے تاثرات اور تبصرے برابر پیش کر رہے تھے۔ لیکن جیسے جیسے ترکی کے لیے حالات سنگین ہوتے گئے
ویسے ہی ویسے ہندوستانی مسلمانوں کی تشویش بھی برداشت کی حدوں سے باہر نکلتی محسوس ہونے لگی۔
اس موقع پر مولانا محمد علی کی جو ذہنی کیفیت تھی اس کا تفصیلی ذکر انھوں نے اپنی سوانح حیات میں کیا ہے۔
وہ تحریر کرتے ہیں :۔

> " بلقان میں اس تباہ کن جنگ کے دوران میرے جذبات اتنے شدید تھے کہ میں اس کا اعتراف
> کرتا ہوں کہ ایک دن میں نے ان سے مغلوب ہو کر خودکشی کرنے کا سوچ لیا تھا۔ یہ بات بلاشبہ
> بڑی متضاد معلوم ہوتی ہے کہ اخلاقی بزدلی کے اس فعل کے لیے کچھ ہمت بھی چاہیے ہوتی ہے
> اور میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیا اس فیصلہ کن رات کو آخری قدم اٹھانے کے لیے مجھ میں

---

[1] ملاحظہ ہو "مصطفیٰ کمال اور تاریخ ترکی و فلسطین وغیرہ" از محمد اظہر علی کاکوروی۔ سلطانیہ برقی پریس لکھنؤ
۱۹۳۸ء صفحات ۱۲۲ تا ۱۲۳۔ اور

A.J. Grant and Harold Temperley : "Europe in the 19th and 20th Century", pp. 376-377.

محصور بہت پہلے ہو گئی تھی۔ لڑائی کی سب سے آخری اطلاع جو مجھے ملی تھی وہ یہ تھی کہ بلغاری فوج
قسطنطنیہ کے شہر پناہ سے صرف ۲۵ میل دور تھی۔ اس قسطنطنیہ سے جس کا نام پایۂ تخت
منتخب شہر مسلمانوں کے لیے تخت اس کا حامل تھا اور جو ان کی آخری امیدوں کا مرکز
تھا۔ ... ۱۹۱۲ء کے موسم خزاں کی اس رات مجھے اپنی پست اور بزدلی کی آزمائش
سے میرے ایک مسلمان دوست کی اچانک آمد نے بچا لیا۔ میرے ان دوست نے کچھ عرصہ
قبل ہی آکسفورڈ سے ڈگری حاصل کی تھی اور اس وقت ان کے ساتھ اسی یونیورسٹی کے ان
کے ایک انگریز ہم جماعت تھے جو ان کے مہمان تھے اور جنھوں نے ہندوستانی ناچ دیکھنے
کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اسی کے لیے نجی طور پر انتظامات کیے گئے تھے اور اس کے واسطے جس جگہ کا
انتخاب کیا گیا تھا وہ ایک بیرسٹر کا مکان تھا جو میرے ہمسایہ تھے۔ میرے دوست نے میری
شرکت پر اصرار کیا۔ میں نے جتنا اپنی ادارتی مصروفیتوں کا عذر پیش کیا اور دردانگیز آخری
اطلاع کے بعد اپنے جذبات کی کیفیت انھیں بتائی، اتنا ہی میرے دوست میرا انکار سننے پر
آمادہ نہ تھے اور وہ مجھے اپنے ادارتی کمرے میں تقریباً جسمانی طور پر اٹھا کر دوسرے مکان میں
ہونے والی نجی محفل رقص میں جبراً لے گئے۔ تو اس طرح بجائے ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور خون میں
لتھڑے ہوئے ایک جسم کے جس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا کہ وہ اتفاقاً تیسری منزل سے نیچے
گر کر اس حادثے کا شکار ہوا ہو، میں یہاں ایک ایسی "عیاشانہ محفل" میں ہاتھ بٹا رہا تھا، جو
میرے نوجوان دوست نے اپنے آکسفورڈ کے ساتھی کے اشتیاق کو پورا کرنے کے لیے بجائی تھی۔"[۳]

مولانا کا یہ شدید تاثر حالات سے پوری مطابقت رکھتا تھا۔ دوسرے حساس مسلمانوں کا اس موقعے
پر کیا رد عمل تھا اس کی صرف دو مثالیں کافی ہوں گی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے اس موقعے
پر اپنی ڈائری میں یہ الفاظ درج کیے تھے :-

---

۳ My Life : A Fragment - An Autobiographical Sketch of Maulana Muhammad Ali", Edited by Afzal Iqbal, 2nd Edition, Lahore-1944, pp. 38-39

[illegible] کے لیے بہت تیار نہ تھے۔ ہر شخص کو ترکی افواج پر پورا اعتماد تھا، خصوصاً جبکہ
[illegible] میں آئینی حکومت ہے۔ اصلاحیں کی گئی ہیں اور نوجوان پارٹی [illegible]
کوشش میں مصروف ہے۔ ان سب کے ہوتے ہوئے ترکی میں ایسے نتیجے نہ ہونے چاہیے تھے۔
[illegible] ہیں۔ بلغاریہ کی فوج قسطنطنیہ سے ۲۰ میل قریب آگئی ہے اور اب ترک اپنی
جانوں کی حفاظت کی خاطر جنگ کر رہے ہیں۔ در حقیقت جنگ صلیب و ہلال کے درمیان ہے
...... تمام دنیائے اسلام پر آسمان سے بجلی گری ہے۔ ہندوستان میں مسلمان خوف و
اضطراب سے بھر گئے ہیں۔ مستقبل نہایت خوفناک اور تاریک نظر آتا ہے۔"[1]

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اس وقت یورپ میں تھے اور چند دن پہلے ہی وہ ترکی کا دورہ کرنے کے بعد وہاں لوٹے تھے۔ یکم نومبر ۱۹۱۲ء کو انھوں نے وینس سے اپنے والد کو خط میں لکھا۔

"حقیقت میں بلقان اور یورپ نے ثابت کر دیا کہ خدا نے کم از کم فی الحال مسلمانوں کو چھوڑ دیا ہے۔ واللہ باللہ ترکوں کا شکست کھانا صرف حادثہ الٰہی ہے ورنہ اب بھی میں پھر وہی کہتا ہوں کہ جہاں تک عالم اسباب کو دخل ہے اب بھی ترکوں کی فوج میں پانچ بلقان کی قوت موجود ہے۔

اب مسلمانوں کی وہ حالت پہنچ گئی سمجھنا چاہیئے جو بنی اسرائیل کی تھی۔ نصرانیت نے اسلام اور الحاد نے مذہب کو شکست فاش دی۔ اب مسلمانوں کا مجموعی طور پر یا فرداً فرداً زندہ رہنا بے شرمی و بے حیائی سے زیادہ نہیں۔"[2]

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات بالکل نجی تحریرات سے لیے گئے ہیں جن کا مقصد شائع کیا جانا نہیں تھا اور اس بنا پر یہ فطری تاثرات کا حقیقی اظہار ہیں اور مسلمانوں کے اس ذہنی کرب اور صدمے کو پوری شدت سے ظاہر کرتے ہیں جو اس حادثے سے پیدا ہوا تھا۔

مولانا محمد علی اس احساس میں سب کے شریک تھے اور یہ واقعہ ان کے اخلاص فکر و احساس کی متعدد مثالوں میں سے ایک ہے۔ لیکن جس وقت سے میری نظر سے یہ واقعہ گزرا تھا اس وقت

۱؎ حبیب اللہ خاں: "حیاتِ آفتاب"۔ صفحہ ۹۲
۲؎ "باقیاتِ بجنوری"۔ صفحات ۱۸۹ و ۱۹۰

میرے ذہن میں یہ خلش تھی کہ آخر مولانا کے وہ دوست کون تھے جو خودکشی کے اقدام سے انھیں باز رکھنا چاہتے تھے۔ میرے علم میں یہ بات تھی کہ اسی زمانے میں مشہور انگریزی ناول نگار ای۔ ایم فارسٹر راس مسعود کی دعوت پر ہندوستان آئے ہوئے تھے اور دہلی میں ان کا ڈاکٹر انصاری کے یہاں قیام رہا تھا۔ میرے ذہن میں اس وقت یہ بات آئی تھی کہ شاید اس موقعے پر فارسٹر مولانا سے ملے ہوں لیکن مولانا نے اپنی سوانح حیات میں جس انگریز کا حوالہ دیا تھا اسے انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی کا گریجویٹ بتایا تھا۔ جب کہ فارسٹر کا تعلق کیمبرج یونیورسٹی سے تھا۔

جولائی ۱۹۷۷ء میں فارسٹر کی سوانح عمری کی پہلی جلد شائع ہوئی جو چند ہفتے قبل مجھے ملی۔ سب سے پہلے میں نے اس میں فارسٹر کے دورۂ ہندوستان کے بارے میں دی گئی تفصیلات کا مطالعہ کیا اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ابتداءً مجھے جو شبہ ہوا تھا کہ اس واقعے سے فارسٹر کا تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ صحیح تھا۔

آخر ہفتہ اکتوبر میں فارسٹر ہندوستان آئے تھے۔ دوسرے مقامات کا دورہ کرتے ہوئے وہ سر راس مسعود کے پاس علی گڑھ پہنچے اور وہاں تقریباً ایک ہفتہ رکنے کے بعد سر راس کے ساتھ دہلی آئے جہاں وہ نومبر ۱۹۱۲ء کے ابتدائی دنوں میں موری گیٹ کے قریب واقع ڈاکٹر انصاری کے مکان پر مقیم ہوئے۔ قیام کے آخری دن ڈاکٹر انصاری نے فارسٹر کی دلچسپی کے لیے ناچ کا انتظام کیا۔ ڈاکٹر انصاری پہلے یہ ناچ اپنے ہی گھر پر رکھنا چاہتے تھے لیکن پڑوس میں ہی ایک انگریز عورت رہتی تھی جس کی وجہ سے یہ اندیشہ ہوا کہ وہ طرح طرح کی باتیں پھیلائے گی جس سے ڈاکٹر انصاری کی پریکٹس کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ لہذا یہ طے ہوا کہ یہ ناچ پرانے شہر کے وسط میں ایک اور دوست کے یہاں رکھا جائے۔

فارسٹر کا سوانح نگار پی این فربینک لکھتا ہے کہ "اس ناچ کے ساتھ ایک بڑا عجیب سیاسی واقعہ رونما ہوا۔ مسعود اور انصاری دونوں علی برادران کے قریبی دوست تھے۔ اور اس وجہ سے وہ دوسرے مسلمانوں کی طرح اس وقت بلقان کی جنگ میں شکست کا سامنا کرتے ہوئے ترکی کی زبوں حالی سے پریشان تھے۔ ایسا ہوا کہ یہ ناچ کامریڈ کے دفتر کے عین پڑوس میں ہونے والا تھا لہذا وہاں جاتے ہوئے مسعود اور فارسٹر کامریڈ کے دفتر میں بھی پہنچے۔ انھوں نے محمد علی کو بڑی پریشانی

کے عالم میں تھا اور وہ خودکشی پر آمادہ تھے۔ 'میری حالت نہایت افسوسناک ہے'۔ انھوں نے کہا 'بلغاری فوج قسطنطنیہ کی دیواروں سے ۲۵ میل کے اندر ہے' تقریباً آبدیدہ ہوتے ہوئے وہ مسعود کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلے گئے اور وہاں روتے کہا 'اب نہ کچھ طلب کرنے کو ہے اور نہ دینے کو۔ اب تو سب ختم ہو گیا'۔ گو کہ فارسٹر نے علی کو ایک نہایت ناقابل قبول شخص پایا پھر بھی وہ ان کے جذبے سے متاثر ہوئے۔ مسعود نے موقعے کو فوراً قبول کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میری زندگی کا موقع ہے۔ ہم نے یونیورسٹی کے لیے جو پیسہ اکٹھا کیا ہے وہ سب ترکوں کو دے دیں گے"۔ اس کے باوجود وہ اس پر مصر رہے کہ علی ناچ میں چلیں اور جب انھوں نے دشواری پیدا کی تو مسعود نے انھیں پکڑا اور جسمانی طور پر انھیں کمرے سے اٹھا کر لے گئے۔ علی نے بلا سوچے سمجھے اس رات کا واقعہ ایک ساتھی اخبار نویس کو سنایا اور علی کے قول مطابق جلد ہی لندن ٹائمز میں یہ اطلاع چھپی کہ کس طرح ایک سرکردہ مسلم شورش پسند نے ترکی کی شکست کے موقع پر اپنی ایک شام محفل میں رنگ رلیاں منا کر گذاری"۔[1]

فارسٹر کے سوانح نگار نے فارسٹر کی ڈائری کی مدد سے اس ناچ کے بارے میں اس انگریز مصنف کے تاثرات بھی پیش کیے ہیں جن کی تفصیل اس جگہ غیر ضروری ہے۔

اگلے ہی دن فارسٹر لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ لیکن فارسٹر کی دہلی میں موجودگی کی وجہ سے اس ناچ پارٹی کے انتظام اور سر راس مسعود کی مولانا محمد علی سے ملاقات اور انھیں زبردستی اس محفل میں کھینچ لانے کے سبب ایک ایسے المناک حادثے کی روک تھام ہو گئی جو اگر حقیقت بن گیا ہوتا تو ملک و قوم اپنے ایک مخلص قائد کی ان قابل قدر خدمات سے محروم ہو جاتا جن سے اگلے کئی سال تک ملک بہرہ ور ہوا۔

---

[1] P.N. Furbank : E.M. Forster A Life. Vol. I, London. 1977, pp. 228-9.

تذیرالدین مینائی

تحریکِ خلافت کا ہندوستانی مسلمانوں پر اثر

ہندوستانی مسلمانوں کا مزاج کچھ ایسا ہے کہ اگر ان کے بارے میں یہ کہا جائے تو بےجا نہ ہوگا کہ وقتاً فوقتاً جذباتیت اور ہیجان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے کروٹ لی اور جداگانہ انتخابات کے مطالبے کو تسلیم کرا لیا۔ اس کے بعد گہری نیند سو گئے۔ دس برس کے بعد پھر خوابِ غفلت سے بیدار ہوئے تو ۱۹۱۶ء میں کانگریس سے معاہدہ کرکے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں تناسب نمائندگی کا مسئلہ حسب دل خواہ طے کرا لیا۔ قوم پھر محوِ خواب ہو گئی۔ اور چار برس کی غافل نیند کے بعد ایک مرتبہ پھر ۱۹۲۰ء میں آنکھیں کھولیں اور تحریکِ خلافت میں اپنے آپ کو کمال سرمستی اور بھرپور قوت کے ساتھ جھونک دیا۔ اس گہما گہمی اور جوش و خروش کے بعد پھر غنودگی اور بے عملی طاری ہو گئی۔ آٹھ برس کے تعطل اور جمود کے بعد ۱۹۲۸ء میں پھر خیال آیا تو انگڑائی لی اور ملی شیرازے کو ازسرِ نو مجتمع کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں برصغیر ہندوستان کے عوام قوم پرستی کے جذبہ سے سرشار ہو چکے تھے۔ مسلمان بھی زیادہ عرصے تک خود کو اس سے الگ نہ رکھ سکے۔ ظاہر ہے ہندوستان پر برطانوی تسلط سے بیزاری کی جو روایت مسلمانوں میں ایک عرصہ دراز سے مستحکم ہو چکی تھی اس کو اتنی آسانی سے مزاجوں اور ذہنوں سے نکالا نہیں جا سکتا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں برطانیہ اور روس میں جو معاہدہ ہوا تھا اس کی وجہ سے ان مسلم ممالک کے لیے مستقل ایک خطرہ لاحق تھا جو ابھی تک آزاد تھے۔
ہندوستانی مسلمان اپنی آزادی اور اپنا اقتدار تو کھو چکے تھے لیکن ان میں ایک نیا احساس و شعور جاگ اٹھا تھا۔ دنیا کے دوسرے مسلمانوں یعنی عالمِ اسلام سے ان کے اپنے روحانی رشتے کا احساس

اور [illegible] حکومت برطانیہ جیسے جیسے ان مسلم ممالک پر اپنا اقتدار اور دائرۂ اثر میں توسیع
کی پالیسی [illegible] ممالک کی خیر خواہی کے بجائے ہندوستانی مسلمانوں میں پالیسی غیر مقبول ہوتی جاتی
تھی۔ ان واقعات کے خلاف جذباتی ردعمل پیدا ہو رہا تھا جس کی وجہ سے حکومت برطانیہ سے مسلمانوں
کا جذبۂ وفاداری سرد پڑتا جا رہا تھا۔ مسلمانوں پر یہ بات بھی منکشف ہو چکی تھی کہ برطانیہ نے یہ
پالیسی [illegible] اختیار کی تھی تاکہ ہندوستان پر اس کی گرفت اور مضبوط ہو جائے۔ مسلمان اپنا اس
خیال پر ایمان کی سی پختگی کے ساتھ رجے ہوئے تھے کہ اسلامی ممالک کو اس دباؤ سے نجات دلانے کی
صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے ہندوستان کی آزادی۔ کیونکہ ہندوستان کے ہاتھ سے نکل جانے
کے بعد انگریزوں کے لیے اسلامی ریگزاروں پر قبضہ کرنا بے سود اور بے معنی ہوگا۔ اشتیاق حسین
قریشی کو اس دلیل میں ایک طرح کی سادہ لوحی جھلکتی نظر آتی ہے۔ اور وہ اس دلیل کو ترکی پروپیگنڈے
کا ایک جزو سمجھتے ہیں۔ پھر بھی وہ سمجھتے ہیں کہ تیل کی دریافت سے قبل اس دلیل میں کچھ جان تھی کیونکہ
یہ ممالک اسلامی سلطنت برطانیہ کے براہِ راست رابطہ کی راہ میں حائل تھے۔[1] ایک اور قابلِ غور
دلیل مولانا حسرت موہانی نے پیش کی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنے
خطبۂ صدارت میں انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو یہ جان لینا چاہیے کہ جمہوریۂ ہند کے قیام سے انھیں
دو فائدے ہوں گے۔ اول یہ کہ ایک جمہوری ملک کے شہری کی حیثیت سے انھیں برابر کے حقوق
حاصل ہوں گے اور وہی فائدے حاصل ہوں گے جو دوسروں کو ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ برطانوی
دائرۂ اثر میں تخفیف کر کے وہ عالم اسلامی کو وہ سکون خاطر مہیا کر سکیں گے جو تعمیری سرگرمیوں کے
لیے نہایت ضروری ہے۔

ایک لحاظ سے ان سب دلیلوں کا رخ ایک ہی سمت میں تھا یعنی یہ کہ اگر برطانیہ اسلامی
حکومتوں کو تختہ پلٹ کر وہاں اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا تو پھر اس کے اس مقصد میں مسلمان معاون
نہ بنیں۔ کیونکہ اگر ہندوستانی مسلمان انگریزوں کے وفادار رہیں گے تو ہندوستان میں انگریزوں
کے قدم اور مضبوطی سے جم جائیں گے۔ اور جب انگریز ہندوستان میں مضبوط ہو جائیں گے تو پھر
ممالک اسلامی پر اپنا تسلط قائم کرنا ضروری سمجھیں گے۔ یہیں سے تحریک خلافت کی بنیاد پڑی۔

---

[1] اشتیاق حسین قریشی، دی مسلم کمیونٹی آف دی انڈو پاک سب کانٹی نینٹ، ۱۹۶۲ء، صفحہ ۲۶۱

[illegible] کے برعکس ہندوستانی مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ دولتِ عثمانیہ اگرچہ کمزور ہو چکی ہے مگر
اس میں اتنی طاقت موجود تھی کہ اسے ایک اسلامی حصار کی شکل بہ آسانی دی جا سکتی تھی
اسی طرح دنیا بھر کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کی حفاظت و سلامتی کی ایک سبیل پیدا
ہو سکتی تھی۔ جہاں تک ترکوں کے افراد اور رجحان کچھ بھی رہا ہو اور خلافت کے ختم کیے جانے پر خواہ کیسی ہی دنیاوی
الجھنیں کیوں نہ پیدا ہوتیں ان کے علی الرغم مسلمانوں کے دانشوروں کو ایک مسلم ریاست کے ٹوٹ جانے
پر بڑی تشویش تھی۔

حکومتِ ہند مسلمانوں کے جذبات و احساسات سے پوری طرح واقف تھی اور اسے ان سے
بظاہر یک گونہ ہمدردی بھی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں نے خلافت کے بارے میں اپنا جو نقطۂ نظر پیش
کیا اس کی حمایت بھی کی گئی۔ یہاں تک کہ جنگ کے اختتام سے قبل حکومتِ ہند کی تجویز پر برطانوی
وزیر اعظم لائڈ جارج نے ہندوستانی مسلمانوں کے مجروح جذبات پر مرہم رکھنے کی غرض سے پارلیمنٹ
میں ایک بیان بھی دے دیا کہ حکومت برطانیہ کا ہرگز یہ ارادہ نہیں کہ وہ ترکوں کو ان کے وطن عزیز
سے محروم کر دے جہاں وہ اکثریت میں ہیں۔ موصوف نے پارلیمنٹ میں کہا کہ " ہم اس لیے نہیں لڑ رہے
چونکہ ہم ترکی کو اس کے زرخیز اور مشہور علاقے ایشیائے کوچک اور تھریس سے محروم کر دیں جہاں پر
ترکی الاصل لوگوں کی اکثریت ہے۔" وزیر اعظم کے اس اعلان کی روشنی میں یہ بالکل فطری بات تھی
کہ مسلمان اپنے مقدمہ کو اس عدالت میں پیش کرتے جو قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والی تھی اور
اس کے لیے ایک وفد بھی یورپ بھیجتے۔ تاکہ حکومت برطانیہ کو اس کے وعدے یاد دلائے جا سکتے۔ ایسا
ہی کیا گیا۔ لیکن وائے حسرت کہ مسلمانوں کے مقدر میں مایوسی لکھی تھی۔ ۱۹۲۰ء میں معاہدہ سیورے
ترکی پر ٹھونپ دیا گیا جس کی رو سے دولت عثمانی ختم کر دی گئی اور اس کے ساتھ ترک اقتدار اعلیٰ بھی۔
اس معاہدہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بری طرح مشتعل کر دیا۔ مسلمانوں کے دل کی بھڑاس ایک
پر جوش تحریک کی صورت میں نکلی۔ اس سے قبل کسی ایسے ایجی ٹیشن کی مثال نہیں ملتی جس نے انگریزی
حکومت کی بنیادوں کو اس بری طرح ہلا کر رکھ دیا ہو۔ مسلمانوں نے اس تحریک میں اس شدومد کے ساتھ
حصہ لیا کہ خود سے گزر گئے۔ شدائد اور مصائب کے احساس کے بغیر وہ اس آگ میں کود پڑے اور کچھ ایسے
لوگوں کو استعجاب میں ڈال دیا جن کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں میں اس قسم کے اقدامات کی صلاحیت ہی نہیں۔

تحریک خلافت کے بانی اور روح رواں مولانا محمد علی تھے۔ ترکی کے مستقبل کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے مولانا ۱۹۲۰ء میں ایک وفد لے کر یورپ گئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے اس بات کو بہت پرزور اور واضح الفاظ میں کہا کہ اگر اسلام کے احکامات کی مناسب طور پر پابندی کرنی ہے تو جزیرۃ العرب (بشمول عراق، عرب، شام اور فلسطین) اور جملہ مقامات مقدسہ جو ان ممالک میں واقع ہیں ترکی کے خلیفہ کے قبضہ میں رہنے چاہئیں۔ اس مطالبہ کی پشت پر محض علماء کے فتووں کی طاقت نہیں تھی بلکہ وزراء کے وہ بیانات اور یقین دہانیاں بھی تھیں جو جنگ کے آغاز پر کی گئی تھیں جن میں واضح الفاظ میں یہ یقین دلایا گیا تھا کہ " ہم ترکی کو اس کے ایشیائی علاقوں سے محروم کرنے کے لیے نہیں لڑ رہے ہیں۔"

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی یورپ سے تہی دست لوٹے۔ واپس آکر اس مسئلہ پر غور و فکر شروع ہوا کہ خلافت اور پنجاب کی بے انصافیوں کا ازالہ کرنے کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کے اس کاز سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا اور اس کی حمایت کے لیے راضی ہوگئے۔ انھوں نے عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کی ایک اسکیم پیش کی۔ خلافت کانفرنس نے اس تجویز کو فوراً اپنا لیا۔ انڈین نیشنل کانگریس نے اس اسکیم کی توثیق بعد میں کی۔ اور یکم اگست ۱۹۲۱ء سے اس پر عمل درآمد شروع ہوگیا۔ گاندھی جی اور مسلمانوں میں عملی سطح پر جیسا اشتراک ہوا اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ حقیقت یہ تھی کہ فریقین میں سے ہر ایک کو دوسرے کی مدد کی ضرورت تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کے لیے گاندھی جی کے والہانہ اشتیاق نے بقول خود انھیں مجبور کر دیا کہ " ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں کہ اب یہ صدیوں میسر نہ آئے گا۔"

دو ہی مہینوں کے اندر مولانا محمد علی نے علی گڈھ کے ارباب حل و عقد کے سامنے یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ وہ حکومت سے اپنا تعلق منقطع کریں اور اس سے مالی امداد لینا بند کر دیں۔ علی گڈھ کے ذمہ داروں کے نزدیک نہ یہ عملاً ممکن تھا نہ عقلاً مناسب۔ کیونکہ کالج کے بیشتر طلباء فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی ملازمت کے لیے حکومت کے دست نگر رہا کرتے تھے مولانا محمد علی نے ڈاکٹر ضیاء الدین کی مزاحمت کے آگے تو سپر ڈال دی لیکن طلباء میں انھیں خاصی کامیابی ہوئی۔ ان کی خطابت اور زور بیان نے نوجوانوں کے دلوں کو مسخر کر لیا اور طلباء کی ایک اچھی خاصی تعداد کالج چھوڑ کر مولانا کی قائم کی ہوئی قومی یونیورسٹی

میں داخل ہو گئی۔ یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی داغ بیل تھی جو آگے چل کر حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مہاتما گاندھی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب کی سرپرستی میں پروان چڑھی اور جلد ہی اس نے اپنی انفرادیت وافادیت اور وقعت ووقار قائم کر لیا۔

تحریک خلافت زیادہ تر مذہبی جذبات پر مبنی تھی اور شروع ہی سے علما کثیر تعداد میں اس کی طرف کھنچ کر آئے۔ جب عدم تعاون کی تحریک اپنے مقاصد میں ناکام ہو گئی تو علماء نے اس مسئلہ کے حل کے لیے زیادہ انقلابی اور زیادہ دینیاتی حل پیش کئے۔ ان میں ایک مولانا آزاد کا فتویٰ تھا، جس کی رو سے مسلمانوں کا فوج اور پولس میں کام کرنا حرام قرار دیا گیا تھا۔ اس سیاسی مرض کے لیے ایک اور نسخہ تجویز کیا گیا تھا اور وہ بھی مولانا آزاد کے ذہن زرخیز کی پیداوار تھا جس کی رو سے لوگ ترک وطن پر آمادہ ہو گئے۔ ایک طرف جذبات کی شدت اور دوسری طرف اس مسئلہ میں ناکامی، ان دونوں کا شدید رد عمل مسلمانوں میں یوں ظاہر ہوا کہ سندھ اور صوبہ سرحد سے اٹھارہ ہزار سادہ دل مگر مخلص مسلمانوں نے اپنی زمین اور جائداد کو اونے پونے فروخت کر کے کابل کی راہ لی۔ اس اقدام میں ان سادہ دل مسلمانوں کی جو تباہی وبربادی ہوئی اور انھیں جس مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اس کی تفصیلات بڑی دردناک ہیں۔

اس تمام عرصے میں ہندوستانی مسلمانوں پر مذہبی جذباتیت پوری طرح طاری رہی۔ پوری قوم کی توجہ کا مرکز مسئلہ خلافت تھا۔ کیونکہ خلیفہ کی عدم موجودگی میں بقول علماء جمعہ کی نماز بھی جائز نہ تھی۔ ملک کے چھوٹے بڑے شہروں میں روزانہ جلوس نکلتے رہے اور جلسے ہوتے رہے۔ ان جلسوں میں پرجوش اور جذبات انگیز تقریریں کی جاتی تھیں۔ سامعین آنسوؤں سے روتے تھے کہ اگر خلیفہ نہ رہا اور اس کے اختیارات باقی نہ رہے تو پھر اسلام کا کیا ہوگا۔ صورت حال بڑی مایوس کن تھی اور بیاکباز وصالح مسلمانوں کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خلافت کے لیے اپنی جان دیدیں۔ اردو کا مشہور ترانہ "بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو" گھر گھر لوگوں کی زبان پر تھا جس کی آواز بازگشت ہر مسلمان کے دل سے آتی تھی اور وہ کچھ اسی جذبہ کی عکاسی کرتا تھا۔

تحریک خلافت کی اس ہماہمی میں ہندوستانی مسلمان خود اپنے ذاتی مسائل سے یکسر بے گانہ و غافل رہے۔ کیونکہ ۱۹۱۲ء سے انھیں یہ درس دیا جاتا رہا تھا کہ پان اسلامزم سے ہی نہ صرف ان کی ساری توقعات وابستہ ہیں بلکہ یہ ایک مذہبی فریضہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب فضول اور عبث

ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ کچھ دور اندیش اور صاحب بصیرت رہنمایان قوم مسلمانوں کے مفادات پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ لیکن عام مسلمانوں کی نظر میں ان کی قطعی کوئی اہمیت نہ تھی۔ انھیں صرف اپنے مذہبی ادارہ "خلافت" سے غرض تھی۔ مصطفےٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں ترکی کو جو پے در پے کامیابیاں حاصل ہوئیں اس سے ترکی کی حیثیت نے بہت اہمیت اختیار کر لی تھی۔ اور مسلمانوں کو ایک بار پھر یہ امید ہو چلی تھی کہ ایک مرتبہ پھر خلافت اپنے پورے تزک و احتشام اور عظمت کے ساتھ قائم ہو گی۔ یہ باتیں بہت دل خوش کن تھیں لیکن ایک اور زبردست صدمہ مسلمانوں کا مقسوم تھا۔ مسلمانوں کے رہنما انھیں ترکی اور خلافت کے لیے ہر ممکن قربانی کے لیے آمادہ کرتے رہے لیکن انھیں ترکی کے اندر رونما ہونے والے واقعات سے یکسر لاعلم رکھا۔ شاید رہنمایان قوم خود بھی لاعلم تھے۔ خلافت کی عظمت اور شان و شوکت کی بازیابی تو دور رہی مصطفےٰ کمال نے خود خلافت ہی کو ختم کر دیا۔ اور خلیفہ کو ترکی سے نکال دیا۔ تحریک خلافت کے رہنماؤں کے لیے یہ ایک جانکاہ صدمہ تھا۔ کچھ دنوں تک وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو دلاسہ دیتے رہے کہ یہ خبریں جھوٹی تھیں۔ اخباروں میں جلی حروف میں کچھ اس قسم کی سرخیاں قائم کی جاتی رہیں کہ "رائٹر جھوٹا ہے" "پھر وہی برطانوی پروپیگنڈہ" وغیرہ۔ بعد میں ایک اور نادر نظریہ پیش کیا گیا کہ "مصطفےٰ کمال خود خلیفہ بننا چاہتا ہے اس لیے اس نے ضعیف اور ناکارہ خلیفہ کو نکال دیا ہے جس نے بڑی بے شرمی کے ساتھ اتحادیوں سے سمجھوتہ کر لیا۔" لیکن آہستہ آہستہ جذباتیت کی کہر آلود فضا میں جب حقیقت کی کرنیں چمکیں تو لوگوں پر ساری سچائی واشگاف ہو گئی۔ بیچارے رہنماؤں کا برا حال تھا۔ ان کی حیثیت بڑی مضحکہ خیز ہو کر رہ گئی تھی۔ انھوں نے اب تک تو یہ کہا تھا کہ اسلام کے لیے خلافت کا ادارہ لازمی تھا۔ لیکن خود ترکی میں ایک شخص ایسا ابھرا جو نہ صرف یہ کہ اس نقطۂ نظر سے ہی متفق نہ تھا بلکہ اس نے خلافت کی اس قدیم عمارت ہی کو ڈھا دیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ تاریخ نے واقعی بڑی ستم ظریفی کی بڑا بے رحمانہ مذاق کیا۔

کمال پاشا کی سربراہی میں ترکی میں سیکولر جمہوری حکومت کے قائم ہوتے ہی تحریک خلافت نہ صرف ماند پڑ گئی بلکہ یوں سمجھیے کہ بالکل ختم ہو گئی۔ اس تحریک کے بے جان ہونے سے عدم تعاون کی تحریک بھی بری طرح متاثر ہوئی، اسی کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کے درخشاں امکانات بھی شبنم صبح گاہی کی طرح معدوم ہو گئے۔ خلافت کے ختم ہو جانے سے ہندوستانی مسلمانوں کی عام پالیسی پر بھی اثر پڑا

حیثیں مولانا محمد علی کے لیے یہ نہ صرف قومی نقصان تھا بلکہ ایک عظیم ذاتی صدمہ بھی تھا۔ یہ غلط نظریہ ہندو
کے مسلمانوں پر مذہبی اعتبار سے ترکی کے خلیفہ کے تئیں کوئی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، ان کا نہیں تھا بلکہ یہ مولانا
ابوالکلام آزاد کی رائے تھی۔ مولانا آزاد جدید مسلم ہندوستان میں پان اسلامزم کے داعی تھے۔ لیکن مولانا محمد علی
نے اپنی پرکشش اور فعال شخصیت اور اپنی پرجوش خطابت سے مولانا آزاد کو اس تحریک کی لیڈر شپ سے
الگ کر کے تمام قیادت خود اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ لوگ مولانا محمد علی کو خلافت تحریک کا لیڈر سمجھتے تھے۔ لیکن
اس تحریک کے دم توڑتے ہی ان کی سیاسی حیثیت بحیثیت خلافت لیڈر کے کچھ گر گئی۔ لیکن اس خود اس
سے کہیں بڑا خمیازہ اٹھانا پڑا۔ ان کے پاس سے وہ سب کچھ چلا گیا جو برسوں سے ان کے لیے روحانی تقویت
کا باعث تھا۔ وہ اساس ہی ختم ہو گئی جس پر ان کی سیاسی پالیسی قائم تھی۔

مولانا محمد علی کچھ عرصے تک تو پان اسلام ازم کے اپنے وژن پر قائم رہے۔ مکہ کی ایک کانفرنس
میں ہندوستان کے اس مرد مجاہد اور غیرت پسند نے ابن سعود کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی
کہ وہ اپنی نو حاصل سلطنت حجاز کو ایک مثالی اسلامی جمہوریہ کی شکل دیں لیکن ان کی کوششیں ناکام
ہوئیں۔ مایوس، ناکام اور خوش فہمی میں مبتلا دوسرے ہندوستانیوں کی طرح مولانا محمد علی کو بھی اپنے
ملک کے اندرونی مسائل کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ادھر بھی امکانات کچھ زیادہ روشن نہیں تھے۔ ہندو
مسلم اتحاد کے شاندار و درخشاں مگر مختصر دور کی جگہ اب فرقہ وارانہ فسادات کا دور دورہ تھا۔ چوری چورا کے
واقعہ کے فوراً بعد ہی گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک واپس لے لی تھی۔ تحریک خلافت اور عدم
تعاون کی تحریک باہم دگر اس طرح گتھی ہوئی تھیں کہ انھیں علاحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نتیجہ ظاہر تھا
مالا بار کے موپلاؤں نے خلافت کے لیڈروں کی آواز پر بڑی گرم جوشی کے ساتھ لبیک کہا تھا۔ اب وہ
بے رہنما اور بے ہدایت تھے اور کسی حد تک بے مقصد بھی۔ اس عجیب صورت حال میں انھوں نے حکومت
کے خلاف بغاوت کر دی اور بہت ہی سنگین فسادات چھڑ گئے، گو اس "موپلا بغاوت" کو بڑی سختی
سے کچل دیا گیا لیکن اس کا ردعمل بہت بھیانک ہوا۔ شمالی ہندوستان خصوصاً پنجاب میں فسادات کا
ایک سلسلہ چھڑ گیا۔ شمالی ہندوستان کے اسی حصے میں بالآخر شدھی اور سنگٹھن" کی تحریک اٹھی اور یہی
وہ سرزمین تھی جہاں سے" تبلیغ و تنظیم" کی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ جنوبی ہند سے بہت دور ہنگامہ و
شورش کے لیے ہمہ وقت تیار اسی پنجاب میں مالا بار کے المیہ کا ردعمل یہ ہوا کہ ہندو مسلم اتحاد

کا جنازہ نکل گیا۔[۲] ڈاکٹر مونجے نے سنگٹھن تحریک کی ابتدا کی۔ چوری چورا کے واقعہ کے فوراً بعد آریہ سماج کے ایک لیڈر سوامی شردھانند نے ایک تحریک 'شدھی تحریک' کے نام سے شروع کی۔ جب ہندو مسلم اتحاد کا آغاز ہوا تھا تو یہی سوامی شردھانند تھے جن کو مسلمان ایک جلوس میں دہلی کی جامع مسجد لے گئے تھے اور انھیں یہ غیر معمولی اعزاز دیا تھا کہ وہ مسجد کے منبر سے مسلمانوں کو خطاب کریں۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور دیگر حضرات نے شدھی اور سنگٹھن تحریکوں کے جواب میں تبلیغ و تنظیم کی تحریکیں چلائیں۔ مولانا محمد علی نے برادران ملت کو تبلیغ و تنظیم کی ان تحریکوں میں حصہ نہ لینے کی تلقین کی اور رسوائی مول لی۔[۳] تنظیم اور سنگٹھن میں حاصل کی ہوئی تربیت کو آزمانے کے لیے فریقین بے تاب تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں نے ایک دوسرے پر آتش زنی، قتل و غارت اور لوٹ مار کے دروازے کھول دئے۔ کوہاٹ۔ پنجاب، مالابار اور پانی پت جیسے خوں ریز ڈرامے مختلف مقامات پر اسٹیج کئے گئے۔ اس کربناک حقیقت کے پیش نظر مولانا محمد علی ہندو قوم پرستوں سے یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ وہ ہندو فرقہ پرستوں کے خلاف سرگرم ہو جائیں گے۔ بہت سے مسلمان تحریک خلافت اور انڈین نیشنل کانگریس سے بدظن ہو گئے تھے اور ان کی وفاداریاں متزلزل ہو گئیں کیونکہ انگریزوں سے تعاون کرنے والے وفادار مسلمانوں نے "ہندو مسلم اتحاد" کے "نتائج" کی طرف نہایت طنز آمیز اشارے کرنا شروع کر دیے تھے۔[۴] مولانا محمد علی قوم پرست ہندوؤں سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ ہندو شرپسندوں سے خبردار رہیں گے جنھوں نے یہ معاندانہ ماحول پیدا کر دیا تھا۔ مولانا کو اس میں مایوسی ہوئی۔ ہندو قوم پرستوں نے ہندوؤں کی فرقہ وارانہ تحریک کی مذمت نہیں کی۔ "آخر مجبور ہو کر انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے بزرگوں کی معیت میں کانپور کانگریس کے موقعہ پر (گاندھی جی سے) یہ التجا کی کہ اب وہ اپنا قفل خاموشی توڑیں اور اس مخالف فضا کا مقابلہ کر کے نسبتاً اچھی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں۔[۵]" اس تجویز پر گاندھی جی خاموش رہے لیکن اس کے کچھ ہی دنوں بعد یکم مئی ۱۹۲۵ء کو انھوں نے کلکتہ کے مرزا پور پارک میں

---

[۲] کامریڈ۔ دہلی ۲۴ر جولائی ۱۹۲۵ء

[۳] ایضاً ۹ر جنوری ۱۹۲۵ء

[۴] ایضاً ۲۴ر جولائی ۱۹۲۵ء

[۵] رئیس احمد جعفری، سیرت محمد علی، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۳۲ صفحہ ۲۱۷

تقریر کرتے ہوئے ایک عجیب و غریب بات کہی۔ انھوں نے کہا:

"آج کل تو میں... صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اگر ہم اپنے ملک کی نجات چاہتے ہیں تو کبھی نہ کبھی دن ہم ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد ہونا ہے۔ لیکن اگر ہمارے مقدر میں یہی لکھا ہے کہ متحد ہونے سے پہلے ہم ایک دوسرے کا خون بہائیں تو پھر میں یہ کہوں گا کہ یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی ہمارے لیے مفید ہے۔"[5]

مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی اس درخواست پر گاندھی جی کی سرد مہری یا بے اعتنائی نے مولانا محمد علی کو ۱۹۳۰ء میں اپنی مایوسی کا ان الفاظ میں اظہار کرنے پر مجبور کیا:

"ہم نے کہ جو دس برس تک گاندھی جی کے ساتھ ہر سرد و گرم میں شریک رہے، ان پر یہ بات واضح کی لیکن ہندوؤں میں خود اپنی اور پنڈت موتی لال نہرو کی مقبولیت قائم رکھنے کی ان کی خواہش نے یہ تصفیہ نہ ہونے دیا۔"[6]

اسباب خواہ کچھ بھی رہے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ترکی میں خلافت کے خاتمے سے اور عدم تعاون کی تحریک کے واپس لیے جانے سے ہندوستانیوں کے ہر حلقے پر خصوصاً مسلمانوں پر بڑا خراب اثر پڑا۔ سر شفاعت احمد خاں نے بڑی دیانت داری سے اس صورت حال کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

"۱۹۲۳ء کے بعد خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کی ناکامی اور بے انصافیوں کے خلاف ردعمل پورے ہندوستان میں محسوس ہونے لگا۔ قوم متحد ہو گئی۔ اور اس تحریک کا اثر جلد ہی زائل ہو گیا۔ اگر ایک طرف مسلمانوں کی سیاسی اور تعلیمی حالت پر اس کا تباہ کن اثر پڑا تو دوسری طرف بلا شبہ اس نے مسلمانوں کو عمل پر آمادہ کیا اور انھیں اپنے ملک کی سیاسی زندگی کا ایک اہم عنصر بنا دیا۔ تحریک خلافت کے زوال نے مسلمانوں کے سیاسی پروگرام میں مایوس کن بدنظمی اور ابتری پیدا کر دی۔ آئندہ کے پانچ سال یعنی ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۸ء تک کا زمانہ پراگندگی اور تذبذب کا زمانہ تھا۔

---

[5] پٹابھی سیتارمیا: دی ہسٹری آف انڈین نیشنل کانگرس۔ جلد اول، بمبئی ۱۹۴۶ء صفحہ ۲۹۸

[6] انڈین راؤنڈ ٹیبل کانفرنس، مائنورٹیز کمیٹی ڈاکیومنٹس۔ (روداد اجلاس ۱ تا ۶) صفحہ

مسلمانوں میں سیاسی عقیدے اور سیاسی حوصلے دونوں کا فقدان تھا۔ دستوری اور فرقہ وارانہ مسائل پر مذاکرات اور بحث و مباحثے کا ایک لامتناہی سلسلہ چلتا رہا۔ دستوری اور فرقہ وارانہ دونوں مسائل کے حل کے لیے بہت سے فارمولے ایجاد کیے گئے۔ لیکن وہ سب بے اثر اور بے کار ثابت ہوئے۔ ایک طرف تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں اور دوسری طرف کانگریس اور حکومت کے درمیان سال بہ سال کشیدگی بڑھتی گئی۔[۸]

یہ "پراگندگی" یہ "تذبذب" اور اختلاف موجودہ صدی کے پہلے تیس برسوں میں ہندوستانی مسلمانوں کا عام رہا ہے۔ "ہندوستانی مسلمان یا یوں کہیے کہ ان کے اعلیٰ اور متوسط طبقے" بقول سید عابد حسین، ایک ذہنی کشمکش سے دوچار تھے۔ ان کے بہت سے اور بعض اوقات باہم متصادم مقاصد مثلاً سیاسی اور اقتصادی بہتری کی ان کی شدید خواہش، اپنے مذہبی حقوق کے تحفظ پر ان کا اصرار، قومی آزادی سے ان کا لگاؤ، انھیں مختلف سمتوں میں کھینچ رہے تھے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے رہنما بہ یک وقت مسلم لیگ کے بھی رکن تھے، جو مسلم فرقہ پرستی کی نمائندگی کرتی تھی، خلافت کانفرنس اور دوسری ایسی تنظیموں کے بھی ممبر تھے جو مذہبی قوم پرستی کی نمائندہ تھیں، نیشنل کانگریس میں بھی شامل تھے جو سیکولر قوم پرستی کی حامی تھی۔ ان دنوں مسلمانوں میں خالص سیکولر اور قوم پرستانہ موقف عنقا تھا۔ اور مسلمانوں ہی میں کیا ہندوؤں اور دوسرے فرقوں کی بھی یہی حالت تھی۔[۹]

تحریک خلافت کا مسلمانوں پر براہ راست کیا اثر ہوا یہ بہت واضح طور پر ظاہر نہ ہو سکا کیونکہ اس تحریک کی ناکامی کے بعد مسلمان فرقہ واریت کی گرفت میں آتے چلے گئے۔ اور ساتھ ساتھ ان کے ذہنوں پر اکثریت کے ہاتھوں سیاسی طور پر پامال ہو جانے کا کابوسی خوف طاری و مسلط تھا ان کے خیالات ان کے عمل اور ان کا وژن سب کے سب داخلیت زدہ اور فرقہ وارانہ عصبیت کا شکار ہو چکے تھے۔ خود مولانا محمد علی کے اپنے الفاظ میں صورت حال کچھ یوں تھی :

" سیاسی ضعف بھرنے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی بصیرت پر اثر ڈالا۔ اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے ہر امروز دیروز میں بدلتا گیا۔ درد مشترک اور مشترک مصائب کا

---

۸ سر شفاعت احمد خاں : دی انڈین فیڈریشن ۔ لندن ۱۹۳۷ء ص ۳۳-۳۲

۹ سید عابد حسین : دی ڈیسٹنی آف انڈین مسلمز ، بمبئی ، ۱۹۶۵ء ص ۹۰-۹۱

احساس جاتا رہا اور بتدریج نظروں سے محو ہو گیا۔ یہاں تک کہ محض تھوڑا ہی سا وقت گزرنے کے بعد آج کی تکلیفیں کل کی خوفناک یادوں کو یکسر محو کر دیتی ہیں۔ اس پر طرفہ خرابی یہ کہ نصف صدی کے ساتھ کج نگاہی کا اور اضافہ ہو گیا۔ ہر فرقہ کو صرف ان تکلیفوں کا خیال تھا جو اس نے اٹھائیں لیکن یہ دیکھنے کی زحمت نہ کی کہ اس فرقے نے دوسرے کو کتنی ایذا پہنچائی۔[10]

تحریک خلافت کا انجام مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے بھی تشویش کا باعث تھا۔ وہ بھی اپنے درد کا اظہار بڑی شدت سے کرتے ہیں۔ اس وقت کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے کل ہند خلافت کانفرنس منعقدہ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۵ء میں اپنے خطبۂ صدارت میں کہا:

"خلافت کی حرکت کے ساتھ ہی ملک کی آزادی و استقلال کی جو متحدہ حرکت شروع ہوئی تھی اور جس کی خصوصیتوں نے بہت جلد دنیا کی توجہ اور دلچسپی حاصل کر لی تھی ایک خاص منزل تک پہنچ کر رک گئی اور اس کے بعد اس کے رد فعل (ری ایکشن) کے اثرات نہایت تیزی کے ساتھ ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ اب سرگرمی کی جگہ افسردگی ہے۔ بیداری کی جگہ غفلت ہے۔ اتحاد کی جگہ انتشار ہے، ملک و قوم کی جگہ فرقہ و جماعت کی صدائیں ہیں اور کام کی رہی سہی قوتوں کے لیے نئے نئے گمراہ کرنے والے فتنے پیدا ہو رہے ہیں۔"[11]

ہندوستانی مسلمانوں کی تحریک سے قبل اور تحریک کے بعد کی ذہنی کیفیت کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"جہاں تک مسلمانانِ ہند کی جماعتی زندگی کا تعلق ہے ۱۹۲۰ء کی ابتدا سے ۱۹۲۵ء کا خاتمہ ہر اعتبار سے مختلف ہے۔ اگر انھیں دو مخالف سمتوں سے تعبیر کیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ گذشتہ حرکت کا سب سے زیادہ موثر اور نمایاں پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں میں متحدہ مقصد کے لیے متحدہ جدوجہد کی سرگرمی پیدا ہوئی۔ ان کی پراگندگی نظم و انضباط سے آشنا ہوئی۔ انھوں نے ہندوستان کے موجودہ دور میں پہلی مرتبہ مقصد، قوم، فرض اور ایثار کی راہ میں قدم اٹھایا..... لیکن موجودہ حالت بالکل اس سے متضاد ہے۔ گذشتہ حرکت جو پوری تیزی کے ساتھ جاری تھی، اچانک رک گئی اور اس کے صدمے سے ان کی جمعیت

---

[10] کامریڈ، ۹ جنوری ۱۹۲۵ء ص ۱۹

[11] خطبات آزاد، مرتبہ شورش کاشمیری، لاہور مکتبہ شعر و ادب، ۱۹۴۴ء، ص ۴۴

مجموعی طور پر قوم انتشار کی جگہ ہر طرف پراگندگی ہے۔ افکار پریشان ہیں۔ طبیعتیں غیر مطمئن ہیں۔ بے شمار افراد میں انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ اور لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ کوئی راستہ ان کے سامنے کھلا نہیں۔ عام طور پر ملک میں غفلت دگروہی کی جو آب و ہوا پیدا ہو گئی ہے وہ خود بھی اسی میں بہہ رہے ہیں۔ اور حالات کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ اس سے الگ ہو کر اپنے فکر و دماغ کی درستی کی انھیں مہلت نہیں ملتی۔"[۱۲]

خلافت کمیٹی بھی گو مگو کے عالم میں تھی۔ خلافت کا مسئلہ تو تقریباً ختم ہو گیا تھا لیکن اب ملک کے مختلف گوشوں سے ایک ایسی تنظیم کے قیام کے مطالبات ابھرنا شروع ہوئے جو شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں کا مقابلہ کر سکے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ خلافت کمیٹی، ہندو مہا سبھا کی مثنّٰی یعنی جواب بن جائے[۱۳]۔ یا پھر ایک بہت ہی ہمہ گیر تنظیم انجمن اسلام کے نام سے قائم کی جائے۔ مسلمانوں کے لیے اس تجویز سے بڑھ کر خوش کن کوئی اور بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن خلافت کمیٹی یہ مطالبہ اس وقت تک پورا نہیں کر سکتی تھی جب تک کہ اس کے دستور میں خاطر خواہ ترمیم ہو کر اس کے دائرۂ کار میں اضافہ نہ کر دیا جاتا۔" لیکن اس قسم کی تنظیموں کے قائم کرنے میں ان کے پس و پیش کی ایک وجہ یہ تھی کہ انھیں اپنے ان ہندو بھائیوں کا پاس تھا جو ان کے ساتھ عدم تعاون کی تحریک میں شریک تھے۔ اور دوسرے یہ کہ انھیں یہ خوف بھی تھا کہ وہ خواہ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برتیں ہندوؤں اور مسلمانوں میں افتراق ضرور پیدا ہو جائے گا۔ اور اس سے وہ خلافت کے مفاد میں ہر قیمت پر احتراز کرنا چاہتے تھے۔......

غرض یہ کہ ایک بے عملی اور جمود کی کیفیت طاری تھی۔ مگر یہ بے عملی ان کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مزید بے عملی اسلام اور مسلمانوں سے غداری تھی۔"[۱۴] اس لیے ۱۱ر مئی ۱۹۲۴ء کو خلافت تنظیم کی ورکنگ کمیٹی نے مولانا ابوالکلام آزاد اور ایڈیٹر تبصرہ ہذا (مولانا محمد علی) کو سننے کے بعد بالآخر بمبئی میں یہ طے کیا کہ اس کے دائرہ عمل میں اضافہ کر دیا جائے اور اب ہندوستانی مسلمانوں کے اندرونی معاملات اور سرگرمیوں کو چلانے، منظم کرنے اور نگرانی کے فرائض بھی شامل کر دیے جائیں اور وہ تمام اقدامات کیے جائیں جو ان کی زندگی کے ہر شعبہ کے لیے مفید ہوں خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، اقتصادی ہوں یا تعلیمی"[۱۵]

---

۱۲ ایضاً ص۲۵ ۔ ۱۳ کامریڈ دہلی ۲۴ر جولائی ۱۹۲۵ء ص۳۵

۱۴ ایضاً ص۲۶ ۔ ۱۵ ایضاً ص۳۶

بہرحال مسلمانوں میں تنظیم کی ضرورت ہر جگہ محسوس کی جارہی تھی۔ کامریڈ میں ایک مراسلہ نگار نے لکھا کہ گذشتہ چند برسوں سے مسلمان بڑے اشتیاق کے ساتھ اپنے دلوں میں اس امید کی پرورش کرتے رہے ہیں کہ ہندو مسلم تنازعات بالآخر ختم ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے اب مسلمانوں کی ازسرنو تنظیم وقت کی اہم ترین ضرورت بن گئی ہے۔ اب طے یہ کیا گیا ہے کہ ایک مسلم اخبار جاری کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے سر علی امام، حسن امام صاحب اور سلطان احمد صاحب نے کثیر رقمیں عطا فرمائی ہیں۔[16]
کچھ اسی قسم کے جذبات کا اظہار خلافت ورکنگ کمیٹی نے اس موقعہ پر کیا تھا جب مہاتما گاندھی نے اپنی سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تھی۔ "دی ورک بفور دی مسلمانز" کے عنوان سے خلافت ورکنگ کمیٹی نے ایک بیان شائع کیا جس میں کہا گیا تھا کہ:

"ان دنوں اکثر و بیشتر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آخر خلافت تنظیم کا اب پروگرام کیا ہے؟ سب سے صحیح جواب یہ ہے کہ "سب کچھ"۔ وہ کون سا کام ہے جسے مسلمان ٹھیک طور سے انجام دے رہے ہیں اور جس میں اصلاح کی ضرورت نہیں، خلافت آرگنائزیشن زندگی کے ہر شعبے میں تنظیم نو اور اصلاح کے کام اپنے ذمہ لے گی۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر اس کا مقصد اتحاد اور خود اعتمادی پیدا کرنا ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ مسلمان اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں اور اسلام اور ہندوستان کی آزادی کے لیے سب کے ساتھ مل کر سب کے خلاف لڑیں ..... خلافت تنظیم آزادی کے لیے ہے غلامی کے لیے نہیں۔ اور جس طرح اس نے مسلمانوں کو برطانیہ کی محکومی میں نہیں رہنے دیا اسی طرح اب یہ مسلمان قوم کو کسی دوسری قوم یا پارٹی کے ماتحت بھی نہیں رہنے دے گی۔ یہ آزادی کی بھوکی ہے اور محض آقاؤں کی ادلا بدلی سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کو اپنی دونوں آنکھیں کھلی رکھ کر صورت حال کا مشاہدہ کرنا چاہئے۔
مسلمان اپنی پوری قوت سے ان لوگوں کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں جو آزادی کو ہندوستان کا پیدائشی حق سمجھتے ہوں۔ بشرطیکہ اسی طرح وہ ہندوستان کے انتظام و انصرام میں ہندوستانی مسلمانوں کی آزادانہ اور مساویانہ شرکت کے پیدائشی حق کو بھی تسلیم کریں۔[17]"

---

[16] ایضاً ۱۴ اگست ۱۹۲۵ء [17] مسلمز اینڈ دی کانگرس، جنرل سکریٹری، سنٹرل خلافت کمیٹی آف انڈیا بمبئی ۱۹۳۰

اس میں صداقت ایک طرف اکثریت کے مخالف بے اعتمادی اور بے اعتباری اور شک و شبہ کی بو آتی ہے تو دوسری طرف اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ مسلمانوں کو نہ صرف اتحاد و شیرازہ بندی کی شدید ضرورت تھی بلکہ اپنی سیاسی حیثیت کا بھی مکمل احساس تھا۔ جو کہ سیاسی زندگی میں اپنا مقام پیدا کرنے کا متقاضی تھا۔ اسی ضرورت پر زور دیتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا تھا کہ "مجھے اس سے انکار ہے کہ ہندوستان کی سیاست و عمل کی زندگی میں مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا چاہیے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ بحالت موجودہ اگر وہ کارکن حلقہ باقی نہ رہا جو خلافت کمیٹی کے نام سے پہچانا جاتا تھا تو لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ مسلمانوں کی جماعتی سرگرمیوں کو آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ اور گذشتہ تحریک نے اعتقاد و عمل کی جو ایک خاص آب و ہوا پیدا کر دی ہے وہ ایک عرصے کے لیے معدوم ہو جائے۔"[۱۸]

اس میں شک نہیں کہ خلافت تحریک نے "اعتقاد و عمل" کی فضا پیدا کر دی تھی۔ مسلمانوں میں آزادی کے خیال سے ایک نیا جوش و ولولہ تھا۔ لیکن "تحریک خلافت دوسرے ملکوں میں بسنے والے برادران اسلام کو یورپ کی غلامی سے آزاد کرانے کی ایک ایثار پسندانہ مہم تھی۔ گو تحریک والوں کو اس وقت اس کا احساس نہیں تھا لیکن ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں بلکہ مسلمانوں کو بڑے پیمانے پر ایک عوامی تحریک کو منظم کرنے اور چلانے کے فن سے آشنا کر دیا۔ ان میں خود اعتمادی پیدا کی۔ تحریک خلافت کے بعد اس برصغیر کے مسلمان سیاست دانوں کا لہجہ بدل گیا۔ انھوں نے اس خیال کو اپنے ذہنوں سے یکسر نکال دیا کہ وہ صرف انگریزوں یا ہندوؤں کے رحم و کرم پر زندہ رہ سکیں گے۔ اب وہ میدان عمل میں ایک تیسرے فریق کی حیثیت سے اتر آئے تھے۔"[۱۹]

مسلمانوں کے ایک تیسرے فریق کی حیثیت سے میدان میں آجانے سے مستقبل کے سیاسی حالات نے مختلف رخ اختیار کر لیا۔ تقسیم ملک کے نقطۂ نظر کے محرکات اور پس منظر کو جواہر لال نہرو اس قوم پرستی کا مرہون منت سمجھتے ہیں جس کی اس ماحول میں پرورش ہوئی تھی۔ اس نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے جواہر لال نہرو کی ڈسکوری آف انڈیا سے ایک طویل اقتباس یہاں پیش کرنا ضروری سا معلوم ہوتا ہے۔ تحریک خلافت اور ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنیت کے بارے میں بحث کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں:

---

۱۸ خطبات آزاد۔ صفحہ ۵۸ ۔۔۔ ۱۹ اشتیاق حسین قریشی۔ صفحہ ۲۷۸

"یہاں اسلام ازم کے قدیم نصب العین کی کوئی معنویت اب باقی نہیں رہ گئی تھی۔ خلافت ختم ہو چکی تھی۔ تمام اسلامی ممالک پوری طرح قوم پرست ہو گئے تھے انہیں دوسرے ملک کے مسلمانوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ترکی اس معاملہ میں پیش پیش تھا۔ دوسری جگہوں کی طرح ایشیا میں بھی دراصل نیشنلزم ایک حاوی قوت تھی۔ ہندوستان میں قومی تحریک اور زیادہ طاقت ور ہو چکی تھی اور اس نے برطانوی راج کو بارہا چیلنج کیا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے ذہنوں میں نیشنلزم کے لیے ایک زبردست اپیل تھی اور کثیر تعداد میں مسلمانوں نے آزادی کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا تھا لیکن اس کے باوجود ہندوستانی نیشنلزم پر ہندوؤں کا غلبہ تھا اور اس پر ہندو پن کی چھاپ تھی۔ اس لیے مسلمانوں کے ذہنوں میں ایک کشمکش سی پیدا ہو گئی۔ بہت سوں نے اس نیشنلزم کو قبول کیا اور اپنی پسند کے مطابق اس کے رخ کو ایک مخصوص جہت دینے کی کوشش کی۔ کچھ لوگوں کو اس نیشنلزم سے ہمدردی تھی لیکن اس کے باوجود اس سے الگ تھلگ رہے۔ اور غیر یقینی کیفیت میں رہے۔ لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے ایک اور ہی رخ اختیار کیا جس کے لیے اقبال کی شاعری اور فلسفے نے ان کے ذہنوں کو تیار کیا تھا۔ میری نظر میں تو یہی وہ پس منظر ہے جس کی بنا پر حال ہی میں ہندوستان کی تقسیم کا نعرہ بلند ہوا۔"[۲۰]

تحریک خلافت نے بلا شبہ مسلمانوں میں ایک ایسی بیداری پیدا کر دی تھی جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔" مسلمانوں میں یہ جو بیداری پیدا ہوئی تھی وہ پھیل کر سیاست کے میدان میں بھی داخل ہوئی اور اب وہ سیاسی برتری کی بات بھی سوچنے لگے۔"[۲۱] ڈیسائی بھی یہی نظریہ پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "ہندوستانی مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے اعتبار سے عدم تعاون کی تحریک کی بڑی تاریخی اہمیت ہے۔ اس سے یہ بات آشکار ہوئی کہ سیاسی شعور جو اس سے پہلے مسلمان رؤسا اور مسلمانوں کے اوپری متوسط طبقے تک محدود تھا وہ اب مسلم عوام کے حلقوں میں بھی نفوذ کر گیا ہے یہ درست ہے کہ خلافت کا مسئلہ ایک مذہبی مسئلہ تھا لیکن سوراج کی جدوجہد کے ساتھ اس کا

---

۲۰ جواہر لال نہرو۔ دی ڈسکوری آف انڈیا، کلکتہ، ۱۹۴۶ء، صفحہ ۱۸-۲۱۷

۲۱ راجندر پرشاد: آٹو بایوگرافی، ۱۹۵۷ء صفحہ ۱۴۱

رہنمائی جدوجہد کی وجہ سے اس کا اثر یہ ہوا کہ اس سے مسلمانوں میں قومی شعور کی سطح بلند ہوئی۔"[۲۲]

اس بیداری اور اس شعور کو مسلمان نیشنلزم میں اور حکومتِ برطانیہ کے خلاف جدوجہد میں کام میں لانے کے لیے تیار تھے۔ جس طرح دس برس کے عرصے میں مسلمانوں میں شعور بڑھا تھا اس سے اس بات کی نشان دہی ہوتی تھی کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مذہب کو نہ صرف یہ کہ سیاست سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سیاسی جدوجہد کے لیے یہ سنگِ بنیاد کا کام دے سکتا ہے۔ بعد میں پیدا ہونے والے سیاسی حالات نے جن کو وقتاً فوقتاً فرقہ وارانہ کشیدگی متاثر کرتی رہی، حریف سیاسی گروہوں کی ضد اور ان کے رہنماؤں کے غیر مصالحت پسندانہ رویہ نے معاملات کو دوسرے رخ پر ڈال دیا۔ اس صورت حال کے ردعمل میں مسلمان ملکی سیاسی زندگی کے اصل دھارے سے برگشتہ ہونے لگے۔ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے وہ اقلیتوں کے فطری ہراس کا شکار ہو گئے۔ اکثریت کے ہاتھوں اپنے آزاد تشخص کے گم ہو جانے کے خوف سے مسلمانوں نے سیاسی مسابقت میں خود کو ایک تیسرے فریق کی حیثیت دے لی۔

حکومت کی طرف سے اصلاحات کی متعدد تجاویز نے اس مناقشے کو اور بڑھا دیا۔ فرقہ وارانہ اور دستوری مسائل پر مذاکرات اور مباحثات کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا اور دونوں مسائل کے حل کے لیے متعدد فارمولے وضع کیے گئے لیکن وہ سب غیر موثر اور بے کار ثابت ہوئے۔ ایک طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اور دوسری طرف کانگرس اور حکومت کے مابین سال بہ سال کشیدگی بڑھتی گئی۔ مسلمان اس بات پر بخوبی سمجھ گئے تھے کہ اقتدار کے تبادلے کے بعد وہ تین کے مقابلے ایک کی مستقل اقلیت میں رہیں گے۔ ہندوستان پر صدیوں تک حکومت کرنے والوں کے وارث ہوتے ہوئے وہ اپنی اس حالت پر آزردہ اور کبیدہ خاطر تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ برطانوی دفتر شاہی کے ہاتھوں سے جب اقتدار اکثریت کے ہاتھوں میں منتقل ہوگا تو یہ اکثریت عملاً ایک قلیل تعداد اور خود غرض چند سری حکومت بن کر رہ جائے گی جو اقلیتوں کے حوصلوں اور امنگوں کی طرف بے رحمانہ غاصمانہ و حاکمانہ رویہ روا رکھے گی جس میں غرور و تکبر اور بے دردی بھی ہوگی۔ ڈاکٹر عبداللہ المامون سہروردی (رکن لیجسلیٹو اسمبلی) کا کم از کم یہی خیال تھا جو انھوں نے انڈین سنٹرل کمیٹی کے لیے اپنی

---

۲۲ ڈیسائی، اے، آر، سوشل بیک گراؤنڈ آف انڈین نیشنلزم، بمبئی، ۱۹۲۴ء، صفحہ ۳۵۸

مانٹ فورڈ رپورٹ میں ظاہر کیا تھا۔ یہ رپورٹ پارلیمنٹ میں بھی پیش ہوئی تھی۔ لیکن مسلمان اس پوزیشن کو بغیر کسی جدوجہد کے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ بقول ڈاکٹر سہروردی وہ جہد البقا اور بقائے اصلح کے فطری قانونوں کو یہ موقعہ دینا چاہتے تھے کہ یہ قوانین اس مسئلہ کا ایک پائیدار اور مستقل حل مہیا کر دیں۔"

مذکورہ بالا قسم کے خدشات اور لیڈروں کے ان رویوں نے باہمی مفاہمت اور مصالحت کے بجائے نفرت، شک وشبہ اور بے اعتمادی کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا۔ دونوں فرقوں کے درمیان خلیج کچھ اس حد تک وسیع ہوتی گئی کہ اس کو پاٹنے کی ہر پُر خلوص کوشش بری طرح ناکام ہوگئی اور بالآخر تقسیم ملک پر منتج ہوئی۔

تحریک خلافت نے مسلمانوں میں ایک عظیم وطنی جذبہ پیدا کیا، ان کو محسوس ہوا کہ وہ ایک بڑی طاقت ہیں اور اگر وہ اس طاقت کو استعمال کریں تو برطانیہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینک سکتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی محسوس ہوا کہ اس طاقت کے استعمال کے لیے ملک کی تمام جماعتوں سے اتحاد و اتفاق لازمی ہے۔ ہجرت کی تحریک جس طرح ناکام ہوئی اس نے بھی مسلمانان ہند میں اپنے ملک اور وطن سے محبت کے احساس کو تیز کر دیا۔

جو نظارہ ہندو مسلم اتحاد کا خلافت تحریک کے زمانے میں آنکھوں کے سامنے آیا، اس کو پھر دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس گئیں۔ تحریک آزادی نے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تھا، اب صرف ایک جذبہ کارفرما تھا کہ انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے اور اس لیے سارا ہندوستان پھٹے کپڑوں، ننگے سر اور ننگے پیر والے رضاکاروں سے بھر گیا اور لوگ اپنا کام کاج چھوڑ کر نکل آئے اور صرف تین نعرہ ہندو مسلمان مل کر لگاتے تھے: اللہ اکبر۔ مہاتما گاندھی کی جے۔ مولانا محمد علی کی جے۔"

قاضی محمد عدیل عباسی (تحریک خلافت صفحہ ۲۷۲)

انور صدیقی

شعلے کی سرگزشت

" اپنا جوش دریا دلی سے خرچ نہ کرو۔ ہمیں اتنا بڑا شعلہ نہیں چاہیے جو ایک ہی دفعہ بھڑک کر ختم ہو جائے۔ ہمیں تو وہ ٹمٹماتا ہوا چراغ چاہیے جو ساری اندھیری رات میں روشنی دے.....''

مولانا محمد علی، تقریر، لاہور، ۲۰ جنوری ۱۹۲۱ء

مولانا محمد علی کی سیاست، صحافت، شاعری اور خطابت کا جائزہ لیجئے تو اندازہ ہوگا کہ ان کی سرگرمیوں کے تمام شعبوں پر ایک غضب ناک، تاریک و تند طوفان کی آسمان بوس لہریں سایہ کئے ہوئے ہیں اور اس طوفان کا مرکز ابتداء مولانا محمد علی کا دماغ نہیں، دل ہے۔ ایک طرح کا نیم متمدن قبائلی خروش اپنے تمام تر رومانی وفور کے ساتھ ان کے کاموں اور کارناموں کے جملہ گوشوں پر چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے یہ کیفیت ان کی سیاست کو رومانی، صحافت کو "احتجاجی" اور شاعری کو کم ضبط رومانیت سے قریب کر دیتی ہے۔

مولانا محمد علی کی شخصیت ایک عرصے تک بحث و نظر کا موضوع رہی ہے۔ وہ خود ساری عمر لڑتے رہے، کبھی برطانوی سامراج سے، کبھی تاریک خیالی سے، کبھی دوسروں سے اور کبھی اپنوں سے، جنگ کا استعارہ ان کی زندگی کا غالب استعارہ ہے۔ ان کے بعض عقیدت مندوں کو اس جنگ میں رزمیہ شکوہ نظر آتا ہے۔ بعض اسے Mock Epic یعنی مضحک رزمیے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ارادت اور عداوت میں گھرے ہوئے محمد علی کی شخصیت انصاف طلب ہے۔ اب جب کہ زمانی فاصلے نے عداوت شعاری اور ارادت مندی کی لے کو مدہم کر دیا ہے، محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ وقت

آگیا ہے جب ان کی شخصیت کا حقیقت پسندانہ تعین ممکن رہے۔

اس مضمون میں میں اس بات کی کوشش کروں گا کہ ان کی شاعری کا جائزہ لوں اور ان تمام مسائل سے گفتگو کروں جو ان کی شاعری پیدا کرتی ہے۔

اس ضمن میں پہلا مسئلہ جو مجھ جیسے قارئین کے لیے درپیش ہے وہ یہ کہ مولانا محمد علی کی شاعری ایک خاص دور کی مسلم سیاست، صحافت اور خطابت سے کچھ اس درجہ مربوط ہے یا مربوط کردی گئی ہے کہ آج کے قاری کو جو شاعری سے، شاعری کی حیثیت سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے، بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ ادب شناسی کے لیے اگرچہ ان محرکات کا جاننا ضروری ہے جو تشکیل شعر میں معاون ہوئے ہیں پھر بھی یہ محرکات ایک اچھے شعر میں کیا سے کچھ بن جاتے ہیں یا اچھی اور بڑی شاعری ان سے کتنی ماورا ہو جاتی ہے، اس کا عرفان بھی ضروری ہے۔ اگر یہ عرفان نہ ہو تو شاعری اور تاریخ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ایک اچھے شاعر اور ناقد کے لیے ضروری ہے کہ وہ واقعہ Fact اور صداقت یعنی Truth میں جو فرق ہے اسے جان سکے ورنہ شاعری واقعہ نگاری اور تنقید، زباں قاری بن کر رہ جاتی ہے۔ اچھی اور بڑی شاعری وقتی اور لازمانی عناصر کو کچھ اس طرح ہم آہنگ کرتی ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دنیا کی بڑی شاعری میں وقت کی تکذیب یا تنسیخ کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ مولانا محمد علی کے مداحوں نے ان کی شاعری کو کچھ اس طرح ملکی سیاست سے پیوست کر کے دیکھا اور دکھایا ہے کہ اس پر صحافت کی طرح Period Literature کا گمان گزرتا ہے اور اسے سراسر ہنگامی سمجھ کر نظر انداز کر دینے کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے بڑی غلطی مولانا محمد علی کی شاعری پر لکھنے والوں نے کی ہے، جو ان کی شاعری کو خلافت تحریک، ترکِ موالات اور دوسری تحریکوں سے وابستہ کر کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر یہ شاعری اتنی ہنگامی ہے تو اسے شاعری کے زمرے میں نہیں، صحافت اور قومی تاریخ کے زمرے میں رکھنا چاہئے۔ یہ طرزِ نظر مولانا محمد علی کی شاعری کے درجے کو بلند نہیں کرتا بلکہ شعر شناسوں میں ایک طرح کی تشکیک پیدا کرتا ہے

دوسری دشواری وہ شدید ترین قرب ہے جو مولانا محمد علی کی شخصیت اور شاعری میں پایا جاتا ہے یا جسے ان کی شاعری پر لکھنے والے نمایاں کرتے ہیں۔ شخصیت اور شاعری کا رشتہ جو صدیوں تک

بہت سی تنقیدی گمراہیوں کا موجب تھا۔ بیسویں صدی میں بڑی حد تک حل ہو چکا ہے۔ تخلیق شعر کے دوران
شاعر کی ذات صرف Medium یا ذریعے کی حیثیت رکھتی ہے اور شاعری میں جو ذات جبلتی ہے اور
وہ ذہن جو تخلیق کرتا ہے بقول ٹی۔ ایس۔ ایلٹ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ شاعری جن جذبات
کی تخلیق کرتی ہے وہ دراصل Art Emotions ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق شخص یا ذات سے
لازمی طور پر براہ راست نہیں ہوتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ مولانا محمد علی کی شاعری اور شخصیت میں فصل و فاصلہ
بہت کم ہے۔ بڑی شاعری ہمیشہ توسیع ذات کا اظہار ہوتی ہے اور ہر طور اظہار سے پہلے اپنے آپ
سے اور موضوع سخن سے ایک طرح کے Aesthetic Distancing کی طالب ہوتی ہے۔ کیا
اس طرح کا فاصلہ محمد علی کی شاعری اور شخصیت میں نظر آتا ہے؟ اور اگر یہ جمالیاتی فاصلہ ان کی
شاعری میں موجود ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے۔ یاد رہے کہ اس استعاراتی فاصلے کے تعین میں ان
خارجی تلازموں، علامتوں اور پیکروں کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے جو شاعر اپنے تجربے کے اظہار کے لیے
وضع کرتا ہے۔

شخصیت، اور شاعری کے مسئلے کو مذہبی اخلاقیات نے اور بھی الجھا دیا ہے یہ شاعری اور شخصیت
میں فاصلے کو شبہے کی نظر سے دیکھتی ہے اور اس فاصلے کو قول و عمل کے تضاد پر محمول کرتی ہے۔ مولانا
محمد علی شدید طور پر مذہبی ہونے کی حیثیت سے غالباً اس فریب میں مبتلا رہے کہ شاعر کی ذات اور اس
کی شاعری میں فاصلہ کم سے کم رہے تو بہتر ہے۔ وہ یہ بات فراموش کر گئے کہ اس سے جمالیاتی اور فنی
نقصان کس قدر ہوتا ہے۔ یہ استعاراتی فاصلہ نہ ہو تو جہاں ایک طرف شاعر صرف نجی جذبے کے
ابتدائی انتشار کی تنظیم نہیں کر پاتا وہیں دوسری طرف تجربے کی عدم تنظیم و تہذیب کی وجہ سے فنی
اظہار کے تقاضے بھی مجروح ہو جاتے ہیں یا ان کی طرف شاعر خاطر خواہ توجہ نہیں کر پاتا۔

مضمون کے ابتداء میں میں نے ان کی سرگرمیوں کے تمام شعبوں پر رومانیت کے عنصر کی حکمرانی
کی طرف اشارہ کیا تھا۔ دراصل ان کی شخصیت اور شاعری کی تمام کوتاہیاں رومانیت کی کوتاہیاں ہیں
اور ان کی ناکامی رومانی آدرشوں کی ناکامی ہے۔ رومانیت ذات کے اصرار و اثبات میں جیسے اور جس
طرح کے غلو سے کام لیتی ہے، وہ جس طرح فن کو صرف اظہار ذات بناتی ہے اور انا کے ستونوں کو جس
طرح مستحکم بناتی ہے اس کا نتیجہ عام طور پر یوروپ کے رومانی دور میں تباہ کن ثابت ہوا ہے۔ یہ رومانیت

سیاست میں نراج کو تقویت دیتی ہے اور سماجی سطح پر ایسے افراد کی تخلیق کرتی ہے جو فوق البشر بننے کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یورپ بالخصوص جرمنی میں رومانی فکر و فلسفے کی بدولت آمرانہ رجحانات کو فروغ ہوا تھا۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ نطشے کے رومانی فلسفے کی سب سے اہم تصنیف ہٹلر ہے! ادبی سطح پر بیسویں صدی میں جو نوکلاسکیت کا رجحان ابھرا تھا وہ دراصل ایک اصلاحی ردعمل تھا رومانیت کے محدود تصورِ ذات کے خلاف اور اس جذباتی عدم تہذیب کے خلاف" جو رسم و رہِ رومانیاں" نے پیدا کر دی تھی۔ سیاسی اور سماجی سطح پر یہی کام اشتراکیت کے ظہور نے بھی انجام دیا ہے۔

مولانا محمد علی کی جذباتیت، ان کی تنومندانا، مبارزطلبی، شعلہ مزاجی، نامفاہمت پسندی اور سیماب صفتی کو رومانی اسلوب حیات کی روشنی میں دیکھنا اور پرکھنا چاہیے اس لیے کہ مغربی تعلیم کے ذریعے ذریعے جو عناصر فطری طور پر ان تک منتقل ہوئے ہوں گے، وہ برطانیہ کے اس دور کے عناصر تھے جب باوجود وکٹوریائی عہد کی نیم کلاسکیت کے، رومانی فکر و فلسفہ ایک طرح کی توسیع یافتہ شکل میں برگ و بار لا رہے تھے۔ مغرب سے اخذ کردہ رومانی فکر و فلسفہ کو تقویت اس نئی مشرقیت نے بخشی جو شبلی، سرسید اور اقبال کے ذریعہ ابھر رہی تھی۔ یہ نئی مشرقیت بھی Cantwell Smith کے قول کے مطابق دراصل رومانی تھے۔ مولانا محمد علی کی ذات انھیں دو رومانی اسالیبِ حیات کا مرکزِ اتصال ہے۔ اس نقطۂ نظر سے محمد علی کی شخصیت اور شاعری کو دیکھا جائے تو ممکن ہے ہم ان کے ساتھ بہتر طور پر انصاف کر سکیں۔

حال سے مقدس ناآسودگی رومانیت کی اساس ہے۔ مولانا محمد علی کی حریت پسندی، انقلابیت اور اپنے مخالفین کی طرف ان کے رویے، ان کے رومانی مزاج کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ غیرآسودگی انھیں ہر لمحہ مضطرب رکھتی تھی اور ہر طرح کی مہم جوئی پر آمادہ۔ اس ناآسودگی کے اظہار کے لیے انھوں نے کچھ تلازمے اور علامتیں ماضی میں تلاش کر لی تھیں اس لیے کہ رومانی ناآسودگی ہمیشہ یا تو ماضی کی طرف دیکھتی ہے یا پھر مستقبل میں ایک طرح کی یوٹوپیا بنا لیتی ہے۔ ماضی یا مستقبل میں خفیہ گلستانوں کی تعمیر کے بغیر رومانی مزاج کے شعراء کو اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ مولانا محمد علی نے اس عالم میں مستقبل کا کوئی زبردست وژن تو نہیں دیا ہے ہاں، یہ ضرور ہے کہ انھوں نے ماضی میں اپنی تسکین و تقویت کے لیے

چند علامتوں کو منتخب کر لیا تھا۔ مثلاً ان کی شاعری میں کربلا اور اس سے متعلق بہت سارے تلازمات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کربلا سے متعلق علامتوں کی تکرار یا ان کا کلیدی طور پر استعمال یقیناً معنی خیز ہے اور تجزیہ طلب ہے۔ غیر شخصی طور پر انھیں واقعۂ کربلا حق و باطل کی جنگ کی حیثیت سے متاثر کرتا ہے۔ ذاتی سطح پر حضرت امام حسین انھیں باطل سے عدم مفاہمت کا پیکر نظر آتے ہیں۔ وہ اسی طرح کی عدم مفاہمت کو اپنی شخصیت کا جزو سمجھتے ہیں اور انھیں اس بات پر فخر ہے کہ وہ بھی سفوڑشی کو باطل سے مفاہمت پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ تخیلی طور پر اپنے آپ کو حضرت امام حسین سے وابستہ اور ہم آہنگ کرتے ہیں اور اپنی پوری زندگی کو کربلا کا استعارہ سمجھتے ہیں۔ علامت سازی کے اس عمل میں انھیں تکمیل خواہش کا سامان نظر آتا ہے۔ انگریزی شاعر شیلی نے جو تسکین اور تائید پرومیتھوس Prometheus کے اساطیری کردار میں محسوس کی تھی اسی طرح کی تسکین و تائید مولانا محمد علی کو حضرت حسین کے کردار میں محسوس ہوئی۔ کربلا کی علامت اور اس کے تلازمات کس کس طرح ان کی شاعری میں بروئے کار آئے ہیں۔ اس کا اندازہ ان اشعار سے ہو سکتا ہے:

روزِ ازل سے ہے یہی اک مقصدِ حیات
جائے گا سر کے ساتھ ہی سودائے کربلا
مطلب فرات سے ہے نہ آبِ حیات سے
ہوں تشنۂ شہادت و شیدائے کربلا

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

دینا تھی دادِ تشنہ لبی یوں حسین کو
کوثر کا اک بہانہ بنی کربلائے دوست

جو تھی مسیح و خضر کو ملتی نہیں یہ چیز
اعدیوں نصیب سے تجھے مل جائے کربلا

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علیؓ کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے
خود خضر کو شبیر کی اس تشنہ لبی سے
معلوم ہوا آب بقا میرے لیے ہے

جو دشت کہ آرام گہ سبط نبی ہے
اس دشت کو لاکھوں ابھی آباد کریں گے

مولانا محمد علی کے لیے کربلا صرف تاریخ کے ایک مخصوص مرحلے پر رونما ہونے والا واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ مولانا محمد علی خود کو اور اس صورت حال کو جو انھیں درپیش ہے کربلا کی توسیع سمجھتے ہیں، یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے گویا انھیں کربلا کی تلاش ہے۔ کربلا کی علامت کو جس ہنرمندی اور فنکارانہ سلیقے سے مولانا محمد علی نے استعمال کیا ہے اس کی مثال اردو غزل میں مشکل سے ملے گی۔ اسے وہ اپنی ذات کی تائید و توسیع کے عمل کی علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں مگر یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ مولانا محمد علی کربلا کی علامت کو اپنے مشن اور ذات کی تائید اور اسے اعتبار و افتخار بخشنے کے لیے زیادہ استعمال کرتے ہیں، توسیع ذات کے لیے کم کہ ان کی رومانی سرشت انھیں ادّعائے ذات سے زیادہ آگے نہیں لے جا سکتی تھی!

کربلا کی علامت کے مضمرات میں سے ایک اور تصوّر ابھرتا ہے جو ان کی شاعری میں غالب تصوّر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہے ان کا تصوّرِ مرگ۔ موت اور وہ بھی شہادت کی موت مولانا محمد علی کے لیے ایک بڑی خوشگوار حقیقت نظر آتی ہے۔ زندگی سے بھی زیادہ خوشگوار حقیقت۔ مولانا کی زندگی اور شاعری کے مطالعے کے بعد مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا ہے گویا وہ ساری زندگی اس اندیشہ میں مبتلا رہے کہ وہ کہیں معمول کے مطابق طبیعی موت نہ مریں۔ ایسی موت سے گریز کے شواہد ان کی شاعری پیش کرتی ہے۔ اس گریز کی ایک شکل ان کی خودکشی کے ارادے میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جس کا ذکر ان کے سوانح نگاروں نے بھی کیا ہے۔ رومانی جذبات پرست انسانوں کی زندگی میں ایسے لمحے ضرور آتے ہیں جب انھیں خواب

اور حقیقت کے درمیان ایک زبردست فاصلے کا احساس ہوتا ہے۔ زندگی کی رائے گانی اور کچھ نہ پانے کا احساس ناخن چبھوتا ہے۔ ایسے لمحوں میں انسان اپنے لیے جذباتی تلافی کے طور پر ایک ایسی موت کی خواہش کرنے لگتا ہے، جو غیر معمولی ہو اور اسے دوام عطا کردے۔ اگرچہ مولانا محمد علی کے مذہبی عقیدے نے ان کی خواہشِ مرگ Death-Wish کو شہادت کا رنگ دے دیا ہے اور اس کے رومانی مضمرات کو چھپا لیا ہے۔ پھر بھی وہ موت کا انتہائی رومانی تصور رکھتے ہیں۔ اس خواہشِ مرگ کے پیچھے شکستِ خواب اور زندگی کی لاحاصلی کا شدید ردِ عمل کارفرما ہے جو تمام رومانیوں کا مقدر رہا ہے۔ اسی سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر!
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

کر گئی زندۂ جاوید ہمیں
تیغِ قاتل نے مسیحائی کی

اس طرح کے مرنے میں بھی جینے کا مزا ہے
قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہِ قضا دیکھ

میرے لہو سے خاکِ وطن لالہ زار دیکھ
اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ

شاید کہ آج حسرتِ جوہر نکل گئی
اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

اور کس وضع کی جویا ہیں عروسانِ بہشت
ہیں کفن سرخ شہیدوں کا سنورنا ہے یہی

شمع ایماں کو خدا روشن رکھے
قبر میں جوہر کی پہلی رات ہے

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

رومانی شعریات میں جذبے کے بے محابا اظہار یا بے ساختگی کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ شعر کے حسن تعمیر، دروبست، استعارہ سازی اور پیکر تراشی کے سلسلے میں بے راہ روی کا اندازہ ملتا ہے۔ رومانی فلسفہ چونکہ تخیل کی زندگی پر زور دیتا ہے اور شدید جذبوں سے زندگی کو عبارت جانتا ہے۔ اس وجہ سے رومانی فن بالعموم ارتکاز سے محروم ہوتا ہے اور اس میں اختصار کا اعجاز خال خال نظر آتا ہے۔ مولانا محمد علی کی ابتدائی شعری تربیت داغ، امیر، تسلیم، جلال اور عروج کی پیدا کردہ کلاسیکی فضا میں ہوئی تھی۔ اس فضا نے انھیں اظہار کی سہولت سکھائی تھی۔ اردو کی کلاسیکی غزل کے علمبرداروں سے انھوں نے زبان اور محاورے کے استعمال کے گر سیکھ لیے پھر بھی جو چیز وہ نہ سیکھ سکے وہ ہے جذبے کی تہذیب اور تجربے کی تنظیم کا فن۔ علاوہ ازیں اردو غزل کی جو کلاسیکی روایت انھیں ورثے میں ملی تھی، وہ شعری زبان کا کوئی بڑا تخلیقی تصوّر نہیں رکھتی تھی۔ لفظوں اور محاوروں سے کھیلنے پر قانع تھی۔ جو شعری زبان محاوروں کے بل پر چلتی ہے وہ بالعموم غیر تخلیقی ہوتی ہے۔ نئی تخلیقی شعری زبان نئے نئے استعارے تراشتی ہے اور محاوروں کے سہارے چلنے والی شعری زبان مردہ استعاروں کو اپناتی ہے اور یہ بات بھول جاتی ہے کہ محاورے دراصل مردہ استعارے ہیں۔ بہرحال مولانا محمد علی نے اس کلاسکی روایت سے ایک طرح کی نیم تخلیقی شعری زبان کے گر سیکھ لیے تھے جو ان کی شاعری میں قدرے ڈھیلے پن سے بروئے کار آئی ہے اس لیے کہ مولانا محمد علی کا جذباتی اور رومانی مزاج کسی نہ کسی طور پر صرف اظہار کا قائل تھا، اس کے نزدیک جذبے کا فوری اظہار ہی اسے ایک طرح کے فشار سے نجات دلانے کے لیے کافی تھا۔ اگست ۱۹۲۹ء میں مولانا محمد علی عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں؛

"آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے ایسے سامان بہم ہو گئے تھے کہ میں

زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا تھا۔ رام پور میں جس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب گویا مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ، امیر، تسلیم، جلال، عروج ـــــ دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے، سب رام پور کے آسمان پر نور افشانی کر رہے تھے ...... میں نے دس برس کی عمر میں بہت سے لغو و فضول شعر مگر با معنی اور موزوں کہے تھے ...... اب یہ حال ہے کہ لکھنے بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں مگر طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بغایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت کلام پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے ...... مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق۔ یہ صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لیے ہیں۔"

'دست افشانی' یا 'پاکوبی' کا عمل تخلیق شعر کا عمل ہرگز نہیں اس لیے کہ شعر صرف جذبات سے نجات پانا ہی نہیں، جذبات کی تہذیب و تزئین بھی ہے۔ ورڈس ورتھ کے Preface to Lyrical Ballads پر پلی بڑھی نسل تخلیقِ شعر کا اس سے بہتر تصور کہاں سے لاتی۔ مولانا محمد علی بھی اسی کے قتیل معلوم ہوتے ہیں۔ صرف جذبے کے خلوص اور شدت کے سہارے جہاں تک شاعری جا سکتی تھی، مولانا محمد علی اسے وہاں تک لے گئے۔ ارتکاز و ایجاز ان کے بس کے نہ تھے کہ انھوں نے مزاج ہی ایسا پایا تھا اور ان کی مصروفیات بھی بسیار جہت تھیں۔ جو بات انھوں نے اپنے مضامین کے سلسلے میں کہی ہے، وہ ان کی شاعری پر بھی صادق آتی ہے:

"... ایک صاحب نے اپنے دوست کو بہت درست لکھا تھا کہ 'معاف کرنا، خط بہت طویل ہو گیا، مختصر لکھنے کے لیے وقت نہیں نکال سکا'۔ جو میری طرح قلم برداشتہ لکھنے پر مجبور ہو، وہ بیچارہ مختصر کیا لکھ سکتا ہے۔"

شاعری بالخصوص غزل کی شاعری جس ارتکاز و ایجاز کا مطالبہ کرتی ہے، اس کا حق مولانا محمد علی کم ہی ادا کر سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اچھی شاعرانہ شخصیت کے باوجود بہت اچھی اور بڑی شاعری کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مگر سیاسی غزل کی روایت میں ان کی ایک خاص حیثیت ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا حسرت اور مولانا محمد علی دونوں ہی شاعر بھی تھے اور سیاسی رہنما بھی۔ حسرت نے نہ جانے کیا

جس کے لئے کہ شاعری میں صرف عاشق ہی رہے، سیاست کو داخل نہ ہونے دیا اور اگر وہ کہیں کہیں داخل بھی ہو گئی ہے تو وہ شعری تجربہ نہیں بن پائی ہے۔ مثلاً اس شعر میں با وجود شعری آہنگ کے کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اسے نثری بیان سے جدا کر سکے:

دولت ہندوستاں قبضۂ اغیار میں — بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

مولانا محمد علی اس نسل کے شعراء میں اس اعتبار سے بہتر ہیں کہ انھوں نے غزل کے علامتی نظام اور عشقیہ محاورے کو قبول کر کے اعلیٰ درجے کی سیاسی شاعری کے امکانات کو وسعت بخشی۔ چونکہ ان کے یہاں مذہب اور سیاست کی دوئی کا تصور نہیں تھا اس وجہ سے انھوں نے اپنی سیاسی غزل میں مذہب سے جذبے کی صداقت بھی حاصل کی اور اس کی وسیع تاریخ سے تلازمات سے بھرپور استعارے بھی حاصل کئے۔ غزل کے تعیمی انداز اور اس کے مخصوص علامتی نظام نے مولانا محمد علی کی غزل کو صحافت کی ہنگامیت سے بچایا، مذہب اور مذہبی تاریخ سے اخذ کردہ علامتوں نے اس کی بساط کو وسعت بخشی — ایک ایسی وسعت جو خالص سیاسی شاعری کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان کے کچھ سیاسی اشعار سنئے جو شعری تقاضے بھی پورے کرتے ہیں:

گر بوئے گل نہیں نہ سہی یادِ گل تو ہے\
صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور

کیا عشق نا تمام کی بتلاؤں سرگزشت\
دار و رسن کا اور ابھی انتظار دیکھ

بے خوف غیر دل کی اگر ترجمان نہ ہو\
بہتر ہے اس سے یہ کہ سرے سے زبان نہ ہو

یقیں آنے کو تو آ جائے تیرے عہد و پیمان کا\
تری آنکھ اے بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

١٧١

الجواهر

في تفسير القرآن الكريم

تأليف

الجزء العشرون

رمضان سنة ١٣٤٩ هـ
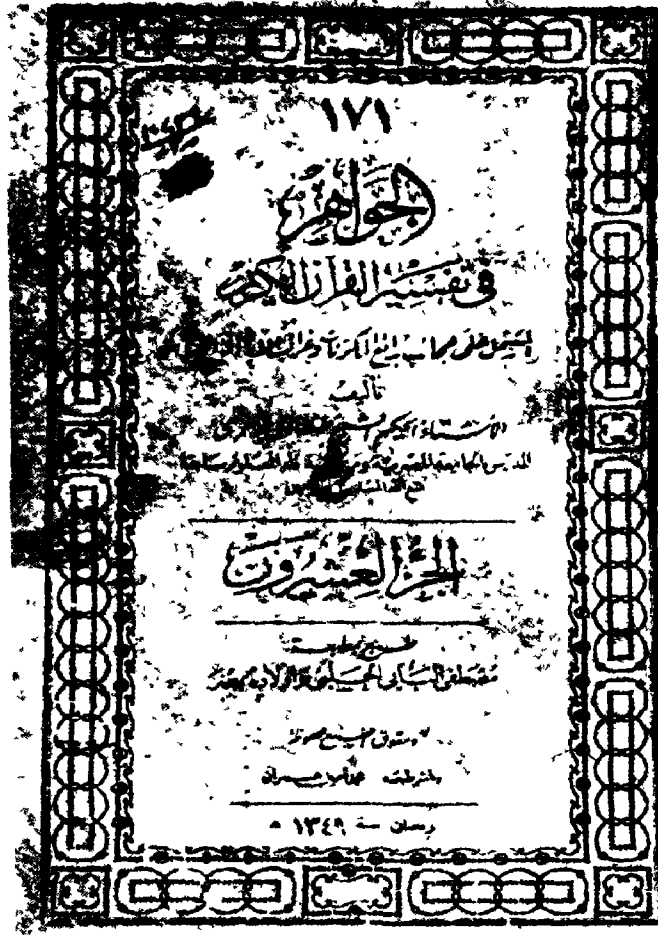
ان تصاویر کے بارے میں ملاحظہ ہو مضمون "جوہر ہند اور جوہری مصر"
صفحہ ۱۲۰

تو گر حدِ پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس حدِ ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

خوفِ غماز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر،
ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے، قفس کے در کھلے

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

یہ سنانے کی نکالی ہے انوکھی ترکیب
ظلم کا نام ستم گر نے حیا رکھا ہے

مولانا محمد علی نے ایسے سیاسی اشعار بھی کہے ہیں جو سپاٹ، بے رنگ اور ہنگامی نوعیت کے ہیں اور ایسے اشعار کی تعداد کم نہیں ہے۔ غزل میں سیاسی اشعار کی روایت کو مولانا محمد علی نے اعتبار بخشا اور بعد کے دور میں اقبال، حسرت اور ترقی پسندوں میں فیض نے غزل سے جو کام لیا ہے، وہ غالباً اس خوبی و خوبصورتی سے ممکن نہیں ہو سکتا تھا اگر مولانا محمد علی جوہر اس سلسلے کا ابتدائی کام انجام نہ دے چکے ہوتے۔
مولانا محمد علی نے چند نظمیں بھی کہی ہیں مثلاً عرض داشت بہ خدمتِ سر سید، فغانِ دہلی، نوحۂ حسین، شانِ کلکتہ، اور دعائے اسیر وغیرہ۔ ان نظموں میں کوئی ندرت اور انفرادیت نہیں ہے، اظہار کا اسلوب بھی غزلیہ ہے۔ دعائے اسیر البتہ اپنے غزلیہ اسلوب کے باوجود مولانا محمد علی کی سب سے اچھی نظم ہے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اقبال کی شاعری سے متاثر ہونے کے باوجود ان کی شاعری کہیں بھی اس بات کا پتہ نہیں دیتی کہ اردو میں اقبال پیدا ہو چکے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ محبت اور

عزت کی وہ کشمکش ہے جس میں مولانا محمد علی اقبال سے ایک معمولی سے اختلاف کی وجہ سے جو ہو گئے تھے یا اختلاف خلافت کے سلسلے میں اقبال کی عدم ہم نوائی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اقبال کو مرحوم کہنے لگے تھے۔ اقبال سے ان کا جو رشتہ رہ گیا تھا اس کا بیان مولانا محمد علی کی زبان میں سنئے

"ڈاکٹر اقبال صاحب کو میں اقبال مرحوم اسی لئے کہتا ہوں اور انھیں میں یقین دلاتا ہوں کہ ان کے سیکڑوں اشعار جو مجھے یاد تھے جب کبھی بھولے بھٹکے ذہن میں یاد آجاتے تھے تو قلب پر وہی اثر ہوتا جو ایسے خاندان والوں کا ہوتا ہے جس کی ایک لڑکی کسی شرمناک فعل کے ارتکاب کے باعث گھر سے نکل گئی ہو اور انھوں نے خاندانی عزت و آبرو کی تباہی کے باعث اسے دل سے بھلانے کی کوشش کی ہو اور اتفاقیہ اس کے اوڑھنے یا پہننے کی کوئی چیز نکل آئے اور یکایک ان کی اس پر نظر پڑ جائے۔ محبت اور شرم دونوں کی کشمکش اس سے زیادہ دل پر چوٹ لگانے والی کون سی جنگ ہو سکتی ہے۔"

اقبال کے سلسلے میں مولانا محمد علی کی Ambivalence نے انھیں شعر کی سطح پر متاثر نہ ہونے دیا ورنہ ممکن ہے کہ مولانا محمد علی اپنے کلاسیکی لسانی رویے سے کچھ آگے بڑھتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ ان کے شعری محاورے میں کوئی معنی خیز تبدیلی رونما ہوتی مگر دیکھا آپ نے کہ وہ کس طرح شخصیت اور شاعری کا محدود تصور رکھنے کی وجہ سے اقبال سے برہم ہو گئے اور اقبال کے فکر و شعر دونوں کے دروازے اپنے اوپر بند کر لیے۔ یہاں بھی ان کی مشتعل بکف جذباتیت ان کی رہنمائی کرتی ہے اور ان کے ردّ عمل کے سانچوں کا تعین کرتی ہے۔ ان کی اسی اور ایسی ہی جذباتیت نے انھیں رومانی سیاست کی بھی راہ دکھائی جو کم ثبات اور ناپائیدار تھی اور ان سے ایسی شاعری بھی کروائی جو کلاسیکیت کی چند ظاہری شکلوں کو قبول کرنے کے باوجود اپنے مزاج اور طینت کے اعتبار سے رومانی شعری رویوں کا اظہار کرتی ہے اور اس میں جذبے اور پیکر کے عدم تعین، حسن تعبیر کے احساس کی کمی، جذبات کا مبالغہ آمیز اور انا گرفتہ احساس جس میں خودنگری کے شعور سے بے خبری اور خودکشی کی طرف مائل ہونے کے وہ سارے عیب موجود ہیں جو بیسویں صدی کے نقادوں نے رومانیت میں دیکھے اور دکھائے ہیں۔ وہ اگر ایک دنیا سے خفا ہونے اور لڑنے کے ساتھ کچھ دیر خود اپنے آپ سے لڑ لینے کا فن سیکھ لیتے تو ممکن ہے کہ بڑی نہ سہی خاصی اچھی شاعری ضرور کر لیتے مگر اس کو کیا کہیے کہ انھوں نے اپنا جوش و جذبہ

[illegible] کیا ہو رہا ہے برخلاف اس کے ہر چراغ کے مقابلے میں ایک ایسا شعلہ بنا [illegible] کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اس شعلے کی سرگزشت ان کی سیاست بھی [illegible] — دونوں روشن بھی ہیں اور گرم بھی مگر ہیں کم ثبات، شعلے کی طرح!

تکلف اور تصنع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا، وہی رنگ یہاں بھی ہے، شعر کہتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں، نہ کسی قسم کی تیاری نہ کوئی اہتمام، کیسی نظر ثانی اور کہاں کا غور و فکر، نہ اصلاح و ترمیم، بس جو دل میں آگیا جھٹ سے کہہ گذرے، یہی حال نثر کا ہے یہی حال نظم کا ہے۔

زمانہ حکومت کی اصطلاح میں "نظربندی" کا تھا، احکم الحاکمین کے اجلاس میں یہ وقت "نظر ثانی" کا قرار پایا، خوب خوب سچے کی کہنے لگے:

سوز دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو
ہے درد دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو
دیر و حرم میں ڈھونڈھ کے سب تھک گئے اسے
اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

شعر سنئے:

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لیے
یہ کیا کہ مئے حلال وہاں اور یہاں نہ ہو
سنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا
جو ہو وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

(مولانا عبدالماجد دریابادی (محمد علی - ذاتی ڈائری کے چند ورق - حصہ دوم صفحہ ۲۲۴)

مولانا محمد عبدالملک جامعی

مولانا محمد علی
کی
آخری تقریر اور آخری تقریب

جناب محمد عبدالملک صاحب جامعہ کے ان چند خوش قسمت قدیم طلباء میں سے ہیں جن کی مکمل تعلیم و تربیت جامعہ ملیہ میں ہوئی اور جنھیں مولانا محمد علی کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کی عزت بھی حاصل ہوئی۔ موصوف مشہور خطاط منشی عبدالقیوم مرحوم کے صاحبزادے ہیں جنھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمان القرآن کی کتابت کی تھی اور جن کا خط مولانا آزاد کو بہت پسند تھا۔ ملک صاحب تقریباً تیس سال سے مستقل طور پر مدینہ منورہ میں مقیم ہیں اور حفظ قرآن کے مدارس کے نگراں ہیں جو مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں قائم ہیں۔ موصوف کو مولانا محمد علی مرحوم سے شروع ہی سے بڑی عقیدت تھی اور اپنی نوعمری کے باوجود مولانا کی خدمت کے لیے زیادہ سے زیادہ مستعد رہتے۔ اسی زمانے میں انھوں نے مولانا کی جامع مسجد دہلی کی آخری تقریر اور مولانا کی سب سے چھوٹی صاحبزادی گلنار کی شادی کے بارے میں کچھ نوٹ لیے تھے جنھیں ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔ ہم مولانا افتخار فریدی (مراد آباد) کے ممنون ہیں، جن کی عنایت سے ہمیں یہ دونوں نوٹ موصول ہوئے ہیں

آخری تقریر

سنہ ۱۹۳۰ء کا سنہ تھا اور اپریل کی جمعرات کا دن صبح کا وقت میں خدمت میں حاضر ہوا، فرمانے لگے کل میں آخری تقریر کروں گا۔ آخری تقریر بس اس کے بعد پھر کوئی تقریر نہیں ہوگی۔ سب سے

کچھ یاد آگئے یعنی سعید سے بھی (ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ سعید انصاری صاحب) اور فلاں اور فلاں ہم نے خود شفیق صاحب کو اطلاع کر دی۔ اصل میں ۱۹۴۷ء کے بعد مولانا کا ان کے پرانے رفقاء، اساتذہ اور طلباء سے سلسلہ منقطع ہوتا چلا جا رہا تھا جامعہ بھی اس کی زد میں آ چکی تھی۔ ہاں یہ ڈاکٹر ذاکر صاحب کا کمال تھا کہ انھوں نے مولانا کو محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان کی عقیدت میں کوئی فرق آ گیا ہے، اگرچہ جامعہ خاصی بدل چکی تھی۔ بہر حال دوسرے دن جامعہ کے اکثر حضرات دہلی کی جامع مسجد میں جمع ہو گئے یہ وہی مسجد تھی جو محمد علی کی ہنگامہ خیز زندگی کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ عموماً ہر جمعہ کو ان کی یہاں تقریر ہوا کرتی تھی، اب ایک زمانے سے سیاسی مباحث چھوڑ دیے تھے، تبلیغی تقریریں ہو رہی تھیں۔ عنوان ہوتا "اسلام عقل کی روشنی میں" مگر آج انھیں سیاسی تقریر کرنی تھی۔ اس لیے اپنی سب سے محبوب اولاد جامعہ کو خاص طور پر انھوں نے جمع کیا تھا۔ مجمع یوں بھی اچھا خاصا تھا اگر تشہیر میں کوئی اہم اعلان ہوتا تو اس سے بھی زیادہ ہو سکتا تھا۔ بہر حال تقریر ہوئی مولانا نے اپنی ساری سیاسی زندگی پر ایک نظر ڈالی پھر موجودہ مسائل سے بحث کی اور ان کے نزدیک جو حل تھا وہ سامنے رکھ دیا۔ تقریر مجھے تسلسل کے ساتھ مطلق یاد نہیں جستہ جستہ فقروں کی ۳۵ برس سے حفاظت کر رہا ہوں۔ اچھا ہے آج سپرد قلم ہو جائیں اور حوالۂ ملت —— اپنی حد سے گذری ہوئی صحت کے بارے میں فرمایا :

اگر میرے ایک پاؤں کے نیچے برف کی سل رکھ دی جائے اور ایک کے نیچے آگ کے انگارے تو میں یہ نہیں بتا سکوں گا کہ آگ کس پاؤں کے نیچے ہے اور برف کس پاؤں کے نیچے ۔ درمیانی تقریر میں ذاکر صاحب وغیرہ کا نام لے کر اطمینان کر لیا کہ وہ واقعی موجود ہیں ۔

اسی ذیل میں انھیں شفیق صاحب (مولوی شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم سابق وزیر تعلیم دہلی اسٹیٹ) یاد آئے، فرمایا، ۔ ہاں وہ تو جیل گیا ہوا ہے۔ جیل کا نام آیا تو یہ بھی جان لینا چاہیے کہ اس وقت گاندھی جی کی تحریک نمک سازی شروع ہو چکی تھی۔ یعنی کانگریس کی طرف سے سول نافرمانی کی ایک تازہ تحریک اور جامعہ کے بعض طلبہ اور اساتذہ اس میں عملاً شریک ہو کر جیل جا چکے تھے شفیق صاحب ہمارے ہاں تاریخ و جغرافیہ کے استاد تھے، مولانا کا اس وقت کانگریس سے کوئی علاقہ نہیں تھا اور وہ اس تحریک کو کچھ زیادہ مفید نہیں سمجھتے تھے۔ اسی فرق رائے اور حالات کی بنا پر فرمایا، میں آج بھی اس کے گال اسی طرح کاٹتا جیسے ہمیشہ کاٹا کرتا تھا۔ وہ مجھے اب بھی اتنا ہی

پیدا ہے [illegible] نسل کو معلوم نہ ہو کہ یہ مولانا کی مستقل عادت تھی کہ وہ اپنے [illegible] کانگرس کا ذکر کرتے تھے۔ جس طرح غایت محبت میں آدمی اپنے بچوں کو پیار کرتا ہے اور یہ عادت ایسی طبعی بن گئی تھی کہ امیر امان اللہ خاں جن کی سطوت کا اس وقت ڈنکا بج رہا تھا۔ [illegible] میں آئے تو بر سر عام ہی [illegible] کانگرس کہنا شروع کر دیے تھے۔ اس زمانے میں مولانا پر ایک الزام یہ چل رہا تھا کہ ان کو حکومت سے روپیہ مل رہا ہے "انقلاب" (مولانا سالک صاحب کے اخبار) نے لکھا تھا کہ مولانا کو ڈھائی سو روپے یا کچھ زیادہ ماہوار حکومت دے رہی ہے اس سلسلے میں فرمایا:

ارے بھائی! افضل حسین میرا ساتھی ہے، اس کو سات ہزار ملتے ہیں، سر چھوٹو رام بھی میرا ساتھی ہے اس کو بھی سات ہزار ملتے ہیں۔ میری تم نے اتنی ہی قیمت لگائی۔ ہمارے ہاں مثل مشہور ہے، آدمی کھائے تو ہاتھی کا [illegible]۔ اگر مجھے حکومت سے لینا ہی تھا تو دو سو ڈھائی سو پر کیوں راضی ہو جاتا — میں نے بھی کانگرس کا ساتھ دیا ہے۔ میں بھی متحدہ قومیت کا علم بردار تھا۔ مگر جو کچھ میں نے اُس وقت کیا تھا۔ اِس وقت اس سے کام نہیں چلے گا۔ اس کی مثال اس لال بجھکڑ کے قصے سے ملتی جلتی ہے جس نے درخت میں پھنسے ہوئے آدمی سے کہا کہ کمر میں رسی باندھ لے، پھر لوگوں سے کہا کہ اس کو کھینچو جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ درخت سے گرا اور گرتے ہی مر گیا۔ لوگوں نے کہا یہ کیا کیا؟ جواب دیا: یہ تو قسمت کی بات ہے، اس کا کیا علاج ہے۔ ورنہ ہم نے سینکڑوں آدمی اسی طریقے سے زندہ کنویں سے نکالے ہیں۔ اس کی تو موت آئی تھی مر گیا۔ اُس وقت کی کانگرس اور تھی۔ آج کی کانگرس اور ہے۔ [illegible] اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا: میں آج جو کچھ کہہ رہا ہوں صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کل قیامت میں میرا دامن نہ پکڑا جائے کہ تو زندہ تھا اور تو نے ہمیں راہ نہ بتائی۔

نمک سازی کی تحریک اس زمانے میں شروع ہو چکی تھی۔ لوگوں میں سیاسی جوش و خروش تھا اس لیے مفتی صاحب بھی [illegible] کر تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ جیسے علماء [illegible] پریشان تھی، وہ تحریک میں حصہ لینا چاہتی تھی مگر کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اسی [illegible]

— [illegible]

[illegible]

[illegible] تو پھر آپ کیا کریں گے؟ کیا آپ بھی پھاٹک بند کر دیں گے؟ اگر شریعت میں وقت
کی پابندی [illegible] ہو گئی [illegible] کوئی چاہیے ہے۔ اس پر مفتی صاحب خاموش ہو گئے۔ مولانا نے
[illegible] کے سلسلے میں پاؤں کی بے حسی کا ذکر کیا تھا۔ وہاں آنکھوں کا حال بھی بتایا تھا کہ
[illegible] تقریر کرنے سے ہی نہیں مطلق بولنے سے منع کر دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر تم نے کسی وقت زور کر
کے [illegible] زور سے بھی دی تو ہو سکتا ہے کہ آنکھ کا پردہ پھٹ جائے اور آنکھ بیکار ہو جائے۔
مولانا کی یہ آخری تقریر تھی ملک کے دارالسلطنت جامع مسجد شاہجہانی میں۔ اس کے بعد آخری نومبر ۳۰ء
میں ایک آخری تقریر ہوئی۔ یہ آل انڈیا کانفرنس کا موقع تھا۔ اس طرح "یہ کل ہند" آخری تقریر
تھی۔ اس کے بعد جیسا کہ سب لوگ جانتے ہیں۔ ایک عالمی آخری تقریر لندن میں ہوئی۔ اس کے
بعد وہیں انتقال ہوا۔ مولانا جامع مسجد دہلی میں ایک بار اور بھی دیکھے گئے مگر تھوڑی دیر کے لیے۔
امروہہ کانفرنس کے سلسلے میں کوئی بات کہنی تھی، آدمی بہت کم تھے، صدر جمعیۃ مفتی کفایت اللہ صاحب
سے بہت ناراض تھے۔ ایک بات ایسی بھی کہی جس کو میں نقل نہیں کر سکتا۔ کوئی دیکھنا چاہے تو
مولانا مظہر الدین کے مشہور روزنامہ "الامان" میں مل جائے گی۔

آخری تقریب

مولانا کی چار صاحب زادیاں تھیں۔ زہرہ، آمنہ، حمیدہ، گلنار بیگم۔ بڑی دو لڑکیوں کی شادی
[illegible]ء میں اس حال میں ہوئی کہ اپنے وطن رام پور سے جلاوطن تھے، شہر میں داخل نہیں ہو سکتے
تھے۔ ابتلا کی یہ خاص شکل صرف محمد علی شوکت علی کے لیے پیش آئی تھی۔ نواب رام پور اپنے آقاؤں
کی خوشنودی کے لیے کم از کم اتنا ضرور کر سکتے تھے کہ اپنے حدود ریاست میں ان کو قدم نہ رکھنے دیں
سو ایسا کر دیا — مولانا کو چند دن کی نظر بندی سے آ کر بہت سے ضروری کاموں میں سے ایک
یہ بھی تھا۔ رام پور جا نہیں سکتے تھے تو اس کے متصل شہر مراد آباد آکر کہ وہ وطن ثانی تھا شادی کی رسم
ادا کی جس میں حلقۂ خواص و احباب میں سے صرف مولانا عبدالباری اور ڈاکٹر انصاری ہی شامل
ہو سکے تھے۔ آمنہ وہی ہیں جن کے بارے میں مولانا کا شعر مشہور ہے ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو — نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

گلنار سب سے چھوٹی تھیں۔ ان کی پیدائش ۱۹۱۲ء کی ہے، کامریڈ اخبار کے جاری ہونے کے بعد دو سال کے اندر گلنار پیدا ہوئیں۔ پھر مولانا کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ گویا دورِ قیادت و سیاست کے شروع ہونے کے بعد مولانا کی ساری توجہ امت اسلامیہ کی طرف منعطف ہوگئی۔ بہرحال یہی گلنار ہیں جن کی شادی مولانا کی آخری تقریب ہے۔ یہ بھی ۱۹۳۰ء کی بات ہے ماہ جون کی۔ ہمارے ہی بورڈنگ ہاؤس بشیر منزل (قرول باغ) میں یہ تقریب منائی گئی تھی۔ مولانا کو اس کا بہت خیال تھا۔ خود مولانا کا مسکن "اقبال منزل" بھی بشیر منزل سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ درمیان میں ایک کھلا میدان تھا، اس کے جنوب سمت میں مولانا تھے اور شمال مشرقی جہت میں ہم لوگ، مہمانوں کا قیام تو اقبال منزل میں ہی ہوا یا ڈاکٹر انصاری صاحب کے یہاں دریا گنج میں لیکن شادی بہرحال ہمارے ہاں ہوئی۔ مولانا عبدالماجد بدایونی اس وقت تک حیات تھے، ان ہی نے نکاح پڑھایا تھا۔ باہر سے تشریف لانے والوں میں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی بھی تھے اور عبدالرحمٰن صدیقی تو وہ تھے جن کے انتظار میں یہ شادی ملتوی ہوتی رہی تھی۔ وہ پہلے سے آئے ہوئے تھے۔ رشتہ داروں میں خصوصیت گوہر علی خاں کی تھی یہ مولانا کے بڑے بھائی تھے لیکن قادیانی ہوجانے کی وجہ سے ان سے تعلق ٹوٹ گیا تھا، مگر اس موقعہ پر وہ موجود تھے۔ شعیب قریشی دولھا تھے۔ مولانا اس رشتے پر بہت خوش تھے، وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح ایک طرف وہ بیٹی کے فرض سے فارغ ہوجائیں گے، دوسری طرف اپنے بعد بیگم محمد علی کا بھی ایک باعزت ٹھکانا چھوڑیں گے اگرچہ یہ زمانہ محمد علی اور انصاری کے اختلافات کے عروج کا زمانہ تھا۔ انصاری صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی تھے، اپنے قدیم ساتھی اور دوست شعیب قریشی کی برات، دولھا کے باپ کی حیثیت سے لے کر آئے تھے۔ برات کے ساتھ نہایت عمدہ قلاقند کی پلیٹیں آئی تھیں۔ پلیٹیں بھی سچی چینی کی تھیں۔ اس شام کو مولانا کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ برات کے آنے کے بعد یہ خوشی اور بڑھ گئی تھی۔ (اس موقعے پر دولھا کے لیے کپڑے بیٹی والوں کے ہاں سے آئے تھے۔ مولانا کپڑے لے کر خود پہنچے اور شعیب صاحب کو پہنانا شروع کیا۔ اتفاق سے جوتا کہیں اِدھر اُدھر ہوگیا۔ اب ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ نوشہ میاں کا جوتا کہاں گیا، نوشہ میاں کا جوتا کہاں ہے۔ شادی کے موقعہ پر اقبال منزل میں دوبار قلعی کرائی گئی تھی۔ ستّر روپے خرچ ہوئے تھے، تصویروں کا بہت شوق تھا، کمروں میں آویزاں کی گئیں۔ قدِ آدم

ایک کمرے میں ایک بہت بڑی قلمی تصویر ان کے دادا علی بخش خاں کی نواب عظمت خاں والی ریاست رامپور کے ساتھ تھی۔ اس کے بالمقابل مصر و ترکی کے مشہور عالم و مفتی شیخ عبدالعزیز کی تھی۔ اس کو آویزاں کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ عالم ایسے ہونے چاہئیں ایسے کہ ایک طرف شریعت سے واقف ہوں، دوسری طرف علوم جدیدہ سے۔ یہ سب تصاویر بہت قیمتی تھیں اور مولانا کو بہت عزیز تھیں مگر مجھے آج تک نہیں معلوم کہ مولانا کے بعد ان کا کیا حشر ہوا۔ بیگم صاحب کے کمروں میں تو کبھی ان تصویروں کو دیکھا نہیں۔ کامریڈ والی میز۔ نہایت شاندار ٹیبل۔ ساگوان کی لکڑی کی، ہاتھی جیسے قدکی، وہ بعد میں ہمارے دفتر میں آگئی تھی۔ مولوی شفیق الرحمن صاحب جو ہمارے ادارے کی ڈائرکٹر تھے، اسی پر کام کرتے تھے اور ان کی غیبت میں بطور نائب یہ شرف مجھے حاصل ہوتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فساد میں یہ ادارہ نذر آتش ہوگیا۔ میں حجاز کے سفر میں تھا میز کے متعلق بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ابھی موجود ہے اور حامد علی کی لائبریری میں گئی ہوئی ہے۔[1]

نئی نسل میں شعیب صاحب کے جاننے والے بھی اب کم ہوں گے۔ ڈاکٹر آف فلاسفی ہونے کے علاوہ اتنی ڈگریوں کے مالک تھے کہ شاید ہی اس زمانے میں اتنی ڈگریاں کسی اور کے پاس رہی ہوں گی۔ انگریزی قابلیت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں، مگر شہرت بہت ہے۔ ایک مرتبہ گاندھی جی گرفتار ہوگئے تو ان کے مشہور اخبار "ینگ انڈیا" کو یہی چلاتے رہے۔ مختصر لفظوں میں یہ کہنا صحیح ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں ان کی وہی حیثیت تھی جو ملک میں جواہر لال کی تھی۔ قومی و سیاسی تحریک سے تعلق ترکی وفد سے شروع ہوا جبکہ اس میں (جرمنی سے آکر ترکی) میں شامل ہوگئے تھے اس کے بعد پھر برابر محمد علی اور انصاری کے ساتھ ہی رہے یہاں تک کہ ہندوستان کی سیاست نے کروٹ بدلی۔ نہرو رپورٹ سے ان کا دل کھٹا ہوگیا اور سیاست سے دست کش ہوگئے۔ مولانا محمد علی اس وقت یورپ میں زیر علاج تھے مولانا شوکت علی نے شعیب کو ضروری کاغذات دے کر یورپ بھیجا تھا۔ جوہر قابل تھا۔ نواب صاحب بھوپال نے اپنی وزارت کے لیے ان کا انتخاب کیا۔

---

[1] کچھ عرصے سے وہ دفتر شیخ الجامعہ میں ہے اور میرے استعمال میں ہے۔ جامعہ کے مرکزی کتب خانہ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کے اہتمام میں مولانا محمد علی نمائش کی تیاریاں ہو رہی ہیں، ارادہ ہے کہ اس یادگار میز کو نمائش کے حوالے کر دیا جائے۔ لطیف اعظمی

بھوپال میں ان کے ایک ساتھی کرنل عبدالرحمٰن بحیثیت معالج خصوصی پہلے سے موجود تھے۔ یہی بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد صاحب کے معالج خاص مقرر ہوئے تھے اور ان کے ساتھ یہاں حج کو بھی آئے تھے۔ میں نے حرم مکہ اور کعبہ شریف دونوں کو اور اس مقام ابراہیم میں دیکھا تھا جو ابھی پرسوں منہدم کیا گیا ہے۔ اسی وزارت کے زمانے میں شادی ہوئی اور شادی کے چار پانچ ماہ بعد جب مولانا محمد علی "گول میز کانفرنس" کی شرکت کے لیے لندن تشریف لے گئے۔ تو نواب حمیداللہ خاں صاحب کے ساتھ شعیب بھی وہاں پہنچے۔ قدرتی انتظامات تھے کہ ادھر مولانا اپنے ساتھ بیگم کو بھی لے گئے، ادھر گلنار بھی شعیب کے ساتھ گئیں۔ گلنار سب سے چھوٹی صاحبزادی تھی۔ اس لیے مولانا کو غایت درجہ محبت تھی۔ اس کا وہاں ہونا مولانا کے لیے بہت تسکین کا سبب تھا۔ وہاں گلنار کی سالگرہ کی تاریخ آگئی۔ گلنار امید سے تھیں، ولادت میں کچھ دیر تھی، مولانا بچے کی خوشی کا انتظار نہیں کر سکتے تھے اس لیے گلنار بیگم کی سالگرہ کی ٹھانی، شوکت صاحب منع کرتے رہے، مگر نہیں مانے، ان پر بہت خفا ہوئے اور دھوم دھام سے سالگرہ منائی۔ لندن میں اس وقت قیام ہائیڈ پارک میں تھا۔ وہاں ہی یہ تقریب منائی گئی اور بے شک مولانا کی یہ آخری تقریب تھی۔ اس کے چند ہی دن بعد مولانا اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس تقریب میں گھر کے لوگوں میں مولانا شوکت علی اور ان کے صاحبزادے زاہد علی۔ بیگم محمد علی اور ان کے بھائی مظفر علی، دوستوں میں شعیب کے علاوہ عبدالرحمٰن صدیقی تھے۔ وہ حقیقت میں مولانا کے "صدیق" ہی تھے۔ یار غار۔ اخیر دم تک مولانا کے ساتھ رہے۔ اور مولانا کے انتقال کے بعد انگریزی صحافت میں یہی مولانا کے جانشین بھی ہوئے، بعد میں مشرقی پاکستان کے گورنر مقرر ہوئے تھے۔ شعیب کی اور ان کی دوستی بہت سچی پکی تھی۔ خود صدیقی صاحب کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کے ایک بھانجے ہیں ڈاکٹر صدیقی، شعیب نے اپنی لڑکی کی شادی ان ہی سے کی اور اس طرح اپنی دوستی کے رشتہ کو خون کے رشتے میں تبدیل کر دیا۔

عتیق صدیقی

مولانا محمد علی کے خاندانی حالات

(مقتبس از تذکرۂ کاملان رام پور)

مولانا محمد علی کے خاندانی حالات بڑی حد تک ہماری دست رس سے باہر رہے ہیں۔ اس موضوع کی طرف نہ تو خود مولانا محمد علی نے توجہ کی اور نہ ان کے سوانح نگاروں ہی نے اسے تحقیق و تفتیش کا موضوع بنانے کی کوشش کی۔ 'بی اما' کی وفات کے فوراً بعد "والدہ کی یاد میں" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ مولانا محمد علی نے انگریزی میں لکھا تھا، جو کامریڈ میں بالاقساط شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے اپنے مادری سلسلے ہی کے کچھ حالات ضمناً قلم بند کیے تھے۔ اپنی خود نوشت میں بھی انھوں نے برسبیل تذکرہ اپنے والد کی مسرفانہ زندگی کا، اپنے چچاؤں کے تمول کا اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کا ذکر کرنے ہی پر اکتفا کی ہے۔

مولانا محمد علی کے خاندانی حالات کا جہاں تک تعلق ہے، احمد علی خاں شوق کی تالیف "تذکرہ کاملانِ رام پور"[1] خصوصیت سے قابل ذکر ہے، جو اس موضوع پر قابل قدر اور مستند معلومات اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس تذکرے کے مولف مولانا محمد علی کے حقیقی چچا زاد بھائی اور ان کی بیوی امجدی بیگم کے حقیقی چچا تھے۔ مولانا محمد علی کی وفات سے اکیس ماہ قبل یہ تذکرہ ان ہی کے "ہمدرد پریس واقع کوچۂ چیلان دہلی میں طبع ہوا" تھا۔ کتاب کے آخر میں احمد علی خاں شوق نے "حالات خاندان مؤلف" تفصیل کے ساتھ قلم بند کیے ہیں، جو ایک سو دو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں

---

[1] یہ تذکرہ دراصل امیر مینائی کے تذکرۂ "انتخاب یادگار" (۱۸۷۳ء) کا تکملہ ہے۔ امیر مینائی کا تذکرہ دو طبقات پر مشتمل ہے۔ پہلے میں فرماں روایانِ رام پور کے حالات ہیں اور دوسرے میں شعرائے رام پور کا تذکرہ ہے احمد علی خاں شوق کا تذکرہ "ریاست رام پور کے علما اور اہلِ کمال" کے احوال پر مشتمل ہے۔

احمد علی خاں رام پور میں ۱۴؍ جنوری ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے۔ "ابتداً کلام اللہ حفظ کیا اور پھر فارسی تعلیم بقدر نصاب مقررہ..... حاصل کی۔" ۱۸۸۲ء میں ریاست رام پور کے رسالہ سواروں میں جمعدار مقرر ہوئے۔ پھر وہ اندور چلے گئے، اور وہاں کی پلٹن میں کپتان کا عہدہ پایا۔ ۱۸۸۹ء میں واپس آگئے۔ ۱۸۹۷ء میں نواب حامد علی خاں نے ریاست کے "کتب خانے کا مہتمم..... بہ ماتحتی حکیم محمد اجمل خاں دھلوی بنایا۔ ابتداءً تیس روپے تنخواہ مقرر کی۔ اس خدمت کو قبول کرنے میں سب عزیزوں کو انکار تھا، مگر مجھے کتابوں کا شوق تھا، اس لیے یہی خدمت پسند کی۔"

مولف کے مندرجہ بالا بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاندان میں یہی پہلے شخص تھے جنہیں موروثی فن سپہ گری کے علاوہ "کتابوں کا شوق" بھی تھا، اور جنھوں نے یہ تذکرہ مرتب کرکے اپنے علمی ذوق کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ان کے بعد مولانا محمد علی کا نمبر آتا ہے، جو ان سے عمر میں پندرہ سال چھوٹے تھے۔

"حالات خاندان مولف"

مولف نے اپنے خاندانی سلسلے کا بیان محبوب بخش خاں کے سوانح سے شروع کیا ہے، جو ان کے اور مولانا محمد علی کے پردادا تھے۔ ان کے "مورث اعلیٰ پشاور کے اطراف سے اسلامی فتوحات کے ساتھ ساتھ پنجاب کے اکثر حصوں میں بود و باش کرتے ہوئے دہلی، اور دہلی سے ضلع مرادآباد کے اغوان پور، موضع میں جو حاکم نشین مقام تھا، آئے..... کہا جاتا ہے کہ محبوب بخش خاں کے اجداد میں شیخ محمد دائم اس علاقے کے صوبہ دار تھے۔"

مولف نے یہ نہیں بتایا ہے کہ ان کا خاندان کہاں سے اطراف پشاور میں آیا تھا۔ یا یہ کہ اصلاً وہ عربی تھے یا افغانی۔ لیکن مولانا محمد علی نے گول میز کانفرنس کی اپنی آخری تقریر میں واضح الفاظ میں کہا تھا کہ "میں نسلاً سامی ہوں۔"

بہرکیف "محبوب بخش کے والد شیخ امان اللہ اور ان کے نانا دونوں نواب نجیب الدولہ بہادر کے دربار میں معتمد ملازموں میں تھے...... محبوب بخش خاں کی ولادت اغوان پور (۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء) میں ہوئی۔ اسی سال نواب نجیب الدولہ کا انتقال ہوا۔ یہ بھی ہوشیار ہوکر باپ اور نانا کے

ساتھ خدمت کرنے لگے .... ہفتم صفر ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء کو محبوب بخش خاں کا انتقال نجیب آباد میں ہوا.... تین بیٹے اور ایک بیٹی یادگار چھوڑیں۔"

محبوب بخش خاں کے سب سے بڑے بیٹے علی بخش خاں جو مولانا محمد علی کے دادا تھے "۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء میں نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ نواب معین الدین خاں بہادر مرحوم نے اپنے فرزندوں کی طرح پالا پرورش کیا۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں گو باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، مگر نواب صاحب نے اس رنج کو محسوس نہیں ہونے دیا' اور انھیں باپ کی خدمت پر مامور کر دیا... نواب صاحب بہادر جو باپ سے زیادہ شفیق تھے ان کا انتقال ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء میں ہوا۔ باپ پہلے مر چکے تھے، نواب صاحب پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ تمام و کمال اخراجات کے کفیل تھے۔ یہ وقت بڑا سخت تھا اور گویا کہ آفت کا آسمان ٹوٹ پڑا۔"

محبوب بخش خاں کے ترجمہ میں مولف نے زوال روہیلکھنڈ کی اجمالی تاریخ بھی بیان کی ہے، جیسے "نواب نجیب الدولہ بہادر کے عروج کے وقت سے لے کر انتقال تک نہایت سخت انقلابوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔" اس دور میں ہندوستان جس طوائف الملوکی کا شکار تھا، اس کے پیش نظر یہ حیرت ناک نہیں ہے کہ صفدر جنگ اور مرہٹوں کے ہاتھوں روہیلکھنڈ کی سلطنت تباہ ہوئی اور رفتہ رفتہ اقتدار انگریزوں کی طرف منتقل ہوگیا' اور نواب نجیب الدولہ کا خاندان انگریزوں کا وظیفہ خوار بن گیا۔ نواب معین الدین" کے انتقال کے بعد تنخواہ انگریزوں نے بند کر دی" اس سلسلے میں نواب مرحوم کے بیٹوں اور سرکار انگریزی سے جو مراسلت ہوئی، وہ مولف نے نقل کی ہے۔ جولائی ۱۸۳۵ء میں نواب مرحوم کے" دونوں صاحبزادوں نے علی بخش خاں کو اپنا مختار اور سربراہ کار مقرر کیا" اور اس طرح سے علی بخش خاں کا "تعلق گورنمنٹ انگریزی سے نیا پیدا ہوا' اور تمام کاروبار جو انگریزوں سے متعلق تھا ان کے سپرد" ہوا۔

۱۸۴۳ء تک علی بخش خاں نجیب آباد میں مقیم رہے۔" لیکن نواب محمود خاں صاحب بہادر کی آمدنی قلیل اور اخراجات کثیر" تھے، اس لیے علی بخش خاں کی" گذر اوقات کی کوئی صورت نہ تھی۔" چنانچہ انھوں نے نواب صاحب سے اجازت لے کر لکھنو کا سفر کیا۔" تقریباً سال بھر وہاں قیام رہا۔ لیکن کامیابی کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔

۱۸۴۳ء میں نواب محمد سعید خاں والی رام پور نے علی بخش خاں کو لکھنؤ سے طلب کرکے اپنے ولی عہد نواب محمد یوسف خاں سے متعلق کر دیا۔ اس کے بعد تا حیات وہ ریاست رام پور سے وابستہ رہے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران ریاست رام پور ہی روہیلکھنڈ کی ایک ایسی ریاست تھی جس نے دامے درمے، قدمے وسخنے انگریزوں کی مدد کی۔ اس سلسلے میں سب سے اہم خدمات علی بخش خاں نے انجام دیں، جنھیں والی ریاست کا اور انگریز حکام کا پورا پورا اعتماد حاصل تھا۔ ان حالات میں یہ حیرت ناک نہیں ہے کہ علی بخش نے، جو "موروثی نمک خوار نجیب آباد کے تھے . . . . بہ نظر خیر خواہی نواب محمود خاں صاحب کے پاس اپنے بھائی حسین بخش خاں کو بھیجا اور عرض کرایا کہ آپ شورشش میں شریک نہ ہوں۔ اس عرض معروض کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ وہاں حسین بخش خاں کی جان کے لالے پڑ گئے۔"

ریاست رام پور نے انگریزی حکام کو امداد پہنچانے کا جو پروگرام بنایا تھا، اس پر عمل درآمد کے سلسلے میں علی بخش خاں کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے سپرد حسب ذیل خدمات تھیں۔

۱۔ نینی تال کو رسد پہنچانا اور روپیہ بھیجنا۔
۲۔ دہلی، لکھنؤ، مراد آباد، نجیب آباد، بجنور، میرٹھ اور بریلی سے روزانہ خبریں منگانا اور نینی تال تک پہنچانا۔
۳۔ نینی تال سے میرٹھ تک یورپین افسروں کی خط وکتابت کا پہنچانا اور بھیجنا۔
۴۔ برٹش گورنمنٹ کے ہاتھیوں کے کھیدہ کی نگرانی اور کل مصارف کا انتظام۔
۵۔ برٹش فوج کے افسروں کو سامان اور فوج کے لیے آدمیوں کا مہیا کرنا۔
۶۔ کان فی ڈنشل کل معاملات کی ذمہ داری
۷۔ باغیوں کے متعلق نگرانی اور ان کی گرفتاری
۸۔ کان فی ڈنشل معاملات میں خود نینی تال جا کر مسٹر الکزینڈر کمشنر سے گفتگو کرنا۔
۹۔ کل مصارف ایام غدر فوجی وملکی کی نگرانی۔"

علی بخش خاں نے یہ خدمات بڑی مستعدی اور ہوشیاری سے انجام دیں۔ اس سلسلے

میں انھیں شدید خطرات سے بھی دوچار ہونا پڑا۔" روہیلکھنڈ میں جب انگریزی تسلط تمام و کمال ہوگیا، نو
۱۹ رنومبر ۱۸۵۹ء کو گورنر جنرل نے فتح گڈھ میں غدر کے خیر خواہوں کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے
عالی شان دربار کیا . . . اسی دربار میں گورنمنٹ کی طرف سے ایک خلعت مع تلوار و طلائی گھڑی کے
علی بخش خاں کو عطا ہوا۔ تین ہزار چودہ روپے سالانہ کی جمع کا علاقہ ضلع مرادآباد میں دیا . . . . .
نواب فردوس مکان نے بھی خلعت عطا کیا۔" اور متعدد مواضعات بہ طور جاگیر عطا کیے۔

" محرم کی دوسری تاریخ ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء کو" علی بخش خاں کا رام پور ہی میں انتقال ہوا . . . . . .
نواب خلد آشیاں نے تجہیز و تکفین کے لیے پانچ سو روپے بھیجے اور خود مزار پر فاتحہ خوانی کو تشریف
لے گئے۔"

مولانا محمد علی کے والد" عبد العلی خاں خلف پنجم علی بخش خاں" کے تھے۔ "ان کی پیدائش
رام پور میں ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں ہوئی۔ ابتداءً حفظ کلام اللہ کیا۔ بیس پارے کر کے چھوڑ دیے
فارسی تعلیم اچھی حاصل کی۔ صرف و نحو عربی میں بھی خوب دستگاہ تھی . . . . پیدائش کے وقت
سے دس روپے ماہانہ وظیفہ ریاست سے پاتے تھے۔ جوان ہو کر رسالہ ششم سواروں میں جمعدار مقرر
ہوئے۔ طبیعت رنگین پائی تھی . . . ."

" ریاست رام پور سے قطع تعلق کر کے جے پور چلے گئے۔ وہاں ملازمت کی کوشش میں بہت
روپیہ صرف کیا۔ ۱۲۹۷ھ کے رمضان میں رام پور آئے۔ ۷ ررمضان کو روزہ کی حالت میں ہیضہ ہوا
اس وقت رام پور میں ہیضہ کی نہایت شدت تھی . . . . . ۷ ررمضان ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۰ راگست
۱۸۸۰ء کو آخیر شب میں انتقال ہوا . . . تیس سال کی عمر ہوئی۔ اپنی یادگار بندہ علی خاں، ذوالفقار
علی خاں، شوکت علی خاں، نوازش علی خاں، محمد علی خاں اور ایک لڑکی چھوڑی۔

" بندہ علی خاں اور نوازش علی خاں کا انتقال ہوگیا۔ ذوالفقار علی خاں گورنمنٹ انگریزی کے
مختلف عہدوں پر رہے اور انسپکٹر آبکاری کے عہدے سے پنشن لے کر قادیان ضلع گورداس پور میں مقیم
ہوگئے۔ احمدی جماعت کے شریک غالب" رہے۔" شوکت علی خاں بی۔ اے برٹش گورنمنٹ کے محکمۂ
افیون میں ڈپٹی کے عہدے سے پنشن لے کر علاحدہ ہوئے۔ سیاسی جماعت میں شامل ہوئے۔ قید یں
بھگتیں، خلافت کے علم بردار" رہے۔ محمد علی خاں بی۔ اے آکسن عالی جناب نواب سید محمد حامد علی خاں

بہادر والئی رام پور نام ہکیم کی توجہ سے ولایت گئے۔ سول سروس کے امتحان میں ناکامیاب ہوئے۔ ریاست رام پور اور بڑودہ میں ملازم رہے۔ اردو کا ہمدرد روزانہ اخبار اور انگریزی کا مرید ہفتہ وار پرچہ جاری کیا۔ سیاسیات کے لیڈروں میں شمار ہوگیا۔ ان کی سوانح عمریاں چند بار شائع ہوچکی ہیں، اور ایک عالم ان کے حالات سے واقف ہے۔ اور آئندہ زمانہ ان کے متعلق بہت کچھ حالات لکھے گا۔"

مذکورہ بالا مضمون اس لحاظ سے تشنہ ہے کہ اس میں مولانا محمد علی کی والدہ اور ان کی آل اولاد کا ذکر نہیں ہے، اس لیے ذیل میں ان کے بارے میں ضروری معلومات درج کی جاتی ہیں:

مولانا محمد علی کی والدہ کا نام آبادی بیگم تھا، امروہہ ضلع مراد آباد کی رہنے والی۔ ۱۸۸۰ء میں ۲۷/۲۸ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئیں، بعد میں بی اماں کے نام سے مشہور ہوئیں، ۱۹۲۴ء میں ۱۲ اور ۱۳ نومبر، بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب میں ۲ بجکر ۱۰ منٹ پر دہلی میں انتقال ہوا، درگاہ شاہ ابو الخیر دہلی میں آسودۂ خاک ہیں۔

مولانا کی رفیقۂ حیات کا نام امجدی بیگم تھا جو مولانا کے چچا زاد بھائی عظمت علی خاں کی صاحبزادی تھیں، ۱۹۰۲ء میں مولانا سے شادی ہوئی، مولانا کی وفات کے وقت وہ ساتھ تھیں۔

مولانا کی نرینہ اولاد نہیں تھی، صرف چار لڑکیاں تھیں: سب سے بڑی زہرہ، جن کی شادی تقریباً ۱۸ سال کی عمر میں ۱۹۲۰ء میں مولانا شوکت علی کے لڑکے زاہد علی صاحب سے ہوئی۔ دوسری آمنہ جن کی شادی تقریباً ۱۷ سال کی عمر میں ۱۹۲۰ء ہی میں محمود اللہ صاحب سے ہوئی۔ ۱۱ر مارچ ۱۹۲۴ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئیں۔ تیسری صاحبزادی حمیدہ بانو کی شادی ۶ر مئی ۱۹۲۸ء کو رام پور کے ایک عزیز ماجد علی خاں صاحب سے دہلی میں ہوئی، ان کا انتقال آخر جولائی ۱۹۲۹ء میں بہ عارضہ دق مسوری میں ہوا، دہلی میں دفن کی گئیں۔ سب سے چھوٹی گلنار تھیں جن کی شادی مولانا کے عقیدت مند شعیب قریشی صاحب سے ۹ر مئی ۱۹۳۰ء کو جامعہ ملیہ دہلی میں ہوئی، تقسیم ملک کے بعد پورا خاندان کراچی چلا گیا اور وہیں ۲۵ر فروری ۱۹۶۲ء کو شعیب صاحب کا انتقال ہوا، اہلیہ کا اس سے پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ (عبداللطیف اعظمی)

سید غلام ربانی مرحوم

ہفتہ وار کامریڈ

[پیش نظر مضمون نومبر ۱۹۷۵ء کے ماہنامہ "جامعہ" میں شائع ہو چکا ہے، موقع و محل کی مناسبت سے اس خصوصی شمارے میں دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ تقریباً ڈھائی سال ہوئے فاضل مضمون نگار کا ۳۰ ستمبر ۱۹۷۶ء کو تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں حیدرآباد میں انتقال ہو گیا، مرحوم کے بارے میں اکتوبر ۱۹۷۷ء کے جامعہ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے۔]

ساٹھ سال سے اوپر ہوئے، مسٹر محمد علی (اس وقت وہ مسٹر ہی کہلاتے تھے) کلکتہ سے دہلی آئے اور اپنے ساتھ اپنے کامریڈ کو بھی لائے۔ کامریڈ ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار تھا۔ بڑھیا کاغذ پر چھپتا تھا، اس کا معیار اتنا بلند تھا کہ انگلستان کے اخباروں کی ہمسری کرتا تھا۔ ملک میں اس کا مطالعہ ایک فیشن ہو گیا تھا۔ کالج کے طالب علم اپنی استعداد بڑھانے کے لیے اس کو پڑھتے تھے۔ کامریڈ کی "گپ" مشہور تھی۔ اس میں حالات حاضرہ پر طنز و مزاح کے پیرایہ میں تبصرہ ہوتا تھا۔ اس کے لکھنے والے ولایت علی بموق (وکیل بارہ بنکی) تھے۔ سروجنی دیوی اور سر نظامت جنگ کی نظمیں بھی اس اخبار میں چھپتی تھیں انگلستان میں اس کے خریدار دو تین سو تھے۔ آٹھ روپے سالانہ اس کا چندہ تھا، خریداروں کی تعداد آٹھ ہزار تھی، میں اس اخبار سے وابستہ تھا۔

ان دنوں جنگ بلقان زوروں پر تھی، بلقانی ریاستوں نے ترکوں کو نرغے میں لے لیا تھا۔ ملک کے مسلمانوں کو ترکوں سے ہمدردی تھی اس جنگ نے اور جوش پیدا کر دیا۔ مولانا محمد علی نے اخبار "ہمدرد" جاری کیا۔ اس کو انھوں نے ۲۲ فروری ۱۹۱۲ء کے پہلے شمارے کے افتتاحی مقالہ میں یوں بیان کیا ہے:

"... ہمدرد جاری کرنے کا خیال کوئی فی البدیہہ نتیجۂ فکر نہیں کہ وزن اور قافیہ کے

قالب میں ڈھل کر زور ادیر میں احباب کی مجلس میں ہل چل ڈال دے۔ کسی گھبرائے ہوئے دل کا عارضی جذبہ نہیں جیسے قوت واہمہ پلک مارتے صورت کا لباس پہنا کر موجود کر دے بلکہ یہ نتیجہ ہے اخباری دنیا میں عرصے تک رہ نوردی کرنے، سینکڑوں ٹھوکریں کھانے اور بہت سے نشیب و فراز دیکھنے کا، قوم کی زندگی کا خلوت کدوں سے لے کر بازاروں تک مطالعہ کرنے کا۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ قوم کے لیے ایک ایسا رفیق سفر تیار کریں جو منزل مقصود کو دور سے نہ دکھائے بلکہ گم گشتگانِ راہ کے ساتھ برہنہ پا ہو کر ایسے قصے کو پیدا کریں جو احساس دلانے کو الف لیلہ کی طرح روز سنایا کرے اور جب تک قوم کی فلاکت اور نکبت ختم نہ ہو یہ داستان بھی ختم نہ ہو ..."

اب جاننے والے جانتے ہیں کہ جس غرض سے یہ اخبار جاری کیا گیا تھا، وہ کہاں تک پوری ہوئی یہ اخبار اس تیزی سے بڑھا کہ دیکھتے دیکھتے اس کی اشاعت پچیس ہزار پہنچ گئی جو اس زمانہ میں کسی اردو اخبار کے لیے ایک معراج تھی۔ اس کا سالانہ چندہ پندرہ روپے تھا اس نے مسلمانوں میں اخبار بینی کا شوق اور سیاسی شعور پیدا کیا۔ کامریڈ کی "گپ" کی طرح ہمدرد کا "تجاہل عامیانہ" مشہور تھا اس کو میر محفوظ علی بدایونی لکھتے تھے۔ مصر، فلسطین، شام اور ایران کے اخبارات دفتر میں آتے تھے ان کے اہم مضامین کے ترجمے ہمدرد میں چھپتے تھے۔

ہمدرد اور کامریڈ کے چیف ایڈیٹر مولانا محمد علی تھے، ان کے مددگاروں میں راجہ غلام حسین، سید جالب دہلوی، میر محفوظ علی بدایونی، قاضی عبدالعزیز، قاضی عبدالغفار، عارف ہسوی، غلام محمد طور، ضیاء الدین برنی، قاری عباس حسین شامل تھے۔ سید ہاشمی فرید آبادی غیر ملکی اخباروں کے ترجمے کر کے دیتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب کو بھی بلایا گیا تھا مگر وہ نہیں آئے۔ عملہ کے ارکان میں برادرانہ تعلقات تھے ایک دوسرے کو آدھے نام سے پکارتے تھے۔ عملہ ایک خاندان تھا جس میں محمد علی صاحب کی حیثیت صدر خاندان کی تھی۔ کبھی بیت بازی ہوتی تھی، چاندنی رات میں فالیز پر جاتے تھے، خربوزے اور تربوز کھائے جا رہے ہیں اور مولانا شوکت علی سب کو ہنسا رہے ہیں۔

مولانا محمد علی جامع مسجد دہلی میں نماز کے بعد تقریر کیا کرتے تھے۔ دلی کے کمشنر نے ان کو منع کیا انھوں نے صاف کہہ دیا کہ اللہ کے گھر میں تقریر کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ ان کی تقریریں

بہت جوشیلی ہوتی تھیں لوگ شوق سے سنتے تھے۔ شہر میں وہ بہت مقبول ہوگئے اور یہیں سے ان کی لیڈری شروع ہوگئی۔

کامریڈ میں ٹرکش ریلیف فنڈ کھولا گیا، لوگوں میں اس قدر جوش تھا کہ روپے کی بارش ہونے لگی۔ انہی دنوں ترکی حکومت نے جنگ میں مالی امداد کے لیے پچاس لاکھ پونڈ کے قرض حسنہ کا اعلان کیا۔ ہمارے دفتر سے ترکی تمسکات بھی جاری ہوئے تھے، میں اس زمانہ میں ہمدرد اور کامریڈ کا خازن تھا۔

مولانا محمد علی نے ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ترکی کو طبی وفد روانہ کیا۔ اس وفد کی روانگی کا منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ جامع مسجد دلّی کے صحن میں جو مکبّر ہے، اس کی سیڑھیوں پر وفد کے ارکان کھڑے ہوئے، سب فوجی وردی پہنے ہوئے تھے، ان کی ٹوپیوں پر ہلال احمر چمک رہا تھا۔ دلی والوں نے اللہ اکبر کے نعروں میں ان کو وداع کیا، اس وفد کے اخراجات کوئی چار لاکھ کے قریب ہوئے۔ جب یہ وفد واپس آیا تو اس کے حسابات کی جانچ مجھ سے ہی کرائی گئی تھی۔

کامریڈ کا دفتر کوچہ چیلان میں تھا، یہ ایک بہت بڑی دو منزلہ عمارت تھی، ایک حصّے میں دفتر اور پریس تھا دوسرے حصہ میں مولانا محمد علی رہتے تھے۔

ایک دن ان کے ہاں کی ماما آئی اور مجھ سے کہا۔ بیگم صاحبہ (بیگم محمد علی) نے پچیس روپے منگائے ہیں صاحب کے سگار کے لیے۔ میں نے اس سے کہا بیگم صاحبہ کی چٹھی لاؤ، وہ چلی گئی، تھوڑی دیر میں پھر آکے کہنے لگی، بیگم صاحبہ خفا ہو رہی ہیں، کہتی ہیں فوراً روپے لاؤ۔ میں نے پھر انکار کر دیا۔

انکار تو میں نے کر دیا مگر سوچنے لگا میاں بیوی کا معاملہ ہے کہیں مولانا خفا نہ ہو جائیں۔ ان کا غصّہ مشہور تھا۔ دوسرے دن دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور زور سے دبایا، میں نے مڑ کر دیکھا تو مولانا محمد علی کھڑے مسکرا رہے تھے کہنے لگے "ربانی میں تم سے بہت خوش ہوا۔"

مجھے خوب یاد ہے، ایک دن شام کا وقت تھا مولانا نے اپنے کمرہ سے باہر آکر پکارا محفوظ! وہ اپنے کیبن سے نکل کر آئے۔ مولانا نے کہا بھئی، اب میں جلد گرفتار کر لیا جاؤں گا۔ بات یہ تھی کہ اس دن انھوں نے وہ معرکتہ الآرا مضمون لکھا تھا جس کا عنوان "The Choice of the Turks" تھا

اس میں ترکوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ اتحادیوں کے خلاف جرمنی سے مل جائیں (یہ پہلی جنگ عظیم کی بات ہے) کوئی دو ہفتے بعد ترکوں نے اتحادیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور وہ جرمنی سے مل گئے۔ اب کیا تھا مولانا کو مہرولی میں نظر بند کر دیا گیا وہاں سے چھندواڑہ جیل پہنچا دیے گئے۔ اس طرح ہمدرد اور کامریڈ دونوں دم توڑ کر رہ گئے۔ مولانا نے صحافت کی جو بساط بچھائی تھی وہ الٹ گئی اور تمام مہرے تتر بتر ہو گئے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا محمد علی کا دفتر صحافت کا ایک تربیتی ادارہ تھا چنانچہ ان کے مددگار اس فن میں پختہ ہو گئے تھے، بعضوں نے اپنے اپنے اخبار نکالے۔ سید جالب صاحب لکھنؤ پہنچے اور وہاں سے روزنامہ ہمدم جاری کیا جو بہت مقبول ہوا قاری عباس حسین ہمدرد میں کام کرتے تھے، انھوں نے لکھنؤ سے "تمدن" جاری کیا۔ قاضی عبدالغفار صاحب نے کلکتہ سے "صداقت" نکالا، پھر "جمہور" جاری کیا۔ آخر میں حیدرآباد سے "پیام" جاری کیا۔

راجہ غلام حسین کامریڈ کے سب ایڈیٹر تھے ان کی عمر مشکل سے تیس سال ہوگی مگر صحافت میں ایک پیر طریقت تھے۔ مولانا محمد علی آخر میں بہت بڑے لیڈر بن گئے ان کا زیادہ وقت قومی اور سیاسی کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ کامریڈ کی ادارت کا زیادہ بوجھ راجہ صاحب کے کندھوں پر تھا۔ انھوں نے لکھنؤ سے "نیو ایرا" نکالا، اس کے لیے روپیہ لکھنؤ کے سربرآوردہ حضرات نے دیا جس میں بڑی رقمیں وہاں کے ہندو وکیلوں اور بیرسٹروں نے دی تھیں، یہ اخبار کامریڈ کا جانشین تھا، وہی پالیسی، وہی اڈیٹر اور وہی پڑھنے والے تھے۔ چنانچہ چند ہی مہینوں میں اس کی اشاعت ہزاروں تک پہنچ گئی۔ میں اس اخبار کا منیجر تھا، اس کی اٹھان غیر معمولی تھی، مقبولیت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ اس کی اشاعت میں کچھ دیر ہو گئی تو مسز اینی بسنت نے راجہ صاحب کو خط لکھا:

"میرے پیارے بچے! تمہارا اخبار اب تک نہیں، تم اچھے تو ہو"

سر اکبر حیدری نے ان کو حیدرآباد بلایا تھا مگر وہ نیو ایرا چھوڑ کر نہیں جا سکے۔ ایک دن شام کے وقت راجہ صاحب "ہندوستانی" کے اڈیٹر کے ساتھ باتیں کرتے رفاہ عام کلب سے آ رہے تھے پیچھے سے ایک گھوڑا ٹم ٹم تڑا کر بھاگا آ رہا تھا۔ اس نے راجہ صاحب کو اس زور کی ٹکر دی کہ وہ گر پڑے

اور ایسے گرے کہ پھر اٹھ نہ سکے۔ بے ہوشی کی حالت میں ان کو بلرام پور ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ دوسرے دن الہ آباد اور کانپور کے کئی سرجن آگئے۔ دلی سے ڈاکٹر انصاری بھی پہنچ گئے۔ سب نے کوشش کی مگر تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔

آٹھ دن وہ ہسپتال میں بے ہوش رہے، لکھنؤ میں وہ بے حد مقبول تھے، دن بھر ہسپتال کا احاطہ لوگوں سے بھرا رہتا تھا، تین آدمی دن رات ان کے پاس رہتے تھے، ایک چودھری خلیق الزماں دوسرے اسحاق علی علوی (اڈیٹر الناظر) اور تیسرا راقم الحروف۔ آٹھویں دن وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اب سوال یہ تھا کہ نیو ایرا کی ادارت کون سنبھالے۔ مولانا محمد علی اس وقت بیتول جیل میں تھے، انھوں نے کہلوایا کہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کو بلا لیا جائے مگر بیگم صاحبہ بھوپال ان کو بہت عزیز رکھتی تھیں، وہ نہیں آسکے۔ آخر کار شعیب قریشی نے اخبار کو سنبھالا، شعیب قریشی صاحب "ینگ انڈیا" کے چوتھے اڈیٹر تھے جب گاندھی جی جیل میں تھے، انھوں نے بڑے سلیقہ سے کام شروع کیا۔ اس زمانے میں چودھری خلیق الزماں اور عبدالرحمن سندھی نے بڑی مدد کی، بلا معاوضہ کئی مہینے کام کرتے رہے۔

نیو ایرا کی اشاعت میں خوب اضافہ ہو رہا تھا مگر حکومت کی نظر میں یہ اخبار کھٹک رہا تھا، چنانچہ اس کی ضمانت ضبط ہو گئی اور اس طرح نیو ایرا کا گلا گھونٹ دیا گیا، یہ کامریڈ کی دوسری موت تھی۔

۱۔ ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء کو بروز سنیچر کلکتہ سے کامریڈ کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔

۲۔ ۱۴ر ستمبر ۱۹۱۲ء کو کامریڈ کا آخری شمارہ (جلد ۴ شمارہ ۱۱) کلکتہ سے نکلا۔

۳۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کو دہلی سے پہلا شمارہ (جلد ۴ شمارہ ۱۲) شائع ہوا۔

۴۔ ستمبر ۱۹۱۴ء میں ضبطیٔ ضمانت کی وجہ سے کامریڈ بند ہو گیا۔

۵۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۲۴ء کو دہلی سے کامریڈ دوبارہ جاری ہوا

۶۔ ۲۲ر جنوری ۱۹۲۶ء کو ناقابل برداشت خسارے کی وجہ سے کامریڈ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

(عبداللطیف اعظمی)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم

روزنامہ ہمدرد

مولانا محمد علی مرحوم کے معتقدوں اور مخلصوں میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم کو ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہے۔ انھوں نے "محمد علی ۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق" کے نام سے دو حصوں میں جو گراں قدر کتاب لکھی ہے، پیش نظر مضمون ان ہی دونوں جلدوں سے مرتب کیا گیا ہے اور اس کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ الفاظ اور جملے مولانا ہی کے قائم رہیں صرف ایک جگہ ربط کی خاطر مرتب کو کچھ لکھنا پڑا تو اسے مولانا کی عبارت سے الگ کرنے کے لیے قوسین میں کر دیا گیا ہے۔ اس مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جن خیالات اور رایوں کا اظہار کیا گیا ہے وہ براہ راست معلومات اور ذاتی مشاہدے پر مبنی ہیں۔ مدیر معاون

۱۹۱۲ء ختم ہو رہا تھا کہ سرکار انگریزی نے دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل ہونے کا اعلان کیا اور کچھ روز بعد اس پر عمل درآمد بھی ہو گیا۔ مسٹر محمد علی اور ان کا کامریڈ ان دونوں کو بھی اب دہلی آنا پڑا۔ کامریڈ ستمبر ۱۲ ۱۹ء میں کلکتہ سے ہٹا اور ۱۲ر اکتوبر ۱۲ ۱۹ء کو دہلی سے نکلنا شروع ہو گیا۔ ہمدرد نکلا تو نہیں لیکن نکلنے کا اعلان اس کے بھی ہو گیا، بلکہ کچھ عرصے کے بعد نقیب ہمدرد کے نام سے ایک مختصر سا روزنامہ نکلنے بھی لگا۔ ہمدرد کی ادارت کے سازوسامان جس پیمانے پر شروع ہوئے، وہ اس زمانے میں اردو اخبارات کے لیے ایک بالکل نئی چیز تھے۔ بدایوں کے ادیب جلیل میر محفوظ علی بی اے (علیگ) کسی زمانے میں محمد علی کے نیم استاد رہ چکے تھے، وہ اس وقت مالک و مدیر ہمدرد کے مشیر خاص تھے، ان ہی کے مشورے سے ایڈیٹری کے لیے پہلے تو مولوی عبدالحق صاحب بی اے

(جواب "بابائے اردو" کے لقب سے مشہور ہیں اور اس وقت حیدر آباد دکن میں انسپکٹر آف اسکولز تھے) مراسلت رہی، لیکن پہلا تقرر بالآخر اس عہدے پر اردو زبان کے نامور ادیب و ناول نویس مولانا عبدالحلیم شرر کا ہوا، چنانچہ ستمبر میں شرر مرحوم دہلی روانہ ہو گئے۔

محمد علی کا معیار پرچے کے ایڈیٹوریل اسٹاف اور لکھنے والوں ہی کے لیے اعلیٰ نہ تھا بلکہ کاغذ چھپائی وغیرہ ظاہری لوازم کے اعتبار سے بھی وہ اردو کے ہمدرد کو اپنے انگریزی کامریڈ ہی کی سطح پر دیکھنا چاہتے تھے اور کامریڈ ظاہری صفائی اور زینت کے معیار سے ولایت کے ہفت روزہ جریدوں کا گویا ہم سطح تھا۔ چھپائی لیتھو کے بجائے ٹائپ کی ہمدرد کے لیے طے پائی اور خوشنما نئے ٹائپ کے لیے آرڈر بیروت (شام) اور مصر کو بھیجے گئے۔ قدرتاً وہاں سے آنے میں مہینوں کی دیر لگی۔ ٹائپ اور پریس کے الجھاوے جلد ختم ہونے والے نہ تھے۔ نقیب ہمدرد تو جوں کا توں نکلتا رہا، اصل روزنامہ ۸ صفحے کی ضخامت والا، ملتوی ہی ہوتا چلا گیا اور ۱۲ء کی مدت ہوئی ختم ہو چکا، کچھ روز بعد شرر صاحب بھی اکتا کر لکھنؤ واپس آ گئے۔

شرر صاحب کے بعد محمد علی کو ایڈیٹوریل صیغے کے لیے قاضی عبدالغفار بی اے مرادآبادی کے سید جالب دہلوی مل گئے اور کچھ روز بعد محمد فاروق ایم، اے دیوانہ گورکھپوری بھی ہاتھ آ گئے۔

جون ۱۳ء سے خدا خدا کر کے ہمدرد نکلنے لگا اور اردو صحافت کی تاریخ میں ظاہری، معنوی دونوں حیثیتوں سے گویا ایک نیا باب کھل گیا۔

کامریڈ کی دھوم تو مچی ہوئی تھی ہی، ہمدرد نکلا تو اس کی بھی دھوم مچ گئی۔ بڑے چھوٹے سب اس کے گرویدہ، لیکن محمد علی کا قدم اب روز بروز اسلامیت کی طرف اور زیادہ ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ مئی ۱۹۱۳ء میں شہر کانپور میں ایک سڑک نکالنے کے سلسلے میں میونسپلٹی اور کلکٹر نے ایک مسجد کے غسل خانہ کو گرا دیا اور اس پر جب مسلمانوں نے اپنے پرجوش احتجاج کا مظاہرہ کیا تو ان کے مجمع پر گولیاں تک چل گئیں، بڑا ہنگامہ برپا ہوا اور اس کے لیڈروں میں مولانا محمد علی بھی تھے۔ کامریڈ نے اپنے احتجاجی اور تنقیدی مضامین میں کلکٹر تو الگ رہے، خود صوبے کے حاکم اعلیٰ سر جیمس مسٹن کی بھی خوب خبر لے ڈالی۔ حکام اس وقت یوں بھی مسلمانوں کی زبان سے کسی کڑی نکتہ چینی کے عادی نہ تھے اور پھر یہ سر جیمس مسٹن تو محمد علی کو اپنا بڑا پرانا "یار وفادار" سمجھ رہے تھے، قدرتاً

بہت بگڑے، ادھر جنگِ بلقان کے سلسلے میں ٹرکی کی ہمدردی میں بھی محمد علی پیش پیش اور اب چہرے پر داڑھی بھی ـــ یہ سب تو تھا ہی کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں یورپ کی پہلی جنگ عظیم میں ٹرکی بھی جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے برطانیہ کے مقابل آگیا اور کامریڈ نے اپنے ایک بڑے لمبے اور بڑے زوردار مقالے میں جو "چوائس آف دی ٹرکس" کے زیرِ عنوان "ٹائمس" (لندن) کے ایک مقالے کے جواب میں تھا، ترکوں کو اپنے اس انتخاب میں معذور ٹھہرایا۔ یہ شرارہ غضب کا تھا۔ حکام انگریز اب کیسے اور کب تک درگزر سے کام لیتے۔ کامریڈ فوراً بند اور محمد علی فوراً نظر بند ہوئے ـــ وہی محمد علی جو ابھی سال دو سال قبل تک بڑے بڑے حکام کی آنکھوں کے تارے اور منظورِ نظر بنے ہوئے تھے۔

(۲۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کے کامریڈ میں "چوائس آف دی ٹرکس" شائع ہوا، اس کے فوراً بعد کامریڈ کی ضمانت ضبط ہوئی اور اخبار بند ہوگیا، مگر روزنامہ ہمدرد جاری رہا، لیکن اس زمانے میں مولانا محمد علی کو جن حالات سے گذرنا پڑا، اس کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہو گئی اس لیے ۱۵ اپریل ۱۹۱۵ء کو ڈھائی ماہ کی رخصت لے کر آرام کرنے کے لیے اپنے وطن رام پور چلے گئے، لیکن وہاں نظر بند کر دیے گئے، کچھ دنوں کے بعد بحالیِ صحت کے لیے پہاڑ پر جانے کی اجازت ملی، چنانچہ اپنی صحت کے بارے میں ڈاکٹر انصاری سے مشورہ کرنے کے لیے ۱۳ مئی کو دہلی آئے اور ارادہ یہ تھا کہ ان سے مشورہ کرنے کے بعد ۱۶ مئی کو مسوری چلے جائیں گے مگر ۱۵ مئی کو انھیں دہلی کے قریب مہرولی میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس نظر بندی کے بعد چند ماہ تک ہمدرد جاری رہا مگر ۱۰ اگست (۱۹۱۵ء) کو بند ہوگیا۔ کوئی پانچ پونے پانچ سال کے بعد آخر دسمبر ۱۹۱۹ء کو مولانا بیتول جیل سے رہا ہوئے۔ اس کے بعد ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا دوبارہ گرفتار کیا گیا اور مقدمے کے بعد دو سال کی سزا ملی۔ ۲۹ اگست ۱۹۲۳ء کو رہا ہوئے تو کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور اسی سال ۲۸ دسمبر کو کوکناڈا میں مولانا کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے بعد دوسرے سال ۱۹۲۴ء میں ۱۳ اکتوبر کو کامریڈ اور ۹ نومبر کو ہمدرد دوبارہ جاری ہوئے۔ اب مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم کی زبانی دوسرے دور کے حالات سنیئے۔)

قیام اب تک علی گڑھ میں تھا، گویا یہی گھر تھا۔ اب دہلی منتقل ہوئے اور کامریڈ اور ہمدرد کے دوبارہ اجراء کا ارادہ پختہ ہوا۔ فضا کا حال دیکھ دیکھ کر کڑھ رہے تھے اور اخبارات نکالنے کا

قصداً اسی خیال سے کیا کہ ان کے ذریعہ فضا درست کریں گے۔ ہندو مسلمان بات بات پر لڑ رہے تھے۔ اور قوتوں کا رخ بجائے حکومت سے مقابلے کے خانہ جنگیوں کی طرف پھرا ہوا تھا۔ اگست ستمبر کا زمانہ ہوگا جب دہلی آگئے اور وہی مکان پھر کرایہ پر لیا جس میں دس برس پہلے رہا کرتے تھے۔ کوچہ چیلان کا اجڑا ہوا، کچھی مدت کے بعد پھر آباد ہوا۔ مکان بہت بڑا اور وسیع، نیچے کے حصے میں برقی پریس کی مشینیں اور پریس کا سارا کاروبار، کوٹھے پر منیجر، خزانچی اور عملۂ کتابت وغیرہ کے دفتر۔ صیغۂ ادارت کے بھی چھوٹے چھوٹے، لیکن الگ الگ کمرے اور کامریڈ کے سب اڈیٹر کا کمرہ تو بالکل ہی الگ، مختصر صحن، پاخانہ، غسل خانہ۔ دوسری طرف خود مولانا کا بڑا سا آفس اور ڈرائنگ روم۔ اسی طرف سے نیچے زنانہ مکان کا بھی راستہ، اوپر اور نیچے دونوں منزلوں میں دو تین فاضل کمرے، اچھے خاصے وسیع، مولانا کے عزیزوں اور مہمانوں کے لیے۔ کبھی کبھی پھر بھی اتنا ہجوم ہو جاتا کہ مکان کی وسعت ناکافی ہو جاتی۔ مکان کا موقع بھی برا نہ تھا۔ دریا گنج کا ڈاکخانہ قریب ہی اور جامع مسجد بھی دہلی کے فاصلوں کے معیار سے قریب ہی، اسٹیشن بھی کچھ ایسا دور نہیں۔ ملا واحدی صاحب اور مفتی کفایت اللہ صاحب اور راشد الخیری صاحب کے مکانات اسی محلے میں۔

اخبار نکالتے وقت تجارتی پہلو نام کو بھی پیش نظر نہ تھا۔ مقصد تمام تر اصلاحی تھا لیکن اب اخبار نکالنا آسان نہ تھا۔ ۱۹۱۲ء اور ۱۹۲۴ء میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس بارہ سال کی مدت میں جنگ یورپ کے اثراتِ مابعد سے دنیا کی دنیا بدل چکی تھی

نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

پہلی چیز تو مصارف ہی کی زیادتی تھی۔ ہر شے پہلے سے کہیں زیادہ گراں ہو گئی تھی۔ کاغذ کی قیمت، کاتبوں کی اجرت، اسٹاف کی تنخواہ، ہر شے کا معیار بلند ہو چکا تھا

غرض جہاں تک ظاہری مصلحت اندیشیوں کا تعلق ہے، اس وقت محمد علی کے اخبار نکالنے

لہ اشارہ شدھی، سنگٹھن اور تبلیغ و تنظیم کی طرف ہے۔ بقول مولانا دریا آبادی: "جیل جاتے وقت محمد علی ملک کی جو فضا چھوڑ گئے تھے، اب اس کے بالکل برعکس تھی، بات بات پر بدگمانی اور بے اعتمادی ایک طرف شدھی اور سنگٹھن کا زور، دوسری طرف اس کے جواب میں تبلیغ و تنظیم"
(محمد علی — ذاتی ڈائری کے چند ورق (حصہ اول) صفحہ ۱۵۴)

کے کوئی معنی نہ تھے، لیکن اس جوش و اخلاص کے پتلے کو ان ظاہری مصلحت شناسیوں کے ہوش و حواس تھے ہی کب؟ . . . . اب پہلی بار سوال سرمایے کا پیدا ہوا۔ ٹائپ پریس کی مشینیں پہلے کی موجود تھیں۔ اور کچھ اب منگالی گئی تھیں لیکن ظاہر ہے کہ مشین ہی تو سب کچھ نہیں، کاغذ کی قیمت، اسٹاف کی تنخواہوں کے لیے ہزاروں روپیہ ماہوار، مکان کا کرایہ وغیرہ وغیرہ۔ آخر ان سب کے لیے کیا سبیل تھی؟ ـــــ اب اللہ جانے محمد علی نے کن کن دوستوں، مخلصوں سے جوڑ بٹور کر کچھ روپیہ فراہم کیا۔ احمد آباد سے ٹوکل مشینیں آگئی ہیں۔ کلکتہ سے لیتھو کی مشینیں بھی روانہ ہو چکی ہیں، ایک دو یوم میں وہ بھی یہاں پہنچ جائیں گی۔ صرف مشینوں کا لگانا باقی ہے، دوسرے ہفتے میں نہیں تو تیسرے ہفتہ ستمبر [۱۹۲۴ء] میں اخبار نکلنے میں کوئی شبہ ہی نہیں۔[2]

ایڈیٹوریل اسٹاف (عملۂ ادارت) کا سوال سرمایے کے مسئلے سے کچھ کم اہم نہ تھا۔ مولانا اس پر تلے ہوئے تھے کہ ان کی جیب پر کتنا ہی بار پڑ جائے، اسٹاف بہر حال بہتر سے بہتر ہی منتخب ہو لیکن آہ! کہ محمد علی کی بیسیوں دوسری آرزوؤں کی طرح اس آرزو کا بھی بالکل کیا معنی بڑی حد تک ہی پورا ہونا مقدر میں نہ تھا۔ "کامریڈ" کے لیے تو کہنا چاہیے کہ آخر تک بھی کوئی مددگار نہ ملا۔ درخواستیں جتنوں کی آئیں، نہ مولانا کی نظر میں نہ جچتے اور مولانا جنہیں لینا چاہتے وہ خود کسی نہ کسی معذوری سے آنہ سکتے۔ مولانا کی نظر پنجاب کے ملک عبدالقیوم بیرسٹر ایٹ لا پر تھی جو لندن سے "مسلم آؤٹ لک" نکال چکے تھے، مولانا ان کے مضامین سے بہت خوش تھے لیکن ان کی امداد کبھی اس سے آگے نہ بڑھی کہ بس کبھی کبھی کامریڈ کے لیے کوئی مضمون بھیج دیتے۔ صوبہ برار کے مبین الرحمٰن بی اے، ایل ایل بی کے مضامین مولانا نے "بمبئی کرانیکل" میں پڑھے اور انھیں بہت پسند کیا، مدتوں ان سے مراسلت رہی اور برابر ان کی آمد کا انتظار رہا، بالآخر نہ آئے اور اپنے صوبے کے ممبر ہو گئے۔ سب سے زیادہ انتظار شعیب قریشی صاحب کا رہا (جن کی قسمت میں ۲ سال کے بعد مولانا کا داماد ہونا لکھا تھا)، علی گڑھ کے ایم اے ایل ایل بی تھے، لندن میں بیرسٹری پڑھے ہوئے، بڑے مخلص اور پرجوش، "نیو ایرا" (لکھنؤ) کو مدت تک سنبھالے رہے، پھر گاندھی جی کی گرفتاری پر ان کے انگریزی ہفتہ وار ینگ انڈیا کے ایڈیٹر رہ چکے تھے، "کامریڈ" کی سب اڈیٹری کے ہر طرح اہل تھے، ان کے لیے سب کوششیں ہوئیں، ان کا

---

[2] دوسرے دور کا پہلا شمارہ ۸ر نومبر ۱۹۲۴ء کو نکلا۔ (مدیر معاون)

دل نہ پسیجنا تھا نہ پسیجا۔ بمبئی سے ایک صاحب کی درخواست آئی، بڑے ہی نیاز مندانہ اور معتقدانہ
ہیں (اس سلسلے کی ہر مراسلت اور درخواست میری نظر سے گزرنا لازمی تھی) مولانا نے ان کو
سمجھا، بہت خوشی سے تو نہیں لیکن بہرحال انھیں بلا لیا، کچھ روز تو انھوں نے بھی اپنی درخوا
انداز تحریر کو خوب نبھایا، اس کے بعد "کامریڈ" ہی سے علیحدہ نہیں ہوئے بلکہ مولانا کے بھی
ترین دشمن ہو گئے اور انھیں اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

"ہمدرد" کے لیے امیدواروں کی کمی نہ تھی، مگر وہی دقت یہاں بھی تھی، جنھیں ہمدرد
تھا وہ عنقا تھے اور جو خود آنے کو تلے رہتے تھے ان کی میزبانی میں ہمدرد کو تامل تھا۔ مولانا کو ا
فرصت نہ تھی کہ ہر درخواست کو پڑھ سکیں، ساری ذمہ داری اسی نیاز مند کے سر تھی۔ جالب صاحب
ہیں نے زبانی گفتگو کی، وہ حضرت اب لکھنؤ کے قطب بن چکے تھے، وطن کی کشش بھی ہٹنے پر آ
نہ کر سکی۔ زمیندار (لاہور) کے مالک صاحب سے بھی مراسلت رہی مگر بے نتیجہ، آخری قرعۂ انتخ
ان چھ صاحبوں کے نام پڑا: (۱) محمد فاروق صاحب دیوانہ گورکھپوری ایم اے (علیگ) ہمد
کے دور اول میں بھی رہ چکے تھے (۲) احتشام الدین صاحب دہلوی ایم اے (علیگ)، بعد
ممتاز لغت نویس (۳) عارف ہسوی صاحب، پرانے نیشنلسٹ اور کانگریسی پرچوں میں کام کئے ہ
(۴) قاری عباس حسین صاحب دہلوی، ہمدم وغیرہ میں کام کئے ہوئے، ایک ماہنامہ تمدن بھی نکا
چکے تھے (۵) محمد جعفری صاحب جامعی مچھلی شہری، جامعہ کے ہونہار نوجوان، ہمدرد میں شروع سے
آخر تک رہے، بعد کو اپنا روزنامہ ملت نکالا (۶) حسن ریاض صاحب بلند شہری، اپنا ایک ہفتہ وا
نکال چکے تھے، مدت کے بعد لکھنؤ سے روزنامہ ہمت اور پھر دہلی سے لیگی روزنامہ منشور نکالا۔

اردو کے کسی روزنامہ میں اس وقت تک نہ سب ایڈیٹروں اور مترجموں کی اتنی تعداد تھی اور
نہ قابلیت کے اعتبار سے اتنا بہتر اسٹاف کہیں اور جمع تھا، غرض کچھ نہ ہونے پر بھی ہمدرد کا اسٹاف
کیفیت اور کمیت دونوں حیثیتوں سے اپنی نظیر آپ تھا۔ یہ بھی ٹھہری کہ مختلف مرکزی مقامات
میں ہمدرد کے "وقائع نگار خصوصی مقرر ہوں، چنانچہ لکھنؤ، بمبئی، علی گڑھ وغیرہ میں وقائع نگاروں
کا تقرر ہوا اور مشاہیر اہل قلم سے درخواست کی گئی کہ سیاسی، علمی، ادبی، مذہبی عنوانات پر اپنے ماہرانہ
فاضلانہ مقالات سے وقتاً فوقتاً ناظرین ہمدرد کو مستفید کرتے رہیں۔

۱۳ اکتوبر (۱۹۲۴ء) کو خدا خدا کرکے کامریڈ کا پہلا پرچہ نکلا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، آٹھ دن کے بعد ۸ نومبر کی شام کو ۹ نومبر کا پہلا پرچہ ہمدرد کا شائع ہوا۔ ۱۲ سو پرچے خاص دہلی میں نکل گئے۔ اور مانگ برابر جاری رہی، محمد علی کا سکہ اب دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔

کامریڈ کی مالی حالت، اس دور ثانی میں، اچھی کبھی بھی نہ رہی، بس پرچہ کشتم پشتم کسی طرح چلے گیا، ایک مہینے میں اگر بڑا زور لگانے سے سو خریدار کہیں بڑھے تو دوسرے مہینے سوا سو خریدار گھٹ بھی گئے فروری ۱۹۲۶ء میں محمد علی سخت علیل ہوئے، ذیا بطیس تو تھا ہی، اب جسم میں پھوڑے جا بجا نکل آئے اور بالکل ہی صاحب فراش ہو کر پڑ گئے۔ کامریڈ چار مہینوں سے قرض چلا آ رہا تھا، چار نمبروں کا مجموعہ ایک نمبر ۲۲ جنوری کی تاریخ ڈال کر تو خیر کسی طرح نکال ہی دیا، اس کے بعد کا پرچہ نکلنا کسی طرح ممکن نہ ہوا۔ پریس والوں، مشین مینوں، کمپازیٹروں وغیرہ کے مطالبات مدت کے چڑھے ہوئے تھے، ان ہی کا چکانا اور بیباق کرنا دشوار ہو رہا تھا، نئے مصارف کی گنجائش کہاں سے نکلتی۔ اس طرح کوئی ۱۵ مہینے کی آب و تاب کے بعد یہ آفتاب صحافت غروب ہو گیا اور اب کی مرتبہ اس کی تدفین انگریز حکومت کے جبر و تشدد کے ہاتھوں نہیں، خود اپنی قوم کی ناقدریوں کے ہاتھ ہوئی۔

وسط مارچ ۱۹۲۹ء میں میں وطن سے حج کے لیے بمبئی روانہ ہو گیا اور مئی میں مدینہ منورہ میں تھا کہ مدینہ (بجنور) کے ایک پرچے سے ہمدرد کے بند ہو جانے کی نہایت درجہ اندوہناک خبر ملی، ہاتھ مل کر رہ گیا، کرتا کیا اور خود مولانا بیچارے بھی کیا کرتے، مسلسل مالی خسارہ کب تک اٹھاتے رہتے۔

——— کامریڈ ہفتہ وار فروری ۱۹۲۶ء میں بند ہو چکا تھا، ہمدرد اردو روزنامہ اپریل ۱۹۲۹ء میں بند کرنا پڑا۔ یہ تھا قوم کی طرف سے قوم کے سب سے بڑے خادم اور سب سے بڑے مخدوم کو عملی صلہ! کوئی دوسرا ہوتا تو عجب نہیں جو اتنی ہمت شکنیوں اور حوصلہ فرسائیوں کے بعد اس کا جگر شق ہو جاتا یا کم از کم قومی خدمات کا تو ان کے بعد نام بھی نہ لیتا۔

عبداللطیف اعظمی

مولانا محمد علی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ

مولانا محمد علی مرحوم جامعہ ملیہ کے بانیوں میں سے اور پہلے شیخ الجامعہ ہیں۔ جامعہ ملک کے مخصوص حالات میں وجود میں آئی، اس لیے عام اداروں اور یونیورسٹیوں کے برخلاف، اس کا کوئی ایک بانی نہیں ہے بلکہ وہ تمام بزرگ ہیں جن کی کوششوں سے اس کا وجود عمل میں آیا۔ خود مولانا نے اپنے ایک مضمون میں جو جامعہ ملیہ کے بارے میں لکھا تھا، جامعہ کے پہلے امیر جامعہ حکیم اجمل خاں صاحب کو اس کا بانی قرار دیا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا محمد علی نے اس کے قیام کے لیے جو اَن تھک کوششیں کیں، وہ کسی اور کے بس کی نہ تھی، یہ ان کی ہی پرجوش اور مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ تھا کہ انتہائی نامساعد حالات کے ہوتے ہوئے جامعہ ملیہ نہ صرف یہ کہ قائم ہوگئی بلکہ ملک و قوم کے دلوں میں اس نے ممتاز جگہ حاصل کر لی۔ افسوس کہ ملک کے سیاسی حالات کی وجہ سے وہ زیادہ عرصے تک شیخ الجامعہ کے فرائض انجام نہ دے سکے، انھوں نے پہلے کوشش کی کہ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ اس عہدے کو قبول فرمائیں اور جب انھوں نے معذوری ظاہر کی تو ان کی گرفتاری سے یہ مسئلہ خود بخود حل ہوگیا، ان کی جگہ جناب عبدالمجید خواجہ صاحب شیخ الجامعہ مقرر ہوئے اور اس وقت تک وہی اس خدمت کو انجام دیتے رہے جب تک ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے فروری ۱۹۲۶ء میں جرمنی سے واپس آکر اس عہدے کا چارج نہیں لے لیا۔ اگرچہ اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے مولانا شیخ الجامعہ کی ذمہ داریوں سے الگ رہے، مگر جامعہ اور اربابِ جامعہ سے ان کا تعلق آخر دم تک قائم رہا۔ جب تک جامعہ علی گڑھ میں رہی، مولانا کا مستقل قیام جامعہ ہی میں تھا۔ اپنے وطن رام پور میں قدم رکھنے کی انھیں اجازت نہیں تھی اس لیے وطن اور گھر سب کچھ جامعہ ہی تھا اور

جب جون ۱۹۲۵ء میں جامعہ دہلی آگئی تو کامریڈ اور ہمدرد کے بند ہونے کے بعد اگر کوئی جگہ تھی جسے مولانا اپنا گھر کہہ سکتے تھے تو وہ جامعہ تھی، چنانچہ انھوں نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی گلنار بیگم کا عقد جامعہ ہی کی عمارت میں کیا اور باہر کے تمام مہمان جامعہ ہی میں ٹھہرے۔ جامعہ سے غیر معمولی تعلق اور محبت ہی کا نتیجہ تھا کہ جب پہلے امیر جامعہ حکیم اجمل خاں صاحب کا انتقال ہو گیا اور جامعہ کی مالی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی تو انھوں نے ۱۹۲۸ء کے اوائل میں جامعہ کی خصوصیات پر متعدد مضامین لکھے جو ان کے روزنامہ ہمدرد میں شائع ہوئے۔ عرصہ ہوا جامعہ نے ان مضامین کو کتابچے کی صورت میں شائع کیا تھا جس کا پہلا عنوان ہے: "جامعہ ملیہ ہے کیا؟" اور دوسرا عنوان ہے۔ "از کلید دین در دنیا کشاد" اس میں مولانا نے بنیادی طور پر جامعہ کی تین خصوصیات بیان کی ہیں: پہلی یہ کہ جامعہ میں دنیاوی علوم کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی بھی تعلیم دی جاتی ہے، دوسری یہ کہ اس کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے اور تیسری خصوصیت ہے۔ خداپرستی، ملت پروری اور وطن دوستی۔ آج بھی جبکہ ملک کے سیاسی و سماجی حالات اور تعلیمی نظام میں بڑی تبدیلی آگئی ہے، مگر ان خصوصیات کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ ذیل میں ان تینوں خصوصیات کا خلاصہ خود مولانا کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے:

پہلی خصوصیت کے بارے میں مولانا نے لکھا ہے کہ: جامعہ ملیہ اسلامیہ نے عربی زبان کو ہر مسلمان طالب علم کے لیے لازمی کر دیا ہے اور علاوہ تفسیر و حدیث، عقائد و فقہ کی تعلیم کے زبانِ عربی کے ادب میں نثر کا کورس، قرآن کریم اور صرف قرآن کریم کو رکھا ہے۔ اس کے بعد جامعہ کا ایک تعلیم یافتہ علماء کرام سے مستغنی تو نہیں ہو سکتا مگر ان کا دست نگر بھی نہیں رہتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ افسوس کہ ہمارے دینی مدارس کے طلبہ کو مدتوں علوم دینی سے یہاں تک محروم رکھا گیا کہ اکثروں نے دین کو ایک پیشہ اور اسی کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنا رکھا ہے جس کے باعث انھیں نہ دین ہی کی دولت صحیح معنوں میں نصیب ہوتی ہے، نہ دنیا کی اور بقول شاعر:

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم — نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے ہوئے
گئے دونوں جہان کے کام سے ہم — نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

انگریزی مدارس میں اول تو کہیں تعلیم دی ہی نہیں جاتی۔ الا ماشاء اللہ اور جہاں کچھ برائے نام دی بھی جاتی ہے، اس کی حقیقت کوئی ہم سے پوچھے جو مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ سے

دینیات کے درجنوں امتحان پاس کرکے کورے کے کورے نکلے تھے اور یہ بھی نہ جانتے تھے کہ قرآن کریم میں ہے کیا؟ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شانِ امتیاز کو دیکھو کہ وہاں دین و دنیا دونوں کی تعلیم دی جاتی ہے

جامعہ کی دوسری خصوصیت کے بارے میں "مادری زبان میں تعلیم" کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتے ہوئے مولانا نے فرمایا ہے کہ: "ہماری غلامانہ ذہنیت کسی چیز سے اس قدر ثابت نہیں ہوتی جسقدر کہ ایک غیر زبان میں تحصیل علوم کی مشقت رائیگاں سے ثابت ہوتی ہے۔ ہم مشرقی تو وحشی لوگ ہیں اور بربریت میں مبتلا ہیں لیکن خود تہذیب یافتہ مغربیوں کا کیا شعار ہے؟ کیا کوئی انگریز اپنے بچے کو تاریخ یا سائنس فرانسیسی یا جرمن زبان میں پڑھواتا ہے؟ کیا کوئی فرانسیسی یا اطالوی اپنے بچے کو جغرافیہ یا ریاضی انگریزی یا روسی زبان میں سکھواتا ہے؟ لیکن ہماری غلامی اور اب ہماری غلامانہ ذہنیت کو دیکھو کر ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے ہندوستانی اساتذہ بھی جو اکثر انگریزی زبان کو خود بھی اس طرح نہیں جانتے جس طرح کہ انگریز جانتے ہیں، ہندوستانی بچوں کو تاریخ اور سائنس، جغرافیہ اور ریاضی انگریزی میں سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ زبان ہے کیا؟ اظہارِ خیالات کا ذریعہ، لیکن اگر ایک شخص ایک زبان سے ناواقف ہے یا اس سے کم واقفیت رکھتا ہے تو وہ زبان اس کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو ایک گاڑی کے لیے پختہ سڑک جس پر گھوڑا گاڑی کو بآسانی کھینچ کرلے جاسکتا ہے۔ اگر سڑک ہموار ہے تو گھوڑے پر صرف گاڑی کھینچنے ہی کی مشقت کا بار پڑتا ہے، یہی تحصیل علوم کا حال ہے۔ اگر شاگرد و استاد دونوں ایک زبان سے بخوبی واقف ہیں تو استاد کے واسطے اظہار خیالات کے لیے ایک اچھا ذریعہ موجود ہے، لیکن اگر استاد کی زبان ہی شاگرد کو اچھی طرح نہ آتی ہو تو پھر سبق یاد کرنا تو درکنار، زبان سمجھے یا سبق سمجھے؟ . . . . شاگرد کی مادری زبان اس کے تحصیل علوم کے لیے وہی حکم رکھتی ہے جو ایک کشتی یا جہاز کے لیے پانی اور ایک غیر زبان جس سے وہ پوری طرح واقف نہیں اس کے لیے وہ حکم رکھتی ہے جو ایک کشتی یا جہاز کے لیے زمین اور اس کے روڑے۔ سب سے زیادہ تیز رو ہوائی جہاز ہوتے ہیں، کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہوائی رگڑ زمین کی رگڑ تو کیا پانی کی رگڑ سے بھی بدرجہا کم ہوتی ہے۔ یہی حال تحصیل علوم کے لیے مادری زبان اور غیر زبان کی رگڑ کا ہے لیکن ہماری غلامی اور غلامانہ ذہنیت کو دیکھو کہ کچی میں گاڑی چلاتے ہیں اور ریل گاڑی کو ہم نے ریل کی پٹڑی سے اتار ڈالا ہے، کشتی کو ریتے میں چلا رہے ہیں اور پھر بھی

امید ہے کہ ہم یورپ کے ہوائی جہازوں سے زیادہ تیز رفتار ثابت ہوں گے اور یورپ والوں سے پہلے ہم منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ خدا ہماری حماقت پر رحم کرے۔ جامعہ کے بانی [مراد حکیم اجمل خاں] کو تجربہ ہو چکا ہے اور اس لیے اس نے جامعہ میں تحصیل علوم کے لیے صرف مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جامعہ میں کم از کم دو سال کم صرف ہوتے ہیں اور اس کے طالب علموں کی معلومات دوسری درس گاہوں کے طلبہ سے اس قلیل عرصے میں بھی زیادہ ہوتی ہیں"۔

جامعہ کی تیسری خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ: "جامعہ ملیہ اسلامیہ نے قومیت مشترکہ ہندیہ اور ملت اُخوتِ اسلامیہ کے اجزائے مفرد کو اس طرح مرکب کیا ہے کہ باوجود سارے ملک کی فضا کے بے حد مکدر ہو جانے کے، جس کا اثر اکثر کالجوں اور اسکولوں پر پڑا ہے اور بالخصوص دہلی میں آئے دن فسادات کے رونما ہونے کے ایک شخص نے بھی اب تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ اور طلبا کی شکایت نہیں کی۔ ان میں تنگ نظری اور تعصب کی زیادتی یا احساس مذہبی دل آزاری کبھی نظر نہیں آتی، بلکہ جس کسی نے جامعہ کی جانچ کی اس پر روشن ہو گیا کہ اس کے طلبا، خدا پرست بھی ہیں، ملت پرور بھی ہیں اور وطن دوست بھی ہیں۔۔۔۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سات سوا سات برس کی زندگی خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے جہاں اپنی خدا پرستی اور ملت پروری کو اپنا شعار بنایا، وہیں اس نے وطن دوستی کو بھی اپنے طلبا کی زندگی کا ایک ولولہ انگیز جذبہ سمجھا اور اس کو ہمیشہ ابھارا۔"

مولانا نے اپنے ایک مضمون میں جامعہ کی ایک چوتھی خصوصیت بھی بیان کی ہے اور وہ ہے دستکاری کی تعلیم۔ مولانا لکھتے ہیں: "جامعہ میں تاریخ و فلسفہ، ادب اور سائنس ہر مضمون کے پڑھنے والے کے لیے یہ بھی لازمی کر دیا گیا ہے کہ ہفتے میں چند گھنٹے کسی نہ کسی دستکاری کی نذر کیے جائیں تاکہ اس کے طلبہ اگر ضرورت پڑے تو اکل حلال کو چھوڑ کر حرام خوری پر مجبور نہ ہو جائیں اور اگر اپنی دماغی قابلیت کی کبھی اتنی کساد بازاری پائیں کہ قوت لایموت بھی اس کے ذریعے سے حلال طریقے پر نہ کما سکیں تب بھی اپنے تئیں بے دست و پا نہ سمجھیں۔۔۔۔"

جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کی ابتدائی زندگی

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا

مردِ حق پسند

بیادگار مولانا محمد علی جوہر

جذبِ عمل کی، جوش کی، دریا دلی کی بات
دیوانہ ہو کے کرتا تھا وہ آگہی کی بات

اس کی ہر اک ادا میں تھی اک شانِ حریت
اس کی ہر ایک بات تھی غیرت دہی کی بات

بے باکیٔ خیال و عمل اس کو تھی عزیز
اس کی نظر میں جرم تھی افسردگی کی بات

سرگرمیٔ حیات کا پیکر تھی اس کی ذات
کرتا رہا وہ زندگی بھر زندگی کی بات

چھڑتا ہے جب کبھی کہیں دار و رسن کا ذکر
اُس پر ہی ختم ہوتی ہے حق دوستی کی بات

اپنی مثال آپ تھا وہ مردِ حق پسند
دل کھول کر ہمیشہ کہی راستی کی بات

یہ تو محمدؐ اور علیؓ کا ہے فیض خاص
سب کو کہاں نصیب محمد علی کی بات
فکر و نظر کے جوہرِ نایاب بکھیر کر
کی اس نے کیا ابھرتی ہوئی روشنی کی بات
تعبیر اس کے خواب حسیں کی ہے "جامعہ"
اس میں اے دوستو، رہے قائم اسی کی بات
حسنِ بیاں کا، زورِ قلم کا دھنی تھا وہ
ہر شخص کہہ رہا ہے، عجب آدمی تھا وہ

عمر انصاری

روح کا خطاب

(مدتوں بعد یومِ مولانا محمد علی جوہر منائے جانے پر)

مدّتوں بعد سہی، آج تو دل شاد کیا
دوستو، کم نہیں یہ بھی کہ مجھے یاد کیا

ہیں، کہ جاں دادۂ گلہائے رہِ الفت ہوں
اب بھی ویسا ہی گرفتارِ غمِ ملت ہوں

جب بھی دنیا سے پلٹ کر کوئی سال آتا ہے
جانے کیوں مجھ کو تمہارا ہی خیال آتا ہے

مجھ سے پوشیدہ تمہارے سحر و شام نہیں
ہائے وہ پیار، کہ جس پیار کا کچھ نام نہیں

میں تھا جب تم میں، تم اتنے کبھی معذور نہ تھے
اہلِ دل کے کبھی پہلے تو یہ دستور نہ تھے

اپنے ماضی کو بھلا دو، یہ ادا خوب نہیں
آپ اپنے سے بھی کیا، سچ کہو، محجوب نہیں

تم سے روشن تھی کبھی شمعِ شبستانِ وطن
اے عزیزانِ وطن، روحِ وطن، جانِ وطن

نہ سہی، گر مرے اندازِ وفا یاد نہیں
اپنے جینے کی بھی کیا تم کو ادا یاد نہیں

کبھی ماتھے پہ تمہارے جو شکن آتی تھی
برق بھی آنکھ ملاتے ہی تڑپ جاتی تھی

جب بھی زنداں میں کھنک جاتی تھی کوئی زنجیر　　بن کے رہ جاتے تھے دربان سراپا تصویر
تم سے دنیا کے اولو العزم سبق لیتے تھے　　دیکھ کر دار و رسن تم تھے جو ہنس دیتے تھے

وہ برستے ہوئے شعلے، وہ گرجتے بادل!　　بن کے تم اُٹھے تھے ان کے لیے پیغام اجل
دل میں شعلوں کو سدا تم نے دبائے رکھا　　پھر بھی ہونٹوں پہ تبسّم کو جگائے رکھا
ایشیا، آج بھی ممنون تمہارا ہی تو ہے　　رگِ ہر گل میں جو ہے خون، تمہارا ہی تو ہے
دل کے ہر نغمے کو تم ساز دیا کرتے تھے　　کوئی آواز ہو، آواز دیا کرتے تھے
تم، اور اس درجہ پریشان، یہ کوئی بات ہوئی　　اس طرح سر بہ گریباں، یہ کوئی بات ہوئی
دھوپ کچھ دیر کی مہماں ہے اتر جانے دو　　رنج جتنے بھی ہیں، راہی ہیں گذر جانے دو
یوں بھی آپ اپنے کو للِلّٰہ نہ بدنام کرو　　میری یادوں سے گلے مل کے ہی کچھ کام کرو
دور اُفتادہ سہی، تم سے مگر دور نہیں　　اپنے پیاروں کو بھلادوں، مرا دستور نہیں
غم کسی کا ہو، خوشی دل کی سمو دیتا ہوں　　جب کبھی یاد وطن آتی ہے رو دیتا ہوں

اِس گلستان میں کلی دل کی مرے کھل نہ سکی
مجھ کو دو گز پئے مدفن بھی زمیں مل نہ سکی

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

نذرِ جوہر

اے مجاہد، اے امیرِ کاروانِ حریّت — سرزمینِ ہند پر اے آسمانِ حریت
تیرے اربابِ وطن کو آرہی ہے تیری یاد — ملک میں ہر سو منائی جارہی ہے تیری یاد
تحفۂ حسنِ ارادت لے کے آیا ہے وطن — نذرِ گل ہائے محبت لے کے آیا ہے وطن
ہر طرف چرچے ہیں تیری عظمتِ کردار کے — تذکرے ہیں تیری قربانی، ترے ایثار کے
تو نے پیدا کر دیا فکر و نظر میں انقلاب — تو نے دیکھا ہند کی آزادیٔ کامل کا خواب
سرنگوں تیرے مقابل تھا فرنگی کا غرور — تو وہ شیشہ تھا کیا تھا پتھروں کو جس نے چور
تو نے گاندھی جی کے قومی زاویہ ہائے نظر — کر دیے اسلامیانِ ہند سے نزدیک تر
تو نے فرقِ کیش و مذہب کو فسانہ کر دیا — تو نے ہم کو صف بہ صف، شانہ بہ شانہ کر دیا
دل سے تھا تحریکِ قومی کا علم بردار تو — تھا ہمارے کارواں کا قافلہ سالار تو
فکر سے تیری صحافت کی نئی سمتیں ملیں — آج تک اس صنف میں تیرا کوئی ہمسر نہیں
برقِ خاطف تھا، اُپچی تلوار تھا تیرا قلم — تیرے سوزِ دل سے شعلہ بار تھا تیرا قلم
دے نہ پائے گی صحافت اور خطابت کی کتاب — تیری بذلہ سنجی و حاضر جوابی کا جواب

ہند والوں کی زبوں حالی کا غم بھی تھا تجھے
اور پاسِ عزّ و ناموسِ حرم بھی تھا تجھے

رشک کے قابل یہ شانِ سرفرازی تھی تری
نغمہ ہندی تھا مگر لَے تو حجازی تھی تری

تیرا دل تھا ملّت اسلام کا درد آشنا
اس لیے ڈالی تھی تحریکِ خلافت کی بنا

تجھ کو اپنے اس گداز دل کی قیمت مل گئی
دفن کی بیت المقدس میں سعادت مل گئی

حق کی راہوں سے قدم تیرا بھٹک سکتا نہ تھا
ٹوٹ تو سکتا تھا تو لیکن لچک سکتا نہ تھا

ہر طرف اب تک ترے عزم و عمل کے سائے ہیں
ہم کو تیرے نقشِ پا ہی تا بہ منزل لائے ہیں

اے دیارِ ہند کے فردوس مسکن رہ نما
حق تو ہم سے کیا ادا ہوگا تری خدمات کا

ہاں مگر دامن میں ہیں یہ چند آنسو، چند پھول
اے گرامی قدر، بہ نذرِ عقیدت ہو قبول

شذرات (بہ سلسلہ صفحہ ۱۰)

سے باز رکھے۔ لیکن وہ اس 'ملیّت' کا بھی طرفدار نہیں ہوسکتا جس کی طرف اسے بعض مسلمان گھسیٹنا چاہتے ہیں اور وہ ہمیشہ اسے اپنا فرض سمجھے گا کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم پر ظلم کرے تو یہی نہیں کہ اس کو اس ظلم میں مدد نہ دے بلکہ اسے اس ظلم سے باز بھی رکھے۔ کیا قومیت کے نئے دلدادہ اپنی قوم پرستی کے لیے اس سے بہتر کوئی اصول آج ایجاد کر سکتے ہیں"؟ مولانا نے یہ بات ۱۹۲۶ء میں کہی تھی، تقریباً چار سال بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ مسلسل جدوجہد، محنت و مشقت اور ایثار و قربانی سے بھری پوری زندگی کے آخری چند برس مولانا پر سخت گذرے، اپنے بھی ان سے خفا ہے اور بیگانے بھی ناخوش ہوئے، خطا ان کی یہ تھی کہ وہ زہر ہلاہل کو قند کہنے کے لیے تیار نہ تھے۔ "قومیت" اور "ملیت" کے مابین مطابقت اور ہم آہنگی کی بات کے لیے اس وقت کی سیاسی فضا بالکل سازگار نہ تھی۔ لیکن وہ اس طوفان میں بھی اپنے موقف پر جمے رہے۔ اس تغیر پذیر دنیا میں اکثر مخلص، نیک نیت اور صاحب عزیمت انسانوں کا یہی انجام ہوتا ہے لیکن ان کے خلوص، نیک نیتی اور عزیمت کی داستانیں دلوں پر نقش اور ذہنوں میں محفوظ رہتی ہیں

ہم شکر گزار ہیں ان تمام مضمون نگاروں کے جنھوں نے ہماری درخواست پر اس خصوصی نمبر کے لیے زحمت اٹھائی اور مضمون لکھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ان تمام حضرات کا کرم اور قلمی تعاون ہمیں حاصل نہ ہوتا تو اتنا ضخیم نمبر ہم نہ نکال سکتے، ہم ان کے بھی ممنون ہیں جنھوں نے اس خاص شمارہ کے لیے انگریزی کے مضامین کا ترجمہ کیا۔ آپ محسوس کریں گے کہ ان ترجموں سے شمارہ کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام ارباب قلم کو جزائے خیر دے۔

عبداللطیف اعظمی

تعارف وتبصرہ

مولانا محمد علی پر چند کتابیں اور خصوصی شمارے

مولانا محمد علی مرحوم کی شخصیت اور خدمات پر اور انھیں ہندوستان کی تحریک آزادی، مسلم عالمی سیاست اور اردو صحافت و شاعری میں جو ممتاز اور منفرد مقام حاصل تھا، ان کے بارے میں قارئین جامعہ اس خصوصی شمارے کے پچھلے صفحات میں ان کے عقیدت مندوں، مخلصوں، ناقدوں اور دانشوروں کی رائیں، تاثرات اور خیالات ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے غالباً یہ مجموعی تاثر بھی قائم ہوا ہوگا کہ اس مجاہد آزادی کے ایثار و خلوص کی جس طرح قدر و عزت ہونی چاہیے تھی نہیں ہوئی اور ان کی سیاسی بصیرت اور ملکی خدمات کا جیسا اعتراف کرنا چاہیے تھا نہیں کیا گیا، نیز جس بسط و تفصیل اور تحقیق کے ساتھ ان کے بارے میں لکھنا چاہیے تھا نہیں لکھا گیا۔ ویسے تو ایک قومی رہنما کے ناطے سے ان کے تعلقات سبھی ہندوستانیوں سے تھے اور یہ ذمہ داری سبھی پر عائد ہوتی ہے، مگر مسلم یونیورسٹی سے ایک ممتاز اور قابل فخر اولڈ بائے کی حیثیت سے، جامعہ ملیہ سے اس کے بانی اور پہلے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے، دارالمصنفین سے اس کے بانی علامہ شبلی سے شاگردی اور اس کے پہلے ناظم مولانا سید سلیمان ندوی سے استاد بھائی کی حیثیت اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم سے عقیدت اور نیازمندی کا جو خصوصی تعلق تھا، ان کی بنا پر علی گڑھ کے علاوہ یہ خوشی اور فخر کی بات ہے کہ دونوں اداروں اور مولانا دریا آبادی نے مرحوم کی یاد کو تازہ رکھنے اور ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے کی مناسب طور پر کوشش کی ہے۔ مولانا کی وفات پر ماہنامہ جامعہ، معارف اور ہفتہ وار سچ نے مرحوم کی شخصیت اور خدمات پر مضامین اور نظمیں شائع کیں، مکتبہ جامعہ نے سب سے پہلے مرحوم کی سیرت و شخصیت پر ایک مفصل سوانح حیات شائع کی جسے جامعہ ملیہ کے ایک ہونہار

"طالب علم" مولوی رئیس احمد جعفری ندوی نے لکھی تھی' بعد میں انھوں نے مولانا کے مضامین، تقاریر اور خطبات کے متعدد مجموعے مرتب کر کے جامعہ سے طالب علمانہ اور مولانا محمد علی سے نیازمندانہ اور عقیدت مندانہ تعلق کا اظہار کیا۔ اسی طرح ایک اور جامعی ——— رئیس صاحب سے کہیں سینئر اور جامعہ کے سابق پروفیسر اور راقم الحروف کے استاد جناب محمد سرور صاحب نے متعدد کتابیں لکھیں اور مرتب کیں، مثلاً مضامین محمد علی (دو حصے)' خطوط محمد علی' مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر اور مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ دار المصنفین نے بھی مولانا پر تین قابل قدر کتابیں شائع کی ہیں' جن کی تفصیل آگے آئے گی۔ مولانا دریا آبادی نے جس خلوص اور عقیدت مندی سے مولانا مرحوم کے تعلق کو تادم حیات نبھایا وہ اپنی آپ مثال ہے۔ مولانا دریا آبادی کی وفات کے بعد ایک تعزیتی جلسے میں ایک فاضل مبصر نے فرمایا تھا کہ مولانا کی پسند اور ناپسند میں انتہا پسندی اور بڑا تلوّن تھا، مگر مولانا محمد علی کے بارے میں مولانا نے بڑی استقامت کا ثبوت دیا، برصغیر ہند و پاک کے علما اور دانشوروں میں وہ تنہا شخص تھے جنھیں زیادہ سے زیادہ مدت تک مولانا کی انتہائی قربت کی سعادت حاصل تھی اور وہ صحیح معنوں میں جلوت و خلوت کے رازداں اور واقف کار تھے اور انھوں نے اپنی اس واقفیت کو اچھے انداز میں نئی نسل تک پہنچایا بھی جو کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے قابل قدر اور قابل تعریف ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد ان کتابوں اور رسالوں کے خصوصی شماروں کے مختصر تعارف ملاحظہ ہوں جو مولانا محمد علی یا ان کے عہد کی سیاست کے بارے میں ہیں اور جو تبصرے کے لیے موصول ہوئے ہیں:

لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی   از ڈاکٹر افضل اقبال

سائز $\frac{18 \times 22}{8}$، حجم ۴۳۴ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴۵ روپے۔ سنہ طباعت: ۱۹۷۴ء
ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر۔ کلب روڈ۔ لاہور (پاکستان)

زیر تبصرہ کتاب، پیش لفظ اور انڈکس وغیرہ کے علاوہ پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

(۱) وکٹوریین ہندوستان میں مسلم ذہن (۱۹۰۲-۱۸۷۸) (۲) کارِ منصبی کی تلاش میں (۱۹۱۰-۱۹۰۲)
(۳) سیاست میں شرکت (۱۹۱۳-۱۹۱۱) (۴) کھلی جنگ (۱۹۱۵-۱۹۱۳) (۵) نظربندی اور قیدوبند
(۱۹۱۹-۱۹۱۵) (۶) ترکی پر حملہ : ہندوستان میں اس کا ردِّ عمل (۱۹۱۹-۱۹۱۵) (۷) تحریک خلافت
اور یورپ کو وفد کی روانگی (۱۹۲۰-۱۹۱۹) (۸) ہندوستان میں خلافت کی سورشس (۱۹۲۰ء) (۹)
غیر متشدد عدم تعاون (۱۹۲۱) (۱۰) تحریکِ ترکِ موالات اور ناکامی (۱۹۲۲) (۱۱) رہائی اور کانگریس
کی صدارت (۲۴-۱۹۲۳) (۱۲) کانگریس سے دوری، شبہات اور اختلاف (۲۶-۱۹۲۵) (۱۳)
دستوروں کا انبار (۲۹-۱۹۲۷) (۱۴) زندگی کا آخری سال (۳۱-۱۹۳۰) (۱۵) ایک جائزہ

ابواب کے عنوانات سے اس کا اندازہ ہو گیا ہو گا کہ زیرِ تبصرہ کتاب بنیادی طور پر سیاسی سوانح عمری ہے اور اس لحاظ سے، اب تک مولانا مرحوم پر اردو انگریزی میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں، تبصرہ نگار کے علم کے مطابق یہ سب سے زیادہ مفصل، مکمل اور بہتر ہے، خاص طور پر تاریخوں کا بہت لحاظ رکھا گیا ہے اور واقعی مصنف نے بڑی محنت اور تحقیق سے کام لیا ہے۔ کتاب کے آخری حصوں میں اہم واقعات کی تاریخیں بھی دی گئی ہیں، اس کو غور سے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شاید مصنف نے اسے مرتب نہیں کیا ہے، کیونکہ ان میں متعدد غلطیاں ہیں اور اندرونی کتاب میں یہ صحیح ہیں، مثلاً مولانا کے والد کے وفات کا مہینہ ان تاریخوں میں صفحہ ۴۱۷ پر اکتوبر لکھا ہے اور اندرونی کتاب میں صفحہ ۲۰ پر اگست درج ہے یا صفحہ ۴۲۰ پر کل ہند خلافت کانفرنس کی تاریخ جون ۱۹۲۱ء چھپی ہے اور صفحہ ۲۰۷ پر جولائی ۱۹۲۱ء ہے جو صحیح ہے، اسی طرح دورِ ثانی کے ہمدرد ثانی کے بند ہونے کی تاریخ ۴۲۱ پر ۲ مئی ۱۹۲۷ء ہے اور صفحہ ۳۷۵ پر اپریل ۱۹۲۹ء ہے جو درست ہے۔ اس غلطی کی وجہ سے جو لوگ محض ان "اہم تاریخوں" پر بھروسہ کریں گے وہ غلطی کے شکار ہو جائیں گے اس لیے اس کی جس قدر جلد تصحیح ہو جائے بہتر ہے۔ ویسے، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اپنے موضوع پر یہ کتاب بہت اچھی اور قابلِ تعریف ہے اور مصنف اور ناشر دونوں قابلِ مبارکباد ہیں۔

محمد علی ــــ ذاتی ڈائری کے چند ورق   از مولانا عبدالماجد دریاآبادی

سائز $\frac{۲۰ \times ۲۶}{۸}$، حصہ اول حجم ۴۲۰ صفحات، غیر مجلد، سنہ طباعت : ۱۹۵۴ء
حصہ دوم حجم ۳۰۸ × ۸ = ۲۱۶۔ سنہ طباعت : ۱۹۵۶ء۔ ان کی کتابوں قیمت، حصہ اول پر ساڑھے چھ

روپے اور حصہ دوم پر پانچ روپے درج ہے، مگر یہ ۲۰-۲۵ سال پہلے کی قیمتیں ہیں، آج بازار میں یہ کتابیں دگنی ڈھائی گنی قیمت پر ملتی ہیں۔ ناشر: دارالمصنفین شبلی منزل۔ اعظم گڈھ (یو، پی) ۲۷۶۰۰۱-

جس نے جامعہ کے اس خصوصی شمارے کا غور سے مطالعہ کیا ہوگا یا جس نے بھی مولانا محمد علی پر کچھ کام کیا ہوگا، اسے یقیناً اندازہ ہوگا کہ مولانا عبدالماجد دریاآبادی کی یہ کتاب اپنے موضوع پر کس قدر اہم اور مفید ہے۔ فاضل مصنف مولانا محمد علی سے عمر میں تقریباً ۱۴ سال چھوٹے تھے مگر کوئی ۱۸ سال تک — ۱۹۱۲ء تا ۱۹۳۰ء — ایسا گہرا اور بے تکلفانہ تعلق رہا ہے کہ اگر خلوت و جلوت کا انھیں واقف کار اور راز دار کہا جائے تو بیجا نہیں ہوگا، اس لیے ان دونوں حصوں میں مولانا محمد علی کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ براہ راست معلومات اور ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے اور یقیناً اس کتاب کی حیثیت بڑی حد تک دستاویزی ہے اور مولانا محمد علی پر کوئی کام کرنے والا اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

مولانا محمد علی کی یاد میں — از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

سائز ۲۶×۲۰ ۔ حجم ۲۷۸ صفحات، غیر مجلد، قیمت درج نہیں، سنہ طباعت: ۱۹۷۷ء۔ ناشر: دارالمصنفین۔ شبلی منزل۔ اعظم گڈھ (یو، پی)۔ ۲۷۶۰۰۱

اس کتاب کے مرتب یا مولف جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب دارالمصنفین کے ناظم اور درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں اور مولانا محمد علی کے پرستاروں میں سے ہیں، اور مرحوم کی کمزوریوں کو تسلیم کرتے ہوئے بھی، ان پر اعتراض کو پسند نہیں کرتے۔ ایک کتاب کی تالیف کے سلسلے میں موصوف نے لکھا ہے کہ: "ایک روز ان [مولانا محمد علی] پر ایک مختصر مضمون لکھنے بیٹھا تو کچھ ایسا خمار چھا گیا کہ یہ مختصر مضمون ۲۷۸ صفحے پر ختم ہوا۔" (دیباچہ صفحہ ۲) مجھ سے زبانی موصوف نے فرمایا تھا کہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی انگریزی کتاب "انڈین مسلمس" شائع ہوئی تو مولانا محمد علی کے متعلق ان کے آخری جملے سے متاثر ہو کر یہ مضمون لکھنے بیٹھا تھا۔ مجیب صاحب کے اس مضمون کا ترجمہ اس شمارے میں شامل ہے اور آخری جملے کا ترجمہ یوں ہے: "..... اس موقع پر برطانوی حکومت سے ان کی یہ اپیل کہ وہ ہندوستان کو آزادی دے، ورنہ وہ ایک غلام ملک کو زندہ واپس نہیں ہوں گے، ایک اذیت ناک شکست کا اعتراف تھی۔" تبصرہ نگار کو ذاتی طور پر خوشی ہے کہ مجیب صاحب کا یہ جملہ ایک کتاب کی تصنیف کا

باعث ہوا۔ اگرچہ فاضل مصنف نے لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے کہ : " یہ کتاب مولانا کی زندگی کی کوئی مکمل سوانح عمری نہ سمجھی جائے بلکہ میں جذباتی طور پر ان کو جو خراجِ عقیدت و تحسین پیش کر سکتا تھا، اس کا ایک ہلکا سا پر تو اس کو سمجھا جائے "۔ مگر بہرحال یہ کتاب مولانا محمد علی کی کتابوں میں ایک مفید اضافہ ہے اور ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

مکتوبات رئیس الاحرار (سیاسی) مرتبہ : ابوسلمان شاہجہاں پوری

سائز $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۸}$، حجم ۲۱۹ صفحات، مجلد، قیمت : ۳۸ روپے۔ تاریخ طباعت : ۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء

ناشر: موڈرن پبلشرز۔ ۸۶ گول ایمپریس مارکیٹ۔ کراچی (پاکستان)

مولانا محمد علی مرحوم کے جشن ولادت کا آغاز پچھلے سال ۱۰ دسمبر کو برصغیر ہندوپاک میں کیا گیا تھا، اسی موقع پر زیر تبصرہ کتاب کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ اس سے پہلے مولانا کے خطوط کا صرف ایک ہی مجموعہ شائع ہوا ہے جسے جامعہ کے ایک قدیم طالب علم پروفیسر محمد سرور صاحب نے جو اس وقت جامعہ میں استاد تھے، مرتب کیا تھا اور مکتبہ جامعہ دہلی سے اکتوبر ۱۹۴۰ء میں "خطوط محمد علی" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ پروفیسر محمد سرور صاحب ہی نے ایک اور کتاب مرتب کی تھی جو دسمبر ۱۹۴۱ء میں لاہور سے " مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر" کے نام سے شائع ہوئی جس میں ایسے متعدد خطوط شامل ہیں جو خطوط محمد علی میں نہیں ہیں۔ اس کی اشاعت کے چند سال کے بعد اواخر ۱۹۴۴ء میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم نے "مشاہیر خطوط" کے نام سے ان خطوط کا ایک مجموعہ شائع کیا جو ان کے نام لکھے گئے تھے، ان میں مولانا محمد علی مرحوم کے وہ خطوط بھی شامل ہیں جو " خطوط محمد علی" میں شائع ہو چکے تھے۔ اب مولانا محمد علی کے ۲۹ خطوط کا یہ دوسرا مجموعہ شائع ہوا ہے جس کے بارے میں اس کے فاضل مرتب، مولانا ابوسلمان شاہجہاں پوری نے لکھا ہے کہ : " صرف مکاتیب جمع کر کے چھاپ دینا ہی مقصد نہیں رہا بلکہ متن کی صحت کا اہتمام بھی کیا ہے اور مجمل بیانات و اشارات کی وضاحت بھی کی ہے اور جن مسائل کے تمام پہلو آج قاری کے لیے معلوم اور روشن نہیں ہیں، ان پر ضروری حواشی اور آخر میں تمام خطوط کی شخصیات پر نوٹس بھی شامل کئے ہیں ... ان شخصیات کے سوانحی نقوش اجاگر کرنے کے ساتھ ان کے افکار اور سیرت کے خصائص اور مولانا محمد علی سے

ان کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔" (صفحہ ۱۰)

اس میں شبہ نہیں کہ ان خطوط کی تلاش و جستجو اور ترتیب میں کافی محنت کی گئی ہے، خاص طور پر اس مجموعے کا مبسوط مقدمہ اور "تذکرۂ رجال" بہت مفید اور قابل تعریف ہیں، مگر ان خوبیوں کے ساتھ چند خامیاں بھی نظر آئیں، مثلاً جو خطوط اس مجموعے میں شامل ہیں ان کے حوالے نہیں دیے گئے ہیں کہ کہاں سے لیے گئے ہیں، بہت سے خطوط انگریزی سے ترجمہ ہیں، اس کی وضاحت کر دینی چاہیے تھی؛ خاص طور پر اس لیے کہ ان خطوط میں زبان و بیان کی جو خامیاں ہیں بہت سے ناواقف انھیں مترجم کے بجائے مولانا محمد علی کی سمجھ لیں گے۔ تذکرۂ "رجال" میں ایک خاتون کے نام "سروپ" کو مسز وجے لکشمی پنڈت کے کنوارپنے کا نام لکھا گیا ہے، حالانکہ "سروپ رانی" پنڈت جواہر لال نہرو کی والدہ کا نام تھا اسی نوٹ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "علی برادران نے انھیں ہر جگہ سروپ بہن یا سروپ آپا لکھا ہے۔" کم از کم اسی سے فاضل مرتب کو سمجھنا چاہیے تھا کہ علی برادران وجے لکشمی کو آپا یا بہن کیسے کہہ سکتے ہیں جب کہ علی برادران ان سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ مسز پنڈت کی تاریخ پیدائش ۱۸ اگست ۱۹۰۰ء ہے، اس لحاظ سے مولانا محمد علی سے تقریباً ۲۲ سال اور مولانا شوکت علی سے کوئی ۲۸۔۲۹ سال چھوٹی ہیں۔

ان معمولی فروگذاشتوں سے قطع نظر، اس کتاب کی اشاعت سے مولانا محمد علی سے متعلق جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں اور اردو کے مکتوباتی ادب میں مفید اضافہ ہوا ہے۔

تحریک خلافت　　از قاضی محمد عدیل عباسی

سائز $\frac{18\times22}{8}$، حجم ۲۷۹ صفحات، غیر مجلد، قیمت: ۱۲ روپے۔ سنہ طباعت: ۱۹۷۸ء۔
ناشر: ترقی اردو بورڈ، وزارت تعلیم اور سماجی بہبود حکومت ہند۔ نئی دہلی۔

ہندوستان کی تاریخ آزادی میں تحریک خلافت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، مگر افسوس کہ اس پر کوئی مفصل اور مبسوط کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ ہمیں خوشی ہے کہ ترقی اردو بورڈ نے زیر تبصرہ کتاب شائع کر کے ملک و قوم کی بڑی مفید خدمت کی ہے اور اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ کیا ہے اس کتاب کے فاضل مصنف قاضی محمد عدیل عباسی صاحب ہیں، جو نہ صرف یہ کہ ایک اچھے صحافت نگار

درادیب ہیں بلکہ تحریک خلافت میں شریک رہے ہیں اس لیے اس کتاب کے لیے آج کل ان سے بہتر کوئی اور نہیں مل سکتا تھا۔

یہ کتاب پیش لفظ اور دیباچہ کے علاوہ تیرہ ابواب پر مشتمل ہے اور نہ صرف یہ کہ تحریک خلافت کے تمام پہلو زیر بحث آگئے ہیں بلکہ بڑی حد تک تحریک آزادی کے بہت اہم گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اس کتاب کی تالیف میں جو مشکلات پیش آئی ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مولف نے لکھا ہے "جب تحریک خلافت پر قلم اٹھایا۔ کے معنی یہ سمجھیے کہ عصر قدیم کی رعنائیوں اور عصر جدید کے طلوع ہونے والے آفتاب کی تابنائیوں کا مطالعہ کیا جائے۔ بمبئی جیسے دور افتادہ مقام پر اس کے لیے نہ کتابیں میسر تھیں اور نہ اخبارات اور نہ میرے پاس اتنا وقت تھا کہ تلاش میں سفر کروں، اس لیے جو کچھ میسر ہو سکا اسی پر اکتفا کرنی پڑی۔" یہ عذر اپنی جگہ پر اہم اور قابل معافی ہے مگر اس کی وجہ سے کتاب میں جو اثرات ظاہر ہوئے ہیں یا جو خامیاں نظر آتی ہیں ان کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ مثلاً "خلافت کمیٹی" کے ذیلی عنوان سے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "خلافت کمیٹی کب اور کیسے قائم ہوئی اس کا سراغ لگانے اور محقق طور پر جاننے کے لیے میں نے بڑی کوشش کی لیکن مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ میں کامیاب نہیں ہوا۔" (صفحہ ۳۸) اس ناکامی کی واحد وجہ یہ ہے کہ بمبئی کے وسائل بے حد محدود تھے اور فاضل مولف کو دوسرے کتب خانوں سے استفادہ کرنے کے لیے وقت نہیں تھا، ورنہ خلافت کمیٹی کے قیام کی صحیح تاریخ اور دوسری تفصیلات معلوم کرنا مشکل نہیں ہے۔ تبصرے کے محدود صفحات کسی طویل بحث کے متحمل نہیں ہو سکتے، ورنہ اس وقت جس قدر کتابیں میری میز پر موجود ہیں، ان ہی سے اس سوال کو اطمینان بخش طور پر حل کیا جا سکتا ہے۔

محترم عباسی صاحب نے دیباچے میں یہ شکایت کی ہے: "جہاں تک تحریک خلافت کی تاریخ کا سوال ہے، دیکھا گیا ہے کہ اکثر مصنفین و مولفین اس پر سرسری گزر گئے اور جس نے کچھ لکھا بھی تو تاریخ تو کجا سنہ تک موجود نہیں۔" یہ عیب خود اس کتاب میں بھی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بسا اوقات الفاظ کے استعمال اور واقعات کے بیان میں بھی پوری احتیاط برتی نہیں گئی ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

"مولانا محمد علی کی گرفتاری نے ملک میں ایک ہیجان برپا کر رکھا تھا اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ تار وائسرائے اور وزیر ہند کو بھیجے گئے جس (؟) میں نظر بندی منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

[illegible] تحریک آیا اور مولانا محمد علی اور مولانا

شوکت علی (جو ایک ساتھ نظر بند تھے) یہ کہا کہ آپ اس پر دستخط کردیں تو رہا کر دیے جائیں ....
ابھی گفتگو ہو رہی تھی کہ علی برادران کی والدہ جو بعد کو "بی اماں" کے نام سے مشہور ہوئیں، نکل
کر آگئیں کہ ہمارے لڑکے کبھی حکومت سے باغی نہ تھے لیکن اسلامی فریضہ، دو نسبت رکھتا ہے
اور اگر وہ اس بلا شرط معاہدے پر دستخط کر دیں گے تو اللہ تعالیٰ میرے جھریوں بھرے ہاتھوں
میں طاقت دے گا کہ میں ان دونوں کا گلا گھونٹ دوں"۔ (صفحہ ۱۷)

اس اقتباس کے خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیے۔ کہیں "گرفتاری" ہے، کہیں "نظر بندی" مولانا محمد علی کو ۱۵ مئی ۱۹۱۵ء کو نظر بندی کا حکم ملا اور اواخر دسمبر ۱۹۱۹ء میں رہائی ملی۔ ۱۹۲۰ء میں ۱۴ ستمبر کو مولانا گرفتار ہوئے اور مقدمے کے بعد دو سال کی سزا ہوئی۔ عباسی صاحب کے اقتباس میں نہ کوئی تاریخ ہے اور نہ سنہ ہی، یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ نظر بندی کی بات کر رہے ہیں یا گرفتاری اور سزا کی؟ بہ ظاہر ۱۹۲۱ء کی گرفتاری اور سزا کے بارے میں ہے، ایسی صورت میں یہ لکھنا صحیح نہیں ہے کہ " علی برادران کی والدہ جو بعد کو "بی اماں" کے نام سے مشہور ہوئیں" کیونکہ اس سے بہت پہلے وہ اس نام سے مشہور ہو چکی تھیں، اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ: " نکل کر آگئیں"، کیونکہ رہائی کی شرائط جیل میں پیش کی گئی تھیں، وہاں "بی اماں" کہاں؟! ایسی ہی کچھ خامیاں اور بھی ہیں۔

ان معمولی خامیوں سے قطع نظر کتاب قابل مطالعہ ہے۔ امید ہے کہ ہر حلقے میں پسند کی جائے گی۔

علی برادران اور ان کا کارنامہ — سید محمد ہادی

سائز ۸×۲۲/۱۸، حجم ۲۲۸ صفحات، مجلد، قیمت ساڑھے پندرہ روپے۔ تاریخ اشاعت: نومبر ۱۹۷۸ء۔ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

مکتبہ جامعہ نے مولانا محمد علی مرحوم کی سیرت و شخصیت پر سب سے پہلے مفصل کتاب شائع کی تھی، اس کے بعد مولانا کے خطوط اور مضامین کے مجموعے شائع کیے، زیر تبصرہ کتاب اس سلسلے کی تازہ ترین کتاب ہے، امید ہے کہ مکتبہ مولانا پر اور کتابیں شائع کرے گا۔

پیش نظر کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے ایک ایسے صاحب نے لکھا ہے جو نہ صرف یہ کہ مولانا کے مخلص عقیدت مندوں میں سے ہیں بلکہ ان کی خدمت میں ایک عرصے تک رہے ہیں

اور ان کی جلوت وخلوت کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے، اس لیے پوری کتاب چشم دید واقعات پر مبنی ہے، البتہ اسلوب اور انداز بیان پر ذاتی پسند اور ناپسند اور عقیدت مندی کا غلبہ ہے، لیکن اس کی شکایت شاید اس لیے کرنا مناسب نہ ہوگا کہ اردو کے مصنفین بالعموم اب تک اپنی تحریروں میں معروضیت پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ مجھے اس کتاب میں علی برادران کے بہت سے کارنامے نظر آئے، اس لیے کتاب کے نام میں "کارنامہ" کے بجائے "کارنامے" ہوتا تو میرے خیال میں بہتر تھا۔

ماہنامہ آجکل۔مولانا محمد علی نمبر   اڈیٹر: شہباز حسین

سب اڈیٹر: نند کشور وکرم

پتہ: پبلیکیشنز ڈیویزن۔ پٹیالہ ہاؤس۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

مولانا محمد علی کے صد سالہ جشن ولادت کی خوشی کے موقع پر یہ خصوصی نمبر شائع کیا گیا ہے، اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ حجم کے اختصار کے باوجود یہ نمبر بہت اچھا اور کامیاب ہے اور سبھی مضامین قابل مطالعہ ہیں، سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بہت سی تصاویر شامل ہیں اور بعض بہت ہی اہم ہیں۔ ہم ادارہ "آجکل" کو اس کی اس کامیاب پیش کش پر مبارکباد دیتے ہیں۔

قیمت صرف ایک روپیہ

ہفتہ وار ہماری زبان۔مولانا محمد علی نمبر   اڈیٹر: ڈاکٹر خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند) کے ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" کا یہ خصوصی شمارہ ہے جو مولانا محمد علی کے جشن صد سالہ کی تقریب کے موقع پر شائع کیا گیا ہے، اس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں (مرحوم) محمد عتیق صدیقی، عبداللطیف اعظمی، بشیر علی خاں شکیب، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور ظہیر علی صدیقی کے مضامین ہیں۔ مولانا محمد علی پر کام کرنے والوں کے لیے یہ اچھا تحفہ ہے۔

پتہ: اردو گھر۔ راؤز اوینیو۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

Regd. No. D-(S)-110 Vol. 76 No. 4 April,

The Monthly JAMIA

Maulana Mohammad Ali Number

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

Subscription Rates

India	Rs. 6-00
Pakistan	Rs. 26-00
Foreign	$ 4 (US) or £ 1.50

Advertisement Rates

Cover IV	Full page Rs. 200/-	Half page Rs 100/-
Cover III & II	Full page Rs 150/-	Half page Rs. 75/-
Ordinary	Full page Rs. 100/-	Half page Rs. 50/-

جامعہ

جلد ۷۶	بابت ماہ مئی ۱۹۷۹ء	شمارہ ۵

فہرست مضامین

شذرات

مسلم ممالک، خاص طور پر ایران اور پاکستان میں اسلامی اصولوں کے مطابق نظامِ حکومت کے قیام کی تحریکوں نے دنیا کی توجہ ایک بار پھر اس مسئلہ کی طرف پھیر دی ہے کہ کیا اسلام عہدِ جدید میں ایسی حکومت اور سماج قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو ایک طرف اس کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہو اور دوسری طرف عہدِ جدید کے تقاضوں کو پوری کرتی ہوں۔ بعض صحافیوں اور اہلِ قلم نے اس سلسلے میں اپنی فکرمندی کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ مسلم ساجوں میں مذہبی ادعائیت اور لفظی معنوں میں دیرینہ عقائد کی طرف واپس لوٹنے کا رجحان زور پکڑتا جا رہا ہے اور یہ صورتِ حال ان کے اپنے خیال میں خود مسلمانوں کے لیے اور پھر ساری دنیا کے لیے "خطرناک" عواقب سے معمور ہے۔ وہ اس بات سے بھی اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں اور ٹکنیکل اداروں میں تعلیم پائے ہوئے افراد کی خاصی بڑی تعداد اس رجحان کی حامل ہے۔

جن اربابِ نظر کو مسلم ممالک میں مذہبی اور اصلاحی تحریکوں سے واقفیت ہے اور جن کی نظر ان کے نشیب و فراز پر رہی ہے، ہمارا خیال ہے کہ انھیں بھی ان ملکوں میں اسلام، اسلامی ثقافت اور اسلامی طرزِ زندگی کی طرف بڑھتے ہوئے میلانات سے خاصی دلچسپی ہے اور وہ بھی ان کے تجزیے اور مطالعے میں مصروف ہیں۔ ان میں سے ایک حلقے کا یہ خیال ہے کہ یہ سارا "ہنگامہ" درحقیقت "احرارِ ملت" کی طرف سے اس ردِ عمل کا نتیجہ ہے جو مغربی تہذیب کی نفس پرستانہ ژولیدگی کے خلاف اب عام ہے اور خود مغرب میں صاحبِ بصیرت اور حساس افراد اپنی تہذیب کی بنیادی

کمزوریوں کا بھرپور احساس رکھتے ہیں' اس سلسلے میں یہ بات بھی اہم ہے کہ مغرب میں نئی نسل کے لوگ اپنی تہذیب' اپنے سماج اور اپنے نظام سے مطمئن نہیں ہیں اور ان میں خاصی تعداد ایسے نوجوانوں کی ہے جو مغربی طرزِ زندگی سے اوب کر اپنے قلب ونظر کی تسکین کے لیے کسی اور طرزِ زندگی اور فلسفۂ حیات کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ اس لیے یوروپ اور امریکہ کے حالات کے تجربہ کے بعد' وہاں کی درسگاہوں میں تعلیم پائے ہوئے نئی نسل کے مسلم دانشوروں اور ٹکنیکل تعلیم کے ماہرین ہیں' جن کا عقیدہ اور یقین یہ ہو کہ ان کے پاس ایک ایسا مذہب ہے جو مادیت اور روحانیت کے مابین ایک خوشگوار توازن کی ضمانت دیتا ہے' اگر مغربی تہذیب و افکار کے خلاف کوئی ردعمل ہو تو ہمیں نہ تو تعجب ہونا چاہئے اور نہ بہت زیادہ گھبرا اٹھنا چاہئے' ہمیں چاہئے کہ اس صورت حال کا ہمدردی اور سنجیدگی سے مطالعہ کریں اور مسئلہ کی اصل نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصہ میں رفتہ رفتہ معاشی خوش حالی کے اسباب پیدا ہوئے' انھیں مغربی سامراج سے سیاسی آزادی تو نصیب ہوئی لیکن معیشت کا نظام ایسا بننے لگا کہ دولت میں اضافہ کے ساتھ مغربی تہذیب کی بالادستی دوسرے راستوں سے در آئی۔ مسلم ممالک کے بڑے شہروں کی آبادیاں تیزی سے بڑھیں اور صنعتی زندگی کی طرف قدم بڑھا دیا گیا۔ بڑے شہروں کی زندگی' جہاں صنعتیں بھی قائم ہوں بڑی پیچیدہ ہوتی ہے' لیکن مسلمان ملکوں میں صنعتی تعلیم اور صنعتی وٹکنیکی ماہرین کی بڑی کمی کے سبب' معیشت کا انحصار مغرب ہی پر رہا اور اس کی وجہ سے مغربی تہذیب اپنی تمام اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ حکمراں طبقے اور دولت مندوں اور خوشحالوں کے نئے طبقے' سبھی پر چھا گئی۔ دولت کی تقسیم منصفانہ نہیں ہوئی اور استحصال کی نئی نئی شکلیں سامنے آئیں' نیچے سے معاشرہ کی معاشی' سماجی' تعلیمی اور اخلاقی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کی گئی' وہ روحانی تربیت جو ایک متوازن سماج کی تشکیل کے لیے ضروری ہے' دیرینہ عقائد کا تتمہ بن کر نظرانداز ہوتی رہی۔ سچی مذہبی زندگی جو اسلام کا بنیادی نصب العین ہے' قصۂ پارینہ سمجھ لی گئی' اور دولت اور حکومت کی سطح پر بالادست طبقہ کا فلسفۂ حیات یہ ٹھہرا کہ

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال حساس مسلم نوجوانوں کے دلوں پر ایک بوجھ ہی ہو سکتی ہے اور اگر وہ اس بوجھ کو اٹھا کر پھینک دینے پر آمادہ ہو جائیں، تو اس میں حیرت اور تعجب کی کیا بات ہے؟ ہاں یہ ضرور سوچنا ہے کہ ان کا یہ شدید رد عمل محض رد عمل ہی ثابت نہ ہو، بلکہ اس کے پیچھے سنجیدگی، گہرائی اور فکر و نظر کے وہ سارے مناسبات ہونے چاہئیں جن سے رفتہ رفتہ ایک مستحکم اور متوازن معاشرہ جنم لیتا ہے۔ ہمیں جو فکر ہے وہ یہی ہے کہ یہ ایک برجستہ رد عمل ہے اور اس کے پیچھے کوئی گہری فکر نہیں ہے، اس لئے اندیشہ ہے کہ کہیں بے ساختہ اور برجستہ عمل اور رد عمل کا کوئی ایسا سلسلہ نہ شروع ہو جائے جو مسلم معاشروں کی مزید تباہی کا سبب بن جائے۔ دنیا کی تاریخ ایسے چھوٹے بڑے انقلابوں سے بھری پڑی ہے جنھوں نے ایسی قوتوں کو جنم دیا، جو بڑی مشکلوں اور سخت آزمائشوں کے بعد ہی قابو میں آئیں اور وہ بھی بعد از خرابیٔ بسیار۔

یہ نقطۂ نظر کہ پہلے سیاسی غلبہ حاصل ہو اور پھر افراد اور معاشرہ کی تربیت کا کام ہو، خطرات سے پُر ہے، ایران اور پاکستان میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں ان کے پیچھے یہی نقطۂ نظر کارفرما ہے، پیغمبرانہ کام یہ ہوتا ہے کہ اس سے پہلے ایسے افراد تیار کیے جاتے ہیں جو بے نفس ہوتے ہیں، جو خدا سے ڈرتے ہیں، جو اپنے قلب و نظر کو پاک رکھتے ہیں ان تمام برائیوں سے جو حجاب بن جاتی ہیں قلوب انسانی اور ان اعلیٰ اقدار کے مابین جن سے زندگی میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ ایسے افراد جب حکومت و اقتدار کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں تو ان میں انتقام کا جذبہ نہیں ہوتا، وہ سراسر رحمت و رافت ہوتے ہیں، وہ حدود اللہ کو پہچانتے ہیں اور ظلم کے تصور سے ڈرتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ سب کے ساتھ انصاف ہو، وہ ظالموں اور غیر منصفوں کے خلاف، خواہ وہ ان کے اپنے ماں باپ، بھائی بند ہی کیوں نہ ہوں، گواہ بن جاتے ہیں، ان کے سامنے ہمہ وقت اپنے نبیؐ کا یہ عمل بھی رہتا ہے کہ جب فتح مکہ کے بعد آپؐ مکہ میں داخل ہوئے تو اسلام کے سارے دشمنوں اور سب ظالموں کو معاف کر دیا، اور کہا کہ تم پر کوئی الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

ہمارا خیال ہے کہ ایران اور پاکستان میں اور اسی طرح دوسرے مسلم ممالک میں بھی

نہ تو مذہبی اصلاح ہی کا کوئی معتد بہ کام ہوا ہے اور نہ سماجی اصلاح ہی کا۔ اس عہد جدید میں اسلامی اصولوں کے مطابق ایک متوازن معاشرہ کی طرح ڈالی جا سکتی ہے، یہ ہمارا عقیدہ ہے، لیکن ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس کے لیے ہمیں اپنے ان تمام سماجی، سیاسی، معاشی اور قانونی اداروں کا جائزہ لینا ہوگا جن کی بنیاد تو اسلامی ہے لیکن اوپر کی تعمیر میں وہ بہت سے خارجی عناصر بھی شامل ہیں جو ان اداروں کے ارتقاء کے ساتھ، وقت کے ایک مرحلے تک، ان کا ضروری حصہ بن گئے۔ پھر ایسا ہوا کہ ان کا ارتقاء رک گیا اور اس حالت پر صدیاں گذر گئیں اور جمود و تعطل کی کیفیت طاری رہی، زمانہ اور زمانے کے تقاضے بدلتے رہے اور یہ ادارے اپنی جگہ اسی طرح جمے رہے، اب جب تک قرآن و حدیث کی اصولی تعلیمات کے مطابق ان کا جائزہ نہیں لیا جاتا اور ان میں ضروری اصلاح اور ترمیم و تنسیخ نہیں کی جاتی، نئے دور میں سچے اسلامی معاشرے اور اس کے معقول اور متوازن اداروں کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ مسلم ملکوں، اور خاص طور پر ایران اور پاکستان میں، اس طرف خاص توجہ کی ضرورت تھی، افسوس ہے کہ ان ملکوں میں اس طرف سے پوری غفلت برتی گئی ہے اور جو افراد اقتدار میں ہیں وہ خود جمود، تعصب اور تنگ نظری کے شکار ہیں۔

ملیشیا سے کچھ ایسی خبریں مل رہی ہیں جن سے ہمارے اسلامی احساس دستور کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہاں کٹر اور متعصب مسلمانوں کا کوئی ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو مقامی ہندوؤں کے مندروں میں گھس کر ان کی دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کو توڑ دیتا ہے، پہلی خبر آئی تو ہمیں یقین نہیں آیا، لیکن پھر کئی روز برابر اخباروں میں مختلف مقامات سے متعلق ایسی ہی خبریں ملیں، یہ بھی خبر ملی ہے کہ ملیشیا کی حکومت اس صورت حال سے سخت بیزار ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ایسا کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے گی، کئی لوگ رنگے ہاتھوں پکڑے بھی گئے ہیں۔ ان تمام واقعات سے ہماری گردن شرم سے جھک جاتی ہے۔ آخر وہ کون سا قرآن ہے جو ملیشیا کے یہ کٹر اور متعصب مسلمان پڑھتے ہیں، وہ کون سا رسول ہے جس کی تعلیمات پر یہ عمل کر رہے ہیں، آخر یہ کیسا اسلام ہے جس کے یہ نام لیوا ہیں؟ کسی سچے اور صحیح الدماغ مسلمان کا یہ کام نہیں ہو سکتا۔ یہ سراسر غیر اسلامی فعل ہے اور اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ یہ ایک طرح کا مذہبی جنون ہے اور ایسے مجنونوں کی جگہ، جیل نہیں، پاگل خانہ نہیں بلکہ تختۂ دار ہے۔

ڈاکٹر رشید احمد جالندھری

اسلام میں تصور ریاست

اسلام میں تصوّر ریاست پر ادھر تیس سال سے بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے جس سے بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسلام شاید نام ہی ریاست یا سیاست کا ہے یہ ساری بحثیں اور تقریریں اس بات کی خبر دیتی ہیں کہ ہم شعوری یا لاشعوری طور پر موجودہ وقت میں رائج فلسفہ ہائے سیاست سے خوش نہیں ہیں اس لیے ہمیں ایسے فلسفۂ سیاست کی ضرورت ہے، جو ہماری اور انسانی سوسائٹی کی مشکلات کا مداوا بن سکے اور وہ ان برائیوں اور خامیوں سے پاک ہو، جو موجودہ فلسفہ ہائے سیاست سے ظہور میں آئی ہیں، یہ احساس بذاتِ خود قابلِ قدر احساس ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ وقت میں ہمیں جس ذہنی قلق اور اضطراب سے واسطہ ہے، تقریباً اسی کا اظہار مغرب کے مفکرین نے بھی کیا ہے، مثلاً مسٹر رسل نے کہا ہے کہ ہمارے عہد کے عجائبات میں سے ایک عجوبہ یہ ہے کہ فلسفہ، ادب اور سیاست کے میدان میں جنون کامیاب ہے،[1] مزید یہ کہ جنون کی یہ کامیاب شکل تحریکات سے طاقت کی طرف بڑھ رہی ہے۔ رسل کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ موجودہ وقت میں انسان کو جنگ سے بچانے اور اقتصادی ناہمواری سے محفوظ رکھنے کے لیے کسی عالمگیر اخلاقی نظام کے قائل ہیں، مگر یہ اخلاقی نظام "چوہے اور بلّی کا اخلاقی نظام نہ ہو"[2] — رسل نے موجودہ اجتماعی صورتِ حال پر جس مایوسی کا اظہار کیا ہے، ڈاکٹر اقبال نے بہت پہلے اس بارے میں لکھا تھا۔ یقین جانئے کہ یورپ موجودہ وقت میں انسانی کی اخلاقی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے[3]۔ غرض یہ کہ موجودہ فلسفہ ہائے سیاست سے اہلِ نظر مطمئن نہیں ہیں امید ہے کہ یہ قلق، یہ اضطراب

---

[1] طاقت۔ لندن ۱۹۵۷ء، ص ۲۷۰ [2] ایضاً، ص ۲۸۵

[3] اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید (انگریزی، لاہور، ص ۱۷۹

کسی واضح، صحت مند اور قابل عمل سیاسی نظام کی تلاش پر منتج ہوگا، جہاں قلق و اضطراب کا اظہار ایک نیک فال ہے وہاں ان سیاسی بحثوں کو دیکھ کر مایوسی بھی ہوئی ہے کیونکہ تیس سالہ بحثوں نے ہمیں کوئی واضح سیاسی تصور نہیں دیا، حتیٰ کہ ہم ملک میں سیاسی استحکام پیدا کرنے میں یک قلم ناکام رہے، جس پر سب سے بڑی دلیل ۱۹۷۱ء کا سیاسی المیہ ہے، اس لیے آج اگر تصورِ ریاست کے ساتھ ساتھ ان بحثوں کا ناقدانہ جائزہ لیں تو یہ امر ہمارے لیے شائد زیادہ مفید ہوگا، اس لیے کہ بے نتیجہ بحث اسی طرح ہے جیسا کہ کتابی علم جو ہماری اجتماعی مشکلات کا حل نہ بتا سکے۔

مولانا رومی نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ ایک عالم جسے اپنے علم صرف و نحو پر بڑا ناز تھا، کشتی میں ملاح سے پوچھا کہ تم صرف و نحو جانتے ہو؟ "جی نہیں!" ملاح نے جواب میں کہا۔ "تم نے اپنی نصف عمر برباد کر ڈالی!" عالم نے کہا، ملاح خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کشتی بھنور میں آگئی، تو اس نے عالم سے پوچھا کہ کیا آپ تیرنا جانتے ہیں؟ "نہیں!" عالم نے کہا "تم نے اپنی ساری عمر برباد کر ڈالی" ملاح نے جواب میں کہا۔

رومی نے یہاں یہ بتانا چاہا ہے کہ ہماری کشتیٔ حیات جو وقت کی لہروں پر رواں دواں ہے، اگر طوفان کا مقابلہ نہ کر سکے تو پھر ناکامی ہے اور ایسا علم جو مشکلات پر قابو نہ پا سکے، بیکار ہے، رومی نے یہ سبق شمس تبریز سے لیا ہے، جس نے کہا تھا کہ اگر علم معلوم یا منزل تک نہ پہنچا سکے، اس سے جہالت بہتر ہے، چنانچہ بعض اوقات یہ احساس ہوتا ہے کہ ہماری یہ ساری بحثیں بے معنی ہو کر رہ گئیں ہیں اور چند الفاظ یا نعرے ہیں، جنھیں ہم بار بار دہراتے جا رہے ہیں، جس کی وجہ سے یہ الفاظ جو اپنے ساتھ عظیم الشان روایات رکھتے تھے، اپنی آب و تاب کھو بیٹھے ہیں، شاید اس لیے اقبال نے برطانوی مفکر ہوبز کے حوالے سے لکھا تھا کہ ایک خاص سلسلہ اور انداز سے چند تصورات اور خیالات کو دہرانے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں نہ کوئی خیالات ہیں اور نہ ہی افکار، افسوس! آج اکثر مسلمان قوموں کے نصیب میں یہی ہے کہ وہ میکانکی طور پر پرانی قدروں کا ورد کر رہی ہیں جب کہ ترک نئی قدروں کی تخلیق کی راہ پر گامزن ہے۔[۴۵] غرضیکہ ہمیں سختی سے خود اپنے افکار کا جائزہ لینا چاہئے، اس تنقیدی محاسبے کے بعد ہم یقیناً کسی مفید نتیجے پر پہنچ سکیں گے، لیکن اپنے محاسبے

---

[۴۵] تشکیل جدید، ص ۱۶۲

کے لیے انسان کا خود اپنی گھات میں بیٹھنا زندگی کا مشکل ترین کام ہے۔

یہاں اگر ماوردی، غزالی اور ابن خلدون کے نظریات دہرائے جائیں تو اس کا شاید چنداں فائدہ نہ ہو بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان تصورات کی بنیاد پر خود ان کے اپنے عہد میں ریاست قائم نہیں ہوئی۔ اس امر سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو، ہمیں ایک ایسے سیاسی نظام کی ضرورت ہے جو ہماری امنگوں آرزوؤں اور روایات کا حامل ہو یہاں یہ بات محتاج بیاں نہیں کہ ان روایات میں مذہب سرفہرست ہے، لیکن ہم اسے کیوں کر عملی شکل دے سکتے ہیں، اس پر بحث ہونی چاہیے۔ چنانچہ پرانے مفکرین کے خیالات کو دہرانے کے بجائے ہم یہاں صرف چند اصولی باتیں کریں گے۔ وہ بھی اپنے معاشرے کے حوالے سے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام کا ہم سے کیا تقاضا ہے؟ نیز ہماری مذہبی زندگی میں عقل اور تجربے کا کیا رول ہے؟ قرآن مجید اور سنت رسول کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اسلام دو باتوں کا حکم دیتا ہے،

(۱) انسان کو اپنا تعلق خدا سے قائم کرنا چاہیے، یہ تعلق جس قدر مضبوط ہوگا، اسی قدر آدمی کی شخصیت میں ٹھہراؤ اور توازن پیدا ہوگا اس تعلق کو قائم کیے بغیر انسانی روح کو کبھی قرار نہیں ملے گا۔ مزید یہ کہ انسان اپنی باطنی اور معنوی خامیوں پر اسی تعلق کی بنا پر قابو پا سکتا ہے، مثلاً قانون جو اجتماعی زندگی کا ایک مظہر ہے، ہماری باطنی زندگی پر کنٹرول نہیں رکھتا، یعنی ہم قانون کے ذریعے، حسد نفرت یا جھوٹ جیسی خطرناک بیماریوں پر قابو نہیں پا سکتے، ان بیماریوں کا مداوا خدا کے ساتھ تعلق کا قائم کرنا ہے جوں جوں خدا اور انسان کے باہمی تعلق کا احساس بڑھتا ہے اسی قدر انسانی فکر و نظر اور قول و فعل میں پاکیزگی آتی جاتی ہے، اور اس طریق سے آدمی اجتماعی زندگی میں ایک بہترین ممبر بنتا ہے۔ شام میں حضرت عمرؓ کے کمانڈر ابو عبیدہ نے حمص سے اپنی فوجوں کی واپسی پر اہل کتاب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے تم سے تمہارے دفاع کے نام پر جو ٹیکس لیا ہے اسے واپس کرتے ہیں کیونکہ ہم اس علاقے کو چھوڑ رہے ہیں اگر ہم واپس ہوئے تو پھر تم سے معاہدہ کریں گے، ابو عبیدہ کا ٹیکس لے کر واپس کر دینا اخلاقی پاکیزگی کی ایک بلند مثال ہے اس شریفانہ برتاؤ کو دیکھ کر اہل کتاب نے کہا کہ خدا تم جیسے لوگوں کو واپس لائے یہی وجہ ہے کہ اقبال نے قرآن مجید کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا قرآن کا بنیادی مقصد جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، انسان اور خدا اور ایسے ہی انسان اور کائنات کے باہمی رشتے

کے بارے میں بلند شعور پیدا کرنا ہے۔[۵] اقبال نے مزید کہا ہے کہ اسلام میں قانون کا سرچشمہ قرآن مجید ہے، لیکن یہ سیگل کوڈ نہیں ہے۔

(۲) اجتماعی زندگی میں اسلام نے شریعت کے نام پر ایک قانون دیا ہے یہ قانون اخلاقی بنیادوں پر ہے یہاں اخلاقی بنیادوں سے مراد ایسی قدریں ہیں، جن کی بنیاد وحی پر ہے، مثلاً موجودہ وقت میں مرد اور عورت کے آزاد تعلقات، بشرطیکہ جبر پر مبنی نہ ہوں، جدید قانون کی نگاہ میں جائز شمار ہوتے ہیں لیکن اسلام اسے ایک برائی قرار دیتا ہے، دراصل ہم اس مفروضہ کو کہ "جو چیز سوسائٹی کے لیے مفید ہے اچھی ہے"، تسلیم نہیں کرتے، بہر نوع ہمارا اخلاقی ضابطہ ایسا ہے، جس کی ہمیں اجتماعی اور انفرادی زندگی میں پیروی کرنی ہوگی، یہ کوئی جز وقتی ضابطہ نہیں ہے، جہاں تک تعلق تمہاری سیاسی زندگی کا ہے، تو اس کے بارے میں نہایت اختصار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے سیاسی زندگی کے لیے کوئی خاص نظام نہیں دیا، بلکہ چند عالم گیر اصول مثلاً مساوات، آزادی اور عدل، جو دراصل توحید کا منطقی نتیجہ ہیں، دے کر اسے انسانی عقل اور تجربے پر چھوڑ دیا ہے، مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ عقل اپنے تجربوں میں وحی سے بالکل بے نیاز ہو جائے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ عقل وحی کی روشنی ہی میں دیکھ سکتی ہے جس طرح کہ انسانی آنکھ کا ہونا بھی ضروری ہے اسی طرح عقل کا جو وحی کی طرح خدا کا عطیہ ہے، استعمال کرنا ضروری ہے اور دونوں کو ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ مغربی سیاست کی بڑی خامی یہ ہے کہ وہ اپنی پوری کامیابیوں، خوبیوں کے باوجود اخلاقی اقدار اور وحی سے بے نیاز ہے۔ جس کی بنا پر وہ انسانی مشکلات میں اضافہ کا موجب بنی ہے، چنانچہ زندگی کے جن امور میں وحی نہیں آتی تھی ان کے بارے میں رسول کریمؐ نے اپنے ساتھیوں سے مشورے کیے، یعنی روزمرہ کی زندگی کے مسائل میں آپ اپنے ساتھیوں سے مشورہ فرماتے یہ مشورہ فرمانا اس بات کی دلیل تھا کہ لوگوں کو زندگی کے مسائل میں اپنی عقل کو استعمال کرنا چاہیے، آپ کی رحلت کے بعد پہلے خلیفہ راشد کا انتخاب کیا گیا، یہ انتخاب صحابۂ کرام نے اپنی صوابدید سے کیا، اس انتخاب نے یہ بھی بتا دیا کہ جو معاشرہ انتخاب کا حق رکھتا ہے، وہ صدر ریاست کو برطرف بھی کر سکتا ہے، نیز یہ کہ انتظامی امور میں عقل و دانش کی فرماں روائی ہے، لیکن اس سیاسی اور انتظامی امور میں بنیادی نصب العین یہ تھا کہ معاشرے کے مفاد کو جس کا تحفظ

---

۵ ایضاً، ص ۱۶۵

عدل و انصاف کے قیام ہی سے ہو سکتا ہے، ہر قیمت پر مقدم رکھا جائے، چنانچہ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے خلیفہ اول اور دوم نے اپنے اپنے وقتوں میں جو قدم اٹھائے وہ اختلافِ وقت کی بنا پر ایک دوسرے سے مختلف تو ہو سکتے ہیں مگر دونوں کی منزل ایک تھی، یعنی عدل و انصاف کا قیام اور انسانی وقار و ناموس کا تحفظ، سوسائٹی میں عدل و انصاف کے قیام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے، کہ بعض مسلم مفکرین نے غیر مسلم انصاف پرور حکمران کو ظالم مسلم حکمران سے بہتر گردانا ہے۔ ایسے ہی ایک حدیث میں آیا ہے کہ ملک کفر کے ساتھ تو باقی رہ سکتا ہے مگر ظلم کے ساتھ نہیں چل سکتا ہے۔

بہرنوع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے اجتماعی زندگی کے نظم و نسق اور ریاستی امور کو چلانے کے لیے جو کچھ کیا اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے

۱۔ اظہار رائے کی آزادی، ہر شہری، ریاستی اور دنیاوی امور میں بے خوف و خطر اپنی رائے کا پوری آزادی سے اظہار کر سکتا تھا۔

۲۔ باہمی مشاورت، خلیفہ یا صدر ریاست کا انتخاب باہمی مشورے سے ہوا۔ لیکن یہ انتخاب کرنے والے خود بھی علم و فضل سے آراستہ تھے، یہ انتخاب اس بات کی دلیل تھا کہ انتظامی امور جن میں کہ وحی خاموش ہے، عقل کے دائرہ کار میں آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلام میں صدر ریاست کو کبھی "خدائی اختیارات" کا حامل تصور نہیں کیا گیا، وہ قوم کے سامنے جواب دہ تھا۔

۳۔ قانون کی حکمرانی، اسلام میں ریاست کی امتیازی خصوصیت، جمہوریت، دستوری بادشاہی یا انتظامی ڈھانچے کو نہیں، یہاں کی سب سے بڑی خصوصیت ریاست میں قانون کی سیادت ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ ہمارے قانون کی بنیاد اخلاقی قدریں ہیں۔ لیکن آج یہاں معاملہ بالعکس ہے، یعنی ہم قانون کی مدد سے انسان کو اخلاقی بنانا چاہتے ہیں حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوتا، واقعہ یہ ہے کہ انسان انسان پر قانون کے نام پر ظلم کرتا ہے، ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے اس امر کی طرف اپنے مخصوص انداز میں اشارہ کیا ہے:

"انسانی قتل و غارت گری کی کوئی ہونا کی ایسی نہیں ہے جو شریعت اور قانون کے نام سے نہ کی گئی ہو اگر تاریخ سے پوچھا جائے کہ انسانی ہلاکت کی سب سے بڑی قوتیں میدان ہائے جنگ کے باہر کون کون سی رہی ہیں، تو یقیناً اس کی انگلیاں ان عدالت گاہوں کی طرف

اٹھ جائیں گی جو مذہب اور قانون کے نام سے قائم کی گئیں۔"

۴۔ ملت کا مجموعی مفاد ہماری سیاست کا بنیادی نکتہ ہے۔ اس مجموعی مفاد ہی میں مشیت ایزدی کام کرتی ہے لیکن مجموعی مفاد کا یہ مطلب نہیں کہ ہم دوسروں کو اپنا غلام بنائیں، اور ان کی محنت پر داد عیش دیں جیسا کہ تمدن کے نام پر سرمایہ دارانہ نظام نے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مفکرین نے ریاست کے فرائض میں جان، مال، آبرو اور دین کا تحفظ قرار دیا ہے۔

آج ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ہم نے اپنے سیاسی نظام کے لیے ان اصولوں کو اختیار کیا، اور ایسا سیاسی نظام تیار کیا جس میں ملک کے بسنے والے تمام شہری برابر کے شریک ہوں، افسوس کہ ہم یہاں ایسا نہ کر سکے فکر و نظر کی آزادی کو سلب کیا گیا، جمہوریت کی راہ ترک کی گئی، قانون سربازار رسوا کیا گیا، اس کوتاہی کی ذمہ داری ہماری سیاست پر ہے جو اخلاق سے یک قلم عاری ہے، لیکن اپنے مفاد کے لیے اخلاق، اسلام اور مذہب کا نام ضرور استعمال کرتی ہے اور جب کبھی ہماری سیاست ناکام ہوئی اور اسے ہونا بھی چاہیے تھا، تو اس نے اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے مذہب کا سہارا لیا۔ اور لوگوں کی توجہ کو بنیادی مسائل سے ہٹانے کی کوشش کی، حتیٰ کہ ہم اپنے ملک کے ایک حصے سے دست بردار ہو گئے، ملکی وحدت کے خلاف یہاں جو طاقتیں کام کر رہی تھیں، اور جس انداز سے جذبات کو برانگیختہ کیا گیا، اس کی طرف ماضی میں توجہ نہیں دی گئی، مثلاً ۱۹۵۲ء میں مجیب الرحمٰن نے کہا کہ مشرقی پاکستان میں اردو زبان لازمی قرار دی گئی ہے جبکہ مغربی پاکستان میں بنگالی زبان نہیں ایسے ہی ۱۹۵۷ء میں مسٹر سہروردی نے مخلوط انتخابات کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو مشرقی پاکستان مغرب سے الگ ہو جائے گا، یا ۱۹۶۲ء میں ایک کتاب "آگ کا دریا" لاہور سے شائع ہوئی، جس میں صاف طور پر یہ کہا گیا کہ مشرقی پاکستان مغرب سے الگ ہو جائے گا، اور خود مغرب والے بھی یہی چاہتے ہیں، یہ صرف چند مثالیں ہیں، لیکن نہ تو ہمارے دانشور طبقہ نے اور نہ ہی ارباب سیاست نے ان باتوں کا سنجیدگی سے کوئی نوٹس لیا، بلکہ ان باتوں کے جواب میں کہا گیا کہ مشرق اور مغرب کو کوئی الگ نہیں کر سکتا، سہروردی صاحب فریب میں مبتلا ہیں، واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کے بناؤ یا بگاڑ میں کام کرنے والے محرکات کا ادراک کیے بغیر کوئی قوم سیاسی استحکام حاصل نہیں کر سکتی یا چند نعروں یا طاقت کے زور پر انسانوں کے دل و دماغ میں حرکت کرنے والے خیالات کو دبایا نہیں جا سکتا، چنانچہ ۱۹۷۱ء کا سیاسی بحران پیدا ہوا، اور بنگال کا علاقہ پاکستان سے باہر نکل گیا

جن لوگوں نے بنگال اور سلہٹ کو پاکستان میں شامل کرنے کا یہ کام کیا، وہی لوگ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ان علاقوں کو پاکستان سے باہر نکال لے گئے، جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمارے ملک میں جمہوری نظام نہیں تھا، جس سے سب لوگوں کو شریکِ اقتدار ہونے کا احساس ہوتا اور کھل کر بات کرنے کی آزادی ہوتی، یہی احساس محرومی تھا، جس نے ہمیں نقصان پہنچایا، اس کا سیدھا سادا علاج اس احساس کو دور کرنا تھا، لیکن ہم نے اسے دور کرنے کی بجائے "خیانت و غداری" کی چند اصطلاحات کے ذریعہ کام چلانا چاہا، نتیجے میں تاریخ نے اپنا فیصلہ ہمارے خلاف دیا، موجودہ وقت میں سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ پاکستان کے تمام لوگوں کو شدت سے شریک اقتدار ہونے کا احساس ہونا چاہیے اور جو عوامل ہمارے خلاف کام کر رہے ہیں ان پر نہایت صبر و تحمل کے ساتھ بحث ہونی چاہیئے کیونکہ زندگی کے ہر مسئلے کو اس کے صحیح تناظر ہی میں دیکھنا چاہیئے جس سے میری مراد یہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام ہوئے تو اس ناکامی کے اسباب کا سراغ لگانا، لیکن اپنی ناکامی کے صحیح اسباب کا پتہ لگانے کے بجائے کسی مذہبی نعرے کا سہارا نہیں لینا چاہیئے، افسوس کہ ہم ادھر تیس سال سے اپنے مسائل کا حل انہی نعروں کی بنیاد پر کرنا چاہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت فیل ہوئی تو خلافت کمیٹی کے ممبران نے یہ طے کیا کہ وہ ایک دوسرے کو صبح کی نماز کے وقت گھر گھر جا کر بیدار کریں گے، اس پر حسرت موہانی نے کہا کہ کوئی آدمی میرے گھر پر نہ آئے یاد رہے کہ موہانی صوم و صلوٰۃ کے بڑی سختی سے پابند تھے، موہانی کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں اپنے سیاسی مسائل سیاست ہی کے سیاق و سباق میں سلجھانے چاہئیں، چنانچہ پاکستان کے سیاسی مسائل کا حل سیاسی انداز ہی سے ہو سکتا ہے یہ جو بار بار خدا کی حاکمیت کا اعلان کیا جاتا ہے، اس پر بھی سوچنا چاہیئے کہ مسلمان تو اللہ کی مشیت اور حاکمیت کو تسلیم کئے بغیر مسلمان ہی نہیں ہو سکتا، واقعہ یہ ہے کہ مذہب چند بوجھل عقائد یا سائنسی انداز فکر کا نام نہیں یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو انسان کو نئی زندگی عطا کرتا ہے، چنانچہ ایک مسلم ریاست میں بار بار اللہ کی حاکمیت کا اعلان تحصیل حاصل ہے خود ہماری تاریخ میں اس نعرے کو سب سے پہلے خوارج نے بلند کیا اور اس کے نتیجہ میں حضرت علیؓ جیسے خلیفۂ راشد اور مقدس انسان کو شہید کر دیا گیا، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی سیاسی ناکامیوں پر مذہبی نعروں سے پردہ نہیں ڈال سکتے، اس سے نہ صرف ہماری مشکلات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ مذہب کا مقدس نام بھی بدنام ہوتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی تاریخ

پڑھتے وقت مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف جانا چاہیے، لیکن ہم آج مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف آرہے ہیں، میری مراد یہ ہے کہ ہم ریاست سے دین کی طرف آرہے ہیں، چنانچہ آج ہمیں قیاسی بحثوں اور بے نتیجہ تقریروں سے الگ رہ کر غور و فکر کی راہ اختیار کرنی ہوگی، اور یہی وہ راہ ہے جس کا سراغ خود مذہب نے ہمیں دیا ہے، چنانچہ ہمیں حقائق کی دنیا میں رہ کر عقل، مشاہدے تجربے کی بنیادوں پر اپنے مسائل حل کرنے چاہئیں، ڈاکٹر اقبال نے ایک جگہ کہا ہے کہ نہ صرف ایشیا بلکہ قدیم تہذیبیں اس لیے ناکام رہیں کہ انھوں نے تلاش حقیقت کے لیے داخل سے خارج کی طرف قدم اٹھایا۔[۵] اس سے مقصد یہ تھا کہ جس فکر کے پیچھے عمل نہیں ہے یا مشاہدہ اور تجربہ نہیں ہے وہ فکر سودمند نہیں، ابن قیم نے بھی کہا تھا کہ یہ کہنا کہ جو شرع کہے وہ سیاست ہے غلط ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سیاست وہ ہے جو شرع کے مقاصد سے ہم آہنگ ہو، شاطبی نے بھی یہی کہا تھا کہ مابعد الطبیعات کا تعلق وحی سے ہے اور دنیاوی امور کا تعلق عقل تجربے اور مشاہدے سے، چنانچہ ہمیں اس بات کو تسلیم کرلینا چاہیے کہ وقت کسی کی خاطر اپنی رفتار نہیں بدلتا اور دل پر ہاتھ رکھ کر تاریخ کو پڑھنے سے کبھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا چنانچہ اگر ہم نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا تو تاریخ کا فیصلہ کل کو پھر ہمارے خلاف ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ہم اپنے سیاسی استحکام میں اسی وقت کامیاب ہوسکتے ہیں، جب ہم عقل و دانش کی راہ اختیار کریں اور ان اصولوں کو عملی جامہ پہنائیں جن کی تلقین قرآن مجید، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور خلفائے راشدین نے کی ہے یہاں پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان اصولوں کی تلقین تو موجودہ وقت میں دونوں ممتاز فلسفہ ہائے سیاست بھی کررہے ہیں یا یہ کہ سویڈن، برطانیہ اور دوسرے ملکوں میں ہر شہری کو ریاست کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے اور وہاں قانون کی مکمل حکمرانی ہے۔

ہماری سیاست کا اب امتیازی وصف کیا ہے؟ اس کے جواب میں نہایت ہی اختصار سے یہ کہا جاسکتا ہے، کہ دنیا کے جس حصے میں بھی انسان کی فلاح و بہبود کے لیے عدل و انصاف کو قائم کیا گیا ہے، ہم ازروئے قرآن ان کی تائید کرتے ہیں ابن تیمیہ نے قبرص کے عیسائی بادشاہ کو خط لکھتے ہوئے کہا تھا کہ ہم ایسی قوم ہیں، جو تمام انسانوں کی بھلائی کی خواہاں ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ موجودہ فلسفہ ہائے سیاست خالص عقل کے مرہون منت ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ وہ

---

[۵] تشکیل جدید (پہلا خطبہ)

انسان کی مشکلوں کو حل نہیں کرپائے ، مثلاً مغربی جمہوریت کی بنیاد فلسفہ انفرادیت پر ہے، جو بالآخر سرمایہ داری پر منتج ہوا اور سرمایہ داری کے ہاتھوں ہم نے اس صدی میں جو مصیبتیں اٹھائی ہیں، اس سے ہر کوئی واقف ہے۔ اس کے برعکس دوسرا فلسفہ، فلسفۂ اجتماعیت پر مبنی ہے، جو بالآخر ڈکٹیٹر شپ کی شکل اختیار کرگیا ہے، اور فرد کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ ان دونوں فلسفوں کو جانچنے کے بعد اسلامی فلسفۂ سیاست کی نمایاں خصوصیت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں کے بین بین ہے، یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیئے، کہ آزادی، مساوات اور عدل وانصاف سے متعلق ہمارے تصورات ماورائی ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جماعتی مفاد کی بڑی تاکید کی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ فرد کو بھی یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ حکمران کا محاسبہ کر سکے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ہم ریاست کی راہ سے ایک ایسے معاشرہ کی راہ ہموار کر رہے ہیں جس کا منتہائے نظر مادی خوشیاں ہی نہیں ہیں۔ بلکہ اخلاقی تربیت بھی ہے، ایسی اخلاقی تربیت جو آخرت میں جوابدہی کے احساس پر قائم ہے، اس ساری بحث کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری سیاست کا منتہائے نظر خدا کی عظمت اور انسان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا ہے۔

فاضل مضمون نگار کا تعارف : ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، سابق ڈائریکٹر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اسلام آباد (پاکستان)

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی

جدید مشرقی تنقید کا دبستان شبلی

(ا)

۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ انقلاب نے ہندوستان کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں جو عظیم ہلچل پیدا کی اس کے نمایاں اثرات اردو ادب پر بھی پڑے۔ چنانچہ ان ہی تغیر پذیر حالات کے نتیجہ میں جدید اردو تنقید کی بنا پڑی۔ یہ حقیقت ہے قدیم تذکروں اور جدید تنقید کے درمیان "آب حیات" کو "گریز" کی حیثیت حاصل ہے۔ محمد حسین آزاد نے مغربی ادب سے کافی اثر قبول کیا تھا۔ کرنل ہالرائڈ اور پنجاب سوسائٹی نے افادی ادب کے اسرار ان پر کھول دیئے تھے۔ اسی لیے آب حیات مشرق و مغرب کے تنقیدی نظریات کا ایک مرکب نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے محمد حسین آزاد کی تنقید نگاری کو "ناکامیاب کوشش" قرار دیتے ہوئے ان پر بہت سخت تنقید کی ہے، لیکن بایں ہمہ وہ یہ اعتراف حقیقت بھی کرتے ہیں کہ:

"چند مخصوص صفات کے باعث آب حیات تذکروں سے آگے بڑھ کر تاریخ ادب کے دائرہ میں آتی معلوم ہوتی ہے۔" اور — "اردو تنقید نگاری کی تاریخ اس سے شروع کی جایا کرے گی۔"[۱]

محمد حسین آزاد ہی کے دور میں جدید تنقید کی بنا حالی نے رکھ دی۔ ان کا شہرۂ آفاق "مقدمہ شعر و شاعری" اردو تنقید کا پہلا اہم صحیفہ بلکہ "عہد نامۂ جدید" ہے۔ اس میں پہلی بار شاعری کی ماہیت اور اصول تنقید سے بحث اور شعر و ادب کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے۔ غالباً اسی اہمیت کے پیش نظر کلیم الدین احمد جیسے مغرب زدہ نقاد نے بھی حالی کے بارے میں جہاں یہ نہایت سخت رائے

محمد نعیم صدیقی ندوی۔ ایم، اے (عربی)، ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی (اردو) ۲/۱۴۲ محلہ بدرقہ اعظم گڑھ

[۱] ڈاکٹر احسن فاروقی: اردو میں تنقید ص ۴۸، ۴۹، ۵۸

ظاہر کی ہے کہ :

" خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ دماغ و شخصیت اوسط، یہ تھی حالی کی کل کائنات[۲]"

وہیں وہ یہ لکھنے پر بھی مجبور ہوئے کہ "اردو تنقید کی ابتدا حالی سے ہوتی ہے، مقدمہ شعر و شاعری اردو میں گویا پہلی اور اہم ترین ناقدانہ تصنیف ہے[۳]" مولوی عبدالحق حالی کی تنقید نگاری کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

" حالی نے صحیح تنقید کی داغ بیل ڈالی۔ ان کا مقدمہ شعر و شاعری ہمارے ادب میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری تصانیف اور ان کے مقالات میں بھی تنقید کی شان نظر آتی ہے۔ اس کے بعد سے ہماری زبان میں تنقید کا خاصا چرچا شروع ہو گیا۔[۴]"

حالی نے مقدمہ عملاً مستقل کتاب کی حیثیت سے نہیں لکھا تھا۔ اور نہ وہ مبادیات تنقید مرتب کرنا چاہتے تھے۔ ان کے پیش نظر محض اپنی شاعری کے نئے رجحان کا جواز فراہم کرنا تھا۔ لیکن یہ ایک عہد آفریں تصنیف بن گئی۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالی مقصدی ادب کے پہلے بالغ نظر مبلغ ہیں۔

مولانا حالی صرف اصولی و نظری تنقید ہی کے امام نہیں ہیں، بلکہ عملی تنقید کی سربراہی بھی ان ہی کو نصیب ہوئی۔ حیات سعدی، حیات جاوید اور یادگار غالب اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ حالی نے مغربی ادب سے براہ راست اکتساب ضرور نہیں کیا تھا۔ اور اسی باعث انھوں نے مغربی ادب کے حوالے پیش کرتے ہوئے اور مثالیں دیتے ہوئے لغزشیں بھی کی ہیں۔ جدید نقادوں نے ان کی فروگزاشتوں پر بڑے ہنگامے برپا کئے۔ لیکن بقول کلیم الدین :

" اس کے باوجود اب تک کوئی تنقید کی تصنیف مقدمہ شعر و شاعری پر اضافہ

---

[۲] کلیم الدین احمد : اردو تنقید پر ایک نظر (اشاعت سوم) ص ۱۰۹

[۳] کلیم الدین احمد : اردو تنقید پر ایک نظر ص ۸۷

[۴] بحوالہ اردو تنقید کے معیار مرتبہ ایم حبیب خاں ص ۱۳

ثابت نہ ہو سکی۔[۵۴]

(۲)

اسی دور میں تنقید کے اسٹیج پر حالی کے بعد شبلی جلوہ افروز ہوتے ہیں اگر حالی کے یہاں مغربی اصول نقد پر اردو ادب کو جانچنے کی کوشش نظر آتی ہے تو شبلی مغرب سے استفادہ کے باوجود مشرق کا دامن تھامے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "مغرب نے انھیں متاثر ضرور کیا مگر ان کے مزاج کو جو خالص مشرقی تھا بدل نہ سکا۔ اسی لیے شبلی کی تنقید مشرقی طرز تنقید کی ترقی یافتہ شکل سے آگے نہ بڑھ سکی"[۵۵] شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر شبلی کے تنقیدی شعور کی نمائندہ تصانیف ہیں

شعر العجم درحقیقت فارسی شاعری کی تاریخ ہے۔ البتہ اس کی چوتھی جلد میں اصناف سخن کو اصول نقد پر پرکھا گیا ہے۔ یہی حصہ شبلی کے تنقیدی شعور، نظریہ اور زاویہ کے سلسلہ میں اردو تنقید نگاروں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے شبلی کی تنقیدی تصانیف میں اسی کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے[۵۶]۔ پرنسپل عبدالشکور نے بھی شبلی کے تنقیدی مرتبہ کا تعین کرتے ہوئے شعر العجم کے حصہ چہارم پر اپنی توجہ زیادہ مرکوز کی ہے[۵۷]۔ لیکن راقم السطور کے نزدیک شبلی کا سب سے اہم تنقیدی کارنامہ موازنہ انیس و دبیر ہے۔ اسی نے ان کو ایک منفرد نقاد کی حیثیت عطا کی ہے۔

نظریاتی اور اصولی تنقید کے ساتھ شبلی کے یہاں عملی تنقید کے بھی بہت اچھے نمونے ملتے ہیں شعر العجم میں جہاں انھوں نے مختلف شعراء کا تذکرہ کیا ہے، وہاں ان کے کلام کی خصوصیات بھی واضح کی ہیں۔ ان تحریروں سے ان کی عملی تنقید کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ عبادت بریلوی رقمطراز ہیں:

> "شبلی نے تنقید کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کی طرف توجہ کی ہے۔ ان کا خاص میدان شاعری کی تنقید ہے۔ انھوں نے شاعری کے اصولوں پر بحث کی ہے۔ اصناف سخن کے اصول بھی وضع کیے ہیں اور شاعروں پر عملی تنقید بھی کی ہے۔ اس لحاظ سے ان

---

۵۴ اردو تنقید پر ایک نظر ص ۱۱۱

۵۵ ڈاکٹر احمر لاری: حسرت موہانی حیات و کارنامے، ص ۲۴۹ (نامی پریس ۱۹۷۳ء)

۵۶ عبادت بریلوی: اردو تنقید کا ارتقاء ص ۱۷۱

۵۷ عبدالشکور: تنقیدی سرمایہ ص ۶۷

کی تصنیف شعر العجم خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہے۔[9]

موازنۂ انیس و دبیر کی تنقید شعر العجم کی عملی تنقید سے کسی قدر مختلف ہے۔ یہاں پہلے وہ فصاحت بلاغت، کلام کی ترتیب، روزمرہ کے الفاظ کے استعمال، استعارات و تشبیہات وغیرہ پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ علیحدہ علیحدہ ان کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کی خصوصیات بتاتے ہیں۔ ان سے کلام میں جو خامیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا ذکر کرتے ہیں اور پھر ان سب کا اطلاق میر انیس کے کلام پر کرتے ہیں۔[10]

یہ بات یقیناً قابل ذکر ہے کہ حالی کے برخلاف شبلی نے مشرقی شاعری کو مشرقی اصولوں ہی کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ان قوانین اور معیاروں کو مغربی تنقید سے مستعار لینے کی طرف توجہ نہیں دی ہے، جن کا حالی نے قدم قدم پر سہارا لیا ہے۔ دراصل یہی حالی اور شبلی کے درمیان نمایاں خط فاصل ہے اسی وجہ سے وہ حالی کے مقابلہ میں مشرقی ادب کی پہنائیوں میں اتر سکے اور اس کی روح کو تلاش کر سکے ہیں۔ انھوں نے مغربی ادب کو بہ نظر تحسین ضرور دیکھا ہے مگر یہ کوشش نہیں کی ہے کہ مشرقی ادب کے ساتھ اسے خلط ملط کر دیں۔[11]

تمام نقادان سخن کا اتفاق ہے کہ شبلی کی تنقید نگاری میں مشرقی انداز تنقید کا رنگ بہت گہرا ہے۔ ان کے تنقیدی افکار و نظریات میں مشرقیت نمایاں ہے۔ جب ہم ان کے اس رجحان کی بنیادوں کی جستجو کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ادبی ذوق کی نشوونما میں عربی شعر و ادب کے بڑے گہرے اثرات تھے۔ عربی نقادوں کے مطالعہ نے ان کے تنقیدی شعور پر جلا کی اور اس کی نشوونما میں حصہ لیا۔ وہ عربی ادب کی شہرۂ آفاق کتاب "العمدہ" کو بہت پسند کرتے تھے۔ اور اسے ابن رشیق کی تمام تصانیف کا "سرتاج" قرار دیتے تھے۔[12] انھوں نے رسالہ الندوہ لکھنؤ کے شمارہ دسمبر ۱۹۰۹ء میں اس کتاب پر بہت مبسوط ریویو لکھ کر اپنی پسندیدگی کے اسباب

---

۹ عبادت بریلوی: "شبلی کی تنقید نگاری" (مضمون) مشمولہ ادیب علی گڑھ۔ شبلی نمبر صفحہ ۲۱۱

۱۰ عبادت بریلوی: اردو تنقید کا ارتقا، ص ۱۸۴

۱۱ ابن فرید: اردو تنقید کی تاریخ (مضمون) مشمولہ ادیب علی گڑھ جون ۱۹۶۱ء، ص ۱۰

۱۲ شبلی نعمانی: مقالات شبلی ج ۲ ص ۳۰

کی مدلل وضاحت کی ہے۔

جس طرح اردو شاعری فارسی وعربی شاعری کی گود میں پروان چڑھی ۔ اسی طرح اردو تنقید بھی فارسی اور اس کے واسطے سے عربی تنقید کی رہین منت ہے۔ یوں تو کتاب العمدہ سے قبل قدامہ بن جعفر کی نقد الشعر، ابو ہلال العسکری کی کتاب الصناعتین اور ابن قتیبہ کی ادب الکاتب وغیرہ جیسی قابل قدر کتابیں منصۂ شہود پر آچکی تھیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ العمدہ کے مرتبہ کو کوئی تصنیف نہیں پہنچ سکی[۱۳] علامہ ابن خلدون اپنے مشہور مقدمہ تاریخ میں ایک جگہ رقم طراز ہیں :

"ابن رشیق کی کتاب العمدہ اپنے فن پر منفرد کتاب ہے۔ اس سے پہلے اور بعد میں بھی اس کے مثل کتاب نہیں لکھی گئی"[۱۴]

جرجی زیدان اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے کہ "هو أجل كتاب فى هٰذا الموضوع"[۱۵] یعنی یہ کتاب اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ خود ابن رشیق نے العمدہ کے بارے میں لکھا ہے۔

"یہ وہ کتاب ہے جس میں تمام اچھے اچھے شعراء اور محاسن و آداب جو اس بارے میں کہے گئے ہیں، جمع کر دیئے گئے ہیں۔ . اس میں شعری محاسن پر زیادہ زور دیا گیا ہے"[۱۶]

ابن رشیق، جس کے تنقیدی نظریات شبلی اور ان کے دبستاں کی تنقید نگاری کا سرچشمہ ہیں، کتاب العمدہ میں لکھتا ہے۔ "شعر میں الفاظ جسم اور معانی روح کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور معانی کو الفاظ سے وہی تعلق ہے جو روح کو جسم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر شعر میں معانی بلند اور الفاظ کی کمی ہو تو وہ شعر ناقص ہوگا۔ اور اسے پست کہا جائے گا۔ اور اس کی مثال اس جسم کی ہوگی جس کے تمام اعضا پورے نہ ہوں۔ اگر معانی میں افلاس ہوگا تو اس افلاس میں الفاظ کا زیادہ حصہ ہوگا۔ اور معانی میں افلاس عموماً الفاظ کی کمی ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور اگر معانی بالکل غائب ہوں اور اس کی غیبوبت دوسرے الفاظ کو بھی بگاڑ دے تو پھر اس کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں اور وہ شعر بھی پست کہا جائے گا۔ اگرچہ وہ سننے میں کتنا ہی بھلا کیوں نہ

---

۱۳ عبدالعزیز میمن : ابن رشیق (عربی)، ص ۷۶

۱۴ ابن خلدون : مقدمہ ابن خلدون ص ۵۷۴ (مکتبہ تجاریہ مصر)

۱۵ جرجی زیدان : تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۲۸۸

۱۶ ابن رشیق : کتاب العمدہ ص ۱

ہو۔ جس طرح بظاہر ایک مردہ آدمی کے جسم میں کوئی فرق نہیں آتا مگر اس سے نہ تو کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے نہ وہ خود ہی کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر شعر میں الفاظ کی بالکل کمی ہو تو معانی درست نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ روح بغیر جسم کے نہیں پائی جاتی۔"[۱۷]

شعر کی حسن کاری پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

"مجھے سب سے زیادہ یہ پسند ہے کہ شعر حسن اور سادگی کا جامع ہو۔ وہ کوئی وقتی اور ہنگامی چیز نہ ہو غریب، ثقیل اور وحشی الفاظ کا استعمال نہ کیا جائے۔ دقت مضمون آفرینی اور آورد سے پاک ہو۔ مشہور امثال، موزوں تشبیہیں اور دل نشیں استعارے اپنے دامن میں لیے ہوئے ہو۔ لیکن تولید اور رقت کا یہ مفہوم نہیں کہ کلام پست، بے مزہ، پھیکا اور بازاری ہو۔ اسی طرح فصاحت، جزالت اور درشتی ناہمواری، غرابت اور گنوارپن سے مختلف چیز ہے۔ وہ ان دونوں کے درمیان ایک اعتدالی حالت کا نام ہے۔"[۱۸]

اور اب شبلی کے تنقیدی نظریات کا جلوہ دیکھیں۔ انھوں نے شعر العجم میں صاف صاف اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ شاعری میں الفاظ کی اہمیت خیال سے کہیں زیادہ ہے۔ اس سلسلہ میں وہ ابن رشیق کی مذکورۃ الصدر رائے کو نقل کرنے کے بعد کہ "لفظ جسم ہے اور مضمون روح، دونوں کا ارتباط باہم ایسا ہے جیسے روح اور جسم کا ارتباط۔" شبلی نے اہل فن کے دو گروہوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک الفاظ کو ترجیح دیتا ہے اور دوسرا مضمون کو۔ لیکن اکثر کا مذہب یہی ہے کہ الفاظ مضمون سے زیادہ اہم ہیں۔ اور آخر میں شبلی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

"شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے... گلستان میں جو مضامین اور خیالات ہیں ایسے اچھوتے اور نادر نہیں۔ لیکن الفاظ کی فصاحت، ترتیب اور تناسب نے اس میں سحر پیدا کر دیا ہے۔"[۱۹]

اپنی عملی تنقید میں بھی شبلی شاعری میں الفاظ اور صوری پہلو کو اہمیت دے کر زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش

۱۷؎ ابن رشیق قیروانی، کتاب العمدۃ ص ۱۰۳ (قاہرہ ۱۹۳۴ء)

۱۸؎ ایضاً ص ۷۵

۱۹؎ شبلی نعمانی، شعر العجم ج ۴ ص ۶۸

کرتے ہیں۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ شبلی نے جدت ادا، تشبیہ، استعارہ اور سادگی وغیرہ پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کی طرف زیادہ توجہ کی جائے۔ بقول عبادت بریلوی "اس طرح کی بحثوں سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کا بنیادی مزاج مشرقی تھا اسی باعث وہ ان مشرقی اصطلاحات تنقید پر بہت زور دیتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ مبالغہ آرائی اور لایعنی باتوں کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک اس مشرقیت کے باوجود واقعیت اور سادگی شاعری کے لیے ضروری ہیں۔ ان خیالات میں وہ حالی سے معانقہ کرتے نظر آتے ہیں۔"[۲۰]

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ شبلی کے یہ تنقیدی افکار ابن رشیق ہی کے مذکورۃ الصدر خیالات کی صدائے بازگشت ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شبلی کی پوری تنقید نگاری پر ابن رشیق اور کتاب العمدہ کے گہرے نقوش مرتسم ہیں۔ جدید اردو تنقید میں مغربی ادب کے میلانات کی جو زبردست لہر اس وقت تک آچکی تھی، اقتضائے عصر کے مطابق اس سے انھوں نے استفادہ ضرور کیا لیکن اپنے قلب و ذہن کو ابن رشیق اور کتاب العمدہ کے گہرے اثرات سے کلی طور پر آزاد نہ کر سکے۔ رہ رہ کر ان کا تنقیدی شعور اسی مشرقی انداز تنقید کا علَم بلند کرنے لگتا ہے۔ غالباً اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ

"شبلی کی تنقید میں مشرقی انداز تنقید کا رنگ گہرا ہے۔ وہ نقاد سے زیادہ معانی و بیان کے عالم نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے موضوع کی سماجی اہمیت کی طرف توجہ نہیں کرتے بس الفاظ کے صحیح استعمال، ان کی شیرینی، ان کی سادگی، جدت ادا اور اسلوب کی دلآویزی کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ بہرحال وہ مشرقی تنقید کے علمبردار ہیں۔"[۲۱]

پروفیسر کلیم الدین احمد نے بھی اسی وجہ سے لکھا ہے کہ:

"شبلی کا زاویہ نظر، شبلی کی تنقید کا ساز و سامان، شبلی کا طرز ادا، ان چیزوں میں قدیم تنقید کی صاف کارفرمائی ہے۔ نئی تنقید کے اصول، نئی تنقید کا زاویہ نظر، نئی تنقید کی ٹیکنک یہ سب چیزیں کہیں نہیں ملتیں۔"[۲۲]

۲۰۔ عبادت بریلوی: "شبلی کی تنقید نگاری" (مضمون) مشمولہ ادیب علی گڑھ شبلی نمبر، ص ۲۰۹
۲۱۔ عبادت بریلوی: اردو تنقید کا ارتقا ص ۱۸۵ ۲۲۔ حوالہ اگلے صفحہ پر

ڈاکٹر احسن فاروقی نے موازنۂ انیس و دبیر پر ناقدانہ تبصرہ کرتے ہوئے شبلی کے تنقیدی شعور پر کلیم الدین احمد کے انداز کی تیز و تند تنقید کی ہے[۲۲]۔ مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ :

"شبلی محمد حسین آزاد سے زیادہ تنقید نگار کہلانے کے مستحق ہیں۔ اور حالی کو چھوڑ کر اب تک کوئی اردو کا نقاد ایسا نہیں نظر آتا جس کو ان سے بہتر کہا جا سکے۔ تنقید کے موجدوں میں حالی کے بعد ان کا نام ہمیشہ لیا جاتا رہے گا۔ اور موازنۂ انیس و دبیر کی اہمیت مقدمہ شعر و شاعری کے بعد سب سے زیادہ رہے گی[۲۳]۔"

اردو تنقید میں شبلی کی ایک اور امتیازی خصوصیت قابلِ ذکر ہے، جس کا تتبع دبستانِ شبلی کے تمام نقادوں نے کیا ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے انیس اور فردوسی پر جو نہایت مفصل اور مبسوط تنقیدیں لکھی ہیں ان میں انھوں نے ان کی شاعری کا جائزہ ایک خاص انداز سے لیا ہے۔ یعنی مختلف عنوانات مثلاً نظامِ حکومت، فصاحت، بلاغت، تہذیب و تمدن، حکمت و موعظت اور اخلاق و سیاست وغیرہ قائم کر کے ان کے تحت تفصیلی ریویو قلم بند کیا ہے[۲۵]۔ عنوانات قائم کر کے تنقیدیں لکھنے کا رواج اس کے بعد عرصہ تک عام رہا ہے۔ اس سے شبلی کے تنقیدی لٹریچر کے دوررس اور پایندہ اثرات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

جدید اردو تنقید میں شبلی کے امتیازِ خاص کا اتباع بہت سے ذوق شناسانِ ادب نے کیا۔ اور اس کے نتیجہ میں مشرقی تنقید کا ایک مستقل دبستان وجود میں آگیا جس کے امام شبلی ہیں۔ مشرقی ادب کا اپنا مزاج ہے۔ مشرق کی اپنی تہذیب اور اقدارِ حیات ہیں۔ لیکن انھیں ابھی تک منضبط تنقیدی اصول کی شکل نہیں دی جا سکی ہے۔ شبلی کے یہاں اس کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ گو انھیں شعوری طور پر مرتب کرنے کا رجحان ان کے یہاں بھی نظر نہیں آتا۔ مگر اس کے باوجود بقول ابن فرید :

"اگر حالی جدید تنقید کے امام ہیں تو شبلی جدید مشرقی تنقید کے امام ہیں[۲۶]۔" (باقی آئندہ)

---

[۲۲] کلیم الدین احمد : اردو تنقید پر ایک نظر (اشاعت سوم) ص ۱۱۷

[۲۳] ڈاکٹر احسن فاروقی : اردو میں تنقید ص ۱۱۹

[۲۴] احسن فاروقی، اردو میں تنقید ص ۱۲۲

[۲۵] عبدالشکور : تنقیدی سرمایہ ص ۷۵

[۲۶] ابن فرید : "اردو تنقید کی تاریخ" (مضمون) مطبوعہ ادیب علی گڑھ (جون ۶۱ء) ص ۱۰

مرزا سعید الظفر چغتائی

اثر لکھنوی

نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا نام بچپن ہی سے سنتے آئے تھے۔ مارچ ۱۹۵۲ء میں میرا ہائی اسکول کا امتحان شروع ہونے سے چند روز پہلے فارسیس اسکول فیض آباد میں ایک بڑا مشاعرہ منعقد ہوا تو لوگ افسوس کرتے رہ گئے کہ آنند نرائن ملا، اثر لکھنوی اور جگر مرادآبادی گورنر جنرل ہاؤس کے مشاعرے میں شریک ہونے کے بعد پاکستان چلے گئے تھے اور ہم انھیں سن نہ سکے۔

جولائی سے میں لکھنؤ آ گیا اور کرسچین کالج میں پڑھنے لگا۔ احتشام صاحب سے چند ہی ماہ بعد بارودخانہ میں ان کے دولت کدہ پر نیاز حاصل ہو گیا۔ اور سرور صاحب سے دو سال بعد یونیورسٹی میں۔ آنند نرائن ملا سے ملاقات آج تک نہ ہوئی۔ ۱۹۵۳ء میں اثر صاحب کو خط لکھ کر باریابی کی اجازت چاہی تو جواب بڑا مایوس کن آیا۔ اب کیا چارہ تھا۔ خاموش ہو گیا۔

افتخار احمد اعظمی کئی برس علی گڑھ رہ کر لکھنؤ واپس آئے تو ۱۹۵۸ء میں ایک دن اثر صاحب کے وہاں ساتھ لے گئے۔ ان دنوں ان کی طبیعت ذرا بحال تھی۔ بڑی کشادہ دلی سے ملے۔ چائے کیا پلائی کہ پوری ضیافت کر ڈالی۔ ہمارے ٹوٹے پھوٹے شعر سنے، اپنے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام سے نوازا۔ پروفیسر نذیر احمد کے بقول طالب علم ندیدہ ہوتا ہے۔ ہم لوگ تقریباً ہر ہفتہ جانے لگے۔ یہیں ایک دن شیخ ممتاز حسین جونپوری سے مع ان کے بسنہ کے ملاقات ہوئی۔ یہیں فنا نظامی کانپوری سے تعارف ہوا۔ وقت اور گزرا۔ افتخار صاحب کا ساتھ چھوٹا، میں تنہا

ڈاکٹر مرزا سعید الظفر چغتائی، ریڈر شعبہ فزکس۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

جاتا رہا۔ چند حاضریوں کے بعد ناشتہ کا تکلف ختم ہوا اور ان کی ادبی و شخصی نوازشیں بڑھتی گئیں۔ جنوری ۱۹۶۳ء میں یورپ روانہ ہونے سے پہلے تک کشمیری محلہ برابر جاتا رہا۔ اور اثر صاحب تکلیف میں ہوئے یا راحت میں ہمیشہ برآمد ہوئے اور گھنٹوں بیٹھے۔ گورکھپور سے خط و کتابت رہی۔ میری بعض نظموں پر اصلاح لکھ لکھ کر بھیجتے اور ناز سے شکایت کرتے، "بیٹے، اب اس بڈھے کو تم گھول کے پی لو!"

اثر صاحب کے بعض خطوں میں بڑا ادبی بانکپن ہے۔ تیکھے تیور، طمطراق، جینے کی آرزو نہ بھی ہو تو لطفِ زندگی کا کیف، صحت سے زیادہ مرض میں! بقولِ غالب ع

بہت سہی غم گیتی شراب کیا کم ہے

اثر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے میں نے زبان سیکھی تھی خاص طور پر مولانا عبدالماجد دریابادی، مولوی نور محمد فیض آبادی، اور اماشنکر چنزو نشی بازل سے۔ لیکن ان میں سے کوئی نہ کہہ سکتا تھا ع مستند ہے مرا فرمایا ہوا۔ یہ اثر صاحب کی شان تھی۔ لفظوں اور فقروں کے باریک معنوی فرقوں پر گفتگو فرماتے رہتے۔ "سرمایۂ زبانِ اردو" اور "نور اللغات" کی کمیاں بیان کرتے اور کہتے۔ "تعجب ہے کہ ان لکھنؤ اور کاکوری میں رہنے والوں کو یہ بات معلوم نہ تھی" گویا کہ ان مصنفوں کو نہ زبان کے بارے میں کسی غلطی یا فروگذاشت کا حق پہنچتا تھا۔ اور نہ ایسی بات کہنے کا جس سے ایک دو نسل بعد اثر صاحب متفق نہ ہوں۔ پھر فرہنگِ اثر شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ "ہدیہ" لکھ کر مجھے انعام دیا۔

"مضامینِ اثر" "چھان بین" اور معارف وغیرہ میں ان کے اور مضامین پڑھ چکا تھا۔ اس لیے ان کے مزاج یا معاصرین سے تعلقات کے بارے میں مجھے کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ دہلی اور لکھنؤ کی زبان کی بابت ان کے اور شوکت سبزواری کے درمیان جو بحث پہلے "معارف" اور پھر "خاور" کے صفحات میں چھڑی اور جسے ختم کرانے کو مولانا عبدالماجد نے مداخلت کی تو لکھا "معاذاللہ یہ اہلِ زبان، کتنے زبان دراز ہو گئے ہیں" اس کا پڑھنا، اپنی تلخ کلامی کے باوجود، ہر زبان کے طالب علموں کے لیے ناگزیر ہے۔ فراق سے ان کا معرکہ ہنوز ختم نہ ہوا تھا۔ لیکن ان صحبتوں میں معاصرین کا ذکر آیا تو کسی بڑی ناگواری کے بغیر، ایک دن فراق صاحب کے قلم سے اپنے بارے

ہیں کوئی تحریر سنائی جو اس مصرع پر ختم ہوئی تھی۔ ع۔ "جا چھوڑ دیا تجھ کو مسلمان سمجھ کر"۔ پھر اپنا جواب پڑھا۔ "خیر۔ آپ نے میری مسلمانی کا خیال تو کیا"!

فراقؔ صاحب کے کسی دوست نے ان کو لکھا کہ فراقؔ کی فلاں کتاب پر مقدمہ لکھ دیں۔ اثرؔ صاحب اس شرط پر تیار ہو گئے کہ فراقؔ اپنے قلم سے درخواست کریں، جو انھوں نے نہیں کی۔ ایک بار کہنے لگے۔ اب میں نے فراقؔ پر تنقید لکھنی بند کر دی ہے۔ اس کا کلام درست ہوتا ہے اور میری اصلاحیں بغیر شکریہ کے اپنا لیتا ہے۔ تنقید سے فائدہ فراقؔ یا اقبالؔ کس عقل مند نے نہیں اٹھایا ہے؟

جگرؔ اور جوشؔ دونوں سے اثرؔ کے تعلقات تھے اور جگرؔ کے الفاظ میں حریفانہ۔ کہتے، جگرؔ صاحب نے شراب چھوڑی تو تمبا کو کثرت سے کھانے لگے۔ مگر ان کی شاعری پر اعتراض کرتے میں نے نہیں سنا۔ بلکہ بعض اشعار کی داد دیتے تھے۔ جیسے ؎ اے محتسب نہ پھینک! مرے محتسب نہ پھینک!! ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے!! فرماتے شعر پڑھ کے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کو شراب سے کتنا لگاؤ ہے، اور محتسب کے عمل سے کتنی تکلیف ہو رہی ہے۔ میرے کرم فرما چودھری عبدالستار خاں بیدلؔ یہ نکتہ نکالتے تھے کہ جگرؔ نے شراب کو بھی ظالم بنا دیا اور محتسب کو بھی۔ بات نکلی تو یاد آیا۔ ایک دن چودھری صاحب میرے ساتھ کشمیری محلہ گئے۔ دوبارہ ملنے گیا تو اثرؔ صاحب کہنے لگے، "پچھلی بار کس دَرْ ھَل کو لے آئے تھے"؟

اثرؔ اور جوشؔ دونوں عزیزؔ لکھنوی کے شاگرد تھے (جن کو حق یا ناحق اکبرؔ الہ آبادی نے شہید جلوۂ رنگیں کہا ہے) اس لیے دونوں میں اوائل عمری سے تعلقات رہے اور چشمک بھی رہی اس کے باوجود اثرؔ صاحب نے مجھے جوشؔ کا کوئی خط نہیں دکھایا۔ حالانکہ مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے ۲۸ خط عنایت فرمائے۔ اثرؔ صاحب کی تہذیب شاید اس کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ذکر خیر بہت رہا۔ اور انھیں دو بزرگوں کے توسط سے میں نے جوشؔ کے بارے میں وہ سب سیکھا، جس کے باعث "پندنامہ جوش" پر مضمون لکھ سکا۔ اور "یادوں کی برات" پڑھی تو اکثر مقامات پر سمجھ میں آگیا کہ کیا کہنا چاہتے ہیں اور کس طرح کہہ رہے ہیں۔

اثرؔ صاحب نے مجھے اپنی ایک نظم سنائی اور کہا: آغاز بڑے غنائی انداز سے ہوا تھا لیکن کچھ

دو رحل کر محسوس ہونے لگا جیسے محبوبہ مر گئی ہو۔ نظم کسی رسالہ کو بھیج دی۔ چھپی تو جوش کا خط آیا:
" میں خودکشی کرنے جا رہا تھا۔ تمہاری نظم پڑھی اور باز رہا"

جوش کی طویل نظم "مناجات" پر اثر نے تنقید لکھی، جس میں منطقی، لسانی اور محاوراتی اعتراضات تھے۔ مضمون "آجکل" کو بھیجا، جس کے ایڈیٹر ان دنوں جوش ہی تھے۔ انھوں نے نہ چھاپا اور اثر تا عمر شاکی رہے۔ مضمون سنایا اور مجھے ہی دے دیا۔ کہیں محفوظ ہوگا۔

پرانے استادوں کے اثر صاحب قائل تھے فارسی میں رومی اور اردو میں میر کے۔ غالب کو بالکل نگر دانتے تھے اور اگر ان کا ذکر آجاتا تو کہتے:۔ "بیٹے تم نے میر نہیں پڑھا"۔ اقبال کا ذکر کم آتا مگر اثر ان کو بین الاقوامی ادب میں اردو کا تنہا نمائندہ قرار دیتے تھے۔ وہ فن کی داد دینے کے لئے فنکار کا مسلمان، شیعہ یا سنی ہونا ضروری نہ سمجھتے تھے، اور نہ شعر کو عقیدہ پر پرکھتے۔ مثنوی سے کہیں زیادہ گرویدہ تھے رومی کے عاشقانہ تغزل کے جو دیوان شمس تبریز میں ملتا ہے۔ رومی کے مداح عرشی رامپوری بھی ہیں اور عبدالماجد دریا آبادی بھی تھے۔ لیکن مولانا ماجد متصوفانہ بالقول حسرت عارفانہ کلام پر سر دھنتے تھے۔ عرشی صاحب اخلاقیات (یا مولوی معنوی کی رعایت سے مولویت) کی داد دیتے ہیں۔ اور اثر صاحب کو عزیز تھے تو ان کے عاشقانہ بلکہ فاسقانہ اشعار۔ ایک دن وہ مست غزل سنائی جس کے مطلع کا مصرع ہے۔ ع " من مستم و تو مستی اکنوں کہ بردخانہ" اور بڑے مزے میں تفسیر کی " عاشق و معشوق میکدے سے پی کے نکلتے ہیں، دونوں لڑکھڑاتے ہوئے۔ معشوق کو اس کے گھر پہنچا کے عاشق کہتا ہے، اب مجھے کون گھر پہنچائے گا، مجھے بھی یہیں پڑا رہنے دے۔"

اثر صاحب کے شعری مذاق اور ذوقِ جمال کی تعمیر میں انگریزی ادبیات کا بڑا ہاتھ تھا۔ انگریزی ادب کے ایک طالب علم کو اپنا مصرع سنایا۔

ع تتلی تتلی سے ہم آغوش ہوئی جاتی ہے۔ اور کہنے لگے:۔ اگر پسند نہ آئے تو سمجھو، تمہیں انگریزی شاعری سے مَس نہیں۔ شفاف جمالیات کے نمونہ کے طور پر اپنا یہ شعر سناتے تھے ؎

کہاں سے لائیے اب اے ہجومِ تشنہ لبی — وہ بوسہ جس میں وفاؤں کا شہد شامل تھا

جس پر، بے اختیار جگر کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

وہ رہے ہم سے دور دور تو کیا   ہم نے بوسے ادا ادا کے لیے !!

کسی عرب شاعر کا یہ تصور بہت خوش ہو کے سناتے کہ محبوب کا سینہ دیکھ کے سمندر کا جھاگ یاد آتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ سٹرک جاؤں۔

اثرؔ صاحب کا انگریزی ادب کا مطالعہ وسیع تھا۔ رومانی شاعروں کی نثر بھی پڑھی تھی۔ لے ہنٹ کے خاص طور پر عاشق تھے۔ تخیل اور نازک بیانی کے لیے اس کا حوالہ دیتے تھے۔ اور اس نے بھی تو انگریزی میں وہ لطیف نثر لکھی ہے۔ جس کا جواب فرانسیسی میں موپاساں اور ژید بھی نہیں دے پائے۔

انھوں نے انگریزی اور انگریزوں کے توسط سے دوسری بہت سی زبانوں کی نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ لیکن ان کی سب سے زیادہ قابل قدر نظمیں میری نظر میں ان کی منظر نگاری سے مختص ہے۔ جہلم کے بہتے پانی میں چاندی کے منظر کا استعارہ ملاحظہ ہو۔ ؏

بلّور بہا جاتا ہے کرنوں کے سہارے ۔ افسوس کہ ان اشعار کی پوری قدر خود اثرؔ صاحب نے بھی نہ کی۔ وہ اپنی غزلوں کے گن گاتے رہے۔ اور اپنے کلام میں ماہرانہ کلام کو سب پر ترجیح دیا کیے

ایک زمانہ میں انھوں نے عنواں دے دے کر اپنے کلام کا انتخاب فرمایا۔ اصل میں مولانا عبدالماجد سے درخواست کی تھی کہ میری غزلوں کا انتخاب کر دیجیے۔ انھوں نے وقت کی کمی کا عذر کیا اور فرمائش کی کہ آپ خود انتخاب فرما کر بھیجیں تو اس کا پڑھنا آسان رہے گا۔ اثرؔ صاحب نے فرمائش پوری کر دی اور نامہ بری میرے سپرد ہوئی۔ لیکن آخر میں اثرؔ صاحب کو محسوس ہوا کہ مولانا نے بعض ان اشعار پر 'ص' نہیں بنایا جو بعض اسباب سے انھیں بہت محبوب تھے۔ مثلاً یہ شعر ؎

پژمردہ ہو کے پھول گرا خاک میں تو کیا ؎ وہ موت ہے حسین جو آئے شباب میں

اثرؔ صاحب کی ایک بھانجی کا انتقال عین عالم جوانی میں ہو گیا تھا اور وہ بستر مرگ پر یہ شعر پڑھا کرتی تھیں۔

ایک اور عقیدہ کا شعر انتخاب میں نہ آیا، جسے سن کے کسی "صاحبِ دل" نے ایک تصویر بنا کر اثرؔ صاحب کو پیش کر دی تھی۔ وہ ایسے انتخاب کو کامل نہ سمجھتے تھے اور نہ ہی مولانا سے معاہدہ شکنی روا رکھ سکتے تھے۔ اس لیے انتخاب شائع نہیں کیا۔ مولانا کے انتخاب در انتخاب والے شعر میرے

پاس نقل رہ گئے ہیں۔ اثر صاحب کی اپنی حسین وجمیل تحریر میں سرخ اور نیلی روشنائی کا اصل انھیں واپس کر دیا تھا۔

رشید احمد صدیقی کے بقول، اونچے درجے کی عاشقانہ شاعری تصوف بن جاتی ہے۔ شاید اسی مناسبت سے اثر صاحب تصوف سے خاصے قریب آگئے تھے۔ اپنے ڈپٹی کلکٹری کے زمانہ میں صفی پور ضلع اناؤ کے ولایت علی شاہ سے برابر ملتے رہتے تھے۔ ایک دن ان سے پوچھا " شیعہ حضرات کا تعلق براہ راست حضرت علی سے ہے اور زیادہ تر صوفی سلسلے بھی انھیں سے شروع ہوتے ہیں۔ پھر ہمارے آپ کے درمیان فرق کیا ہے؟" جواب میں شاہ صاحب اور اثر صاحب کا مکالمہ سنئے: " محبت اچھی ہے کہ نفرت؟" " بھلا کون کہے گا، محبت نہیں نفرت! " " تو پھر جس سے محبت ہے اس کے گن گاتے ہو۔ نفرت میں کیوں وقت گنواتے ہو۔ یہی دونوں کا فرق ہے۔" اثر صاحب یہ گفتگو بار بار دہراتے تھے اور ان کے نیازمندوں میں بہت سے لوگ اس کی گواہی دیں گے۔ اسپنوزا نے عیسائیوں اور یہودیوں میں مصالحت کا یہ فارمولا دیا تھا کہ یہودی حضرت عیسٰی کو برا نہ کہیں اور عیسائی ان کی الوہیت پر اصرار نہ کریں۔ شیعہ سنی مصالحت کے لیے اثر صاحب کی تجویز تھی کہ شیعہ حضرات خلفاء کو برا نہ کہیں اور سنّی انھیں جزوِ ایمان ماننے پر اصرار نہ کریں۔

اثر صاحب میں وہ رواداری اور وسیع المشربی بہ درجہ اتم موجود تھی جو ادیب و شاعر ہونے کے لیے بھی ضروری ہے، اور ایک تعلیم یافتہ، شگفتہ مزاج، مہذّب انسان ہونے کے لیے بھی۔ بعض لوگوں سے فخریہ بیان کرتے تھے کہ ایک دن ان کی لڑکیوں نے آکے ان سے پوچھا۔ " بابا، تبرّا کسے کہتے ہیں؟" مولانا عبدالماجد فرماتے تھے کہ سنجیدہ طور پر تبرّا یہ ہے کہ خود کو آلِ رسول پر ہونے والی مبیّنہ زیادتیوں سے بری قرار دے۔ غلو ہر بات میں برا ہوتا ہے۔

مجھ سے اثر صاحب نے بتایا کہ والدہ کے زمانہ تک گھر پہ " رسم " ہوتی تھی۔ مگر اس موقع پر ملازم سنی عورتوں سے کہہ دیا جاتا تھا، " بی بی، تم ذرا ہٹ جاؤ" تاکہ ان کی دل آزاری نہ ہو۔

یورپ جاتے وقت جنوری ۱۹۶۳ء میں اجازت لینے گیا تو فرمایا " واپسی پر آنا ضرور، زندہ ہوا تو مکان پہ، مر گیا تو قبر پر۔" ساڑھے تین سال بعد چھٹیوں میں آیا تو سخت علیل تھے۔ سلام کہلا دیا، تکلیف ہوتی۔ تین برس اور گذار کے مستقل واپس آیا تو رخصت ہو چکے تھے۔ قبر پہ جانے کا قرض ہنوز باقی ہے

ڈاکٹر مظفر حنفی

تذکرۂ آثار الشعراء

بھوپالی شعرا اور ان شاعروں کے، جو بسلسلۂ ملازمت یا تجارت بھوپال میں مقیم تھے، حالاتِ زندگی اور نمونہ کلام پر مشتمل یہ تذکرہ ۱۳۰۶ھ (مطابق ۱۸۹۰ء) میں سید محمد ممتاز علی المتخلص بہ حافظ نے ترتیب دیا تھا اس وقت کی حکمران ریاست بھوپال، نواب شاہجہاں بیگم کی خواہش کے مطابق منشی فدا علی فارغ نے اس پر نظر ثانی کی تھی اور یہ تذکرہ سرکاری مطبع شاہجہانی میں ۱۳۰۷ھ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تھا۔

تذکرے کے مولف ممتاز علی حافظ کے والد کا نام میر اعجاز علی تھا جو سید محمد غوث گوالیاری کی نسل سے تھے۔ ممتاز علی ۱۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم سعد اللہ خاں متوطن سرونج سے حاصل کی۔ بعد ازاں مفتی محمد عبد اللہ پنجابی سے جغرافیہ، علم ہندسہ اور ہیئت اور مولوی عبد اللہ بلگرامی سے عربی صرف و نحو و حدیث و تفسیر پڑھی۔ فارسی میں مولوی ذو الفقار احمد بھوپالی کے شاگرد رہے اور ہندی مدرسہ میں کچھ ناگری کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔ بچپن میں نواب گوہر بیگم نے میوہ خوری کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ۱۲۹۰ھ میں ریاست بھوپال میں روبکار نویس کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۲۸۷ھ میں طبیعت شعر و شاعری کی طرف مائل ہوئی اور منشی محمد عسکری کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ بعد ازاں ان کی مسلسل علالت کی وجہ سے منشی محمد فدا علی فارغ کی شاگردی اختیار کی اور انھیں سے زیادہ فیضِ سخن حاصل کیا۔ حافظ فارسی اور اردو میں یکساں استعداد رکھتے تھے۔ آثار الشعرا انھوں نے ۳۶ سال کی عمر میں ترتیب دے دی تھی۔

ڈاکٹر مظفر حنفی، لکچرر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

اس کی اشاعت کے وقت ان کے پاس جو دیگر مسودات غیر مطبوعہ موجود تھے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

فیض تازہ   دیوانِ کلام

توجیہ خسروی ـــــ جشن تاج محل سے متعلق مثنوی

غنچۂ مراد ـــــ تاریخ ریاست بھوپال

مرآۃ الخیال ـــــ مجموعۂ مضامین

کیفیت مسافرت ـــــ سفرنامہ ۔

یہ امر تحقیق طلب ہے کہ مندرجہ بالا مسودات یا ان میں سے کچھ کبھی شرمندۂ اشاعت بھی ہو سکے یا نہیں۔ " آثار الشعراء" کا زیر بحث نسخہ مجھے عزیز فاروقی صاحب ساکن سیہور (بھوپال) کی وساطت سے دستیاب ہوا تھا۔ یہ نسخہ ناقص الاول ہے۔ اور کتاب کے ابتدائی دس صفحات ضائع ہو چکے ہیں۔ اصل تذکرہ ۸/۲۲ × ۱۸ سائز کے ۲۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اختتام پر فہرست مضامین کے تحت چھ صفحات اور صحت نامہ کے طور پر چار مزید صفحات شامل ہیں۔ اس طرح مکمل کتاب کل ۲۸۰ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ کاغذ انتہائی شکستہ اور مرورِ ایام سے زرد پڑ چکا ہے حتیٰ کہ ہاتھ لگانے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ کتابت عام طور پر انیس[19] سطری ہے جسکی ہر سطر میں اوسطاً پندرہ الفاظ ہیں، قلم اوسط اور طباعت روشن ہے۔ صفحات پر چہار جانب حاشیہ قائم کیا گیا ہے۔ شاعروں کے ذکر میں یہ التزام برتا گیا ہے کہ ہر نئے شاعر کا بیان اس کے تخلص کے تحت شروع ہوا ہے۔ جسے نسبتاً جلی قلم سے لکھا گیا ہے۔ بہ استثنائے چند، شعراء کے حالاتِ زندگی مرتب کرنے میں بے حد اختصار سے کام لیا گیا ہے اور عام طور پر پانچ پانچ چھ چھ سطروں میں متعلقہ شاعر کے اہم سوانح حیات کا احاطہ کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ بعد ازاں نمونۂ کلام ہے جس میں بخل نہیں برتا گیا اور حتی الامکان شاعر کے نمائندہ کلام کا نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، مذکورہ نسخے کے ابتدائی دس صفحات غائب ہیں لیکن خوش قسمتی سے اس کتاب کی فہرست مضامین آخر میں ترتیب دی گئی ہے۔ اس لیے بہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ ضائع ہونے والے صفحات میں کیا تھا۔ فہرست کے مطابق ان دس صفحات میں " حمد باری تعالیٰ عز اسمہٗ " " نعت رسول خدا "، " سبب تالیف تذکرہ "، " مقدمہ موجد شعر و ایجاد شاعری "، " بیان شعرائے

عرب" اور "بیان شعرائے یونان" شامل تھے۔ موخر الذکر بیان کا بیشتر حصہ جو صفحہ ۱۱ تا ۱۴ پھیلا ہوا ہے، محفوظ ہے، بعد ازاں صفحہ بیش کے نصف تک، جو "بیان شعرائے یورپ"، "بیان شعرائے فارسی" بیان شعرائے ہند" اور "بیان شعرائے اردو" مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ یہ مختصر مختصر سے ادبی جائزے بڑے تشنہ، سرسری اور بعض مقامات پر ناقص ہیں۔ شعرائے اردو کے بیان میں عہدِ ولی سے لے کر مؤلف کے دور تک نمائندہ اور مشہور شعراء کی فہرست ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے جس میں مومن اور شیفتہ وغیرہ کے نام تو شامل ہیں لیکن غالب کو برادری سے باہر رکھا گیا ہے جب کہ مولف کے ہم عصر سخن لوگوں میں غالب کے کئی تلامذہ بھوپال ہی میں موجود تھے۔

تذکرے کے اگلے ۲۰۸ صفحات (ص ۲۰ تا ۲۲۴) میں بھوپالی سخن وروں اور ریاست بھوپال سے کسی طرح کا تعلق رکھنے والے شعراء کے مختصر کوائفِ حیات اور نمونہ کلام پیش کیے گئے ہیں اور ترتیب تخلص میں ردیف کے اعتبار سے قائم کی گئی ہے۔ آخری اڑتیس[۳۸] صفحات میں مختلف شعراء اور نثر نگاروں کی تقاریظ، تہنیتی قطعات اور قطعہ ہائے تاریخ شریکِ اشاعت ہیں جن کے درمیان مولف کی ایک طویل مناجات (ص ۲۵۰ تا ۲۶۶) اور ان کے اپنے قطعات بھی شامل ہیں۔ ان تقریظوں اور قطعات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) تقریظ اور قطعات تاریخ فدا علی فارغ (استاذ مولف) (۲) تقریظ مولانا عباس رفعت۔ (۳) تقریظ منشی عظیم الدین (۴) تقریظ سید شجاعت علی (۵) تقریظ سید عبد القادر (۶) تقریظ معشوق علی خاں جوہر (۷) تقریظ لالہ جادو رائے شمیم (۸) قطعہ تاریخ عنایت اللہ خاں راسخ (۹) قطعہ تاریخ منشی محمد عسکری (۱۰) تقریظ عزیز اللہ خاں (۱۱) تقریظ عزیز اللہ خاں (۱۲) قطعہ مظفر حسین صبا (۱۳) قطعہ قادر علی خاں قادر (۱۴) تقریظ ام الحامد پروین

بعد ازاں وہ دو ضمیمے ہیں جن کے تحت فہرست مضامین اور صحت نامہ ترتیب دیا گیا ہے۔ چونکہ یہ تذکرہ بہ اعتبار تخلص ردیف وار ترتیب دیا گیا ہے اس لیے اس میں متعلقہ شاعر کے ادبی مرتبے کے اعتبار سے تقدیم و تاخیر یا زمانی ترتیب کی گنجائش نہیں تھی البتہ اہم شعراء کے سلسلے میں مولف نے یہ رعایت ضرور روا رکھی ہے کہ ان کے حالات میں قدرے تفصیل سے کام لیا ہے اور جن سخن وروں کو اس کی نگاہ میں زیادہ وقعت حاصل تھی ان کا نمونۂ کلام اسی مناسبت سے

زیادہ پیش کیا گیا ہے۔

ردیف الف کے تحت منشی احمد علی احمد (بوہرہ)، یمین الدین احمد (متوطن رام پور) سید ابو احمد (وطن امروہہ، ولادت: ۱۲۴۹ھ تلمیذ عباس رفعت)، امجد علی آزاد (متوطن ہردوئی، شاگرد احسن بلگرامی، ولادت: ۱۲۶۴ھ)، سید اسد علی اسد (تلمیذ حاتم علی مہر و امداد حسین صغیر)، سید امجد علی اشہری (تخلص ثانی: امجد)، سید اصغر علی اصغر (متوطن گوالیار، مصنف مثنوی "گلزار و گلرو" و "نعمت عشق")، اکرام حیدر اکرام (متوطن بجنور، تلمیذ فدا علی فارغ) اور امداد علی امداد (متوطن خیرآباد، متوفی ۱۲۸۵ھ) کے حالات درج کیے گئے ہیں۔ نمونے کے طور پر ان میں سے اردو میں کہنے والوں کے ایک ایک شعر حاضر ہیں:

چمن دہر میں اک ہم رہے محروم وصال
ورنہ ہر شاخ کا ہوتا ہے شجر سے پیوند (احمد علی احمد)

ڈھلا ہے سانچے میں نخل قامت، کرشمہ و ناز ہے قیامت
بہار پر ہے گل جوانی، بلا کا جوبن ٹپک رہا ہے (سید ابو احمد)

نہ نیند آتی ہے شب کو نہ چین ہے دن کو
بھری ہے کیسی مری چشم انتظار میں آگ (امجد علی آزاد)

یا رب ہوائے وصل کی تدبیر کیا کروں
اغیار ہیں شریر، مرا گلعذار شوخ (اسد علی اسد)

یہاں یوں بے حجابانہ چلے آتے ہو رندوں میں
وہاں حدّ ادب لکھا ہے دروازہ کی چلمن پر (امجد علی اشہری)

ترے کاکل کا سودائی ہے اکرام
رہا ہو وہ نہ اس کالی بلا سے (اکرام حیدر اکرام)

ردیف بائے موحدہ میں صرف شریف حسین باذل (متوطن فرخ آباد) کو جگہ ملی ہے:

میں وہ خوابیدہ ہوں غوغائے قیامت نے مجھے
آکے سو بار اٹھایا پہ اٹھایا نہ گیا (شریف حسین باذل)

ردیف تا کی ابتداء نواب صدیق حسن خاں توفیقؔ سے کی گئی ہے اور ان کے حالات بالتفصیل درج کیے گئے ہیں (ولادت ۱۲۴۸ھ، تقریباً ڈیڑھ سو کتابوں کے مصنف) ان کے ساتھ فرماں روائے بھوپال نواب سکندر جہاں بیگم نے عقدِ ثانی کیا تھا۔

کیا پُرخطر ہے دشتِ محبت قدم قدم
دل میرے آس پاس ہے بیں ڈل کے آس پاس (صدیق حسن توفیقؔ)

ان کے علاوہ اس ردیف کے تحت منشی عبد العلی تونگرؔ (فرزند و شاگرد عبد الواحد خاں سکینؔ، متوفی ۱۲۹۹ھ) کو جگہ ملی ہے جس کا ایک مطلع ہے:

دیکھیے ہر دم نہ اپنا روئے روشن آب میں
ہو جیے ہر دم نہ صاحب آتش افگن آب میں (عبد العلی تونگرؔ)

ردیف 'ث' میں صرف سید محمود علی ثروتؔ کا ذکر کیا گیا ہے (ولادت ۱۲۸۰ھ تلمیذ ممتاز علی حافظؔ مولف تذکرہ ہذا) نمونہ کلام:

ایک ثروت ہی نہیں طالبِ دیدار ترا
سارے عالم کو ترا محوِ تمنا دیکھا (محمود علی ثروتؔ)

اسی طرح ردیف 'جیم' میں صرف جمیل احمد جمیلؔ کو جگہ ملی ہے جن کا وطن سہسوان تھا۔ اور محمد خاں شہید کے شاگرد تھے۔ موصوف اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ نمونۂ کلام اردو ملاحظہ ہو:

اے جذبِ عشق بات نہ جائے شبِ فراق
ایسا نہ ہو ہم آہ کریں اور اثر نہ ہو! (جمیل احمد جمیلؔ)

ردیف 'حا' کے ذیل میں مولفِ تذکرہ ممتاز علی حافظؔ کے علاوہ، جن کے حالات ابتدا میں بیان کیے جا چکے ہیں، حکیم الدین حکیمؔ کو جگہ ملی۔ مولف نے اپنے بیان میں از حد تفصیل سے کام لیا ہے۔ اور اپنے کلام کا بیش از بیش حصہ تذکرہ میں شامل کر دیا ہے۔ ان کی شاعری قدیم روایات کی پاسدار ہے اور پختہ کلامی کی شاہد ہے لیکن سوز و تاثیر سے عاری ہے۔ بطورِ نمونہ ایک شعر پیش ہے:

اک لمحہ میں دیوانہ ہے اک لحظہ میں ہشیار
ہے سخت تعجب کہ مرے دل کو ہوا کیا (ممتاز علی حافظؔ)

حکیم الدین حکیم سے متعلق ورق (۱۰۰/۹۹) چونکہ نسخے میں شامل نہیں ہے اس لیے ان کا شعر درج کرنے سے معذور ہوں۔

ردیف 'خا' میں صرف فخرالدین خیالی (ولادت ۱۲۵۶ھ، تلمیذ امیراللہ تسلیم، مصنف نثر خیالی) کا بیان شامل ہے، یہ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے:

ہوائے تیرہ بختی نے اڑایا واں سے بھی مجھ کو
رہا پھولوں میں جو نکہت کی صورت میں نہاں ہو کر (فخرالدین خیالی)

نواب جہانگیر محمد خاں دولہ (ولادت: ۱۲۳۴ھ، نواب سکندر جہاں بیگم والی بھوپال کے شوہر، صاحب دیوانِ اردو، متوفی ۱۲۶۰ھ)، منشی شنکر پرشاد دآس (متوطن گوپا مئو، مصنف نبین مال داس) کو ردیف 'دال' میں جگہ ملی ہے ان میں سے موخرالذکر کی صرف نثر اور ہندی کلام کے نمونے تذکرے میں درج کیے گئے ہیں۔ نواب دولہ کا ایک شعر بطور نمونہ پیش ہے:

قمر کی طرح کب منت کش خورشید انجم ہیں
نہیں لیتے ہیں عالی طبع ہرگز بار احسان کا (جہانگیر محمد خاں دولہ)

ردیف 'ذال' میں صرف سید علی اعظم ذکی (تخلص ثانی ربط، ولادت ۱۲۸۵ھ، شاگردِ مولف) کے حالات بیان کیے گئے ہیں جو فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، اردو کا ایک شعر ہے:

دل تو کبھی تھم جاتا ہے تھامے سے ولیکن
طوفان بپا کرتا ہے یہ دیدۂ تر روز (علی اعظم ذکی)

عنایت محمد خاں راسخ (متوطن رام پور، شاگرد اسمٰعیل حسین منیر اور احمد علی رسا، فارسی میں کہتے تھے)، محمد رسول (مصنف تشریح الحروف)، مولانا محمد عباس رفعت (متوطن بنارس۔ تلمیذ اسداللہ خاں غالب دہلوی، مصاحب خاص نواب جہانگیر محمد خاں دولہ مہتمم تعمیر جامع مسجد بھوپال، ناظم محکمہ تنظیمات شاہجہانی، مصنف قیصر نامہ، مثنوی دل افروز، تقریباً چالیس کتب کے مصنف)، مولوی عبدالرقیب (متوطن قصبہ باڑی، بھوپال) حبیب احمد رویت (متوفی ۱۲۶۲ھ، فارسی کے شاعر) کے نام ردیف 'را' میں درج ہیں۔ ان شعرا کا نمونہ کلام حسب ذیل ہے، رفعت کی فارسی مثنوی بطور نمونہ تذکرے میں درج ہے۔ اس لیے ان کا شعر اپنی جانب سے پیش کرتا ہوں:

شرم کی دولت، گمانِ عشق مجھ پر ہو گیا
بات الٹی ہے حیا نے کر دیا رسوا مجھے (عنایت محمد خاں راسخ)

لاغر ایسا فراسش پر مجھ کو
جس نے دیکھا، گماں ہوا شل کا (رسول)

پہرہ ہے رقیبوں کا چھپر کھٹ کے برابر
دس بیس یقیں ہیں گے یہاں کٹ کے برابر (عباس رفعت)

ہو بہار باغ ہستی کیوں نہ ہم رنگِ خزاں
آمد و شد ہے نفس کی بادِ صرصر کا جواب (رقیب)

ردیف 'زا' میں محمد محی الدین زور (۱۲۸۵ھ سال ولادت) کا بیان ہے

متبدل ہوگا جب اس کے کرم سے بخت برگشتہ
تو مثل دوست ہر دشمن بھی اپنا مہرباں ہوگا (محی الدین زور)

امداد علی ساجد (متوطن گوپامئو، تلمیذ قلق لکھنوی)، افضل میر خاں سراج (رئیس بھوپال)، علی حسن خاں سلیم (صاحبزادہ نواب صدیق حسن خاں، سال ولادت ۱۲۸۳ھ، چھ سات کتابوں کے مولف و مصنف)، سید اعظم حسین سلیم (متوطن سندیلہ، فارسی میں بھی کہتے تھے) عبد العطوف عرف محمد تقی خاں سنجر (متوطن قزوین ایران، شاعر دربار، صرف فارسی میں قصیدے کہے) سید فرید الدین سبیل (متوطن گوالیار، متوفی ۱۲۸۹ھ، صرف فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے) منشی جگل کشور سیراب (وطن مین پوری، شاگرد معین الدین احمد رامپوری، مصنف مثنوی پری پروانہ) کا ذکر ردیف 'سین' کے ذیل میں کیا گیا ہے۔

نہ پہنچا گرچہ ساجد زندگی میں، یوں تو پہنچوں گا
بگولہ ہوں گا میں بعدِ فنا یثرب کے میداں کا (امداد علی ساجد)

سوز و گداز، آہ و بکا، نالہ درد و یاس
سب کچھ ہیں فیضِ عشق سے لیکن اثر نہیں (افضل میر خاں سراج)

عمر یوں کاٹی کسی کی یاد میں : شام نالہ میں، سحر فریاد میں (علی حسن خاں سلیم)

خاکسارانِ جہاں کے وہ قدم لیتے ہیں
سربلندوں کا نہ لیتے تھے جو نخوت سے سلام — (سید اعظم حسین تسلیم)

آتی ہے اجل اور نہ دوا کرتی ہے تاثیر
مجھ سا بھی جہاں میں کوئی رنجور نہ ہوگا — (جگل کشور سیراب)

ردیف 'شین' کا آغاز نواب شاہجہاں بیگم (والی ریاست بھوپال، ولادت ۱۲۵۴ھ، فارسی میں شاہجہاں اور اردو میں پہلے شیریں پھر تاجور تخلص اختیار کیا) کے نام نامی سے ہوا علاوہ ازیں اس کے ذیل میں عبدالمجید خاں شاداب (اکثر فارسی میں کہتے تھے) سید شجاعت علی شجاعت بھوپال، جادو رائے شمیم بھوپالی (مصنف گلشن شمیم اور چمن شمیم، ہندی میں جادو بیا تخلص کرتے تھے) یار محمد خاں شوکت (ولادت ۱۲۴۹ھ، پہلے اسداللہ خاں غالب دہلوی بعد ازاں محمد عباس رفعت سے سلسلہ تلمذ رہا، مصنف دیوان شوکت۔ تذکرہ فرح بخش وغیرہ، نصیر احمد خاں شوق، (تلمیذ نواب مرزا داغ دہلوی)، حافظ خان محمد خاں شہیر (شاگرد اسداللہ غالب، شعرائے دربار میں سے تھے، افتخار الشعراء کا خطاب پایا۔) کے بیانات بھی شامل ہیں :-

واہ وا، کیا ہی نیا یہ آپ کا چالا ہوا
دل ہمارا لے لیا اک عمر کا پالا ہوا — (شاہجہاں بیگم شیریں)

تری مہر و عطا سے مرے شہ دیں
میسر راحت ہر دو جہاں ہو — (شجاعت علی شجاعت)

خیال عارض رنگیں سے دل کو کیوں نہ فرحت ہو
ہوا کرتا ہے غم انساں کا زائل گلستانوں میں — (جادو رائے شمیم)

کوئی تدبیر سے آزاد نہ دیکھا ہم نے
جس کو ڈھونڈا وہ گرفتار مقدر نکلا — (یار محمد خاں شوکت)

دل ہوا خوں تو جگر ہو گیا پانی پانی
جاری آنکھوں سے ہوئے لعل و گہر دونوں ساتھ — (نصیر احمد خاں شوق)

پوچھو نہ اہل عشق کو کیا ہیں، کہاں کے ہیں
جیسے آپ جس طرح کے، بس ہو بس، جہاں کے ہیں — (خان محمد خاں شہیر)

مظفر حسین صبا (متوطن گوپامئو، تلمیذ محمد احسن بلگرامی) اور لالہ بشن پرشاد صہبا (متوطن ٹونک، تلمیذ اعجاز سہسوانی) کا تذکرہ ردیف 'صاد' کے تحت قلم بند کیا گیا ہے :

شراب ناب بھی ہے یارِ مہ لقا بھی ہے
کہو تو شیخ کہ جنت میں یہ مزا بھی ہے (مظفر حسین صبا)

ظلم خود ظالم کو ہوتا ہے عذابِ باطنی
پیٹ انگاروں سے بھرتا ہے خدا گل گیر کا (بشن پرساد صہبا)

'ضاد' ردیف میں سید محمود حسین ضبط (ولادت ۱۲۸۷ھ، شاگرد ممتاز علی حافظ) واحد شاعر ہیں، ان کا شعر ہے :

سب غزالِ دشت کہتے ہیں مرا افسانہ آج
چشم مستِ شوخ کا جو میں ہو دیوانہ آج (محمود حسین ضبط)

ردیف 'طا' میں بھی ایک ہی شاعر سید عنایت حسین طالب نے جگہ پائی ہے (وطن بگرگر تلمیذ فدا علی فارغ)

طالب کو تشنہ کامی محشر کا غم نہیں
جاتا ہے مُہرِ ساقیِ کوثر لیے ہوئے (عنایت حسین طالب)

ردیف 'ظا' میں بھی ایک ہی شاعر کا بیان ملتا ہے جو ہیں امتیاز علی ظاہر (ولادت ۱۲۷۵ھ برادر مولف تذکرہ)، نمونۂ کلام یہ ہے :

وہ منہ سے نہ بولے، نہ ادھر آنکھ اٹھائی
دربار میں ہم ان کے جو آئے تو ہوا کیا (امتیاز علی ظاہر)

عاقل محمد خاں عاقل (تلمیذ عزیز بھوپالی) سید عبد العلی خاں (فارسی گو)، یوسف عرف دلارے صاحب عاشق (فرزند کپتان ماتوک فرانسیسی، فارسی میں بھی شعر کہتے تھے) محمد عبد العزیز صاحب عزیز (متوطن بھوپال، تلمیذ محمد خاں شہیر)، عزیز اللہ خاں عزیز (تلمیذ عبد اللہ بھوپالی، مصنف نعت عزیز)، معشوق علی خاں جوہر (تلمیذ اسد اللہ خاں غالب دہلوی، ان کا ذکر اس ردیف میں شاید سہواً شامل ہوگیا)، عبد العزیز خاں عزیز بھوپالی (تلمیذ عزیز اللہ خاں عزیز، متوفی ۱۳۰۵ھ

محمد عسکری صاحب عسکری (متوطن دہلی، تلمیذ غلام ضامن کرم و فدا علی فارغ، صاحب دیوان) کے
حالات ردیف 'عین' کے ذیل میں درج کیے گئے ہیں۔ نمونۂ کلام:

خود وہ آجاتے ہیں عاقل از رہِ لطف و عطا
بر سرِ یاری مگر اپنا مقدّر ہو گیا (عاقل محمد عاقل)

خاکِ لیلیٰ بھی بگولوں پر اڑتی پھرتی ہے
نجد میں صورتِ محمل کبھی ایسی تو نہ تھی (یوسف صاحب عاشق)

خضر نے پہنچا دیا کوئے صنم تک اے عزیز
آج سے ہم نے بھی ان کا نام رہبر رکھ دیا (عبدالعزیز صاحب عزیز)

پاؤں وحشت نے نکالے جل گئے دشتِ جنوں
اب ٹھکانہ کچھ نہیں جز دامنِ صحرا مجھے (عزیز اللہ خاں عزیز)

استخواں کیا خاک تک باقی نہیں ہے دہر میں
آسیائے چرخ نے اس طرح پیسا ہے مجھے (معشوق علی خاں جوہر)

اس قدر خواہانِ دنیا کیوں ہوا ہے اے عزیز
کچھ خیالِ آخرت تجھ کو بھی ناداں چاہیئے (عبدالعزیز خاں عزیز بھوپالی)

دور مدفن سے ہے گزرا شہسوارِ نازنین
وائے قسمت ہم بنے ہیں سبزۂ بیگانہ آج (محمد عسکری)

محمد نجف علی خاں غیور (متوطن پشاور، ولادت ۱۲۷۱ھ، شاگردِ مولّف آثارالشعراء) کا حال
ردیف 'غین' میں بیان ہوا ہے:

سرو دربارِ غم عالم سے بھلا مسرور کیا ہوویں
کہ ہجرِ یار کا سینہ پہ اپنے رنج چھایا ہے (نجف علی غیور)

'فا' ردیف میں سب سے پہلے بڑی تفصیل کے ساتھ بمع وافر نمونہ کلام نظم و نثر فارسی منشی
فدا علی فارغ (استاذِ مولف، ماہرِ فنِ تاریخ گوئی، مصنف کارنامہ شاہجہانی) اور بعدازاں منشی
سوہن لعل فروغ (متوطن بدایوں) کے حالات مندرج ہیں:

وہ مکدر نہیں ہوتے جو ازل سے ہیں صاف
کس نے رنگِ آئینۂ مہر فلک پر دیکھا (سوہن لعل فروغ)

(قاف' کے ردیف میں سید قادر بخش قادر (متوطن بھوپال، فارسی گو) عبدالقادر صاحب قادر اور قدرت علی قدرت کا تذکرہ ہے۔

رخِ یار نے آتشِ رشک سے
جلائے بہارِ گلستاں کے پر (عبدالقادر)

دریا دلی سے ابر بہاری کی آج کل
قطرہ کو رتبۂ گہر آب دار ہے (قدرت علی قدرت)

ردیف 'کاف' کے ذیل میں عبدالقیوم کاتب (تلمیذ اعظم حسین سلیم) غلام ضامن کرم (تلمیذ لطف علی خاں لطف دہلوی، متوفی ۱۲۶۵ھ)، نورالحسن خاں کلیم (ولادت ۱۲۷۸ھ صاحبزادہ نواب صدیق حسن خاں، کئی کتابوں کے مصنف، فارسی اور عربی میں تخلص نور) اور منشی فدا علی کرم (جن کے حالات فارغ تخلص کے تحت ردیف 'فا' میں بھی درج ہیں) وقیع الدین گلچیں (متوطن دہلی تلمیذ اعظم دہلوی، مصنف فارسی مثنوی جشن تاج محل)، جمال الدین گمنام (موطن کوتانہ، متوفی ۱۲۹۹ھ) کے احوال مذکور ہیں:

تصور روز و شب رہتا ہے دل میں روئے روشن کا
خوشا کاتب کہ تم نے بھی پری شیشہ میں پالی ہے (عبدالقیوم کاتب)

کہیں ہیں دیکھ کے میری غزل کے شعر بلند
اسی زمین سے ہوتا ہے آسماں پیدا (غلام ضامن کرم)

یہی وسیلہ ہے ہم سے سیاہ کاروں کا
بس ایک سلسلۂ زلف یار رکھتے ہیں (نورالحسن کلیم)

زر کے بدلے میں اگر حسن کا سودا ہوتا
نقدِ جاں بیچ کے ہم وصل کا ساماں کرتے (وقیع الدین گلچیں)

روز عکس رخ ہے اس کا، شب ہے سایہ زلف کا
لعلِ لب کی چھوٹ ہے گویا زمیں پر چاندنی (جمال الدین گمنام)

سید اسد علی ببیبؔ (ولادت ۱۲۸۵ھ تلمیذ ممتاز علی حافظؔ) واحد شاعر ہیں جنھیں ردیف 'لام' میں جگہ ملی ہے :

کون مانع تھا عیادت کو دم نزع بھلا
اس بہانے سے مگر تم نے نہ آکر دیکھا (اسد علی ببیبؔ)

ردیف 'میم' میں محمد عباس رفعتؔ کا تذکرہ، جن کا ذکر ردیف 'را' میں کیا جا چکا تھا، دوبارہ تخلص محتشمؔ کے تحت کیا گیا ہے اور نمونہ میں پھر محض فارسی کلام درج کیا گیا ہے بعد ازاں ابوالحسن محترمؔ (فرزند عباس رفعت)، عبدالمجید محوؔ (نبیرہ عباس رفعت)، مردان علی مرداںؔ (صوفی بزرگ اور مولف کے تایا)، عبدالواحد مسکینؔ (متوطن اکبرآباد، متوفی ۱۲۷۱ھ، مصنف دیوان مسکینؔ، مثنوی چشمہ شیریں فارسی)، نبی خاں معجزؔ (متوطن رامپور، تلمیذ داغؔ دہلوی)، گوپی ناتھ سہائے مفتونؔ (متوطن مین پوری) مقصود علی خاں مقصودؔ (متوطن شاہجہاں پور، ماہر فن عروض) اور منشی ارشاد احمد میکشؔ (تلمیذ اسد اللہ غالبؔ دہلوی) کے حالات اور اشعار درج ہیں :۔

یوں نہ جانو کہ میں سید ہوں، بہشتی ہوں گا
گر عمل بد ہیں تو دوزخ ہی ٹھکانا ہوگا ! (مردان علی مرداںؔ)

منظور ہے کہ ٹھوکریں کھائے نگاہ بھی
روزن میں در کی کون تھی پتھر کی احتیاج (نبی خاں معجزؔ)

بیٹھا جو نقش پا کی طرح کوئے یار میں
اٹھنا محال ہوگیا بس انتظار میں (گوپی ناتھ مفتونؔ)

عشق کو اپنے برملا کر کے
گھر بگاڑا اپنا بنا کر کے (مقصود علی مقصودؔ)

میں تو میں، قاتل کے وہ انداز ہیں
بوالہوس رکھ دے گلا شمشیر پر (ارشاد احمد میکشؔ)

مندرجہ ذیل شعراء کو ردیف 'نون' میں شامل کیا گیا ہے :۔

سید عبدالقادر ناظمؔ (تلمیذ صابر حسین صباؔ)، ناظم علی ناظمؔ (تلمیذ فدا علی فارغؔ)، احمد حسین نافذؔ (متوطن

لکھنؤ، ولادت ۱۲۶۸ھ تلمیذ منشی امیر احمد ساکن رامپور)، بلدیو سنگھ نامیؔ (متوطن دہلی، متوفی ۱۳۰۱ھ تلمیذ امام بخش صہبائی، صرف فارسی میں شعر کہتے تھے)، نیاز احمد نامیؔ (تلمیذ مصطفےٰ حسین راسخؔ) عالم گیر محمد خاں نمودؔ (نواب شاہجہاں بیگم کے بھتیجے) سید صدیق حسن خاں نوابؔ (ردیف 'تا' میں ان کا مفصل ذکر تخلص توفیقؔ کے تحت بھی کیا گیا ہے) نور الحسن خاں نورؔ (صاحبزادہ نواب صدیق حسن خاں، جن کا ذکر ردیف 'کاف' میں تخلص کلیمؔ کے تحت بھی کیا گیا ہے)، منشی جھنوہر لعل نوشؔ۔

ضعف کے عالم میں جنبش ہے عدم کی رہنما
مجھ کو کروٹ کا بدلنا بھی سفر ہے دور کا　　(عبدالقادر ناظمؔ)

تعلق مر کے بھی باقی رہا زلفِ پریشاں کا
ملا قسمت سے بہرِ دفن تختہ سنبلستاں کا　　(ناظم علی ناظمؔ)

کیا صفائی ہے ترے ہاتھ کی ماشاء اللہ
ایک ہی وار میں سر تن سے زمیں پر آیا　　(احمد حسین نافذ)

دبا کر خاک کر ڈالا فلک نے اس قدر ہم کو
ہوا پر اڑ نہیں سکتا غبار اپنے بیاباں کا　　(نیاز احمد نامیؔ)

ہے عدم میں بھی مقرر کوئی راحت کا مقام
جو گیا کنجِ لحد میں وہ نہ باہر آیا!　　(عالم گیر محمد نمودؔ)

ردیف 'واؤ' کے شعرا ہیں، سید حسین شاہ واصفؔ (معروف بہ مولوی بخاری، مصنف خلعت الہنود، شاگرد مفتی عنایت احمد، متوفی ۱۲۸۵ھ)، سید واصل علی واصلؔ (ساکن شجاع علی پور) اور عبدالحی وجدؔ (تلمیذ فدا علی فارغؔ) جن میں سے صرف موخر الذکر اردو میں بھی کہتے تھے:

خیالِ شعلۂ رخسارِ جاناں نے کیا کشتہ
تڑپتا ہوں میں جوں سیماب اکثر اپنے مدفن میں　　(عبدالحی وجدؔ)

میر صفدر علی ہاشمیؔ (وطن امروہہ، تلمیذ شیخ ابراہیم ذوقؔ دہلوی، متوفی ۱۳۰۱ھ) کے احوال ردیف 'ہا' میں مذکور ہیں:

مرے گناہ تو مجھ کو ڈبو چکے تھے سب
رکھی ہے اشکِ ندامت نے آبرو باقی　　(صفدر علی ہاشمیؔ)

اور سب کے آخر میں مولوی یوسف علی یوسف (رئیس قصبہ گوپامئو، کئی کتابوں کے مصنف و مؤلف) کے حالات ردیف 'یا' کے ذیل میں درج کیے گئے ہیں :

نہ مانا ہمتِ عالی نے میری دشتِ غربت میں
کرے سایہ مرے سر پر بہت منّت ہما نے کی (یوسف علی یوسف)

یہ تذکرہ "گلستانِ سخن" (قادر بخش صابر اور امام بخش صہبائی) جس میں ایک خاص عہد کے دہلوی شعراء کے حالات اور نمونۂ کلام یکجا کر دیے گئے ہیں، کی قبیل سے ہے اور اواخر انیسویں صدی تک کے ان شاعروں سے متعلق ہے جو بھوپالی تھے یا ریاست بھوپال سے کسی نہج سے متعلق تھے۔ تذکرے میں شعرا کے حالات اور نمونۂ کلام وغیرہ پیش کرنے میں کوئی اصول مدنظر نہیں رکھا گیا ہے، چنانچہ بڑی ناہمواری کا احساس ہوتا ہے۔ اُن شاعروں کے حالات اور نمونۂ کلام پیش کرنے میں بڑی دریادلی اور تفصیل سے کام لیا گیا ہے جن کا کسی طرح مولف سے تعلق تھا، بقیہ لوگوں کا ذکر سرسری انداز میں کر دیا گیا ہے۔ مولف میں تنقیدی بصیرت کی کمی نظر آتی ہے، چنانچہ شعراء کے کلام پر یا تو کوئی رائے دی ہی نہیں گئی یا پھر سطحی توصیف سے کام چلایا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی تذکرے میں پیش کردہ کلام سے بھی اس دور کے شعراء سے متعلق اچھی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ فرسودہ مضامین اور پامال اور مروّج خیالات کو انتہائی رسمی انداز میں بیان کیا گیا ہے البتہ ایک دلچسپ حقیقت یہ ضرور سامنے آتی ہے کہ انیسویں صدی کے یہ بھوپالی شعراء جو راسخ، ذوق، صبا، امیر اللہ تسلیم، غالب، امیر مینائی اور داغ وغیرہ سے مشورۂ سخن کرتے نظر آتے ہیں ان میں بیرونی اساتذہ میں سب سے زیادہ تلامذہ غالب کے بھوپال میں پائے جاتے تھے، البتہ درجۂ اول اور صف دوم کا کوئی نمایاں غزل گو ان تقریباً سو شاعروں کے ہجوم میں نظر نہیں آتا۔ یہ بات ضرور ہے کہ یہی شعراء بھوپال میں اگلی نسل اور مستقبل کے اچھے غزل گو شعراء مثلاً مراج میر خاں سحر، سہا مجددی، ذکی وارثی، حامد سعید، شعری بھوپالی، وکیل بھوپالی، صہبا قریشی، باسط بھوپالی، شفا گوالیاری وغیرہ کے پیش رو تھے اور گلستانِ سخن میں انھیں کے لگائے ہوئے بیج آزادی کے بعد اختر سعید، مقصود عرفان، کیف بھوپالی، مسرت قادری، محمد علی تاج، شاہد بھوپالی، نجیب رامش، اظہر سعید، رفعت الحسینی، فضل تابش، واحد پریمی، قاسم نیازی، متین نیاز، اجلال مجید، کاوش جذباتی، ظفر صہبائی وغیرہ کی شکل میں اچھی غزل کہنے والے اور ہوئے جن میں سے اکثر کا ذکر "بھوپال میں غزل" (مرتبہ دلکش ساگری) میں کیا گیا ہے۔ انیسویں صدی کا یہ تذکرہ یقیناً اس ادبی اہمیت کا حامل ہے کہ اسے تدوینِ نو کے ساتھ شائع کیا جائے۔

کوائف جامعہ

سفیر لیبیا جامعہ

حکومت لیبیا کے سفیر متعین ہندوستان عزت مآب جناب محمد یوسف مقریف ۲۹ رمئی (۱۹۷۹ء) کو شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب کی دعوت پر ازراہِ کرم جامعہ تشریف لائے۔ اس موقع پر جامعہ کے دونوں ڈین جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب، جناب عبدالحق خاں صاحب خازن جامعہ جناب رضی اللہ چشتی صاحب، آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی جناب شریف الحسن نقوی صاحب لائبریرین جناب شہاب الدین انصاری صاحب، شعبۂ اسلامیات و عرب ایرانین اسٹڈیز کے پروفیسر مشیر الحق صاحب اور صدر شعبہ ڈاکٹر محمد اجتبا ندوی، صدر ٹیچرز ایسوسی ایشن جناب عبداللہ ولی بخش قادری صاحب اور شعبے کے اساتذہ اس موقع پر موجود تھے۔ شیخ الجامعہ صاحب نے تفصیل سے جامعہ کا تعارف کرایا اور اس کی خدمات پر روشنی ڈالی اور افسران جامعہ اور اساتذہ نے اپنے اپنے شعبوں کے کام سے معزز مہمان کو روشناس کرایا۔ موصوف محترم نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے ان باتوں کو سنا اور جامعہ کی علمی و تعلیمی خدمات پر اپنی مسرت کا اظہار کیا اور اپنی طرف سے اور اپنے ملک کی طرف سے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔ قارئین جامعہ کے لیے یہ بات بھی دلچسپی کا باعث ہوگی کہ ابھی حال میں امیر جامعہ جسٹس محمد ہدایت اللہ صاحب لیبیا تشریف لے گئے تھے تو آپ کی عنایت اور توجہ سے وہاں کے سرکاری اور علمی حلقوں میں جامعہ کا بہت اچھا تعارف ہو گیا تھا۔

سفیر محترم کی خدمت میں جامعہ کی بعض مطبوعات بھی پیش کی گئیں، مثلاً "فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید"، اردو سہ ماہی "اسلام اور عصر جدید" اور انگریزی سہ ماہی "اسلام اینڈ ماڈرن ایج"۔

آخر میں آپ نے ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کو بھی ملاحظہ فرمایا۔

ایک استاد فارسی کی تازہ کتاب

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی صاحب جامعہ کالج میں فارسی کے لکچرر ہیں اور کئی کتابوں کے مولف اور مصنف۔ پچھلے سال مئی ۱۹۷۰ء میں "آذری" کے نام سے ایک ترجمہ شائع ہوا ہے۔ "آذری" دراصل آذر بائیجان کی قدیم زبان ہے جو صدیوں تک رائج رہی ہے اور بقول فاضل مترجم: "آج بھی اس کے بہت سارے آثار دیکھے جا سکتے ہیں۔" اس کتاب کے مصنف احمد کسروی تبریزی ہیں جنھوں نے بڑی تحقیق و جستجو کے بعد اس زبان — "آذری" کی اصلیت اور حقیقت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ کتاب بہت ہی مختصر ہے مگر فاضل مترجم کے الفاظ میں: "احمد کسروی نے اس مختصر سی کتاب میں تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔"

مترجم کے مقدمے اور مصنف کے دیباچے کے علاوہ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے:

(۱) آذر بائیجان کے قدیم لوگ اور زبان (۲) ترکی نے کب اور کس طرح آذر بائیجان میں راہ پائی (۳) کچھ آذری زبان کے بارے میں (۴) آج کی آذری کے نمونے۔

جن لوگوں کو مختلف زبانوں، ان کی خصوصیات اور ترقی و نشو و نما سے دلچسپی ہو، ان کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔ ترجمہ سلیس اور رواں ہے۔

کتاب بہت ہی خوبصورت آف سٹ پر چھپی ہے۔ قیمت بارہ روپے۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵ کے پتے پر مل سکتی ہے۔

ایک نوجوان کی بے وقت وفات

جناب علاء الدین عباسی صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری میں ایک ہونہار اور نوجوان کارکن تھے۔ ۵ راپریل کو چند روز کی علالت میں ان کا اچانک اور بے وقت انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ

مرحوم مرکزی کتب خانہ میں ۲ فروری ۱۹۶۴ء کو بحیثیت لائبریری کلرک ملازم ہوئے تھے۔

لیکن انھوں نے ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور جامعہ سے پرائیویٹ طور پر بی اے پاس کیا۔ اس کے بعد دلی یونیورسٹی کے شبینہ کالج میں ایم اے اردو کی کلاس میں داخلہ لیا اور وہاں نمایاں نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۷۲ء میں جامعہ سے رخصت تعلیمی ملنے پر مسلم یونیورسٹی کے بی لب ایس سی میں داخل ہو گئے اور وہاں سے فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن کے مستحق قرار پائے۔ جب عباسی صاحب اپنی خداداد صلاحیتوں اور محنت و کاوش سے اپنی تعلیمی استعداد کو وسیع بنانے میں کامیاب ہو گئے تو شعبہ جاتی ترقیاں آسان ہو گئیں۔ وہ پہلے تو پروفیشنل اسسٹنٹ مقرر ہوئے اور بعد میں ترقی کرتے کرتے اسسٹنٹ لائبریرین کے عہدے پر پہنچ گئے۔

علاؤالدین عباسی مرحوم کی المناک وفات کی خبر سن کر جامعہ کے اسٹاف کے علاوہ طلباء کی برادری میں بھی رنج و افسوس کی لہر دوڑ گئی۔ ۷ را پریل کو ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری میں کتب خانہ کے جملہ کارکنان کا ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت لائبریرین شہاب الدین انصاری صاحب نے فرمائی۔ مرحوم کے بارے میں بہت سے ساتھیوں نے اپنے خیالات اور تاثرات کا اظہار کیا۔ آخر میں لوگوں نے کھڑے ہو کر تعزیتی تجویز منظور کی۔

اس افسوس ناک اور بے وقت وفات سے متاثر ہو کر جامعہ کالج کے سابق استاد جناب سید ابوالکاظم قیصر زیدی صاحب نے "فسونِ مرگ" کے نام سے حسب ذیل نظم کہی ہے جو تعزیتی جلسے میں پڑھی گئی تھی۔

اک عجیب سناٹا! اک عجیب غم ناکی!!
کس کی موت کا افسوں
کر گیا ہر اک شے کو کیف و حسن سے عاری
میٹھی میٹھی آوازیں
مسکراہٹیں پھیکی
کپکپاتے ہونٹوں پر نا تمام سے جملے
سوگوار آتے ہیں سوگوار جاتے ہیں
اجنبی نگاہیں ہیں اجنبی سے چہرے ہیں

وہ نہ کوئی رہبر تھا

وہ نہ کوئی عالم تھا

تر زباں نہ تھا کوئی

خوش بیاں نہ تھا کوئی

ایک مردِ سادہ تھا

ایک فردِ سادہ تھا

لہجہ نرم و شائستہ

شکوہ زیرِ لب رہ کر — لفظ لفظ ہونٹوں سے — ٹوٹ کر نکلتا تھا

خود "نہیں" کے دامن میں

نم گداز جذبے کی

ایک نیک انساں تھا

ایک مردِ سادہ تھا — ایک فردِ سادہ تھا

جامعہ میں تعطیلات گرما کا آغاز

آج کل (یکم جون) جامعہ میں امتحانات ہو رہے ہیں، تمام طلبا امتحانات میں مشغول ہیں، ہر طرف سکون اور خاموشی ہے۔ امید ہے کہ ۵ر جون کو تمام امتحانات ختم ہو جائیں گے۔

یکم جون سے جامعہ میں تعطیلات گرما شروع ہو گئی ہیں، یکم اگست کو جامعہ کھلے گی۔ داخلے کی درخواستیں نئے تعلیمی سال کے شروع ہونے سے قبل آجانی چاہئیں۔

(کوائف نگار)

ماہنامہ جامعہ — مولانا محمد علی نمبر

قیمت: آٹھ روپے۔ ساڑھے آٹھ روپے بھیجنے پر یہ خصوصی شمارہ مفت ملے گا اور جنوری ۱۹۷۹ء سے دسمبر ۱۹۷۹ء تک رسالہ جامعہ جاری کر دیا جائے گا۔

عبداللطیف اعظمی

تعارف و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہے)

فکر اسلامی کی تشکیل جدید   مرتبین:۔ ضیاء الحسن فاروقی، مشیر الحق

سائز ۱۸x۲۲/۸، حجم ۴۰۸ صفحات، مجلد قیمت: تیس روپے، تاریخ اشاعت: ۱۹۷۸ء

ناشر: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

"فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ" کے عنوان سے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ کے اہتمام میں اواخر دسمبر ۱۹۷۷ء کو ایک سیمینار منعقد ہوا تھا جس میں ہندوستان کے مشہور علمار کرام اور ممتاز دانش وروں نے شرکت کی تھی۔ اس میں جو مقالے پڑھے گئے تھے، زیر تبصرہ کتاب انھیں مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کے شروع میں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی ڈائریکٹر جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب کا ایک طویل اور مبسوط مقدمہ ہے جس میں موضوع زیر بحث کی وضاحت کی گئی ہے اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سیمینار کے بعض مندوبین نے لفظ "تشکیل" پر اعتراض کیا تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مقدمہ نگار نے لکھا ہے کہ: "بعض حضرات تھے جنھوں نے موضوع سیمینار میں "تشکیل" کے لفظ کو محل نظر سمجھا اور سوال کیا کہ تشکیلِ جدید کا آخر کیا مطلب ہے؟ کیا ایک نیا اسلام (معاذ اللہ) بنانا مقصود ہے؟ ہمارے ذہنوں میں اس طرح کا کوئی الجھاوا نہیں تھا اور فکرِ اسلامی سے ہماری مراد دین اسلام ہرگز نہیں تھا اور نہ ہوسکتا تھا۔ ہماری مراد اس سے الہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید تھی، یعنی ایک جدید علم کلام کی

ضرورت کا ایک بار پھر احساس دلاتا تھا۔" (صفحہ ۱۴) آگے چل کر ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ: "جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل دین ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلام میں زندگی کے ہر ہر گوشے سے متعلق ہدایات ہیں، یہ منشا ہرگز نہیں ہوتا کہ جس وقت "اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" والی آیت حضور پر نازل ہوئی، بس وقت کی رفتار وہیں رک گئی اور انسانی معاشرہ، جیسا کہ اس وقت تھا جامد ہو کر رہ گیا۔ ایسا سوچنا قرآنی تعلیم کے منافی ہوگا، اس لیے کہ تغیر وہ حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی آیت ٹھہرایا ہے۔ اس لیے مکمل دین کہنے سے مراد صرف یہ ہے کہ تغیر و تبدل کی جو صورت بھی ہو اور جس زمانے میں بھی ہو، اسلام ان سب حالات میں صحیح صحیح رہنمائی کرتا ہے اور ہمیں وہیں سے فیضان حاصل کرنا چاہیے۔ اسلام زمانے کی رفتار کو نہیں روکتا اور چاہتا ہے کہ معاشرے میں ضروری اصلاح و تجدید سے کام لے کر زندگی کو مفید اور بامقصد بنایا جائے۔ اس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ فکر و عمل کی ہر تبدیلی کے باوجود معاشرے میں، توازن، سلامتی اور داخلی و خارجی امن و طمانیت کی فضا اگر پیدا کی جا سکتی ہے تو اسی کے پیغام پر عمل پیرا ہو کر۔" (صفحہ ۲۰)

ضیاء صاحب کے مقدمے، پروفیسر فتح اللہ مجتبائی (سابق کلچرل کاؤنسلر حکومت ایران متعینہ ہند) کے مقالے "فکر اسلامی: عہد نو کے تقاضے" اور حکیم الامت مولانا قاری محمد طیب صاحب (مہتمم دار العلوم دیوبند) کے "کلماتِ طیب" کے علاوہ، ۴۳ مقالے زیر تبصرہ مجموعے میں شامل ہیں، جن کی تقسیم حسب ذیل عنوانات کے تحت کی گئی ہے:

(۱) تشکیل نو: کیوں اور کیسے؟ (۲) تشکیلِ نو میں حدیث نبوی کے مطالعہ کی اہمیت (۳) تشکیلِ نو اور فقہ و اصول فقہ (۴) تشکیلِ نو: تصوف و کلام کی روشنی میں (۵) تشکیلِ نو: روایت اور تجدد (۶) تشکیل نو: نیا زمانہ، نئے مسائل (۷) تشکیل نو: مطالعہ شخصیات (اس حصے میں ڈاکٹر اقبال، شیخ محمد عبدہ، جمال الدین افغانی اور سرسید کے افکار و خیالات اور مجتہدانہ کارناموں پر بحث و گفتگو کی گئی ہے۔) (۸) تشکیل نو: نئے نقطہائے نظر

ان مقالہ نگاروں میں ہندوستان کے مشہور اداروں کے نمائندے شامل ہیں، مثلاً عربی مدارس میں سے دار العلوم ندوۃ العلماء اور دار العلوم دیوبند وغیرہ، یونیورسٹیوں میں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد وغیرہ اور علمی و تحقیقی اور اسلامی اداروں

میں سے دارالمصنفین اعظم گڈھ، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، تغلق آباد نئی دہلی اور ہمدرد مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، حیدر آباد وغیرہ اور بقول مولانا محمد طیب صاحب: اس اجلاس میں ملک کے تمام مرکزی اداروں کے نمائندے اور تقریباً ہر مکتب خیال کے فضلا اور دانشوروں نے شرکت کی۔" (صفحہ ۳۱)

عام طور پر بحثوں، گفتگوؤں اور تحریروں و تقریروں میں اسلامی احکام اور تعلیمات و روایات کی روشنی میں جدید مسائل کے حل کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے، مگر راقم الحروف کے علم، واقفیت اور یادداشت میں، ہندوستان میں اس مسئلے پر غور و خوض کرنے کے لیے اتنا کامیاب سیمنار کوئی اور منعقد نہیں ہوا اور نہ زیر بحث موضوع پر اردو میں اتنی جامع اور متنوع کوئی کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس لیے ہمیں قوی امید ہے کہ یہ کتاب علمی، تحقیقی اور اسلامی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

وفیات ماجدی یا نثری مرثیے

مرتبہ:۔ حکیم عبدالقوی دریاآبادی

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۳۴۲ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت پندرہ روپے، تاریخ اشاعت: دسمبر ۱۹۷۸ء۔ ملنے کا پتہ:۔ صدق جدید بک ایجنسی۔ کچہری روڈ۔ لکھنؤ (یوپی)

مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم (۱۸۹۲-۱۹۷۷) اردو کے صاحب طرز ادیبوں میں سے تھے۔ انھوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک اردو صحافت کی خدمت کی ہے۔ اس عرصے میں نہ جانے کتنے قابل ذکر اور مشہور اشخاص کا انتقال ہوا ہوگا اور نہ جانے کتنے چھوٹے بڑے تعزیتی مضامین اور نوٹ مرحوم نے لکھے ہوں گے۔ خوشی کی بات ہے کہ مرحوم کے بھتیجے اور داماد اور ان کے یادگار اخبار "صدق جدید" کے ایڈیٹر حکیم عبدالقوی دریاآبادی (بی۔ اے) نے مرحوم کے ۶۲ منتخب تعزیتی مقالے اور شذرے "وفیات ماجدی یا نثری مرثیے" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کئے ہیں جو حسب ذیل چھ ۶ ابواب پر مشتمل ہے:

(۱) خاندان والے (۲) علمائے کرام اور بزرگانِ طریقت (۳) سیاسی لیڈر (۴) شاعر، ادیب و صحافی (۵) ڈاکٹر و طبیب (۶) دیگر حضرات

ان مرحومین میں سے جن پر زیر تبصرہ کتاب میں تعزیتی مضامین اور نوٹ شامل ہیں، علماء کرام میں مولانا اشرف علی تھانوی (مرحوم کے مرشد)، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا سید سلیمان ندوی مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، سیاسی لیڈروں میں مولانا محمد علی، مہاتما گاندھی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہرلال نہرو، چودھری خلیق الزماں، ادیبوں اور صحافیوں میں پروفیسر احتشام حسین، مولانا ظفرالملک علوی، چودھری محمد علی اور عبدالمجید سالک قابلِ ذکر ہیں۔

جب کسی مرحوم شخصیت پر کوئی تعزیتی مضمون یا نوٹ لکھا جائے تو اس کی سیرت و شخصیت اور اس کے خصوصی کارناموں کا ذکر تو ضروری ہے ہی، مگر تحقیق کے نقطۂ نظر سے، اس کی پیدائش اور وفات کی صحیح اور مکمل تاریخوں کی بھی بڑی اہمیت ہے، جس کی طرف عام طور پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں بھی اکثر و بیشتر یہ کمی محسوس ہوئی۔ مولانا عبدالماجد صاحب سے اس کا مطالبہ غالباً صحیح نہیں ہوگا، لیکن اگر فاضل مرتب نے حسب ضرورت حاشیے میں، اس کا اضافہ کردیا ہوتا تو اس کتاب کی افادیت میں معتدبہ اضافہ ہوجاتا۔ لیکن اس کمی کے باوجود، جو ہر مضمون یا نوٹ میں نہیں ہے، علمی و ادبی لحاظ سے بہرحال یہ کتاب بہت مفید اور قابلِ مطالعہ ہے اور وفیات میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔

خطبات ماجدی

مرتبہ :۔ محمد صدیق دریاآبادی

سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ حجم ۱۱۲ صفحات، مجلد مع گردپوش۔ قیمت دس روپے۔ سنہ اشاعت: ۱۹۷۸ء۔ ناشر :۔ ادارہ انشائے ماجدی۔ نمبر ۱۴۷۔ ربندر سرانی۔ الورچیت پور روڈ۔ کلکتہ۔

مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم نے اپنی ایک حقیقی بھتیجی اور اپنی تین صاحبزادیوں کے نکاح کے مواقع پر جو خطبے پڑھے تھے، انھیں کو کتابی صورت میں شائع کردیا گیا ہے۔ فاضل مرتب نے ان خطبات کے بارے میں لکھا ہے کہ: "مولانا کی دوسری تحریروں کی طرح یہ خطبے بھی ان کے ادبی شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں اور حد درجہ مؤثر ہیں" نیز انھوں نے لکھا ہے کہ: "عربی میں جو مسنون خطبۂ نکاح رواج پائے ہوئے ہے [؟ ہیں]، اس [؟ ان] کی بہترین شرح و ترجمانی

ان خطبات میں کی گئی ہے۔ دولھا اور دلہن کے لیے یہ ایک جامع اور زندگی بھر کام آنے والے ہدایت نامے کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

یہ خطبات اگرچہ ایک مخصوص نوعیت کے ہیں اور مخصوص مواقع کے لیے لکھے گئے ہیں، مگر ان میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ صرف زوجین ہی کے لیے مفید نہیں ہیں اور نہ صرف ازدواجی زندگی کو سنوارنے کے لیے ضروری ہیں بلکہ مسلم سماج کی اصلاح و بہتری میں ان سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔

کتاب آفسٹ میں چھپی ہے اور "حسن سیرت" کے ساتھ ساتھ حسن صورت سے بھی آراستہ ہے۔ امید ہے کہ نہ صرف علمی و مذہبی حلقوں میں بلکہ مسلم گھرانوں میں بھی قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور حسن قبول حاصل کرے گی۔

نوائے سحر — ڈاکٹر سحر اعظمی

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۱۴۴ صفحات۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت: پانچ روپے۔ تاریخ طباعت: ۱۹۷۸ء۔ ملنے کا پتہ: سحر کلینک۔ بیلتھرا روڈ۔ ضلع بلیا (یوپی)

اعظم گڈھ کے علاقے میں شعر و ادب کی ہمیشہ صحت مند اور شاندار روایت رہی ہے اور بقول پروفیسر احتشام حسین صاحب: "اس خطے کے شعرا نے ہر دور میں نہ صرف وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیا ہے بلکہ فن کے اعلیٰ معیار کو پیش نگاہ رکھ کر علم و ادب کی آبیاری کی"۔ ڈاکٹر مقبول احمد سحر اعظمی اسی سرزمین کی موجودہ نسل کے ان شعرا سے تعلق رکھتے ہیں جن کے کلام میں تازگی ہے، زندگی ہے، لطافت ہے، بلندی ہے، حوصلہ ہے، غرض وہ سب کچھ ہے جسے ایک شعر کی خصوصیت کہا جاتا ہے۔ جناب سحر نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور دونوں میں روانی، شگفتگی اور جملہ فنی خوبیاں موجود ہیں۔

زیر تبصرہ مجموعے کے شروع میں "رسمیات زمانہ" ہیں، یعنی سب سے پہلے شاعر کی تصویر ہے، پھر انتساب، پھر ہدیۂ تشکر، اس کے بعد سید احتشام حسین مرحوم کے قلم سے پیش لفظ ہے (احتشام صاحب کا انتقال یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو ہوا ہے اور یہ پیش لفظ پر تاریخ ۱۲ مئی ۱۹۷۱ء کی ہے) آج کل تقریظ

کا رواج قریب قریب ختم ہوگیا ہے، مگر اس مجموعے میں ڈاکٹر انصار اللہ نظرؔ صاحب کے قلم سے تین صفحہ کی ایک تقریظ بھی شامل ہے، اس کے بعد ٹاؤن کالج بلیا کے لکچرر شبنمؔ بانسپاری صاحب نے سحرؔ کے شاعرانہ مسلک پر اختصار کے ساتھ اظہار خیال فرمایا ہے اور آخر میں حکیم قاضی محمد اسرار حسن صاحب نے دو صفحے میں شاعر کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ اس کے بعد صفحہ ۱۹ سے صفحہ ۱۱۰ تک غزلیں ہیں اور صفحہ ۱۲۱ سے ۱۴۴ تک نظمیں ہیں۔ پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم ترقی پسند تحریک کے ممتاز رہنماؤں اور اردو کے معتبر اور مستند نقادوں میں سے تھے۔ موصوف نے جناب سحرؔ کی شاعری کے بارے میں پیش لفظ میں لکھا ہے:

"میں نے جستہ جستہ سحرؔ اعظمی کی غزلیں بھی دیکھی ہیں اور نظمیں بھی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان کے پیش نگاہ شاعری کا ایک قومی، اخلاقی اور تہذیبی مطمح نظر ہے جس سے شاعری "شعر محض" کے حدود سے باہر نکل کر ترجمانِ حیات بن جاتی ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں دونوں میں رجائی اور نشاطیہ آہنگ، جہدِ زندگی میں شریک ہوکر مشکلات پر قابو پانے کی آرزو، خوب سے خوب تر کی جستجو اور امیدِ فردا کی روشنی برابر نظر آتی ہے، لیکن ان کے اظہار میں شعری لطافتوں کو برقرار رکھنے کی برابر کوشش کی گئی ہے۔ شاعر کے مزاج اور افتادِ طبیعت کا رنگ اس کے ابتدائی کلام ہی سے ظاہر ہونے لگتا ہے۔ پختگی تک پہنچتے پہنچتے اس میں گہرائی، قادر الکلامی اور روانی ضرور آجاتی ہے مگر طرز ادا کا ایک تسلسل قائم رہتا ہے، سحرؔ اعظمی کی ابتدائی غزلوں میں وہی بلند نگاہی اور اظہار میں وہی لطافت ہے کہ جو آج کے اشعار میں اور زیادہ عمیق، سنجیدہ اور لطیف ہوگئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مزاج شاعرانہ اور شخصیت دلدادۂ فن ہے۔ جس کے فیض نے ان کے کلام میں ہمیشہ شیفتگی اور تازگی پیدا کی ہے۔"

جناب سحرؔ کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

ساقی جو مرے دل میں احساس کا شعلہ ہے	ہر رند کے ساغر میں ڈھل جائے تو اچھا ہے
اشعار کے سانچے میں انکا کے ڈھلنے تک	شاعر نے لہو دل کا سو بار نچوڑا ہے

مولانا محمد علی نمبر — چند خطوط

ماہنامہ جامعہ کے مولانا محمد علی نمبر کا عام طور پر بڑی گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں تحریری طور پر جو رائیں ملی ہیں وہ ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

جناب سید نذیر نیازی صاحب (لاہور)

"محمد علی نمبر کا بہت بہت شکریہ۔ مضامین خوب ہیں، لیکن ضرورت ایک ایسی اشاعت کی ہے جو محمد علی کے شایانِ شان ہو یعنی ان کی سیاسی شخصیت اور اسلامی ہندوستان میں اس کا فیصلہ کن کردار واضح طور پر ہمارے سامنے آجائے، پھر بھی آپ کی کوشش ہر طرح سے قابلِ تعریف ہے۔ مبارکباد قبول فرمایئے۔ مجیب صاحب کا مضمون پسند نہیں آیا۔"

موصوف سے مولانا محمد علی نمبر کے لیے مضمون کی درخواست کی گئی تھی اور اس خط سے معلوم ہوا کہ آپ نے بھیجا بھی تھا، مگر ہمیں نہیں ملا، اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "اگر ارشاد ہو تو اپنے مضمون کی نقل بھیج دوں، اس میں ایک اشارا اقبالؔ اور محمد علی کے تعلقات کی طرف بھی ہے۔"

پروفیسر آل احمد سرور (کشمیر یونیورسٹی۔ سری نگر)

"کل کی ڈاک سے "جامعہ" کا محمد علی جوہر نمبر موصول ہوا۔ آپ کو یقیناً شکایت ہوگی کہ میں نے باربار وعدوں اور یقین دہانی کے، اس نمبر کے لیے اپنا مضمون نہیں بھیجا۔ آپ نے اس کے لیے مزید انتظار کیا ہوگا۔ بات یہ ہوئی کہ مضمون تو بہرحال میں لکھ سکتا تھا اور کافی غور و فکر کے بعد محمد علی

اور اقبال پر لکھنے کا ارادہ تھا، مگر ہوا یہ کہ اس عرصے میں محمد علی کے دل کے متعلق میری رائے میں خاصی تبدیلی ہوئی ہے۔ ایک زمانے میں تو مجھے ان سے بڑی عقیدت تھی۔ ان پر کئی نظمیں لکھی ہیں، کئی مضامین میں بھی ذکر کیا ہے، مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے ان کے مختصر خاکے میں اور مجیب صاحب نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، اس کی اہمیت زیادہ ہے، اس لیے اس نمبر کے لیے مضمون نہ لکھ سکا۔ اب یہ ارادہ ہے کہ آپ کے اس نمبر پر ریویو کر دوں اور وہ آپ ہی کے رسالے میں چھپنے کے لیے بھیج دوں۔ ابھی تو میں نے صرف آپ کا اداریہ اور مجیب صاحب کے مضمون کا ترجمہ پڑھا ہے، پورا رسالہ پڑھ لوں تو لکھوں گا۔ بہرحال آپ نے اس نمبر کی ترتیب میں جو محنت کی ہے اس کی داد دیتا ہوں، خاصا قیمتی مواد آپ نے جمع کر دیا۔ مبارک ہو۔"

پروفیسر مسعود حسین (مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ)

"جامعہ کا "مولانا محمد علی" نمبر ملا، دیکھا اور پڑھ ڈالا ــــ کچھ مولانا کی شخصیت کی کشش اور کچھ آپ کا سلیقۂ ترتیب۔ جامعہ دراصل آپ ہی کے دم خم کی بدولت، نامساعد حالات میں مسلسل نکل رہا ہے اور اس کے خاص نمبروں کے لیے تو آپ بے حد تگ و دو کرتے ہیں۔ اس شمارے سے بھی صاحبانِ قلم کا تکلف اور آپ کی تکلیف دونوں ظاہر ہیں۔

یہ شمارہ اس سے بھی زیادہ بھرپور ہو سکتا تھا، لیکن یہ آپ کے احاطۂ امکان سے باہر تھا۔ لوگ وعدہ کر لیتے ہیں، وفا نہیں کرتے۔ بعض میری طرح 'نیم وعدہ' پر ٹال دیتے ہیں، تاہم آپ نے بعض اچھے مضامین یک جا کر لیے ہیں جو مولانا کے ماحول، ان کی شخصیت اور شاعری کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ چند تبرکات کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن کیا کیجیے گا، جب حرکت نہ ہو برکت سے بھی کام چلانا پڑتا ہے!

مولانا محمد علی اور جامعہ پر آپ اور زیادہ بھرپور لکھ سکتے تھے۔ مولانا کا تعلق جامعہ سے بہت تھوڑی مدت کے لیے رہا (اور آخر میں تو وہ اس سے شاکی بھی ہو گئے تھے) لیکن یہ مدت بہت اہم تھی، اس لیے کہ قائم ہوتے وقت وہ اس کی سب سے متحرک شخصیت تھے۔ علی گڑھ سے نبٹنا آسان کام نہیں تھا، یہ اسی شیر دل کا حوصلہ تھا کہ نبٹا اور خوب نبٹا۔ اسی طرح ملک عبدالعزیز بن سعود کی خاندانی بادشاہت کے خلاف آواز اٹھانا، عین مکہ مکرمہ میں، ہمہ شما کے بس کی بات نہ تھی، لیکن وہ کہہ گیا کہ جو کہنا تھا۔

میں نے مولانا کو بچپن میں اقبال منزل (جامعہ کے بچوں کا دارالاقامہ) میں بارہا دیکھا، عید، بقرعید، میلاد اور دیگر تقاریب کے موقعوں پر جب وہ جامعہ کے بچوں کو بلاتے تھے۔ آج سوچتا ہوں تو خود کو گھاٹے میں نہیں پاتا، اس لیے کہ جو بڑے بھی ان کے حضور میں جاتے تھے وہ شکوہ سنج مجھے نظر آتے تھے۔"

(اس خط میں "مولانا محمد علی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ" پر جو اظہار خیال کیا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے، دراصل یہ مضمون عین وقت پر اور محض "خانہ پُری" کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس موضوع پر لکھنے کے لیے جامعہ کے ایک ایسے سابق استاد سے درخواست کی گئی تھی جو جامعہ کے دور اول کے طالب علموں میں سے ہیں اور مولانا کے روزنامہ ہمدرد میں کچھ عرصہ کام بھی کر چکے ہیں۔ انھوں نے ہماری بار بار کی یاد دہانیوں پر مضمون شروع بھی کر دیا تھا اور ایک معتد بہ حصہ لکھ بھی لیا تھا لیکن ہر دور ان کے ذہن میں نئے اور اچھوتے نکتے پیدا ہوتے تھے جس کی وجہ سے وہ مضمون مکمل نہ کر سکے، ان کا وعدہ اب بھی برقرار ہے، دیکھیے کب عنایت فرماتے ہیں۔)

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ (اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر، سیرون (شملہ)

"محمد علی نمبر آپ نے بڑی محنت سے ترتیب دیا ہے۔ مضمون، انتخاب بڑا وقیع ہے۔ اس فرشتہ خصلت انسان کی سیرت کو سمجھنے میں اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے، جستہ جستہ تمام مضامین پڑھتا جا رہا ہوں۔"

جناب ظہیر علی صدیقی (ریسرچ اسکالر محمد علی، لکھنؤ یونیورسٹی)

محمد علی نمبر ملا، خوب ہے۔ ماہنامہ آج کل کے وسائل آپ سے زیادہ ہیں، مگر آپ کا یہ نمبر اس سے کہیں بہتر اور جامع ہے۔ مجھ جیسے ریسرچ اسکالر کو اس سے بڑی مدد ملے گی۔

ڈاکٹر قمر اقبال (جنرل سکریٹری جوہر میموریل سوسائٹی اترپردیش۔ لکھنؤ)

"یہ جان کر انتہائی مسرت ہوئی کہ آپ کا محمد علی نمبر شائع ہو گیا اور ساتھ ہی یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ یہ نمبر انتہائی حسین ہے۔ میری جانب سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔"

No. D-(S)-110 Vol. 76 No. 5 May, 1979

The Monthly JAMIA

JAMIA MILLIA ISLAMIA
NEW DELHI - 110025

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

Subscription Rates

India	Rs. 6-00
Pakistan	Rs. 26-00
Foreign	$ 4 (US) or £ 1.50

Advertisement Rates

Cover IV	Full page Rs. 200/-	Half page Rs. 100/-
Cover III & II	Full page Rs. 150/-	Half page Rs. 75/-
Ordinary	Full page Rs. 100/-	Half page Rs. 50/-

جامعہ

شمارہ ۶	بابت ماہ جون ۱۹۷۹ء	جلد ۷۶

فہرست مضامین

خط وکتابت کا پتہ:-

ماہنامہ جامعہ جامعہ نگر نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

طابع وناشر:- عبداللطیف اعظمی ★ مطبوعہ۔ جمال پریس دہلی ★ ٹائیٹل۔ دیال پریس دہلی

شذرات

ماہنامہ جامعہ کے مدیر جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب، ایک جلسے میں شرکت کے لیے تاشقند تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں سے سوویٹ روس کے مسلمانوں کے بارے میں "مسلمز آف دی سوویٹ ایسٹ" کے نام سے ایک مجلہ شائع ہوتا ہے، جس کی دسویں سالگرہ کے موقع پر ایک بین اقوامی جلسے کا انتظام کیا گیا ہے جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شرکت کے لیے ہندوستان کے صرف دو مدیروں کو دعوت نامے بھیجے گئے تھے، ایک دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے مدیر سید محمد الحسنی صاحب کو جن کا اس کانفرنس کے انعقاد سے پہلے انتقال ہوگیا، دوسرا انگریزی سہ ماہی "اسلام اینڈ دی موڈرن ایج" کے مدیر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب مرحوم کو، لیکن کانفرنس کے منتظمین کو مطلع کیا گیا کہ عابد صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے تو انھوں نے اس کے موجودہ مدیر اور جامعہ ملیہ کے ادارے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے اعزازی ڈائرکٹر جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب کو مدعو کیا اور انھوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ امید ہے کہ واپسی پر وہ اس کانفرنس اور سوویٹ یونین کی مشرقی جمہوریتوں کے مسلمانوں کے بارے میں قیمتی اور مفید معلومات اپنے ساتھ لائیں گے اور قارئین جامعہ کو ان سے مستفید فرمائیں گے۔

گذشتہ دو مہینوں میں ہم چار اہم اور قابل قدر شخصیتوں سے ہمیشہ ہمیش کے لیے محروم ہو گئے۔ ۲۳ مئی کو ایک بزرگ عالم مولانا سید فضل اللہ رحمانی نے تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں علی گڑھ میں انتقال فرمایا۔ ۱۲ اور ۱۳ جون کی درمیانی شب میں عربی کے ایک نوجوان صحافی اور کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم مولانا سید محمد الحسنی ندوی نے اور ۱۱ جولائی کی شام کو اردو کے ایک نوجوان صحافی مولانا اسحاق ندوی نے وفات پائی۔ ان دونوں صحافیوں کا تعلق دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تھا، اول الذکر عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے اور ثانی الذکر اردو کے پندرہ روزہ اخبار "تعمیر حیات" کے اڈیٹر تھے۔ اتفاق سے دونوں مرحومین کی عمر ایک ہی تھی، یعنی تقریباً ۴۴ سال،

دونوں ندوہ کے چشم و چراغ تھے اور یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ دونوں کی وفات بہت ہی مختصر علالت کے بعد یکایک اور اچانک ہوئی۔ دونوں کا تعلق مولانا ابوالحسن علی ندوی سے بہت گہرا تھا اور ان کی تعلیم و تربیت اور تصنیف و تالیف کا ذوق علی میاں کا مرہون منت تھا۔ جو تھے مرحوم اردو کے مشہور ادیب و مصنف جناب بشیر احمد ڈار ہیں، جن کا انتقال پاکستان میں ہوا۔

مولانا سید فضل اللہ مرحوم بڑے جید عالم اور علمائے سلف کا بہترین نمونہ تھے۔ مرحوم کی عمر کا بیشتر حصہ اور زندگی کا بہترین زمانہ حیدرآباد میں گذرا، وہ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں استاد تھے۔ ریڈر اور صدر شعبے کے عہدہ سے ریٹائر ہونے کے بعد کچھ عرصے تک حیدرآباد ہی میں مقیم رہے، مگر بعد میں، شاید اس لیے کہ ان کی دو صاحبزادیاں مسلم یونیورسٹی کے زنانہ کالج کے شعبۂ دینیات میں استاد ہیں، مستقل طور پر علی گڑھ چلے آئے اور بالآخر یہیں کی خاک ان کی آخری آرام گاہ قرار پائی۔

علی گڑھ کے جس مکان میں ان کی رہائش تھی اس کے قریب ہی میرے چھوٹے بھائی کا مکان ہے جس میں ان کے بچے اپنی والدہ کے ساتھ تعلیم کے سلسلے میں رہتے ہیں۔ مرحوم سے ان لوگوں کے گہرے تعلقات تھے اور بعض بچوں کو مذہبی تعلیم بھی دیتے تھے، اس کی وجہ سے میرے بھی ان سے مخلصانہ تعلقات پیدا ہو گئے، خاص طور پر جب انھیں معلوم ہوا کہ میں نے مولانا شبلی نعمانی کے علمی و ادبی کارناموں پر ایک کتاب لکھی ہے تو ان کی شفقت و محبت میں اور اضافہ ہو گیا۔ انھیں مولانا شبلی سے بڑی عقیدت و محبت تھی، انھوں نے از راہ کرم میری کتاب منگوا کر ملاحظہ فرمائی اور مولانا کے بارے میں زریں خیالات سے مستفید فرمایا۔ مرحوم بہت ہی متواضع، خلیق، سادہ مزاج اور صوفی منش انسان تھے۔ ان کی پوری زندگی علم و مذہب، تعلیم و تدریس اور قرآن و حدیث کی خدمت میں گذری۔ انھوں نے امام بخاری کی مشہور کتاب "ادب المفرد" کی شرح لکھی ہے جو "فضل اللہ الصمد" کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں مدینہ منورہ سے شائع ہوئی اور عالم اسلام میں بہت ہی مقبول ہوئی۔ مرحوم کے استاد اور خسر مفتی عبداللطیف رحمانی مرحوم نے جامع ترمذی کی ۱۲ جلدوں میں مفصل اور مبسوط شرح لکھی ہے اور مولانا فضل اللہ نے اس اہم کام میں اپنے استاد کا ہاتھ بٹایا، اور بعد میں اس کی نظر ثانی کی اور مفید حاشیوں کا اضافہ فرمایا، مگر اب تک اس شرح کی اشاعت کا انتظام نہیں ہو سکا ہے۔

مرحوم کا خیال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جتنے غزوات پیش آئے، وہ سب کے سب دفاعی تھے، چنانچہ ان ہی کے مشورے اور ہدایت پر ان کی ایک صاحبزادی نے جو اس وقت کسی بیرونی ملک میں تھیں اور شاید اب

بھی ہیں اس موضوع پر ایک طویل مقالہ لکھا ہے، جس پر کچھ عرصہ پیشتر مرحوم نظر ثانی فرما رہے تھے۔ ادھر کچھ عرصہ سے مجھے علی گڑھ جانے کا موقع نہیں ملا، اس لیے یہ معلوم نہیں کہ یہ مقالہ اب کس منزل میں ہے۔
خدا مرحوم کو اپنی عنایتوں اور رحمتوں سے نوازے اور ان کی اولاد کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

مولانا محمد الحسنی مرحوم ندوہ کے سابق ناظم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم کے صاحبزادے اور اردو و عربی کے جلیل القدر مصنف اور جید عالم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے بھتیجے تھے۔ علی میاں ہی کی طرح مرحوم کو اردو اور عربی پر یکساں قدرت تھی اور دونوں زبانوں میں انھوں نے قابل قدر کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، مثلاً مشہور نو مسلم محمد اسد کی کتاب "روڈ ٹو مکہ" کا اردو ترجمہ "طوفان سے ساحل تک"، ندوہ کے بانی مولانا محمد علی مونگیری مرحوم کی مبسوط سوانح حیات، عربی مضامین کا مجموعہ "الاسلام الممتحن" (اسلام دور آزمائش میں) وغیرہ۔
مرحوم کے والد ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم کو راقم الحروف کو ندوۃ العلماء کی طالب علمی کے زمانے میں بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا بہت اچھا موقع ملا تھا۔ موصوف انتہائی نیک، شریف، کم گو اور فرشتہ صفت انسان تھے۔ محمد میاں صورت و سیرت اور اخلاق و عادات کے لحاظ سے بالکل اپنے والد محترم کو پڑے تھے اور علم و ادب اور تصنیف و تالیف میں اپنے عم محترم مولانا علی میاں کے پیرو اور مقلد تھے، ان کی یہی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے اپنی نو عمری ہی میں بزرگوں اور معاصرین میں یکساں مقبول اور محبوب تھے۔ مرحوم کے عربی مضامین کے مجموعے "الاسلام الممتحن" کے دیباچے میں مولانا علی میاں نے مرحوم کے بارے میں لکھا ہے کہ: "ان کا نشو و نما ایسے والد کی آغوش میں ہوا جو عقائد کی صحت و پختگی، قوت ایمانی، قلب و دماغ کی وسعت، جدید مطالعہ اور حقیقت پسندی میں ممتاز تھے، وہاں مذہب و سائنس اور قدیم و جدید میں کوئی تضاد نہ تھا، وہ مشرقی و مغربی علوم کے چشموں سے یکساں طریقے پر بہرہ ور ہوئے تھے اور انھوں نے ان دونوں کے بہترین و حسین ترین اجزا کو جذب کر کے ان کے درمیان ایک حسین و دلآویز امتزاج پیدا کر لیا تھا اور اس طرح وہ مجمع البحرین بن گئے تھے جس کی مثال اس عصر میں ملنی مشکل ہے۔"

مولانا محمد الحسنی کی وفات اس لحاظ سے بڑی تکلیف دہ اور افسوسناک تھی کہ بہت ہی کم عمری میں اور انتہائی مختصر علالت میں یہ حادثہ پیش آیا تھا، نیز یہ وفات ایک ایسے ہونہار اور ذہین کی وفات تھی جس سے

اہل ندوہ اور ملک و قوم کو بہت سی توقعات تھیں، مگر مولانا اسحاق جلیس کی وفات اس لیے ان سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور بڑا المیہ ثابت ہوئی کہ عمر و مدت علالت میں دونوں میں یکسانیت تو تھی ہی، نیز مولانا جلیس بھی بہت ہی حوصلہ مند تھے اور ان کی صلاحیتوں سے بھی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں، مگر چونکہ پہلا زخم ابھی ہرا تھا، اس لیے یہ دوسرا حادثہ ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ ایک اور لحاظ سے اس حادثے کی نوعیت بہت ہی سنگین اور رنج دہ ہے۔ مختلف اخبارات کی خبروں کے مطابق یہ حادثہ ہسپتال کی غفلت اور بے توجہی بلکہ شرارت پسندی کا نتیجہ ہے۔ اخبارات کے مطابق، ۹؍جولائی کی شب میں جب موصوف کو لکھنؤ میڈیکل کالج کے ہسپتال میں داخل کیا گیا تو اس وقت ان کے پیٹ میں شدید درد تھا (موصوف پہلے سے السر کے مریض تھے) مگر اس وقت تکلیف اور علاج کی طرف توجہ کرنے کے بجائے دستخط مسئلہ زیر بحث آ گیا۔ موصوف نے متعلقہ فارم پر اردو میں دستخط کئے تھے اور جو نرس اس وقت ڈیوٹی پر تھی، اس کو اس پر اعتراض تھا، اس کے نزدیک دستخط ہندی میں نہیں تو کم از کم انگریزی میں کرنا چاہیے تھا۔ جب ڈاکٹر کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا تو اس نے بھی نرس کی تائید کی، مگر موصوف شدید تکلیف کے باوجود اپنے عمل اور موقف کو بدلنے کے لیے تیار نہیں تھے، اس لیے ہسپتال کے کارپردازوں نے ان کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں کی اور اخبارات کے بقول وہ ۲۶ گھنٹے تک ڈاکٹروں کی بے نیازی کے شکار رہے اور مرض نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ بالآخر کوئی پانچ دن کی حیات و موت کی کشمکش کے بعد ۱۱؍جولائی کی شام کو عصر اور مغرب کے درمیان اس تکلیف سے ہمیشہ ہمیش کے لئے نجات پا گئے۔

اپنی وفات سے کچھ ہی دن پہلے "تعمیر حیات" کے اداریے میں جو ان کی وفات سے ایک روز پہلے، ۱۰؍جولائی کو شائع ہوا، اپنے رفیق اور ہم عمر دوست محمد میاں کی تعزیت میں چند ایسی باتیں لکھی ہیں جن کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا قدرت خود ان کے بارے میں خود ان ہی کے قلم سے لکھوا رہی تھی۔ موصوف نے اپنے اس تاریخی اداریے کا آغاز عربی کے ایک جملے کے بعد ان الفاظ سے کیا ہے: "۱۳؍جون ۱۹۷۹ء، ۱۷؍رجب المرجب ۱۳۹۹ھ کی شب میں صرف چند گھنٹوں کی موت و حیات کی کش مکش کے بعد مولانا محمد الحسنی ندوی اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ مرحوم نے حیات مستعار سے ابدی زندگی کا سفر ایسی سرعت سے طے کیا کہ جس نے یہ خبر سنی اسے یقین کرنا دشوار ہو گیا۔ ... انسانی زندگی میں غیر متوقع حادثے پیش آتے رہتے ہیں لیکن وقت کا مرہم ان زخموں کو مندمل کرتا جاتا ہے، یہ نہ ہو تو زیست دشوار ہو جائے لیکن بعض حادثے اپنی کیفیت کے اعتبار سے دائمی درد و الم چھوڑ جاتے ہیں جو بھلائے نہیں بھولتے، جن کی یاد ہر گام، ہر موڑ اور ہر لمحہ تازہ ہوتی رہتی ہے۔ مولانا حسنی ندوی کا سانحۂ رحلت بھی دل کا وہ زخم ہے جسے بھرنے میں وقت کا مرہم شاید ناکام رہے، یادوں کی پروائی دل کے اس زخم کو ہرا کرتی رہے گی، ان کی جدائی کا غم ناقابل فراموش ہے ...."

ان دونوں مرحومین کی وفات کے وقت مولانا علی میاں ہندوستان سے باہر تھے، اس لیے ظاہر ہے ان کا درد و غم کہیں زیادہ رہا ہوگا۔ خدا انھیں صبر و تحمل کی طاقت دے اور مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

(باقی صفحہ ۳۰۸ پر)

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ

قدیم اردو کا سرمایۂ الفاظ

اردو زبان کا بنیادی ڈھانچہ ہند آریائی ہے۔ اسی لیے اس کے ذخیرۂ الفاظ کا بیشتر حصہ ہند آریائی ماخذ پر مشتمل ہے۔ اردو کے ایک بڑے ذخیرۂ الفاظ کا تعلق تدبھو یعنی درمیانی ہند آریائی ماخذ سے ہے جن میں پراکرتیں اور اپ بھرنشیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ سنسکرت کے تتسم الفاظ بھی اردو میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔ اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں بہت سے دیسی الفاظ بھی شامل ہیں۔ اردو نے جدید زبانوں مثلاً پنجابی، مراٹھی، گجراتی وغیرہ سے بھی الفاظ مستعار لیے ہیں۔ مغربی ہندی اور مشرقی ہندی کے بھی بے شمار الفاظ اردو میں شامل ہوتے رہے ہیں۔ دکنی اردو میں دراویڈی زبانوں بالخصوص کنڑ اور تلگو کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ جدید اردو میں انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کے الفاظ کثیر تعداد میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان ماخذ کے علاوہ اردو میں عربی فارسی اور ترکی زبانوں کے الفاظ کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ عربی فارسی سے آئے ہوئے الفاظ اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا اہم جزو ہیں۔ اردو نے اپنے ارتقا کے دوران نہ صرف عربی فارسی بلکہ ترکی زبان سے بھی الفاظ لیے ہیں جو ایک زمانے میں ہندوستان کے حکمراں طبقے کی زبان تھی۔ قدیم اردو کے سرمایۂ الفاظ کو حسب ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ تتسم الفاظ
۲۔ تدبھو الفاظ
۳۔ دیسی الفاظ
۴۔ عربی فارسی و ترکی الفاظ

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ، پرنسپل اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر سولن (ہماچل پردیش)

۱۔ سم الفاظ:۔ سم کے معنی ہیں "اُس جیسا"۔ "اُس" سے یہاں مراد سنسکرت زبان ہے۔ سنسکرت الفاظ جب بغیر کسی رَدّوبدل کے استعمال ہوتے ہیں تو "تتسم" کہلاتے ہیں۔ قدیم اردو میں بہت سے سنسکرت الفاظ بالکل اسی طرح استعمال ہوئے ہیں جیسے کہ وہ سنسکرت میں استعمال ہوتے تھے۔ مثلاً سندر، گیان، جل وغیرہ۔ یہ تمام الفاظ قدیم ہند آریائی (۵۰۰ ق م تا ۵۰۰ ق م) سے آئے ہیں۔ درمیانی ہند آریائی دور (۵۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ عیسوی) میں ان الفاظ میں کسی قسم کی صوتی تبدیلی واقع نہیں ہوئی کیوں کہ ان میں اور اس دور کی زبان کے مزاج میں چنداں مغائرت نہیں تھی۔ قدیم اردو میں تتسم الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کا استعمال اردو میں شروع ہی سے آزادانہ طور پر ہوتا رہا ہے۔ دکنی تصانیف میں تتسم الفاظ کا تناسب اور بھی زیادہ ہے۔ رفتہ رفتہ ایسے الفاظ کی تعداد اردو میں کم ہوتی گئی اور ان کی جگہ عربی فارسی کے الفاظ لینے گئے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں (۱۷۰۰ — ۱۷۸۱) اور شاہ حاتم (۱۶۹۹ — ۱۷۸۱) کی تحریک اصلاحِ زبان سے متاثر ہو کر شاعروں نے اٹھارہویں صدی کے نصف میں تتسم اور تدبھو الفاظ کی ایک بڑی تعداد کو اردو زبان سے خارج کر دیا۔

ڈاکٹر شری رام شرما[1] نے قدیم اردو (دکنی اردو) میں تتسم الفاظ کے بکثرت استعمال کی دو وجہیں بیان کی ہیں۔ اولاً اردو کے آغاز و ارتقا کے دوران میں جن صوفیائے کرام نے تبلیغ و اشاعتِ دین کا کام کیا وہ ویدانت اور ہندو فلسفے سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اسلامی خیالات اور ہندوستانی فلسفے میں امتزاج پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اپنی اس کوشش میں انھوں نے چند تبدیلیوں کے ساتھ انھیں اصطلاحات کو استعمال کیا جنھیں ہندوستانی فلسفی پہلے استعمال کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان صوفیوں کے ملفوظات میں خالص سنسکرت الفاظ کا استعمال بکثرت ملتا ہے۔ سنسکرت الفاظ کے بکثرت استعمال کی دوسری وجہ دکنی شاعروں اور ادیبوں کی سنسکرت کے کلاسیکی ادب سے واقفیت ہے۔ جس کی وجہ سے انھیں سنسکرت کے ذخیرۂ الفاظ تک بڑی آسانی سے رسائی حاصل تھی۔ ڈاکٹر شری رام شرما نے اپنی ہندی تصنیف دکھنی ہندی کا اُدبھو اور وکاس میں ایسے تتسم الفاظ کی ایک طویل فہرست دی ہے جو دکنی شاعروں اور ادیبوں نے اپنی تصانیف میں استعمال کیے ہیں۔ مثال

---

[1] دکھنی ہندی کا اُدبھو اور وکاس، پہلا اڈیشن (پریاگ)، ص ۱۳۱ (ہندی میں)

کے طور پر چند الفاظ یہاں درج کیے جاتے ہیں :-

۱- خواجہ بندہ نواز گیسو دراز : جیون، جیو (معراج العاشقین)

۲- برہان الدین جانم : بالک، سنسار، سیوک، بھید، دیا، گیان، جل، کرودھ (ارشاد نامہ)

۳- علی عادل شاہ ثانی : اَدَھر، گج، گگن، کھنڈ، روپ (کلیات علی عادل شاہ)

۴- ابن نشاطی : بہار، نیر، مکھ، برنَل، جگت، سُندر (پھول بن)

۵- قاضی محمود بحری : گیان، انت، بَل، ساچار، روگی۔ (من لگن)

شمالی ہند کی قدیم اردو تصانیف میں بھی تتسم الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ بکٹ کہانی دیوانِ فائز اور قصۂ مہر افروز و دلبر میں تتسم الفاظ جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ عاشور نامہ، مرائی ریختہ اور کربل کتھا جن میں واقعاتِ کربلا کا بیان ملتا ہے تتسم الفاظ کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ شمالی ہند کے مصنفین کے یہاں تتسم الفاظ کی مثالیں حسب ذیل ہیں :

۱- محمد افضل : لوک، ناگ، من، کر، کٹھن، دیہہ، سُکھ، مکھ، جیو، کتھا، روپ، ماس۔ (بکٹ کہانی)

۲- روشن علی : نَین، اَدھک، مُکھ، بھید، گیان، نیر، جگت (عاشور نامہ)

۳- اسمٰعیل امروہوی : سنسار، مُکھ، جیو، تاپ، بہار، انت، داس، آنند (دو قدیم مثنویاں)

۴- فائز دہلوی : مکھ، جَل، جیو، کیول، مَن، پریت، سُندر، بھون، سیوا، اَدَھر، اَدھک، پاپ (دیوانِ فائز)

۵- فضلی : بالک، کنٹھ، بھید، جیو۔ (کربل کتھا)

۶- عیسوی خاں بہادر : سُکھن، اپما، کرانتی، انگ، سمے، سُگندھ، سموہ، اَدھک، سُندر، پون، مند، ساگر، ہت، ہتیا، سبھا (قصۂ مہر افروز و دلبر)

۲۔ تدبھو الفاظ: سنسکرت الفاظ جب اپنی بدلی ہوئی حالت میں استعمال ہوتے ہیں تو "تدبھو" کہلاتے ہیں۔ تدبھو الفاظ کی بنیاد اگرچہ سنسکرت ہے لیکن وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کی شکل، شباہت میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے لیکن اتنی نہیں کہ انھیں بالکل پہچانا نہ جا سکے۔ اردو میں ایسے الفاظ کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کا ماخذ سنسکرت یا قدیم ہند آریائی ہے اور جو درمیانی ہند آریائی دور میں تبدیلی کے عمل سے گذرے ہیں۔ اردو میں تدبھو الفاظ کی مثالیں یہ ہیں، مثلاً کام (س: کرم) دودھ (س: دگدھ)، ناچ (س: نرتیہ)، گھوڑا (س: گھوٹک) وغیرہ

اردو کے لفظی سرمائے کا دار و مدار زیادہ تر درمیانی ہند آریائی (پراکرت اور اپ بھرنش) پر ہے یہی وجہ ہے کہ تتسم الفاظ کے مقابلے میں اردو میں تدبھو الفاظ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اردو نے پراکرت اور اپ بھرنش سے کثیر تعداد میں الفاظ لیے ہیں۔ اردو کی ساخت کی طرح اردو کا لفظی سرمایہ بھی شاہ حاتم کے دور تک خالص ہند آریائی تھا۔ اس کے بعد شاعروں اور ادیبوں نے اس دور کے موجودہ الفاظ کے ایک کثیر سرمایے کو ترک کر دیا اور اس کی جگہ عربی فارسی کے الفاظ استعمال کرنے لگے۔ جن صوتی خطوط پر سنسکرت الفاظ نے تدبھو الفاظ کی شکل اختیار کی وہ یہ ہیں :-

۱۔ مصوتے :-

(۱) مختصر مصوتوں کی طویل مصوتوں میں تبدیلی

(الف) اَ > آ :-

سنسکرت	>	اردو
کَرَم	>	کام
سَپْت	>	سات
ہَسْت	>	ہاتھ

(ب) اِ > ای؛

سنسکرت	>	اردو
بھِکشْ	>	بھیک
شِکشْ	>	سیکھ

سنسکرت > اردو

جِہوَ > جیبھ

(ج) اُ، اؤ:-

دُگدُھ > دؤدھ

پُتر > پوت

اُشٹر > اؤنٹ

۲- مُصمتے:-

(۱) ہکاری آوازوں کی /ہ/ میں تبدیلی

(الف) کھ > ہ:-

سنسکرت > اردو

مُکھ > مُنہ

(ب) تھ > ہ:-

کتھ > کہہ

(ج) گھ > ہ:-

میگھ > مینہہ

(د) دھ > ہ:-

دَدھی > دہی

(۲) غیر مسموع مصمتوں کی مسموع مصمتوں میں تبدیلی۔

(الف) چ > ج:-

سنسکرت > اردو

کُنچکا > کنجی

پَنچک > پنجا

(ب) ٹ > ڈ:-

سنسکرت > اردو

گھوٹک > گھوڑا (گھوڑا)

کپٹک > کپڈا (کپڑا)

(۳) کوزی (ڻ) کی تالوی /ن/ میں تبدیلی :-

پَرنڻ > پان

کرنڻ > کان

دِوِگنڻ > دگنا

(۴) /ش/ اور /ش/ کی /س/ میں تبدیلی :-

شواس > سانس

شت > سو

شراونڻ > ساون

ورشٹ > برس

(۵) ایک مصمتے کا دوسرے مصمتے سے تبادلہ (INTERCHANGE)

(الف) و > ب :-

وِشُ > بس

وانر > بندر

سَروُ > سب

وایُ > باوَ (ہوا)

(ب) ی > ج :-

یَوَ > جوَ

کاریَ > کاج

یَتنَ > جَتنَ

۲۔ مرکب مصمتے :-

	سنسکرت	<	اردو
(۱)	گ + دھ	<	دھ
	دُگدھ	<	دودھ
(۲)	پ + ت	<	ت
	سپت	<	سات
(۳)	ر + و	<	ب
	سَرْو	<	سب
(۴)	ت + ر	<	ت
	پُتْر	<	پوت
(۵)	ر + پ	<	پ
	سَرْپ	<	سانپ
(۶)	ر + ب	<	ب
	دُربل	<	دُبلا
(۷)	س + ت	<	ت (تھ)
	ہَست	<	ہات (ہاتھ)

اردو کے قدیم مصنفین کے یہاں تد بھو الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں صرف وہی تدبھو الفاظ دیئے جا رہے ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں :-

۱۔ افضل : بکٹ کہانی

پریت، نت، جتن، بچن، اگن، مؤرکھ، مپت، جنم، سندیسا

۲۔ روشن علی : عاشور نامہ

پرگٹ، کارن، بچن، ہیا (دل)، ترن، اچرج،

۳۔ اسمٰعیل امروہوی : دو قدیم مثنویاں —

پیت، جتن، بوڈھا (بوڑھا)

۴۔ فائز دہلوی: دیوانِ فائز

درپن، چھب، گت، چرن، من، درس، مدھ، بن،

۵۔ فضلی: کربل کتھا۔

ہونٹھ، ماٹی، پوت، جیبھ، اندھیار، بھوئیں (بھومی)

۶۔ عیسوی خاں بہادر: قصہ مہر افروز و دلبر

پربت۔ سپنا، گن، دیپ، دھیرج، بیوگ، جوت

۷۔ آبرو: دیوان آبرو

بن، اچرج، جوت، جوگی، برہ، گھیو (گھی)، اگن (آگ)، ہتیا۔

۳۔ دیسی الفاظ:۔ دیسی کے معنی "ملکی" یا "مقامی" مراد لیے جاتے ہیں۔ جن الفاظ کے ماخذ کا سنسکرت یا پراکرت زبانوں میں پتہ نہیں چل پاتا انھیں ہم دیسی الفاظ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جان بیمز[1] کے خیال کے مطابق ایسے الفاظ قدیم زبانوں سے دخیل (BORROWED) الفاظ کے طور پر آئے ہیں یا آریوں نے سنسکرت کے بعد کے دور میں تشکیل دیئے ہیں۔ سنتی کمار چٹرجی[2] کے مطابق ایسے الفاظ ماقبل آریائی زبانوں مثلاً دراویڈی، آسٹرک وغیرہ سے آئے ہیں اسی لیے آریائی زبانوں میں ان کے ماخذ کا سراغ نہیں ملتا۔ یہ الفاظ ان زبانوں اور بولیوں کی باقیات ہیں جو آریوں کی آمد سے قبل اس خطۂ ارض میں بولی جاتی تھیں۔ تتسم اور تدبھو الفاظ کے شانہ بہ شانہ اردو میں دیسی الفاظ بھی کافی تعداد میں استعمال ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ان کا استعمال اسی طرح برقرار ہے۔ ایسے چند دیسی الفاظ یہ ہیں، مثلاً پیٹ، کٹورا، کٹار، ڈھول، گھونٹ، جھاڑ، گھاٹ وغیرہ ان الفاظ کی ایک صوتی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں معکوسی (RETROFLEX) آوازوں کا بہت گہرا امتزاج پایا جاتا ہے۔

---

[1] اے کمپریٹو گرامر آف دی ماڈرن ایرین لینگویجز آف انڈیا، ہندوستانی ایڈیشن (دہلی، ۱۹۶۶ء)، ص ۱۱۲۔ اصل اشاعت ۷۲-۱۸۷۲ء

[2] دی اوریجن اینڈ ڈیولپمنٹ آف دی بنگالی لینگویج (لندن، ۱۹۷۰ء)، ص ۱۹۱ پہلی اشاعت ۱۹۲۶ء

۴۔ **عربی فارسی الفاظ:** اگرچہ اردو زبان کی اساس ہند آریائی ہے لیکن اس کے ذخیرۂ الفاظ میں عربی اور فارسی زبانوں کے بے شمار الفاظ شامل ہیں۔ فارسی ہندوستان کی مقتدر زبان تھی۔ سالہا سال تک اسے یہاں کی سرکاری، تہذیبی اور ثقافتی زبان کا درجہ حاصل تھا۔ مسلم حکمران جو ہندستان میں وقتاً فوقتاً وارد ہوتے رہے مختلف زبانیں بولتے تھے۔ ان تمام زبانوں میں فارسی کو خاص اہمیت اور مرتبہ حاصل تھا۔ اس زبان نے شمالی ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی زندگی پر بڑے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ محمود غزنوی سے لے کر مغلوں تک زیادہ تر حکمراں ترکی النسل تھے اور ترکی ان کی مادری زبان تھی۔[۴] لیکن ایرانی تہذیب و تمدن کا ان پر اتنا اثر تھا کہ ہر دور میں فارسی ہی سرکاری اور تہذیبی زبان قرار پاتی رہی۔

عربوں کی فتحِ ایران کے بعد عربی زبان کو ایران میں کافی فروغ حاصل ہوا۔ فارسی زبان کے لیے چند ردّ و بدل کے ساتھ عربی رسمِ خط اختیار کیا گیا اور عربی کے بے شمار الفاظ فارسی میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ ترکوں اور ایرانیوں کے ہندوستان آنے پر عربی بھی جو ان کی مذہبی زبان تھی یہاں آئی۔ اس طرح فارسی میں جو صدیوں تک ہندوستان کی سرکاری و تہذیبی زبان تھی بے شمار عربی و ترکی الفاظ داخل ہو گئے۔ اردو میں عربی و فارسی الفاظ براہ راست داخل نہیں ہوئے بلکہ یہ فارسی کے وسیلے سے اردو میں آئے۔ اردو نے ان الفاظ کو اپنی زبان کے مزاج و منہاج اور صوتی آہنگ کے مطابق اختیار کیا۔

اگرچہ اردو نے مختلف زبانوں بالخصوص عربی و فارسی سے بے شمار الفاظ مستعار لیے ہیں، لیکن اردو زبان کے لسانی ڈھانچے میں جو اہمیت ہندی (یعنی ہندوستانی) الفاظ کو حاصل ہے وہ کسی اور زبان کے الفاظ کو حاصل نہیں۔ ہندی الفاظ کے استعمال کے بغیر اردو کا کوئی جملہ تشکیل نہیں پا سکتا۔ جبکہ اردو میں بے شمار ایسے جملے بن سکتے ہیں جن میں ایک بھی عربی فارسی لفظ استعمال نہ ہوا ہو۔ نثر میں انشا اللہ خاں انشا کی رانی کیتکی کی کہانی اور نظم میں آرزو لکھنوی کی سریلی بانسری ایسی مثالیں ہیں جن میں بجز ہندی الفاظ، عربی فارسی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں ہوا ہے۔[۵]

۴۔ اکمل ایوبی، ''اردو پر ترکی زبان کے اثرات'' تحریر (دہلی، جنوری مارچ ۱۹۷۱ء)

۵۔ مسعود حسن رضوی ادیب، اردو زبان اور اس کا رسم خط، دوسرا ایڈیشن، (لکھنؤ ۱۹۶۱ء)، ص ۲۳

تتسم اور تدبھو الفاظ کی طرح عربی فارسی الفاظ بھی اردو میں اس زبان کے دور آغاز ہی سے استعمال ہوتے آرہے ہیں۔ ابتدائی دور میں اردو کا ارتقا ریختہ کی شکل میں ہوا۔ اس میں نہ صرف عربی فارسی الفاظ کی آمیزش ہوتی تھی بلکہ فارسی کے فقرے اور جملے بھی استعمال ہوتے تھے۔ امیر خسرو کی غزلیں اور افضل کی بکٹ کہانی اس کی بہترین مثالیں ہیں جن میں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کے فقرے، مصرعے اور محاورے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا فارسی کی نحوی ساختیں اردو میں کم ہوتی گئیں اور اردو پر فارسی کے اثرات صرف الفاظ کی حد تک ہی رہ گئے۔ اردو نے عربی فارسی الفاظ اپنے صوتی مزاج کے مطابق مستعار لیے۔ قدیم اردو تصانیف میں املا کی بے قاعدگیاں اس کا بین ثبوت ہیں۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے نصف میں اصلاح زبان کی تحریک کے زیر اثر شاعروں اور ادیبوں نے عربی فارسی الفاظ کے اصل تلفظ اور املا پر زور دینا شروع کیا۔ مرزا مظہر جانِ جاناں اور شاہ حاتم نے بے شمار تدبھو اور تتسم الفاظ متروک قرار دے کر ان کی جگہ عربی فارسی الفاظ اختیار کیے اس سے زبان میں معیاری پن پیدا ہوا۔ زبان کو معیاری بنانے کی تحریک دہلی میں اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں اور لکھنؤ میں انیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں ابھری۔

قدیم اردو میں مستعمل عربی فارسی الفاظ کی ایک طویل فہرست ہے جن میں مذہبیات، ملکی نظم و نسق، انتظام و انصرام، فوج و اسلحہ، ملبوسات، نواکہات و میوہ جات، خورد و نوش، آرائش و زیبائش، امراض و تشخیص، علاج و معالجہ، اعضائے بدن، فنونِ لطیفہ، جمالیات وغیرہ سے متعلق الفاظ شامل ہیں۔ یہ الفاظ آج بھی اردو میں اسی طرح رائج ہیں۔

اردو میں ترکی الفاظ زیادہ تر فوج و اسلحہ، ملبوسات، خورد و نوش اور سماجی القاب سے متعلق ہیں، مثلاً: توپ، توپچی، چاقو، یلغار، یورش، سپاہی، نقارہ، تمغہ، قاب، چق، چمچہ، توشک، شال، لاش، باورچی، قورمہ، قیمہ، قاش، خاتون، خان، خانم، بیگ، بیگم، بی بی، بابا، آغا، سوغات، کمک، سراغ وغیرہ۔

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی

(دوسری قسط)

جدید مشرقی تنقید کا دبستانِ شبلی

(۳)

جدید مشرقی تنقید کے جس دبستان کے شبلی امام تھے اس کے مقتدیوں میں حکیم عبدالحیٔ، عبدالسلام ندوی، حبیب الرحمن شروانی، عبدالماجد دریا آبادی، اقبال سہیل، مرزا احسان احمد، شاہ معین الدین، سید صباح الدین اور علامہ سید سلیمان ندوی کے نام خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں۔ یوں تو شبلی کی مخصوص تنقیدی روایات پچیس تیس سال کی مدت تک اردو ادب میں اثر انداز اور مقبول عام رہیں۔ اور شبلی کی تنقید کے زیر اثر ایک پوری جماعت علم و ادب کی جانب متوجہ ہو گئی۔ لیکن درحقیقت مذکورہ بالا نورتن ہی نے ان روایات کی شدت اہتمام اور کامل عقیدت کے ساتھ اتباع کی۔ اور اسے مزید آگے بڑھانے کے لیے سعی مشکور کی۔

حکیم عبدالحیٔ کی مشہور تالیف "گل رعنا" اس زمانہ کے تنقیدی لٹریچر میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس میں اردو زبان کی ابتدائی تاریخ، اس کی شاعری کا آغاز، عہد بعہد کے باکمال اردو شعراء کے صحیح حالات، ان کے منتخب اشعار اور ان کے ہر قسم کے کلام کے نمونے درج ہیں مولف نے اپنے مقدمہ میں تصریح کی ہے کہ یہ کوئی مقصود بالذات تنقیدی تالیف نہیں ہے۔ بلکہ دراصل مولف نے اپنی ذاتی بیاض مرتب کر کے، اس میں شامل شعراء کے مختصر حالات کا اضافہ کر کے شائع کر دیا ہے۔ لیکن تمام نقادوں نے لکھا ہے اور یہی صحیح بھی معلوم ہوتا ہے کہ گل رعنا کی تالیف کا بنیادی مقصد "آبحیات" کے تنقیدی تسامحات کی نشاندہی اور ان کو درست

لہ عبدالشکور: تنقیدی سرمایہ ص ۷۶، ۱۱۱

کرنا تھا۔ مؤلف کے خلف الرشید سید ابوالحسن علی نے اپنی کتاب حیات عبدالحئی میں بقول خود "آب حیات کی تاریخی فروگزاشتوں" اور "غیر محتاط مبالغہ آمیز تصویر کشی" کی چند مثالیں ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ :

"یہ آب حیات کے صاف آئینہ پر دھبہ کی طرح نمایاں ہیں ان کی تحقیق اور اصل واقعہ کا اظہار ہر اس دیانت دار مورخ کا فرض تھا جو اس موضوع پر آزاد کے بعد قلم اٹھاتا اور ہمارے علم میں گل رعنا میں سب سے پہلے اس فرض کو انجام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔"[۲]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عبدالحئی کا تنقیدی معیار آزاد سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے وہ نہ صرف قدم قدم پر آب حیات کی بیساکھیوں کا سہارا لیتے معلوم ہوتے ہیں بلکہ بعض جگہ تو اس کے بیانات لفظ لفظ آب حیات ہی سے ماخوذ ہیں۔ اسی باعث عبدالشکور کی رائے ہے کہ

" اگر آب حیات وجود میں نہ آتی تو حکیم صاحب کی بیاض خاندانی دستاویز ہی کی حیثیت رکھتی۔"[۳]

راقم کا خیال ہے کہ مولف نے گل رعنا کے سبب تالیف کی جو وضاحت کی ہے اس کے بعد اس رائے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ " یہ ایک قدیم طرز کا تذکرہ ہے جس میں تنقید کا حصہ بہت کمزور اور ناقص ہے۔"[۴] مولوی عبدالحق نے اس کتاب کی اشاعت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

" جو لوگ مولانا مرحوم سے واقفیت رکھتے تھے۔ انھیں ممکن ہے اس کا علم ہو۔ ورنہ عام طور پر لوگ اس سے لاعلم تھے کہ مولانا مرحوم اردو زبان وادب کا ایسا اچھا ذوق رکھتے تھے۔"[۵]

پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنی معروف سخت گیری کے باعث اس پر شدید ناقدانہ رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں

---

[۲] ابوالحسن علی : حیات عبدالحئی ص ۲۲۴ (اشاعت اول ۱۹۵۰ء نامی پریس لکھنؤ)

[۳] عبدالشکور : تنقیدی سرمایہ ص ۱۱۴، (ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ)

[۴] مصدر سابق ص ۱۱۱

[۵] مولوی عبدالحق : تبصرہ گل رعنا۔ رسالہ اردو اورنگ آباد، جولائی ۱۹۲۵ء

"گل رعنا میں تنقیدی حصہ کالعدم ہے ..... اگر یہ نہ لکھی گئی ہوتی تو بہتر تھا۔ اس کتاب کی تنقیدی و ادبی دنیا میں کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے بدلے کہیں بہتر ہوتا اگر مصنف گل رعنا آب حیات پر ایک مفصل ریویو لکھتے اور اس ریویو میں تفصیل کے ساتھ آزاد کی غلطیوں کا انکشاف کرتے اور نئی معلومات کی روشنی میں آب حیات میں جو خامیاں رہ گئی تھیں ان کا ازالہ کردیتے۔"[۵۶]

ارباب نظر سے کلیم الدین احمد کی اس رائے کی حیثیت مخفی نہیں، دراصل جو لوگ قدیم تالیفات کو جدید تنقیدی اصولوں کی روشنی میں پرکھتے ہیں ان کو کم از کم اس ذہنی فاصلہ کو ہمہ وقت ملحوظ رکھنا چاہیئے جو صاحب تالیف کے درمیان حائل ہے۔ میرے خیال میں خود مصنف گل رعنا نے کہیں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ یہ کتاب تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ انھوں نے تو یہ بھی نہیں لکھا ہے کہ یہ آب حیات کی فروگذاشتوں اور استدراک و تتمہ ہے۔ بلکہ اس کے برعکس انھوں نے تو پوری حقیقت پسندی کے ساتھ اس تالیف کے اغراض و مقاصد اور اس کے پیمانے اور رقبہ کا اظہار اپنے پیش لفظ میں کردیا ہے۔

یہ کسی حد تک درست ہے کہ گل رعنا کا تحقیقی پایہ کافی کمزور ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس کتاب اور اس کے فاضل مولف کے کمال اعجاز کی دلیل ہے کہ اپنے تمام تنقیدی و تحقیقی نقائص کے باوجود اس تصنیف نے اردو تنقید کے ارتقاء میں ایک ایسی اہم کڑی کی حیثیت حاصل کرلی ہے جس سے دامن بچا کر کوئی مورخ ادب گذر جانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

عبدالسلام ندوی نے اپنی پچاس سالہ تصنیفی زندگی میں مختلف موضوعات پر بہت کثرت سے مضامین لکھے مگر ان کا خاص موضوع شعر و ادب تھا۔ وہ اس کے نکتہ سنج نافد بھی تھے اور دیدہ ور محقق بھی۔ ان کی دو جلدوں پر مشتمل "شعرالہند" ان کتابوں میں ہے جنھوں نے شعر و ادب کا مذاق بنایا ہے۔ اس کے حصہ اول میں قدماء کے دور سے لے کر دور جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات و انقلابات کی تفصیل دی گئی ہے۔ اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی وغیرہ پر تاریخی اور ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔

---

[۵۶] کلیم الدین احمد: اردو تنقید پر ایک نظر ص ۶۶ (اشاعت سوم ۱۹۶۹ء)

عبدالسلام ندوی کی تنقید نگاری بھی شبلی کے زیر اثر مشرقی انداز کی تنقید کی گود میں پروان چڑھی۔ شعر الہند کی تالیف میں مولف نے جس کاوش و محنت اور جستجو و جانفشانی سے اردو شاعری کے تمام ذخیرہ کا مطالعہ کر کے اس کے ارتقا کی منزلوں پر روشنی ڈالی ہے، اس کا اعتراف ان نقادوں نے بھی کیا ہے جو مجموعی طور پر شعر الہند کے تنقیدی معیار سے مطمئن نہیں ہیں[۸]۔ بہرحال اس کتاب کو عموماً پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اس پر کافی سخت ناقدانہ رائے کا اظہار کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ اس اعتراف حقیقت پر بھی مجبور ہوئے کہ

"اپنی نوعیت میں یہ کتاب بہت عمدہ اور قابل تعریف ہے اور اس کتاب کو تصنیف کر کے مصنف نے فی الحقیقت زبان اردو کی بڑی خدمت کی ہے ..... اس میں خاص خاص باتیں ایسی ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں[۸]"

شعر الہند پر جہاں تعریف و تحسین کے پھول نچھاور کئے گئے وہیں تعریض و تنقیص کی چنگاریاں بھی برسائی گئی ہیں۔ اس قابل قدر کتاب کی تنقید میں مولوی عبدالحق، نصیر الدین ہاشمی، نیاز فتحپوری اور کلیم الدین احمد کے نام پیش پیش ہیں۔ مولوی عبدالحق نے شعر الہند کے تنقیدی پائے پر کوئی اعتراض نہیں کیا ہے بلکہ ان کا شکوہ صرف اس کتاب کے نام اور مباحث کی تشنگی تک محدود ہے[۹]۔ نصیر الدین ہاشمی کو شکایت ہے کہ مولف نے اس میں دکن کی ادبی خدمات کو نظر انداز کر دیا ہے یا کم از کم کماحقہ ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے[۱۰]۔ مگر اس کے ساتھ انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ "اگر ان فروگذاشتوں سے قطع نظر کر لیں تو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ شعر الہند اب تک کے اردو تذکروں میں ایک قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے[۱۱]"

---

۸ محمود الحسن رضوی : اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر ص ۳۰۴
کلیم الدین احمد : اردو تنقید پر ایک نظر ص ۷۱
عبدالشکور : تنقیدی سرمایہ ص ۱۸۶

۸ رام بابو سکسینہ : تاریخ ادب اردو ص ۷۶ (اردو ترجمہ عسکری)

۹ عبدالحق : تنقیدات عبدالحق ص ۹۸ (اشاعت اول ۱۳۴۲ھ حیدرآباد)

۱۰ نصیر الدین ہاشمی : مقالات ہاشمی ص ۲۵۸

۱۱ مصدر سابق ص ۲۷۸

نیاز فتحپوری نے شعر الہند کو تنقیدی کتاب تو تسلیم کیا ہے مگر وہ اس کی دوسری جلد کے بعض مباحث کے حوالے سے اس کی تنقید کو "عیب دار" قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عبدالسلام ندوی نے شاعر کے اصل رنگ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے[۱۲]۔ کلیم الدین احمد نے جنہوں نے پورے اردو ادب کا مطالعہ مغرب کی سیاہ عینک سے کیا ہے، شعر الہند کو سعی نا محمود سے تعبیر کرتے ہوئے حسب معمول سخت تنقید کی ہے۔ وہ یہاں تک لکھتے ہیں کہ،

"میں نے بہت غور کیا لیکن مجھے شعر الہند کی تالیف کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالسلام کو شعر و شاعری سے کوئی مناسبت نہیں۔ ان کی طبیعت خشک و بے رنگ ہے اور یہ خشکی و بے رنگی ہر جگہ اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت جلد اکتا جاتی ہے۔ سخن فہمی، احساس طبیعت، مذاق صحیح، تیز و تند ادراک ان اوصاف سے عبدالسلام صاحب مبرا ہیں[۱۳]۔"

عبدالسلام ندوی کی نقادانہ حیثیت کے بارے میں کلیم الدین احمد کا یہ اظہار خیال بے جا لفظی اور قلم کی بے محل نمائش سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ یہ کوئی سنجیدہ انداز نقد نہیں ہے۔ ادبی تنقید میں اس قسم کی قطعیت اور ادعائیت بغایت نادر چیز ہے۔ عبدالسلام ندوی کو خشک و بے رنگ کہنا خود نقاد کی طبع خشک کا غماز ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمن کی یہ رائے یقیناً نہایت وقیع ہے کہ:

"شعر الہند اردو زبان کی وہ مایہ ناز تصنیف ہے جو اس صف میں رکھے جانے کے لائق ہے جہاں آب حیات، مقدمہ شعر و شاعری اور شعر العجم رکھی جاتی ہے ....
شعر الہند پر تنقید و تنقیص کی چنگاریاں برابر برسائی جا رہی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ کہنے میں تامل نہیں کہ چمنستان اردو کا یہ سدا بہار پھول ہے[۱۴]۔"

عبدالسلام ندوی نے شعر الہند کے علاوہ ۱۹۴۸ء میں ایک اور تنقیدی تالیف "اقبال کامل"

---

۱۲ نیاز فتحپوری: ماہنامہ نگار لکھنؤ فروری ۱۹۲۶ء

۱۳ کلیم الدین احمد: اردو تنقید پر ایک نظر ص ۷۱

۱۴ صباح الدین عبدالرحمن: "میرے مولوی صاحب" شبلی نیشنل کالج میگزین عبدالسلام نمبر ص ۵۴

لکھی۔ اقبالیات کے ہر پہلو پر حاوی یہ جامع تالیف بے حد مقبول ہوئی۔ اور بلاشبہ اس نے ملک میں اقبال شناسی کو عام کرنے میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس میں اقبال پر اس وقت تک جو کچھ لکھا جا چکا تھا، اس کو نقدِ نظر کے ساتھ مرتب طریقہ سے یکجا کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اقبال کے سوانح مذہبیت، اخلاق و سیرت اور تصانیف پر اس میں نہایت بصیرت افروز تبصرہ ہے۔ اس کے بعد ان کی شاعری کے مختلف ادوار قائم کرکے ہر دور کے کلام پر الگ الگ تبصرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح فارسی شاعری پر ریویو ہے۔ اس کے بعد ان کے کلام کے ادبی محاسن اجاگر کئے گئے ہیں۔ پھر لسانی فروگذاشتوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ فلسفۂ خودی اور اس کے اجزا و عناصر پر تفصیلی بحث ہے۔ پھر نظریۂ ملت، تعلیم، سیاسیات، قومیات، فنونِ لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کے بارے میں ان کے خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ آخر میں اقبال کے نعتیہ کلام پر تبصرہ ہے۔ یہ ہے اقبال کامل کے مباحث کا خلاصہ۔ اس سے اس تالیف کی تنقیدی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پرنسپل عبدالشکور جنھوں نے شعرالہند کی سخت تنقیص کی ہے "اقبال کامل" کی تحسین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ ایک کامیاب تالیف ہے اور اقبالیات کے سلسلہ میں غور و فکر سے پڑھی جائے گی۔"[۱۵]

حبیب الرحمٰن خاں شیروانی فارسی اور اردو کے محقق تھے۔ ان کی تحریروں میں شبلی کا رنگ بڑی حد تک جھلکتا ہے۔ اپنے عہد کے معیاری رسائل مخزن اور زمانہ وغیرہ میں کثرت سے تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ جن کا مجموعہ "مقالاتِ شیروانی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں مولانا شیروانی نے میر حسن کے تذکرہ شعرائے اردو اور دیوان درد کو بھی اپنے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ مقالات شیروانی کے مضامین میں الفاروق، حیات جاوید، غزل فارسی، آئینۂ سکندری، اردو غزل اور مقدمہ کلیات عزیز، فارسی کے دو نایاب دیوان، تذکرہ مخزن الغرائب، مکتوبات سرور تقریظ کلام محوی اور دیوان عاشق دہلوی خاص طور پر حبیب الرحمٰن خاں کے تنقیدی شعور کے آئینہ دار ہیں۔ ان پر شبلی کے اثرات بہت گہرے اور نمایاں ہیں۔ ایک مضمون "حبیب گنج کا کتب خانہ کس طرح جمع ہوا" میں وہ بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ "اسی زمانہ

[۱۵] عبدالشکور: تنقیدی سرمایہ ص ۱۹۰

میں شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ ان کے فیض صحبت سے وسعت نظر پیدا ہوئی۔"[16]

اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں کی طرح شیروانی بھی شعر و ادب کی اہمیت کے قائل اور سوسائٹی پر اس کے اثرات کو تسلیم کرتے ہیں۔ فارسی غزل کے دورِ اول پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"نزاکت و لطافت اور استعارہ و مجاز (جو جانِ غزل ہے) معدوم ہے۔ جوش و ولولہ اور سوز و گداز بھی نہیں۔ ان صفات کے پیدا ہونے کے دو بڑے سبب ہیں۔ ایک تصوف دوسرا سوسائٹی کا رنگ۔ تصوف ان شعرا میں نہ تھا۔ سوسائٹی سپاہ کے نعروں اور ہتھیاروں کی جھنکار سے گونج رہی تھی۔ نزاکت کہاں بار پاتی۔ سوز و گداز کو مصروف کارزار سپاہی کیا جانے۔"[17]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب و شعر کو پرکھنے کے لیے گہرے سماجی شعور کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اور شاعری کو محض قافیہ پیمائی نہیں خیال کرتے۔ بلکہ حقیقی شاعری کے قائل ہیں۔ جس کے لیے قوت مشاہدہ ضروری ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے:

"وہ مغرب کے اثرات کے قائل ہیں۔ لیکن تنقید میں وہ ان اثرات کو خاطر خواہ برت نہیں سکے۔ کیونکہ عربی تنقید کے گہرے مطالعہ نے ان کو پوری طرح مشرقی رنگ میں رنگ دیا ہے۔ چنانچہ ان کی عملی تنقید میں بندش کی چستی، معنی آفرینی اور نازک خیالی وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔"[18]

عبدالماجد دریاآبادی کی بنیادی حیثیت ایک عالم و فلسفی، صحافی اور صاحب طرز انشا پرداز کی تھی۔ لیکن ان کے بعض مضامین میں گہری ادبی بصیرت اور تنقیدی رجحانات کی جھلک بھی ملتی ہے ان کے تنقیدی مضامین کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ جو "مضامین عبدالماجد" اور "مقالاتِ ماجد" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اول الذکر مجموعہ میں جوہر اور ان کی شاعری، غالب کا فلسفہ، مثنوی، جاویدنامہ، اور ضرب کلیم خاص طور پر مولانا دریا آبادی کے تنقیدی شعور کے نمائندہ مضامین ہیں۔

---

[16] حبیب الرحمٰن، مقالات شیروانی ص ۳۸۴ (شیروانی پریس علی گڈھ ۱۹۴۶ء)

[17] حبیب الرحمٰن شیروانی: مقالاتِ شیروانی ص ۸۲

[18] عبادت بریلوی: اردو تنقید کا ارتقاء ص ۲۴۷

غلام دستگیر رشید نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے :

"اردو میں ادبی نقد و تبصرہ کی تاریخ "سچ" اور "صدق" کے تبصروں اور تنقید کی قدر و قیمت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ان مضامین سے نقاد کی نکتہ رس نظر، ذوقِ انتخاب اور کھوٹے کھرے کو پرکھنے کی خاص صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔"[19]

مولانا عبدالماجد نے کہیں اپنے تنقیدی نظریات کی وضاحت نہیں کی ہے، مگر ان کی عملی تنقید سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعری میں تخیل، طرزِ ادا، لطفِ زبان، خیال کی ندرت، ترکیبوں کی صفائی اور جدت کے عناصر کو اہمیت دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مشرقی طرزِ تنقید کے ساز و سامان ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ مغربی ادبیات سے براہِ راست واقفیت رکھنے کے باوجود انھوں نے انداز تنقید کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی ہے۔ اور پوری طرح مشرقی تنقید کے اثرات کو قبول کر لیا ہے۔ دراصل یہ علامہ شبلی ہی کے آفتاب فیضان کا عکس ہے۔ وہ خود اپنے ایک مضمون "میری محسن کتابیں" میں رقمطراز ہیں :

"۱۹۰۶ء میں نیاز مقالات شبلی اور الکلام سے حاصل ہوا۔ اور اسی دم سے جادو مولانا شبلی کا چل گیا۔ تلاش ان کی اور تحریروں کی شروع ہوئی۔ انھیں پڑھتا نہ تھا بلکہ تلاوت کرتا تھا ..... مولانا کے ہر مضمون کی ایک ایک سطر بار بار پڑھنا، فقرے کے فقرے حفظ ہو گئے۔ ترکیبیں زبان پر چڑھ گئیں۔ ہم سنوں سے کہتا پھرتا بلکہ لڑتا پھرتا کہ علامہ شبلی اس دور کے مجدد ہیں۔"[20]

مولانا دریابادی کے یہاں تاثراتی تنقید کے عناصر زیادہ شدت سے نظر آتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ اس تاثراتی انداز میں ایک طرح کا خلوص اور علمیت کی شان ٹپکتی ہے جو انھیں دوسرے تاثراتی نقادوں سے ممتاز بنا دیتی ہے۔[21] تشریح و تفسیر بھی ان کی تنقید نگاری کی ایک خصوصیت ہے۔ اس سلسلہ میں اشعار کو نقل کر کے ان کا مطلب لکھنا ان کا خاص انداز ہے۔ اپنے اس تشریحی انداز

---

[19] غلام دستگیر رشید : گلہائے رنگ رنگ (دیباچہ مضامین عبدالماجد)

[20] عبدالماجد دریابادی: مضامین عبدالماجد ص ۱۷

[21] محمود الحسن رضوی : اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر ص ۴۰۰

کے باعث وہ بسا اوقات تجزیے کے راستہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کا مخصوص اسلوب نگارش بلا شبہ بڑا جاندار، بلیغ، دلچسپ اور دلکش ہے لیکن یہ تنقید کے لیے بالکل غیر موزوں ہے۔ اسلوب کو برقرار رکھنے کا خیال تنقید کی طرف سے ان کی توجہ کو اگر ہٹاتا نہیں تو کم ضرور کر دیتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ پروفیسر عبدالشکور نے اپنی کتاب میں عبدالماجد دریابادی کے تنقیدی مضامین پر کافی تفصیل سے بحث بھی کی ہے اور ساتھ ہی ان کو مولانا کے کسی بھی مقالہ میں "تنقیدی پہلو دور دور نظر نہیں آتا"۔ اپنی تنقید کے خاتمے پر وہ لکھتے ہیں:

"مولانا کو مغرب کی آبرو ریزی اور مشرقیت و اسلام کی قدر افزائی سے کہاں فرصت ملتی ہے کہ وہ خالص تنقید کی جانب متوجہ ہو سکیں۔"[۲۲]

یہ رائے غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ در حقیقت جس چیز کو عبدالشکور مولانا کی تنقید کا عیب قرار دیتے ہیں وہی ان کا سب سے بڑا کمال اور وصف ہے۔ (باقی آئندہ)

---

۲۲ عبدالشکور، تنقیدی سرمایہ ص ۱۲۳، ۱۲۹

ضروری تصحیح:

ماہنامہ جامعہ کے پچھلے شمارے (بابت ماہ مئی) میں "تذکرہ آثار الشعراء" کے صفحہ ۲۵۰ کی تیسری سطر میں نواب شاہجہاں بیگم کی جگہ نواب سکندر جہاں چھپ گیا ہے۔ قارئین جامعہ تصحیح فرمالیں۔

قسطنطین ٹیوڈوری

ترجمہ:- ڈاکٹر سید محمد اجتبار ندوی

عربی کا دیگر عالمی زبانوں پر عمل اور ردِ عمل

اموی دورِ حکومت میں مختلف علوم وفنون کے عربی ترجموں کا آغاز ہوا اس عہد میں سب سے پہلے ترجمہ کی تحریک حضرت معاویہ کے پوتے خالد بن یزید (۸۴ء) نے شروع کی، عہد عباسی میں جب ادبی سرگرمیاں بڑھیں اور خلیفہ ہارون رشید اور ان کے صاحبزادے مامون کے زمانہ میں نقطۂ عروج پر پہنچ گئیں تو عربی زبان میں — یونانی، فارسی، سریانی، ہندی، کلدانی اور مصری زبانوں میں موجود — فلسفہ، طب، منطق، فلکیات، ریاضی، تاریخ، کیمسٹری، سرجری اور دوسرے سائنسی علوم کی کتابوں کے ترجمے کئے گئے، ان ترجموں کی بدولت عربی زبان کی تاریخ میں بے مثال علمی و ادبی ترقی رونما ہوئی۔ اور اس کا دائرہ کار براعظم ایشیا، یورپ اور افریقہ تک پھیل گیا، اس کے نتیجہ میں عربی زبان ترقی کر کے ایک ایسی علمی زبان بن گئی کہ عقل اور منطق کی کسوٹی پر پرکھی وجانچی جانے لگی اور علوم وفنون کی بہت سی اصطلاحات وضع کی گئیں، نیز اس دور کے تمام معروف علوم کے لیے نئے الفاظ اور نئی تعبیریں تلاش کی گئیں۔

مفتوحہ علاقوں کی اقوام سے خلط ملط کا اثر

عربی فتوحات — جن کا دائرہ دنیا کے بہت سے خطوں تک پھیل گیا تھا — کی ابتدا ہی میں عربوں

فاضل مضمون نگار لبنانی عیسائی ہیں اور یہ مضمون "العربی" (کویت) میں شائع ہوا ہے۔
فاضل مترجم جامعہ ملیہ کے شعبۂ اسلامیات وعربی وایرانی اسٹڈیز میں ریڈر ہیں۔

کا دوسری بہت سی دوسری بہت سی قوموں سے ملنا جلنا ہوا جن سے انھوں نے ان کی زبانیں سیکھ لیں اور ان سے کچھ علوم و فنون بھی اخذ کیے ۔۔۔ خصوصاً آرامی قومیں دورِ جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی دور میں ۔۔ اس کے نتیجہ میں عربوں نے ان کی زبانوں سے بہت سے الفاظ اپنی زبان میں سمو لیے ۔ اسی طرح سریانیوں سے بھی عربوں کے روابط بڑھے اور انھوں نے ان سے بھی سیکڑوں الفاظ اپنائے ۔ خاص طور سے وہ الفاظ اور اصطلاحات جن کا تعلق زراعت، کاشت، صنعت، تجارت اور کشتی رانی سے تھا ۔ اس سلسلہ میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ عربی کے اکثر وہ الفاظ جن کا تعلق زراعت سے ہے وہ اصلاً آرامی زبان سے ماخوذ ہیں ۔

عربوں نے ۶۵۲ء میں ایران فتح کیا اور وہ اس قدیم ثقافتی و تہذیبی روایات کے حامل ملک پر پانچ سو برس تک حکمراں رہے، انھوں نے اس کی تہذیب و تمدن سے بہت استفادہ کیا، اور دوسری زبانوں کے بہ نسبت فارسی زبان کے الفاظ زیادہ اپنائے ۔ اسپین پران کا تسلط ۷۱۱ء میں ہوا اور وہاں تقریباً سات سو برس رہے ۔

عربی زبان نے اسپینی زبان پر بہت بڑا اثر ڈالا ۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ اسپینی زبان میں جتنے عربی الفاظ داخل ہوئے ہیں ان کی تعداد ایک چوتھائی سے کم نہیں، پرتگال کو ۷۱۴ء میں فتح کیا اور اس پران کی حکومت ۱۱۳۹ء تک رہی، اس کے نتیجے میں پرتگالی زبان نے تین ہزار عربی الفاظ اخذ کیے پوپ جان دی سوزا نے (J. DE SOUZA) (۱۷۲۴ - ۱۸۱۲) ۔۔ جو دمشق میں پیدا ہوا، اور اس کے والدین عربی النسل تھے ۔۔ ۱۶۰ صفحہ پر مشتمل ایک ڈکشنری (لشبونہ ۱۷۸۹ء) ترتیب دی ہے، جن میں ان تمام عربی الفاظ کی نشاندہی کی ہے جو پرتگالیوں نے عربی زبان سے اخذ کیے اور انھیں بڑی حد تک پرتگالی زبان میں ضم کرلیا ۔

ہالینڈ کے مشہور و ممتاز مستشرق آر ۔ ڈوزی R. DOZY (۱۸۲۰ء - ۱۸۸۳ء) نے عربی الاصل اسپینی و پرتگالی الفاظ پر مشتمل ڈکشنری کو مکمل کیا جس کی تصنیف ہالینڈ ہی کے مستشرق انگلمان (ENGLEMAN) لیدن "۱۸۶۹" نے شروع کی تھی یہ ڈکشنری ۴۲۴ صفحات پر مشتمل ہے، قاری کو اس سے تمام اسپینی و پرتگالی مذکورہ الفاظ کی عربی اصل معلوم ہو جائے گی ۔

عربی زبان میں عجمی الفاظ

صلیبی جنگ بازوں اور تاجروں سے عربوں کے اختلاط اور معرکوں کے دوران عرب ممالک سے فرانس کے روابط قائم ہوئے، اور الجزائر پر ۱۸۳۰ء میں فرانسیسی سامراج اور تونس پر ۱۸۸۱ء اور مراکش پر ۱۹۱۲ء کے انتداب کے بعد یہ روابط زیادہ وسیع ہو گئے، اٹلی کی بعض آزاد ریاستوں اور عرب ممالک کے درمیان ایک طویل عرصے تک تجارتی تعلقات قائم رہے جس کی وجہ سے عربی زبان میں کچھ ایسے الفاظ داخل ہو گئے جو آج تک تجارتی اور مالیاتی شعبوں میں رائج ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل الفاظ:

"روبیا، برتستو، کمبیو، کمبیالہ، بنک، سیرکولار، بورصہ وغیرہ"

اگرچہ عربوں نے دوسرے ملکوں کی طرح یونان کو فتح نہیں کیا، لیکن دور عباسی ہی سے وہ ان کے علوم و فنون اور تصانیف کو ان کی اصل زبان یا اس کے سریانی ترجموں سے عربی میں منتقل کرتے رہے، عرب مفکر ابو نصر فارابی (۸۷۳ - ۹۵۰) نے ارسطو اور افلاطون کی کتابیں پڑھیں اور دونوں کی تصنیفات کو رواج دیا اور شرحیں لکھیں۔

عیسائیت کے منظر عام پر آتے ہی عوامی یونانی زبان ان تمام مشرقی علاقوں میں پھیل گئی جو یونان کے زیر نگیں تھے، شام، مصر اور شرق ادنی کے دوسرے ممالک جنھیں عربوں نے فتح کیا وہ یونانی زبان سے روشناس تھے، اس سے انھوں نے سیکڑوں الفاظ حاصل کئے۔ ان سے سریانی زبان کے ذریعہ عربی نے خاص طور سے استفادہ کیا، اسی طرح خود یونانی زبان نے عربی کے بہت سے الفاظ اپنائے۔ اگرچہ ان الفاظ نے یونانی زبان میں مل کر ایسی شکل اختیار کر لی کہ ان کی عربی اصل کی نشاندہی کرنا بڑا دشوار ہو گیا ہے۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی زبانیں مثلاً سریانی، فارسی، یونانی، لاطینی، فرانسیسی، اطالوی، اسپینی اور ترکی وغیرہ کے الفاظ بھی عربی زبان میں داخل ہو گئے۔

سریانی الاصل الفاظ

"تاجر، رقعہ (لکھنے کے لیے کاغذ کا ٹکڑا) اجبار، جاسوس، مجلۃ، ترعۃ، بقعۃ (زمین کا

ٹکڑا)، حسن، حکیم، اسبوع، حرب، رصیف، روح، حیوان، اقنوم، رحمٰن (خدا تعالیٰ کی خاص صفت) جنت، خیاط، درب، دیر، اطلس (باریک ریشمی کپڑا) کوز (چھوٹا لوٹا) تنور، اکلیل (تاج) انبوب، تلمیذ، محی، ریح، اُس (بمعنی اساس)، اہات، بیت، ترجمہ، حشرۃ، رمیۃ، مروحۃ، زمن، نعلق ساوبۃ، زیت، سفینہ، مسجد، ساس، حانوت، کینس (یہودیوں کی عبادت گاہ) صمصام (تلوار) اور بہت سے ایسے الفاظ جنھیں ہم آج عربی الاصل سمجھتے ہیں۔

فارسی الاصل الفاظ

"استاذ، اوج (بلندی) دستور، جوق (آدمیوں کا گروہ) برہان، بستان، ربان، جھبذ (ممتاز نقاد) زندیق، دیباج، دیباچہ (کتاب کا مقدمہ یا اسی سے مشابہ، عربوں میں اسے سنہرا یا رنگین رکھا جاتا تھا) افیون، ساذج، سراب، سرادق، جزیہ، جناح (گناہ) جوہر، صک، دفتر، دیوان، خنجر، سفنجۃ (کبیالتہ) ابریق، اسطوانۃ، بازار، جام، دکان، سمار، عربون، برطیل، برنامج، طازج، طبق (جس میں کھانا کھایا جائے) طراز، خلیج، درویش، دولاب، نامی (بانسری) صرمایۃ، روزنامہ، خواجہ، خز، جاموس، بوتقۃ (ہروہ برتن جس میں دھات پگھلائی جاتی ہو) الیاقوت، المسک، القصعۃ، الفلفل، ہندام، بادنجان یا باذنجان، السرایا (سرکاری دفتر یا شاہی دربار) مارستان، نرجس، النارجیلۃ، برید، بند، صہریج، جادۃ" ان کے علاوہ کچھ اور الفاظ ہیں جنھیں عربی الاصل خیال کرکے بولتے اور لکھتے ہیں۔

یونانی الاصل الفاظ

اُسطول، فردوس، طقس (دینی روایت کے معنی میں) فلسفہ، موسیقی، برج، یرقان، کیمیاء، مینار، درہم، اقلیم، خلیفہ، اُسطور (جمع اساطیر) طقم، قرطاس، قیراط، ابرشیۃ، ابلیس، اثیر، اُرثوذکسی، ازمیل، انجیل، اسقف، الماس، اسفنج، جغرافیہ، بلسم، تلغراف، خارطۃ، دینامو، فلس، قندلفت (گرجا گھر کا خادم) ارستقراطیۃ، مقلاد (اس کی جمع مقالید) الارث، اٰحتۃ، کیلو، کیلوجرام، الناولون (سواری کی اجرت) سجل وغیرہ۔

لاطینی الاصل عربی الفاظ

اسطبل (اصطبل) امبراطور، بنزول، برکان، ربیع، بلاط (بمعنی محل) قنصل، فرن، دینار قبان، قنطار، بارجۃ، سراط، (صراط) تندیل، قناۃ، قمیص، ترانزیت، مانیفاتورا، قلنسوۃ، قیصر، کردینال، قفقہ، میل، کومسیور، کوب، کوفیۃ، جزال، البرولیتاریا، اُقۃ

یہ تمام الفاظ لاطینی زبان سے ماخوذ ہیں، اور بیشتر الفاظ یونانی اور اطالوی زبانوں کے واسطہ سے عربی زبان میں ضم ہوگئے ہیں۔

فرانسیسی الاصل الفاظ

سکرتیر، برلمان، بروتستانتی، دکتور، رادیو، طن، ملیون، ملیار، مارشال، باسبورت، بلون، بانیستار (ریشم کا باریک پٹرا) دزینہ، نوفوتیستہ، بورجوازیۃ، ماسونی، بطاریۃ وغیرہ،

اطالوی الاصل الفاظ

بریل، بنك، بورصتہ، کمبیالۃ، رصید، مبیو، دوبیا، کونترانو، فاتورۃ، اکسترا، شوکولاتہ، سیکوزناہ، بردستو، بالہ، صابورۃ (کشتی کی تہہ میں جو وزنی چیز رکھی جائے، جس سے اس کا توازن قائم رہے) قرصان (۔۔ قزاق) بیرۃ، بولیصتہ (سرکلر جیسے: بولیصتہ الشحن اور بولیصتہ التامین) وغیرہ

ان میں سے ہم بیشتر الفاظ آج بنکوں اور تجارتی کاروبار میں استعمال کرتے ہیں۔

اسپینی الاصل الفاظ

بطاطا، تبغ، ریال، الکناری (ایک قسم کا خوش الحان پرندہ) کبنا (درخت) یہ الفاظ ترکی زبان کے واسطے سے عربی میں داخل ہوئے۔

ترکی الاصل الفاظ

بارۃ (اس کی جمع "بارات" تخت کے چالیسویں حصہ کو کہتے ہیں) ترش، بیرق، ترسانۃ (جنگی

سازوسامان کا اسٹور) رخته، قنبلته، قفطان، برغی، کندرۃ وجانی، بارود، جمارک، زنکین،
جزدان، فرمان، بقلاوی وغیرہ

یہ اور ان جیسے سیکڑوں الفاظ عربی زبان میں داخل ہوئے جس سے اس کے سرمایہ میں اضافہ ہوا۔ ان کے اور اصل عربی الفاظ میں تمیز کرنا دشوار ہوگیا ہے۔ عربوں نے یہ طریقہ اپنا کر عربی ذوق ومزاج کا لحاظ رکھتے ہوئے ہزاروں الفاظ عربی قواعد وضوابط کے مطابق ڈھال لیے، انھوں نے ترجمے اخذ واشتقاق اور وضع واستعمال میں بڑی مہارت اور لیاقت کا ثبوت دیا، عجمی الفاظ کو عربی قالب میں اس طور پر منتقل کیا کہ کوئی عیب ونقص محسوس نہیں کیا جاسکا، ممتاز ماہرین لغت کے علاوہ کسی کے خواب وخیال میں نہیں آسکتا کہ لفظ " تنوعۃ " سریانی زبان سے اور " بستان" فارسی سے " برج " یونانی سے " دینار" لاطینی سے " قنبلۃ " ترکی سے " ملیون" فرانسیسی سے اور " برمیل" اطالوی زبان سے ماخوذ ہے۔

مغرب کا عربی کتابوں پر انحصار

ممتاز اور مشہور عرب علماء وفلاسفہ نے ـــ جن کا تعلق بغداد، قرطبہ، قاہرہ اور تونس سے تھا ـــ علم وفن کے ارتقاء کے لیے راہ ہموار کی، اور پانچ صدی سے زیادہ تک تہذیب وتمدن کی مشعل روشن رکھی جب کہ پورا براعظم یورپ گہری نیند میں محوخواب تھا، یورپ جب اپنی گہری نیند سے بیدار ہوا، تب اس نے عربی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کا کام شروع کیا، اہل یورپ نے عربوں کی اصل تحریروں اور تصنیفات پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ ان علوم کا بھی ترجمہ کیا جنھیں عرب علماء نے یونانی زبان سے منتقل کیا تھا، ۱۱۳۰ء میں طلیطلہ کے ہیڈ پوپ ایمانڈ کی زیر صدارت مترجمین کی ایک جماعت تشکیل دی گئی، اس جماعت نے اپنی کارکردگی سے یورپی برادری کو بڑا فائدہ پہنچایا،

پانچ سو برس تک یورپ کی یونیورسٹیاں اپنے تمام سائنسی مضامین میں عربی مولفات کی محتاج اور مرہون منت رہیں، ان کے لیے ذرائع علم ان کتابوں کے سوا کچھ اور نہیں تھے۔ پندرہویں صدی کے آخر میں یونانی کتابوں کے بالمقابل کئی گنا زیادہ عربی کتابیں توبنگین کے نصاب

میں داخل تھیں، اور اٹھارہویں صدی تک مونپلیا (MONIPELIER) کی عظیم طبی یونیورسٹی میں رازی اور ابن سینا کی مولفات پڑھائی جاتی تھیں۔

یورپی زبانوں میں عربی الفاظ کی آمیزش

عرب حکمرانی کے ابتدائی دور میں مغرب۔ اور اس کے سماج میں عربی زبان کا بڑا گہرا اثر تھا، بہت سی یورپی زبانوں میں اس کے اثرات نمایاں ہوئے، اس مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ ہم عربی سے ماخوذ یونانی، اسپینی، پرتگالی، انگریزی اور فرانسیسی الفاظ کی تعداد پیش کریں۔ جس طرح ہم نے یورپی اور دیگر زبانوں سے کسب فیض کیا اسی طرح ان لوگوں نے بھی استفادہ کیا ہے۔ اسپین نے بیشتر پھولوں اور گلابوں کے نام عربی زبان سے حاصل کئے اور برانس پہاڑ کی چوٹیوں سے گذر کر بہت سے عربی الفاظ فرانس منتقل ہوئے۔ مثال کے طور پر :

"برقوق، یاسمین، قطن اور زعفران، اسپین اور اس کے واسطے سے لاطینی امریکہ نے عربی سے بہت سارے لغوی قواعد و ضوابط، تعلیمی، معاشی اور سماجی گوشوں کے لیے اختیار کئے۔ عربوں نے ــ جو بحر روم کے پاسبان، سالار کارواں اور جہاز راں تھے ــ فرانس اور اٹلی کو لشکر، دفتر اور شکار کے سلسلہ میں بہت سے الفاظ و اصطلاحات فراہم کیں، مختصر یہ کہ وسطی دور میں عربی فلسفہ، طب اور مختلف علوم و فنون کی زبان تھی بلکہ وہ سائنس و تجارت کی مصطلحات کے دائرہ میں بین الاقوامی زبان تھی۔

مگر گذشتہ صدی کے آغاز سے معاملہ برعکس ہوگیا، عرب مترجمین اٹلی اور فرانسیسی زبان کی مختلف علوم و فنون سے متعلق تصانیف منتقل کرنے لگے۔ اس عمل نے عربی زبان میں ایک زبردست انقلاب برپا کر دیا۔ اس کے معانی، مقاصد، اسلوب اور طرز نگارش میں وسعت و عمق پیدا ہوا۔

قاہرہ میں مدرسہ "قصر العینی"[1] کے قیام نے عربی زبان کو بڑی ترقی عطا کی، وہاں کے ممتاز اساتذہ نے عصری علوم کے ضروری اور مفید حصے طالب علموں کے لیے عربی میں منتقل کئے، اور مغربی مصطلحات کے بالمقابل عربی مصطلحات وضع کیں، اس عظیم علمی کاوش کا اثر نہ صرف مصر بلکہ پورے

---

[1] ۱۸۳۷ء سے اب وہاں میڈیکل کالج اور فوجی اسپتال ہے۔

مشرق عربی پر چڑا البنان و شام میں ایک جدید علمی انقلاب کی داغ بیل پڑی، اور علوم سائنس کی تصانیف عربی میں منتقل کی گئیں، یہ انقلابی تحریک منتخب اور ممتاز اساتذہ، اور ذہین معاملہ فہم صحافیوں اور ناشروں کے ہاتھوں پروان چڑھی اور ترقی پذیر ہوئی۔

سائنس کی اصطلاحات کا پہلا عربی دائرۃ المعارف

عباسی خلیفہ مامون کے دور میں سائنس کی اصطلاحات کا پہلا عربی دائرۃ المعارف "مفاتیح العلوم" کے نام سے مرتب ہوا، اس کا مصنف ابو محمد عبداللہ محمد الخوارزمی تھا (۱) یہ دائرۃ المعارف طب، حساب، ہندسہ، فلکیات اور اس زمانہ کے دیگر علوم کی اصطلاحات پر مشتمل ہے، خوارزمی نے اپنی ایک دوسری تصنیف میں الجبرا سے متعلق بحث کی ہے اور اس کے مسائل دو تہائی موازنہ میں جیومیٹری "COORDINATION" کے ذریعہ حل کیئے گئے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خوارزمی نے دو ڈگری کے موازنہ EQUATION OF 2 DEGREES کے علاوہ اور کچھ حل نہیں کیا، جس شخص نے تین ڈگری والے موازنہ کو حل کیا اس کا نام عمر بن ابراہیم تھا۔

خوارزمی ۔ جس کی متعدد علوم و فنون سے متعلق تصانیف ہیں ۔ سب سے قدیم عرب ریاضی داں شمار کیا جاتا ہے، اس کے الجبرا اور موازنہ سے متعلق کتابوں کے لاطینی زبان میں ترجمے کیے گئے ہیں، محمد بن علی تھانوی نے (م ۱۱۴۵ھ) اصطلاحات کی ایک دوسری معجم تصنیف کی جس کا نام "کشاف اصطلاحات الفنون و العلوم" ہے جو علوم اسلامیہ میں فنی موضوعات کے لیے مستعمل ہیں۔

اس بات کے ثبوت کے لیے کہ عربی نے مختلف علوم و فنون اور ان کی وضع اصطلاحات کے سلسلہ میں گرانقدر اور عظیم خدمات انجام دی ہیں اور عملی طور پر حصہ لیا ہے، وہ تمام تحریریں پیش

---

(۱) مفتاح العلوم کے مصنف خوارزمی کے بارے میں معلوم ہے کہ اس کی وفات ۳۸۷ھ میں اور مامون عباسی کا زمانہ یا اس کا دور حکومت اس کے بھائی امین کے قتل ۱۹۸ھ سے شروع ہوا اور مامون کی وفات ۲۱۸ھ پر ختم ہوا، سو مامون اور خوارزمی کی وفات کے درمیان تقریباً ۱۶۹ برس کا فرق ہے نیز یہ کتاب معجم ہے دائرۃ المعارف کسی طرح بھی نہیں کہی جا سکتی۔

کی جاسکتی ہیں جنھیں محمد بن زکریا رازی (۸۶۴ تا ۹۳۲ء) نے لکھی ہیں۔ یہ طب اور کیمیا میں بڑی شہرت کے مالک ہیں، اور جالینوس عرب کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں، اور سترھویں صدی عیسوی تک یورپ میں سند و حجت کے درجہ پر فائز تھے۔

اس سلسلہ میں الشیخ الرئیس ابن سینا (۹۸۰ - ۱۰۳۷ء) کی طب، فلسفہ اور تصوف کے بارے میں مکتوبہ تحریریں بھی روشن مثالیں ہیں، یورپ نے ان کی تصانیف کے ترجمے اپنی زبانوں میں کیے اور ان کتابوں پر اعتماد و بھروسہ اور انحصار کیا، ابن الہیثم نے (۹۶۵ تا ۱۰۳۹ء) ریاضی، طبیعات اور فلسفۂ ارسطو سے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ امراض چشم سے متعلق اس کی کتاب "علم المناظر" ان کتابوں میں شامل ہے جس کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا، عصر وسطی میں روجر بیکون ROGER BECON (۱۲۱۴ء) تک یہ کتاب یورپ کے نصاب درس میں تھی، اس کے علاوہ ابو الریحان البیرونی (۹۷۳ تا ۱۰۴۸ء) جو ریاضیات، فلکیات، طب، تقادیم، تاریخ اور یونانی و ہندی علوم میں ممتاز اور شہرۂ آفاق تھا، اس کی تصانیف میں سے "الآثار الباقیۃ من القرون الخالیۃ" ۱۸۳۸ء میں لیپزج LEPZIG میں طبع ہوئی۔ ان کے علاوہ اور دوسرے عرب علماء و فلاسفر کی تحریروں اور تصانیف سے مغربی دنیا نے بہت زیادہ کسب فیض کیا۔

جدید علوم کی تعبیر اور ترجمانی کے لیے عربی زبان کی صلاحیت

گذشتہ صدی کے آخر اور موجودہ صدی میں کچھ ایسے سائنسی معاجم ترتیب دیے گئے کہ جس میں اس کے مصنفوں نے عربی علوم سے کچھ زیادہ استفادہ نہیں کیا اور قدیم عربی اصطلاحات کے استعمال کی جانب توجہ نہیں کی، نیز علمی حقائق کی تعبیر و ترسیل میں دقت نظر اور بحث و تمحیص سے کام نہیں لیا، جس کے نتیجہ میں یہ معاجم عجلت پسندی اور غلطیوں سے خالی نہ رہ سکے، اور اس میں غیر ملکی اثرات کی آمیزش ہوئی، جب کہ ان مصنفوں کو چاہیے تھا کہ ان معاجم کے مندرجہ ذیل الفاظ و اصطلاحات کا استعمال اس طور پر کرتے کہ غیر ملکی اصطلاح کے لیے صحیح لفظ و شکل رونما ہو جاتی، اس کا طریقہ حسب ذیل تھا:۔

(۱) اشتقاق کے ذریعہ، یعنی ایک کلمہ دوسرے کلمہ سے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے بنایا جائے کہ ان دونوں کے اعداد معنی قریب ہوں۔
(۲) تعریب کے ذریعہ، یعنی اجنبی لفظ کو عربی قالب میں ڈھال لینا، اسے "دخیل" کہتے ہیں، جسے عربی قواعد کے مطابق منتقل کیا جائے۔
(۳) نحت کے ذریعہ۔ یعنی ایک کلمہ کا دو کلمات سے مرکب کرنا بشرطیکہ ہر ایک کے معنی واضح اور نحت کی اصطلاح کے مطابق ہو۔
(۴) اصل کے مطابق الفاظ کا انتخاب کیا جائے۔
(۵) ترجمہ کے ذریعہ، یعنی اس مغربی لفظ کا ترجمہ، جسے کسی جدید معنی یا اصطلاح کے لیے استعمال کیا گیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ ہم لوگ اپنے علمی وفنی معاجم کی ترتیب اور تالیف میں مندرجہ بالا پانچوں وسائل کیوں نہیں اختیار کرتے، جب کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ عربی زبان میں صلاحیت، لیاقت اور الفاظ کے ضم کرنے، سمونے، بڑھانے اور ترمیم واضافہ کی بڑی گنجائش ہے۔ انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ وضع، نحت، اشتقاق اور دوسری شکلوں سے تبدیل و ترمیم کرسکتا ہے، اس کی ایک طویل تاریخ ہے جو بڑے عظیم سرمایہ کی حامل ہے، اس کی ترقی و نمو کے لیے بہت سے مواد جمع ہوگئے تھے، جس کے ذریعہ وہ زمانہ کے ساتھ ساتھ رواں دواں رہی، عربی زبان کی وسعت صلاحیت، اصالت اور قوت و نکھار بلکہ اس کے ترقی پذیر اور جدید علوم کی ترجمانی کی صلاحیت کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس نے ترقی و عروج کے دور میں علمی اور فنی اصطلاحات کے لیے تمام ضروری وسائل و مواد اور الفاظ و تعبیریں فراہم کیں اور اس سے غیر ملکی زبانوں نے بہت کچھ اخذ کیا، اور بہت سی اصطلاحات اور الفاظ کی ساخت و ترکیب میں استفادہ کیا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے دائرۃ المعارف میں سال بہ سال بڑے بڑے ضمیموں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے، ان مغربی اصطلاحات میں وہ افریقی، ایشیائی اور ہندوستانی الفاظ کا ذخیرہ بھی شامل ہے جو ان قوموں کی زبانوں پر جاری و ساری ہیں۔ انھیں یہ الفاظ منتقل ہونے والے فوجیوں کے ذریعہ حاصل ہوئے۔ اسی بنا پر برطانیہ اور فرانس کی علمی

حوی اکادمیوں نے اپنے معاجم میں ان الفاظ کو سمولیا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک عوام میں رائج و مستعمل الفاظ اصل زبان کے الفاظ کی طرح ہیں، جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، تاکہ زبان جمود کا شکار نہ ہونے پائے اور اس کی ترقی کی راہیں مسدود نہ ہو جائیں۔

شذرات (بہ سلسلہ صفحہ ۲۷۸)

جناب بشیر احمد ڈار کی وفات ۲۹ مارچ کو ہوئی اور چونکہ ہندوستان و پاکستان کے درمیان مواصلات کا سلسلہ خاطر خواہ نہیں ہے اس لیے یہ اطلاع ہمیں بہت تاخیر سے جون کے اواخر میں ملی۔

مرحوم پاکستان کے مشہور ادیبوں اور ممتاز ماہرین اقبالیات میں سے تھے اور اردو و انگریزی دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے، نیز ان کا خصوصی مضمون فلسفہ تھا، اس لیے ان کی کتابیں اور مضامین انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ہیں اور زیادہ تر فلسفیانہ موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ مرحوم کو علامہ اقبال سے گہری عقیدت اور محبت تھی اس لیے ان کی بیشتر کتابیں اور مضامین اقبال سے متعلق ہیں۔ اس مختصر وقت میں ان کی جو کتابیں مل سکیں، یا جن کی تفصیلات معلوم ہو سکیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

اردو میں: (۱) حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق (۱۹۵۸) (۲) تاریخ تصوف قبل از اسلام (۳) انوار اقبال (مارچ ۱۹۶۷) (۴) پاکستان کیوں؟

انگریزی میں:- (۱) فلسفۂ اقبال کا مطالعہ (۱۹۴۴) (۲) اقبال اور ما قبل کانٹ کا فلسفۂ ارادیت (۱۹۵۶) (۳) اقبال کے خطوط اور تحریریں (۱۹۶۷) (۴) سید احمد خاں کے مذہبی خیالات (۵) قرآنی اخلاقیات

موصوف کا سنہ پیدائش ۱۹۰۸ء ہے، اس طرح قدرت نے گویا انھیں ۷۱ سال کی عمر عطا کی اور انھوں نے اسے تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف جیسے معزز کام میں صرف کیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین!

ڈاکٹر رشید الوحیدی

صبر۔ اصلاح معاشرہ کا ذریعہ

صبر کی ایک تو دینی اور شرعی حیثیت ہے جس کی اپنی جگہ پر بڑی اہمیت ہے۔ اس کی اسی حیثیت اور اہمیت کی وجہ سے اس کو باجماع امت واجب کیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں کم و بیش انتی سے زیادہ مقامات پر متعدد طریقوں سے صبر کا ذکر ملتا ہے۔ کہیں امر کی صورت میں ذکر ہے۔ یاایھا الذین آمنوا اصبروا۔ اے ایمان والو صبر سے کام لو۔ (وجوب تو اس امر ہی سے ثابت ہو جاتا ہے)، امر کی دوسری مثال: یاایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔ اے ایمان والو اللہ کی مدد صبر اور نماز کے ذریعہ طلب کرو۔ یہاں صبر کو نماز کے ساتھ ذکر کر کے اس کی اہمیت اور بھی واضح فرمادی گئی۔ ایک جگہ اور صبر کے لیے حکم کا یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ نماز اور صبر کے ذریعے مدد حاصل کرو۔ ایک جگہ صبر کو اولوالعزم انبیاء کرام کا وصف بتا کر حکم دیا گیا ہے کہ تم بھی انہی کی طرح صبر کرو اور اس کے ساتھ ہی بے صبری سے روکا بھی گیا ہے: واصبر کما صبر اولوالعزم من الرسل ولا تستعجل لھم۔ کہیں صابرین کی خدا نے تعریف فرمائی، ان کو نیک لوگوں کے زمرے میں شامل فرمایا چنانچہ ایک جگہ صالح بندوں کا شمار خدا نے صبر کرنے والوں سے شروع کیا۔ الصابرین والصادقین والقانتین والمستغفرین بالاسحار۔ صبر کرنے والے، راست باز، نیک لوگ سحر کے وقت توبہ کرنے والے، اور ایسے ہی نیک لوگوں کے لیے قرآن نے فرمایا۔ اولٰئک الذین صدقوا واولٰئک ھم المتقون۔ ایسے ہی لوگ سچے اور راست باز اور وہی لوگ خدا سے ڈرنے والے ہیں۔ پھر کہیں ان کو

ڈاکٹر رشید الوحیدی، لکچرر شعبۂ اسلامیات و عربیہ وایرانین اسٹڈیز۔ جامعہ ملیہ۔ دہلی

یا بت کا یقین دلایا گیا واللہ یحب الصابرین ۔ اللہ پاک صبر کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے ۔
کہیں صبر والوں کے ساتھ اپنی معیت ظاہر فرمائی ۔ واصبروا ان اللہ مع الصابرین ۔
صبر کرو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۔ ایک جگہ ان کو جنت کی بشارت دی گئی وبشر الصابرین
بہترین بدلے کا وعدہ فرمایا گیا ۔ ولنجزین الذین صبروا اجرھم باحسن ما کانو یعملون
صبر کرنے والوں کو بہت اچھا اور پورا پورا بدلہ ملے گا ۔ اور ایک موقع پر تو بلا حساب وشمار انعامات
کا وعدہ ہے ۔ انما یوفی الصابرون بغیر حساب ۔ اس طرح سولہ سترہ طریقے اور
اسلوب قرآن نے صبر کے ذکر میں اپنائے ہیں ۔ مقصد اللہ کے بندوں کو صبر پر آمادہ کرنا اور اس
کے ذریعے خدا کی رضامندی اور قربت کا حصول ہے ۔ قرآن پاک کے علاوہ احادیث اور اقوال
صلحاء سے بھی صبر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

ایمان کے لیے صبر کی وہی حیثیت ہے جو جسم کے لیے سر کی ہے جس طرح بغیر سر کے جسم کا وجود
محال ہے اس طرح بغیر صبر کے ایمان بھی نہیں ہے ۔ حضرت عمرؓ اکثر فرماتے تھے ۔ خیر عیش اد
ادرکناہ فی الصبر " بہترین زندگی ہم نے صبر میں پائی ہے ۔ ایک صحیح حدیث میں حضورؐ نے صبر کو " نور "
فرمایا ہے نیز آپؐ نے فرمایا : مومن کے لیے کس قدر خوشخبری اور خوش نصیبی ہے کہ اس کے لیے غم
اور خوشی دونوں حالتوں میں فائدہ رکھا گیا ہے آپؐ نے فرمایا : ان اصابتہ سراء شکر فکان
خیر لہٗ وان اصابتہ ضراء صبر فکان خیر لہٗ ۔ کسی کو مسرت ملی اس نے شکر کیا تو اس کے
لیے بھلائی ہے اور کسی کو رنج پہنچا اس نے صبر کیا اور اس کے لیے بھی بھلائی ہے ۔ حضورؐ نے ہر قسم کی کامیابی
اور فلاح صبر کے اندر فرمایا ہے : اعلم ان النصر مع الصبر جان لو کامیابی صبر میں ہے ۔

غرض قرآن ، حدیث اور اقوال صلحاء میں سے یہ چند مثالیں مشتے نمونہ از خروارے پیش کی
گئیں جس سے دینی لحاظ سے صبر کی اہمیت اور اس کے اخروی فوائد کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے ۔
اب ہمیں ایک دوسرے پہلو سے صبر کے موضوع پر غور کرنا اور اس کی تفصیلات کا جائزہ لینا ہے ۔

اگر ہم صبر کی حقیقت اور اس کے متعدد اقسام کا ذرا گہرائی سے مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے
کہ صبر بھی دیگر اخلاقِ فاضلہ کی طرح انسانی برادری اور سوسائٹی میں ایک عظیم اصلاحی انقلاب کا
ضامن ہے اور معاشرت میں اس کی وجہ سے سکون و اطمینان کی فضا پیدا ہوسکتی ہے ۔

عرفِ عام میں ضبط و تحمل اور خاموشی کے ساتھ کسی پریشانی اور مصیبت کو جھیل جانا صبر کہلاتا ہے یا کسی فیصلے کو خواستہ یا ناخواستہ اس طرح قبول کرلینا کہ اس پر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہ ہو، یہ بھی صبر کہلاتا ہے۔ مگر اس کے علاوہ بھی یہ لفظ اپنے اندر ایک جہاں معنی پوشیدہ رکھتا ہے جس کے اثرات بے شک بہت دور رس ہیں۔

صبر کے جو لغوی معنی ہیں وہ عام معنی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں، مثلاً الصبر فی اللغۃ الحبس والکف : لغت میں صبر کے معنی رک جانے محبوس اور پابند کرنے کے ہیں قرآن پاک سے بھی اس معنی کی تائید ہوتی ہے۔ اللہ کے نیک بندوں کی معیت اور رفاقت کے لیے کہا گیا ہے : واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغداوة والعشي يريدون وجهه (اپنے آپ کو ان بندوں کے ساتھ رکھو جو صبح شام اللہ کو اس کی رضا کے لیے یاد کرتے ہیں) تقریباً یہ وہی مفہوم ہے جو عرفِ عام میں سمجھا جاتا ہے کیونکہ مصائب اور ناپسندیدہ امور پر ضبط و تحمل کے ذریعہ واویلا اور جزع و فزع سے خود کو روکے رکھنا عرفِ عام میں بھی صبر کہلاتا ہے۔ کبھی زبان کو شکوہ شکایت سے روکا جاتا ہے کبھی نفس کو شور و ہنگامہ اور جزع و فزع سے روک لیا جاتا ہے اور کبھی اعضاء ظاہری کو بے چینی اور تشویش سے روکا جاتا ہے، یہ سب صبر ہی کی مختلف صورتیں اور قسمیں ہیں۔

صبر کی تین قسمیں ہوسکتی ہیں، پہلی یہ کہ : نفوسِ انسانی پر احکامِ الٰہی، خواہ وہ معاملات سے متعلق ہوں یا عبادات سے عموماً شاق ہوتے ہیں۔ عبادات کے باب نماز، روزہ، زکوٰۃ، صدقات خیرات، تلاوت کلام پاک، نصیحت کا سننا اس کو قبول کرنا، نیز عبادت سے متعلق دوسرے امور۔ معاملات کے باب میں، حقوق انسانی، ماں باپ، اعزا و رشتے داروں کے حقوق پھر پڑوسیوں اور اہلِ وطن کے حقوق، ملازمت، تجارت، زراعت اور بیع و شرع میں ایمانداری، لین دین میں دیانت داری وعدے اور عہد کی پابندی، حفظِ مراتب، زبان، آنکھ، ہاتھ، پیر کا جائز اور صحیح جگہوں پر استعمال، یہ سب انسان کی فطرت اور اس کے طبع آزاد پر طوق و سلاسل کی گراں باری سے کہیں زیادہ بوجھ اور قید ہے۔

اگر انسان اپنے نفسِ امارہ اور طبع آوارہ کی تمام سرکشی، آزادی اور بے راہ روی پر پابندی

عائد کر کے اور روک لگا کر ان چیزوں میں احکام الٰہی اور اس کے قانون کی پابندی کرتا ہے تو یہ صبر کے مقام پر فائز کہلائے گا۔ اور چونکہ اس نے ان احکامات پر عمل کے لیے اپنے نفس کو پابند بنایا، اطاعت خداوندی کو ہر طرح ملحوظ رکھا تو یہ صبر علی طاعۃ اللہ ہوگا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ نفس انسانی فطرتاً معصیت اور جرم کوشی پر بہت جری ہے یہ نفس عیار سو سو بھیس بدل کر ہزار ہا تاویلات کے پردے میں غیر اخلاقی حرکتوں اور گناہ کے کاموں کے لیے وجہ جواز تلاش کر لیتا ہے۔ امور قبیحہ اور اعمال بد کی طرف تیزی سے مائل ہوتا ہے ایسی صورت میں نفس کو ان باتوں سے روکنا، خود کو بدی کے قعر مذلت میں گرنے سے بچائے رکھنا یہ صبر عن معصیۃ اللہ۔

تیسری قسم صبر علی امتحان اللہ امتحان ارضی و سماوی دونوں طرح کا ہوتا ہے۔ کبھی وبا، قحط، سیلاب اور خشک سالی کے روپ میں اور کبھی بیماری، موت، تلف اموال کی صورت میں بہر حال یہ بہت مشکل مقام ہے مگر جن لوگوں کی نگاہ میں فرمان الٰہی: ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ (کوئی مصیبت اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آتی) ان کے لیے یہ مرحلہ آسان ہے۔ اطاعتِ الٰہی اور ترک معاصی میں انسان کو اختیار حاصل ہے مگر آفات میں انسان مجبور ہے اور اس اختیار و جبر کی وجہ سے اطاعت و معاصی میں صبر پر ثواب بھی زیادہ ہے۔ ایک شخص کو کوئی ناپسندیدہ اور بڑی چیز مرغوب ہے اسے اس چیز کے کرنے اور چھوڑنے پر پورا پورا اختیار بھی حاصل ہے تو اس کا یہ صبر اس صبر کے مقابلے میں جو اس نے کسی بیماری یا مصیبت پر کیا ہے، زیادہ اہم اور قابل قدر ہے کیونکہ پہلی صورت میں وہ باوجود قدرت کے محض اللہ کے خوف سے خود کو ارتکاب جرم سے روک لیتا ہے جب کہ دوسری صورت میں وہ صبر کے لیے مجبور ہے، اگرچہ اجر سے یہ دوسری صورت بھی خالی نہیں ہے مگر افضیلت میں یہ پہلی صورت کو نہیں پہنچ سکتا، امام ابن تیمیہ نے اس کی بہت عمدہ مثال دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "حضرت یوسفؑ نے ایک صبر اس وقت کیا تھا جب ان کے بھائیوں نے انھیں کنویں میں دھکیل دیا اور چھوڑ کر چلے گئے" اور دوسرا صبر اس وقت کیا جب امراۃِ عزیز نے انھیں گناہ پر مجبور کیا مگر وہ اس پر تیار نہیں ہوئے اور اپنے نفس کو محفوظ رکھا۔ پہلی صورت صبر علی امتحان اللہ کی ہے، وہاں صبر کے سوائے

ہی کیا تھا اور دوسری صورت صبر عن معصیۃ اللہ کی ہے جس میں حضرت یوسف ؑ کو پورا اختیار حاصل ہے۔ پھر وہ خود نوجوان ہیں۔ زلیخا ایسی حسین شریف با عزت عورت گناہ پر مائل بلکہ اصرار کر رہی ہے پردیس میں ہیں جہاں اہل وطن اور اہل خاندان پر بدنامی کا کوئی خطرہ نہیں ہے، عزیز مصر موجود نہیں ہے محل میں کسی کے آنے کا امکان نہیں ہے، غرض گناہ پر آمادہ کرنے والے اسباب نہایت قوی ہیں۔ حضرت یوسف ؑ نے ان تمام دواعی و محرکات کے باوجود خود کو گناہ سے روکا اور صبر سے کام لیا، ظاہر ہے یہ صبر خدا کے اور عقل سلیم کے نزدیک زیادہ افضل ہے۔

ترک معصیت کے مقابلے میں چونکہ ادا ء طاعات کا وظیفہ و عمل شارع کی نگاہ میں زیادہ محبوب ہے اس لیے لازمی طور پر صبر عن معصیۃ اللہ کے مقابلے میں صبر علیٰ طاعۃ اللہ کی اہمیت بھی زیادہ ہے۔ اس بات کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ترک معصیت اصل میں ایک ذریعہ ہے جس سے اطاعت کی تکمیل اور اس میں حسن پیدا ہوتا ہے یعنی شارع کی نگاہ میں اطاعت اصل مقصود ہے، اب اس اصل مقصود میں جو چیزیں کمزوری پیدا کرنے والی ہیں ان کو چھوڑنا بھی ضروری ہے جیسے اصل مقصود یہ ہے کہ حلال چیزوں کو استعمال کرو تو اس کا تقاضا ہے کہ حرام چیزوں سے بچو یا انسانی جان کا احترام مقصود ہے تو ضروری ہے کہ قتل ناحق سے بچا جائے یا تجارت اور حلال نفع کا حکم دیا تو ربوا اور سود سے اجتناب لازم ہوا، چونکہ ان تمام اوامر اور اطاعات کو ضعف و اختلال سے بچانا تھا اس لیے ان کے مقابلے میں ایسے کاموں سے روک دیا گیا جو اس کے برعکس ہیں اور معاصی کی فہرست میں آتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ مقصود اصلی اطاعت الٰہی ہیں اور ترک معصیت ان اطاعات کو مکمل کرنے کے لیے ہے۔ بہرحال صبر ہو یا کوئی دوسرا اصلاحی اور اخلاقی عمل، طبیعتِ انسانی ہر اچھی بات سے بھاگتی ہے اور مشکل ہی سے عادت پڑتی ہے، پھر صبر کا مرحلہ کچھ زیادہ ہی مشکل تھا اسی لیے صبر کی مزید تین قسمیں حکماء نے کیں: صبر باللہ، صبر للہ، صبر مع اللہ اور ان سب کے معنی ہیں اللہ کی توفیق، اس کی محبت اور استعانت کا مفہوم شامل ہے۔ صبر باللہ = صبر بقوۃ اللہ ومعونہ۔ اللہ کی مدد اور اس کی قوت سے صبر کی توفیق حاصل کرنا۔

صبر للہ = رجاءً ثوابہ وخوف عقابہ، اللہ سے ثواب کی امید میں یا اس کی سزا کے

خوف سے صبر کرنا۔ صبر لِلّٰہ کی تفسیر یوں بھی کی گئی ہے۔ وَھو ان یکون الباعث لہٗ علی الصبر محبۃ اللّٰہ وارادۃ وجھہ والتقرب الیہ۔ صبر پر آمادہ کرنے والی صرف اللہ کی محبت اس کی رضا کی طلب اور اس کی قربت کا حصول ہے۔

صبر مع اللّٰہ، جعل نفسہ وقفاً علی اوامر اللّٰہ۔ نفس کو اللہ کے حکم کے لیے وقف کر دینا۔ یہ تیسرا مرحلہ نسبتاً ان دونوں سے سخت ہے۔ نفس اور خواہشات کے تمام تقاضوں کو چھوڑ کر خدا کے احکامات کی ادائیگی کے لیے ہر وقت خود کو تیار رکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ حضرت جنیدؓ فرماتے ہیں: المسیر من النفس الی اللّٰہ صعب شدید۔ نفس سے خدا کی طرف چلنا بہت مشکل کام ہے۔ اس مشکل کو حضرت جنیدؒ نے دوسری طرح بھی بیان کیا ہے: الصبر تجرع المرارۃ من غیر تعبس۔ صبر کیا ہے؟ خوشی خوشی کڑوا گھونٹ پینا ہے۔

خواصؒ نے صبر کی نہایت جامع تعریف فرمائی ہے جس سے شریعت کے بھی تمام تقاضے پورے ہوتے ہیں: ھو الثبات علی احکام الکتاب والسنۃ۔ صبر کتاب وسنت پر پوری طرح قائم رہنے کا نام ہے۔ بعض بزرگوں نے فرمایا: الصبر ھو الاستعانۃ باللّٰہ۔ صبر اللہ سے مدد چاہنے کا نام ہے۔ ایک حکیم نے صبر کے لفظ ہی سے اس کی تعریف کی ہے، فرماتے ہیں:

"الصبر مثل اسمہ مُرٌّ مذاقہ لکن عواقبہ احلیٰ من العسل"۔ صبر اپنے نام کی طرح ہے (صبر ایلوا کو بھی کہتے ہیں جو بہت کڑوا پھل ہے) اس کا مزا کڑوا ہے لیکن اس کا نتیجہ شہد سے زیادہ شیریں ہے۔ ایک عاشق صادق کا قول ہے: الصبر ان ترضیٰ بتلف نفسک فی رضاء من تحبہ۔ جس سے محبت ہو اس کی رضا اور خوشی کے لیے اپنے نفس کو قربان کر دینا صبر ہے۔ ابو علی دقاقؒ کا قول ہے: فاز الصابرون بعز الدارین لانھم قالوا من اللّٰہ معیتہٗ (ان اللّٰہ مع الصابرین) صابر دونوں جہاں کی دولت سے سرفراز ہے کیونکہ اسے خدا کی معیت نصیب ہے۔ (اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

ایک نہایت واضح مگر جامع قول یہ بھی ہے: الصبر ھو ترک الشکویٰ۔ صبر شکوہ شکایت چھوڑ دینے کا نام ہے۔ امام تیمیہؒ اسی ترک شکوہ کو صبر جمیل کہتے ہیں جس کا ذکر قرآن پاک میں بھی ہے۔ صبر کی اس تعریف کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ شکوہ کرنے والا اکثر اوقات بالکل غیر شعوری

طور پر لاعلمی میں ان آفات ارضی وسماوی کا شکوہ ایک دوسرے سے کرنے لگتا ہے جن کا فاعل اور خالق اللہ ہے۔ یہ بات صبر کے منافی ہے اور خدا کی شان میں گستاخی بھی، کیونکہ اللہ کے معاملات کی انسان سے شکایت کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ خالق کی شکایت مخلوق سے اور آقا کی شکایت غلام سے کی جا رہی ہے، ایسے ہی ایک واقعہ کا ذکر ہے: ایک شخص نے کسی دوسرے شخص سے اپنی مشکلات اور تنگیٔ رزق کی شکایت کی، اس نے انتہائی حیرت سے کہا: یاھذا اَتشکو من یرحمک الی من لا یرحمک۔ اے آدمی تو ایک رحم کرنے والی ذات کی شکایت اس سے کر رہا ہے جو رحم نہیں کرتی (اللہ کی شکایت انسان سے) اس کے بعد حسب ذیل دو شعر پڑھے:

" واذا عرفك بلیّۃ فاصبر لھا | صبر الکریم فانّہ بك اعلم
واذا شکوت الی ابن آدم انما | تشکوالرحیم الی الذی لا یرحم "

جب تجھ کو کوئی مصیبت پیش آئے تو اس پر اللہ کے لیے صبر کر کیوں کہ وہ تیرے حال سے بخوبی واقف ہے اور اگر تو کسی انسان سے اس مصیبت کی شکایت کرے گا تو یہ گویا رحیم کی شکایت ہوگی سے ہوگی جو رحم کرنا نہیں جانتا"

اس تفصیل کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ایک اچھے سماج اور پرسکون ماحول کے لیے صبر علی طاعۃ اللہ یعنی اچھے اخلاقی اصولوں پر خود کو پابند کر لینا اور صبر عن معصیۃ اللہ یعنی ہر قسم کی معاشرتی برائیوں سے آپ آپ کو روک لینا، یہ دونوں خوبیاں اپنے اندر پیدا کرنی ہوں گی۔ خود کو اچھا بنا کر پیش کرنا ہوگا۔ اور دوسروں کی برائی سے چشم پوشی، عفو اور درگذر سے کام لینا ہوگا۔ ظاہر ہے اس میں صبر کا کڑوا گھونٹ تو پینا ہی پڑے گا لیکن جیسا کہ پیچھے گذرا ہے، عواقبہ احلی من العسل اس کا نتیجہ شہد سے زیادہ شیریں برآمد ہوگا۔ انسان دوسروں کے عمل اور کردار کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اپنے اندر یہ اسپرٹ پیدا کرلے تو آہستہ آہستہ یہ عملی نمونہ پورے ماحول پر اثر انداز بھی ہو سکتا ہے۔ نیز اس صورت میں اچھے افراد سے جو سماج ترتیب پائے گا، وہ خود بھی پسندیدہ ہوگا۔ قرآن پاک میں تہذیب نفس اور تکمیل اخلاق نیز ایک اسلامی ماحول کی تشکیل کے لیے جو پیغام ملتا ہے۔ غور و فکر کے ساتھ ساتھ اگر ان پر عمل بھی کیا جائے تو بے شک مطلوبہ نتائج برآمد ہوں گے، اگرچہ ہر ہر قدم پر صبر کی ضرورت پڑے گی۔

اب دیکھئے قرآن نے کہا ہے" ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو ولا یغتب بعضکم بعضاً ظاہر ہے غیبت سے دلوں میں نفاق جنم لیتا ہے۔ دشمنی بڑھتی ہے آپس کی محبت ختم ہو جاتی ہے۔ ماحول بڑا گھناؤنا اور تنگ ہونے لگتا ہے۔ شک وشبہ اور بے اعتمادی کی فضا عام ہو جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ پورے صبر کے ساتھ اس اصول کو اپنایا جائے۔

قرآن پاک نے فرمایا ہے اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم۔ بدگمانی سے بچو کیونکہ بعض بدگمانی گناہ بھی ہوتی ہے۔ کسی کے بارے میں بلا تحقیق بدگمانی قائم کر لینا ایک اخلاقی جرم ہو سکتا ہے۔ تم بدگمانی کی وجہ سے کوئی فیصلہ کر بیٹھو پھر گنہگار بھی ہوگے اور اس شخص کے خلاف ایک غلط مفروضے کی بنیاد پر تمہارے دل میں نفرت بیٹھ جائے۔ خوشگوار تعلقات میں فرق پڑ جائے۔ اتحاد و محبت پارہ پارہ ہو جائے، یہ اسلام کی روح اتحاد کے منافی ہے۔ نیز اس صورت میں ایک بہت بڑا سماجی نقصان بھی ہوگا۔

ایک اور جگہ ہے ولا تجسسوا کسی کے معاملات میں تجسس نہ کرو۔ ایک شخص کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ اور رنج کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص اس کے ذاتی معاملات اور نجی زندگی کے بارے میں تجسس سے کام لے، چھپ چھپ کر اس کی نجی باتوں کا پتہ لگائے یہ عیب بھی سوسائٹی کے لیے سم قاتل ہے۔

معاملاتی زندگی کا ایک زریں اصول بتایا گیا ہے اوفوا بالعہد ان العہد کان مسئولاً اپنے عہد کو پورا کرو عہد کے بارے میں تم سے سوال ہوگا۔ ایفاء عہد شیوۂ مردانگی بھی ہے اور بقاء امن و محبت کی ضمانت بھی اسی لیے اس حکم کو اختیار کرنے اور اس پر عمل کرنے میں جس صبر کی ضرورت ہے اس کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے کیونکہ اس کے مقابلے میں عہد شکنی، دھوکہ دہی، غداری، عیاری کے ہلاک نتائج ہی تو ہیں جنھوں نے قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔

اسی طرح مختصراً بعض دوسری برائیوں پر نظر ڈالیے۔ جنہوں نے روزمرہ کی زندگی کو گھن کی طرح کھا لیا ہے۔

کاش ان برائیوں سے روکنے کے لیے جو علاج بتایا گیا ہے، پورے صبر و ضبط کے ساتھ ہم انھیں اپنا سکیں تو انسانیت کی تڑپتی لاش اور آدمیت کی سسکتی روح کو آج بھی سکون نصیب ہو سکتا ہے۔

ظلم، چوری، ڈاکہ، رہزنی، بے ایمانی یا مکر و فریب کے جرائم اور ان سے پیدا ہونے والے مکروہ اثرات نے دنیا کو قدرے بے چین کر دیا ہے۔ قرآن نے ان سب سے روکا ہے۔

لا تاکلوا اموالکم بالباطل — ناجائز طریقے سے لوگوں کے مال پر دست درازی نہ کرو

لا تاکلوا اموال الیتامیٰ — یتیموں کا مال ہڑپ نہ کر جاؤ۔

حل اللہ البیع و حرم الربوا۔ اللہ نے بیع کو حلال کیا اور ربوا کو حرام کر دیا۔ اور پھر نہایت جامع اور مثبت انداز میں ایک سبق دیا گیا ہے جو اکل حلال، نظافت و پاکیزگی کا مظہر ہے۔

کلوا من طیبٰت ما رزقناکم — رزق حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔

اس حکم نے سارے ممنوعات کو ختم کر دیا، بے شرمی، بے حیائی سے بچنے اور بے باکانہ بے حجابانہ حیوانوں کی سی زندگی گذارنے سے ان آیتوں نے روکا۔

یغضوا من ابصارھم و یحفظوا فروجھم۔ اپنی نظروں کو نیچا رکھو اور اپنی عزت کی حفاظت کرو

لا تدخلو بیوتکم غیر بیوتکم حتیٰ تستانسو و تسلمو الی اھلھا۔ دوسروں کے گھروں پر جب تک اجازت نہ لو اور جب تک ان کو سلام نہ کرلو مت داخل ہو (یعنی اجازت لے کر جاؤ)

ایک دوسرے کا مذاق اڑانے اور طعنہ طنز و تشنیع سے جذبات اور شخصیت مجروح ہوتی ہے اور پھر فتنے کا دروازہ کھلتا ہے۔ کبھی انسان اپنی طاقت کے زعم میں یہ حرکت کرتا ہے کبھی فطرت کی کجی اس پر ابھارتی ہے۔ اس کے لیے فرمایا گیا:

لا تمش فی الارض مرحاً — زمین پر اکڑ کر مت چلو

لا یسخر قوم من قوم — ایک قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے

لا تنابزوا بالالقاب — نام کو مت بگاڑو

ولا تلمزوا انفسکم — ایک دوسرے کو طعنہ مت دو

جھوٹے تفاخر، غرور و تکبر اور بے جا شان و شوکت کی بیخ کنی یہ کہہ کر کر دی گئی:

انا خلقنٰکم من ذکر و انثیٰ — تم ایک ماں باپ کی اولاد ہو (پھر کیوں فرق کرتے ہو)

وجعلنٰکم شعوباً و قبائل لتعارفوا۔ یہ قبیلے اور شعوب کی تقسیم تو محض آپس پہچان اور تعارف کے

لیے ہے) ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (فخر و غرور کی بات یہ خاندانی حسبی و نسبی دھڑے بندی میں نہیں ہے جو جس قدر احکام الٰہی پر عمل کرنے والا اور متقی ہوگا وہ زیادہ معزز و مکرم ہوگا۔ غور کیجیے۔

انما اموالکم و اولادکم فتنۃ - واللہ عندہ اجر عظیم " انسان کے لیے ان کے اموال اور اولاد ایک فتنہ ہیں اور اللہ کے نزدیک ان میں بڑا اجر ہے"

انسان مال اور اولاد کے لیے ہر قسم کے جائز و ناجائز، حرام و حلال کام کرتا ہے۔ اس احساس سے قطع نظر کہ اس کا کون سا قدم انصاف و شرافت کے خلاف ہے اور کہاں تک عزت و وقار کا خون ہو رہا ہے، وہ اپنے مال کو بڑھانا چاہتا ہے، اسے اس سے بھی کوئی غرض نہیں کہ کسی کی حق تلفی ہو رہی ہے، دیانت و شرافت پارہ پارہ ہو چکی ہے، محنت کشوں اور مظلوموں کا حق مارا جا رہا ہے وہ ان تمام باتوں سے آنکھ بند کر لیتا ہے، اس سے ایک طرف سماج میں بربادی اور استحصال کا دور دورہ ہوتا ہے دوسری طرف اللہ کی نگاہ میں ایسا شخص مغضوب اور ظالم قرار پاتا ہے۔

اسی طرح اولاد کو بڑھانے کے لیے دنیا میں اس کی جاہ و عزت کے لیے چھوٹی چھوٹی ملازمت کے لیے کتنے ہی جائز حقوق کا خون کرتا ہے، اس راستے کی رکاوٹوں کو بے جا خوشامد، چاپلوسی حتیٰ کہ رشوت کے ذریعے دور کرتا ہے اس طرح غریبوں اور بے سہارا لوگوں کے راستے پر رکاوٹ کھڑی کرتا ہے اور عدل و انصاف کے ذریعے ہونے والے فیصلوں کو متاثر کر کے اللہ کی خفگی مول لیتا ہے۔

یہ ہیں مال و دولت کے وہ مہلک نتائج جن کی وجہ سے انھیں فتنہ کہا گیا ہے، مگر یہ دونوں چیزیں محض صبر کے نتیجے میں " اللہ کے نزدیک اجر عظیم " کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں اور دور نہیں اسی فرمان الٰہی سے ملا ہوا یہ پیغام بھی موجود ہے۔

بظاہر یہ کتنا بڑا تعارض اور تناقص ہے کہ ایک چیز کو فتنہ کہا جا رہا ہے اور اسی پر اجر عظیم کا وعدہ ہے پایا گیا، اس راہ میں صبر یہی ہے کہ اپنے نفس کو احکامات الٰہی کا پابند بنائے اور اس کی نافرمانیوں سے خود کو باز رکھے اس طرح اولاد کی تربیت اور نشو و نما نیز مال کا حصول اور اس کا خرچ انعام ہی انعام ہے۔

فتنہ و فساد صرف اسی ایک موضوع میں منحصر نہیں ہے جو مال اور اولاد کی محبت کی شکل میں بیان کیا گیا بلکہ جائزہ لیجیے تو آج دنیا کا سب سے بڑا مرض انسانی آبادی میں قسم قسم کے فتنوں کا ظہور ہے

جو ہماری خود غرضیوں اور بدنیتی کا نتیجہ ہے۔ ایک چیز جس کو نہایت معمولی سمجھ لیا گیا ہے اور سوسائٹی پر اس کا چلن عام ہے وہ ہے طرح طرح کی ریشہ دوانیوں، مفاد عامہ کے خلاف تخریبی کارروائیوں خفیہ گٹھ جوڑ، بلیک مارکٹنگ، چور بازاری اور ان جیسے خطرناک دوسرے رجحانات کا وجود جن سے یہ فتنے جنم لیتے ہیں۔

انسان اپنی ذاتی اغراض کے لیے یہ سارے فتنے اپناتا ہے لیکن اسی شخصی مفاد اور ذاتی اغراض کو بھلائی کے لیے قربان کرنا، طبائع کو بجبر و اکراہ ایسی غلط روش کے خلاف آمادہ کرنا بہ صبر ہے کیونکہ یہ سب معاملہ جہاں ایک غیر انسانی فعل ہے وہیں بہت بڑا گناہ بھی ہے اور یہ صبر۔ صبر عن معصیۃ اللہ ہوگا۔ اور یہی وہ صبر ہے جس کی آج دنیا کو ضرورت ہے نیز ضرورت اس پر عمل کی ہے۔ اصول خواہ کتنے ہی پاکیزہ ہوں عمل اور کردار اخلاقی اقدار کے لیے بنیادی شرائط ہیں عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر ابھر آئے

کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھا ہے

جامعہ کی اشاعت میں تاخیر

ہمیں انتہائی افسوس ہے کہ جامعہ کے اس شمارے کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بازار میں نہ تو اس سائز کا کاغذ مل رہا ہے جس پر جامعہ چھپتا ہے اور نہ وہ مسطر ہی مل رہا ہے جس پر جامعہ کی کتابت کی جاتی ہے۔ اس وقت بڑی مشکل سے کام چلایا گیا ہے۔ اس غیر معمولی تاخیر پر ہم قارئین جامعہ سے معذرت خواہ ہیں۔ (ادارہ)

مولانا محمد علی نمبر — چند تبصرے

ماہنامہ جامعہ کے پچھلے شمارے میں مولانا محمد علی نمبر کے بارے میں چند خطوط کے اقتباسات شائع کیے گئے تھے، اس شمارے میں شکریے کے ساتھ چند تبصرے شائع کیے جا رہے ہیں۔ اس سے قارئین جامعہ کو اندازہ ہوگا، کہ ہمارے اس خصوصی شمارے کے بارے میں معاصر اخبارات کی کیا رائے ہے۔

ہفتہ وار صدق جدید (لکھنؤ) مورخہ یکم جون

"رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ کے بانی تھے۔ اس ادارے سے نکلنے والے رسالہ جامعہ نے اپنے بانی کی یاد میں یہ خاص نمبر توقعات کے عین مطابق نکالا ہے۔ شروع میں شذرات مدیر رسالہ جناب ضیاء الحسن فاروقی کے قلم سے ہیں جن میں دو اہم باتوں کی طرف قارئین کو توجہ دلائی ہے۔ (۱) اب تک مولانا کے کسی سوانح نگار نے مولانا کی اس جد و جہد کا تنقیدی جائزہ نہیں پیش کیا جس کا مقصد ایم اے او کالج (مسلم یونیورسٹی کے پیش رو) کو اس کے استعماری پرنسپلوں سے نجات دلانا تھا۔ (۲) دوسری بات (جو) ہماری توجہ کی طالب ہے، وہ "ملیت" اور "قومیت" کے بارے میں مولانا محمد علی کا موقف ہے۔ اس خاص نمبر کے مضمون نگار حضرات نے بھی ان دو باتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں کی ہے، البتہ خود جناب مدیر نے اپنے شذرات میں ان دونوں موضوعوں پر قلم اٹھا کر اس کمی کو خاصی حد تک پورا کر دیا ہے اور قومیت و ملیت کے سلسلے میں مولانا کے مضبوط موقف کی وضاحت ہی نہیں بلکہ وکالت بھی فرمائی ہے۔

پہلا مضمون مولانا محمد علی کی آپ بیتی کے عنوان سے پروفیسر محمد سرور کا ہے۔ یہ مولانا کی

ناتمام کتاب ہے۔ MY LIFE-A FAGMENT کے نام سے ۱۹۴۲ء میں لاہور سے شائع ہوئی تھی، کے بعض ترجمے کی حیثیت رکھتا ہے اور بڑا ہی پر معلومات اور ساتھ ہی مولانا کے مذہبی جوش کا ترجمان ہے۔ دوسرا مضمون مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے مولانا محمد علی جوہر پر چند نقوش و تاثرات کے عنوان سے بہت خوب ہے۔

ایک مضمون روزنامہ ہمدرد کے عنوان سے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی محمد علی سے متعلق مشہور کتاب محمد علی، ذاتی ڈائری کی دو جلدوں سے لے کر جناب عبداللطیف اعظمی نے اس طرح مرتب کیا ہے کہ الفاظ اور جملے مولانا ہی کے قائم رہیں۔۔۔۔ خود عبداللطیف صاحب کے قلم سے ایک مضمون مولانا محمد علی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے عنوان سے بہت خوب ہے اور اس میں مولانا اور جامعہ ملیہ کے اس تعلق کو جو انھیں اس کے زمانۂ قیام سے ان کی وفات کے وقت تک رہا، ظاہر کیا گیا ہے۔

مولانا محمد علی کے ایک ہندو شاگرد اور صحافی رانا جنگ بہادر کے انگریزی مضمون کا ترجمہ "مولانا محمد علی، ایک دلآویز قدآور شخصیت" کے عنوان سے خاص نمبر کا طویل ترین[1] مضمون ہے، جس کا تمہیدی فقرہ یہ ہے: "اپنی نوجوانی کے ایام میں جن قدرآور سیاسی شخصیتوں کی قربت کا فخر مجھے حاصل رہا ہے، ان میں سب سے دلآویز شخصیت مولانا محمد علی کی تھی"۔۔۔۔۔۔

مولانا محمد علی پر اب تک مختلف رسائل کے جو خاص نمبر نکلے ہیں ان سب پر بہ لحاظ کمیت و کیفیت یہ خاص نمبر تفوق رکھتا ہے۔"

ہفت روزہ ندائے ملت (لکھنؤ) مورخہ ۱۰ جون

"رئیس الاحرار مولانا محمد علی سے متعلق گزشتہ چند ماہ میں متعدد رسائل و اخبارات نے اپنے خاص شمارے شائع کئے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی (جس کے بانیوں میں مولانا محمد علیؒ ممتاز ترین درجہ رکھتے تھے) کا شائع کردہ یہ نمبر ان سب سے زیادہ مکمل و مفصل، جامع و دیدہ زیب نظر آتا ہے۔ شذرات (از مدیر رسالہ) سے آخر تک تقریباً ہر مضمون محمد علیؒ کی زندگی اور ان کے

---

[1] سب سے طویل مضمون "تحریک خلافت کا ہندوستانی مسلمانوں پر اثر" ہے (مدیر معاون)

کارناموں سے متعلق ہے۔ معلومات فراہم کرنے والا اور صحیح خراج عقیدت پیش کرنے والا نظر آتا ہے
معاون مدیر جناب عبداللطیف اعظمی جامعی نے اس خاص نمبر کی تدوین میں سرگرم حصہ لیا ہے۔ خود
ان کے مضامین تو قابل مطالعہ اور موضوع کا حق ادا کرنے والے ہوتے ہیں، انھوں نے رسالہ
میں درج ہونے والے اکثر مضامین کا تعارف کرایا اور ان پر حاشیے دے کر بعض غلطیوں کی تصحیح
کا ضروری فرض بھی انجام دیا ہے، لیکن کہیں کہیں چوک گئے ہیں، مثلاً معین الدین حارث صاحب
کے انتہائی عقیدت مندانہ مضمون میں آمنہ مرحومہ کو بڑی صاحب زادی لکھا گیا ہے، حالانکہ وہ مجھلی
صاحبزادی ہیں[۱]، اسی طرح خود اعظمی صاحب کی تحریر میں برطانوی وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج کو قدامت پسند
(کنزرویٹو) پارٹی کا لیڈر لکھا گیا ہے[۲] حالانکہ وہ لبرل (اعتدال پسند) تھے اور زندگی بھر اسی پارٹی سے
متعلق رہے تھے۔ اس قسم کی چند جزئی فروگذاشتوں کو چھوڑ کر یہ خاص نمبر بڑے کام کا ہے مدیر رسالہ
ضیاء الحسن فاروقی صاحب کے قلم سے شذرات اور ایک مضمون محمد علی اور ابوالکلام آزاد،
مولوی عبدالسلام قدوائی کا مضمون "مولانا محمد علی۔ کچھ یادیں" مولانا ابوالحسن علی ندوی کا مضمون
"نقوش و تاثرات" مشہور صحافی اور مولانا محمد علی کے شاگرد رشید رانا جنگ بہادر جامعی کے
مضمون "محمد علی ایک دلآویز قد آور شخصیت" کا اردو ترجمہ (اصل مضمون انگریزی میں شائع ہوا تھا)
عبداللطیف اعظمی صاحب کا مضمون "مولانا محمد علی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ" انور صدیقی کا مضمون "شعلے
کی سرگذشت" خاص طور سے پڑھنے کے قابل ہیں۔

روزنامہ "ہمدرد" کے نام سے ایک مضمون مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام سے شائع ہوا ہے
یہ مضمون ان کی تصنیف "محمد علی۔ ذاتی ڈائری" سے اخذ کر کے تقریباً انھیں کی عبارت میں عبداللطیف
نے مرتب کیا ہے۔ تین نظمیں بھی شامل ہیں، ہر نظم موثر ہے۔ مولانا محمد علی کی بعض نایاب تصاویر اس
میں شامل ہیں، ان کے اخبارات "ہمدرد" "کامریڈ" کے پہلے شماروں [کے ٹائیٹل] کا عکس، اور
ان کی اردو غزل ان کے ہاتھ کی تحریر کردہ کا عکس بھی شامل ہے۔ مولانا محمد علی سے عقیدت رکھنے والے

---

[۱] یہ غلطی واقعی نظروں سے اوجھل ہو گئی، مگر صفحہ ۱۸۴ پر جہاں مولانا کی تمام صاحبزادیوں کا ذکر ہے، آمنہ مرحومہ کو خود راقم الحروف نے دوسری صاحبزادی ہی لکھا ہے۔ (مدیر معاون) [۲] فاضل تبصرہ نگار کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ راقم الحروف کی کسی تحریر میں لائڈ جارج کا سرے سے ذکر ہی نہیں آیا ہے۔ (مدیر معاون)

ہر پڑھے لکھے اور ہر کتب خانہ میں اس خاص نمبر کو جگہ ملنا چاہیئے۔" (ع ق)

پندرہ روزہ تعمیر حیات (لکھنؤ) مورخہ ۱۰ جون

" جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں مولانا محمد علی کا نام بھی ہے، اس لیے اس کا حق تھا کہ وہ اپنے بانی و محسن کی صدسالہ برسی* کے موقع پر (جب کہ ہندوستانی مسلمان اپنے فراموش شدہ جوہر کو پہچان رہے ہیں) اپنی محسن شناسی کا بھی ثبوت دے۔ خدا کا شکر ہے کہ رسالہ جامعہ نے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی اور جناب عبداللطیف اعظمی کی محنت و توجہ سے جامعہ اور محمد علیؒ دونوں کا حق بخیر و خوبی ادا کیا ہے۔ رسالے کا یہ محمد علی نمبر اس کے دوسرے نمبروں کی طرح اپنے مواد و ہیئت کے لحاظ سے بہت قابل قدر و لائق تحسین ہے اور اس میں مولانا مرحوم پر بڑا قیمتی مواد فراہم ہو گیا ہے جس سے ان کے سوانح نگار اور ان پر لکھنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔ پروفیسر محمد سرور، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی، راجا جنگ بہادر، ضیاء الحسن صاحب فاروقی، سید حامد حسین، انور صدیقی، نعیم صدیقی، نذیر مینائی کے مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔ البتہ پروفیسر مجیب صاحب کا مضمون کچھ غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے جس میں مولانا محمد علی کی سیاست سے محرکات پر ہمدردانہ طور پر غور نہیں کیا گیا ہے۔"

---

* برسی نہیں صدسالہ یوم پیدائش (مدیر معاون)

کوائف جامعہ

جامعہ کا نیا تعلیمی سال

امسال بوجوہ امتحانات دیر میں ختم ہوئے، اس لیے تعلیمی سال بھی کچھ تاخیر سے شروع ہو رہا ہے۔ معمولاً ہر سال یکم جولائی کو تعلیمی سال شروع ہو جاتا تھا، مگر اس سال استاذوں کا مدرسہ (ٹیچرز کالج) اور مدارس ۱۶ر جولائی کو اور کالج یکم اگست کو کھل رہا ہے۔ آج کل داخلوں کے لیے امیدواروں کی دوڑ دھوپ جاری ہے۔

شیخ الجامعہ صاحب کا انجمن اساتذہ کی طرف سے خیر مقدم

پچھلے سال جامعہ ملیہ کی انجمن اساتذہ (ٹیچرز ایسوسی ایشن) کی طرف سے جناب شیخ الجامعہ صاحب کا پرتپاک اور پرجوش خیر مقدم کیا گیا تھا اور اس موقع پر صدر انجمن اساتذہ جناب نذیر الدین مینائی صاحب نے شیخ الجامعہ صاحب کی خدمت میں ایک پرخلوص سپاسنامہ پیش کیا تھا جس کا خلاصہ ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔ چونکہ مولانا محمد علی نمبر کی تیاری میں جنوری سے اپریل تک جامعہ بند تھا اس لیے یہ خلاصہ تاخیر کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے، جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

"میں انجمن اساتذہ کی طرف سے آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ آپ نے جامعہ کی زندگی کے بڑے تہلکہ خیز اور بحرانی دور میں اس کی سربراہی قبول کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آپ جس ادارے میں تشریف لائے ہیں وہ اپنی مادی بے سروسامانی کے باوجود کچھ ایسی اقدار سے مایہ دار ہے جن کی تشکیل جامعہ کی اجتماعی زندگی نے کی ہے۔ یہاں کی تعلیمی اور تہذیبی زندگی میں جمہوریت اور مساوات کی قدریں شروع سے ہی کارفرما رہی ہیں۔ ان کے فروغ میں ڈاکٹر

ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہاں آزادی اور اعتماد کی فضا میں جامعہ کے کارکن، مراتب کے امتیازات سے ماوراء ہو کر، ایک بامعنی اور پرنور شرکت کے احساس کے ساتھ ان مقاصد کے لیے سرگرم عمل رہے ہیں جن سے جامعہ عبارت ہے۔ اشتراک عمل کی یہی سرشاری یہاں کے تمام کارکنوں کو سروسامان سے بے نیاز رکھتی تھی کہ جامعہ صرف تنظیم ہی نہیں تھی تحریک بھی تھی۔ اس تحریک میں، فیصلے اور عمل میں، سارا ادارہ شریک رہتا تھا۔ تمام کارکن شریک رہتے تھے کہ ساری سرگرمیوں کی اساس انفرادی قیادت نہیں، اجتماعی قیادت ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فیصلہ کرنے والی انجمنوں میں ہر سطح کے کارکنوں کو نمائندگی حاصل تھی۔ اور جمہوری مساوات کی وہ ساری اقدار یہاں بہت پہلے سے کارفرما رہی ہیں جن کا آج ملک کی دانش گاہوں میں مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہ صورت حال ۱۹۶۲ء تک برقرار رہی پھر جامعہ کا نیا آئین حکومت کی توثیق کے بعد نافذ کیا گیا اور نہ جانے کن اسباب کی بنا پر جامعہ اپنے امتیاز کی بہت سی علامتوں سے محروم ہو کر رہ گئی۔ انجمنِ اساتذہ نے مجالس بالا میں اساتذہ کی نمائندگی کا جو مطالبہ پیش کیا ہے وہ دراصل کوئی نیا مطالبہ نہیں ہے اور نہ اس کے پیچھے دوسری جدید دانش گاہوں کی تقلید کا جذبہ کارفرما ہے بلکہ یہ مطالبہ ان جمہوری اقدار کی بازیافت پر مبنی ہے جو ہمارا خواب بھی ہیں اور عزم بھی۔ گذشتہ دنوں اس طرح کے جمہوری مطالبات کو منظور نہیں کیا گیا تھا، اب ہم آپ کی طرف ان مطالبات کے سلسلے میں پُرامید ہو کر دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی زندگی جمہوری آدرشوں کو فروغ دینے اور مستحکم کرنے والی روایت کے سائے میں گزری ہے۔

جناب شیخ الجامعہ صاحب، جامعہ ملیہ اسلامیہ، یونیورسٹی کی حیثیت سے ابھی تشکیل و تعمیر کے مراحل سے گذر رہی ہے۔ ہمیں بڑی مسرت ہے کہ آپ ادارے میں قدم رکھتے ہی اس کی توسیع و ترقی کے خواب دیکھنے لگے ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے خوش آیند ہے۔ جامعہ کو ایک مکمل اور جدید یونیورسٹی بننا ہے، مگر اس عمل میں یہ نکتہ کسی طور بھی فراموش نہیں ہونا چاہیے کہ جامعہ کی جدیدیت اس کے ماضی کی اقدار سے ہم آہنگ ہو۔ ان اقدار سے جن میں کچھ نور مسلک انسانیت کا ہے، کچھ وسیع المشربی کا ہے اور بہت کچھ اس سچی مذہبیت کا ہے جو دیواریں بناتی نہیں، گراتی ہے۔ جو سنگھرش نہیں سنگم کی راہیں کھولتی ہے۔ جامعہ کی راہ ہمیشہ اعتدال، میانہ روی اور ہوش مندی

کی راہ رہی ہے۔ یہاں نہ تو مصنوعی اور غلو آمیز مذہبیت کو پسند کیا گیا ہے اور نہ ہی نمائشی سیکولرزم کو سراہا گیا ہے۔ یہی جامعہ کی راہ ہے اور یہی اس کی روش بھی۔ یہی جامعہ کا بنیادی کردار بھی ہے۔ کسی بھی وجہ سے فراموش گاری اور مصلحتوں کی گرد بیٹھ جانے کے سبب اگر جامعہ کا بنیادی کردار نظروں سے محو ہو گیا ہے تو اس کی بازیافت کی شعوری اور بھرپور کوشش کرنی ہوگی۔ کہ یہی کچھ ہماری متاع گراں بہا ہے۔ اور اسی کو ہماری تمام تر سرگرمیوں میں منعکس بھی ہونا چاہئے۔ اسی کردار کی روشنی میں ہمیں تعمیر اور توسیع کے منصوبے بنانے چاہئیں۔ ہماری ترقی کو ماضی کی تردید نہیں توسیع ہونا چاہئے کہ اس طرح سچی ترقی اور اندھی دوڑ میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ شعور نہیں ہوتا تو ادارے بے رونق مقبرے بن جاتے ہیں اور تہذیبیں غروب ہو جاتی ہیں۔ ہمیں علم ہے کہ آپ مردان راہ بیں اور راہ داں میں شامل ہیں اور ایک وسیع انتظامی اور عملی تجربے کے مالک ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ جامعہ آپ کے جوشِ عمل میں اپنا خواب شامل کر دے گی اور خواب و عمل کا یہی اشتراک آپ کی اور اس ادارہ کی کامیابی کا ضامن ہوگا۔

اساتذہ کی جماعت علمی اور مادی سطحوں پر جن مشکلات کا سامنا کرتی آئی ہے اور اس انجمن کی امنگیں اور اس کے عزائم، جو وقت کے ساتھ مطالبات کی شکل اختیار کر گئے ہیں، ان کے ذکر کا یہ موقعہ نہیں کہ اس موضوع پر ہم آپ کی سمع خراشی کرتے ہی رہیں گے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ عمل آپ کی قیادت میں دیر طلب اور سست رفتار نہیں رہے گا۔

خدا کرے جامعہ آپ کو اور آپ جامعہ کے لیے مبارک ثابت ہوں میں انجمن اساتذہ کی طرف سے جامعہ کی تعمیر و تشکیل کی تمام کوششوں میں بھرپور تعاون کا یقین دلاتا ہوں اور آپ کا جامعہ میں خیر مقدم کرتا ہوں۔

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے کا بھیجنا ضروری ہے)

جائزۂ مخطوطاتِ اردو (حصّہ اول) ۔ از:۔ مشفق خواجہ

سائز ۱۸x۲۲/۸، حجم ۱۲۵۶ صفحات، مجلد مع گرد پوش، طباعت ٹائپ میں،
قیمت:۔ سو روپے، تاریخ اشاعت: فروری ۷۹ء۔ ناشر: مرکزی اردو بورڈ۔ لاہور (پاکستان)

اس کتاب کے فاضل مولف جناب مشفق خواجہ صاحب سے میری واقفیت محض مضامین اور خطوط کے ذریعہ ہے اور اس وقت سے ہے جب بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے زمانے میں وہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) میں تھے۔ ابتدا میں میں انھیں صرف ایک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے جانتا تھا، مگر پچھلے سال اکتوبر ۷۸ء میں ان کے کلام کا ایک مجموعہ "ابیات" موصول ہوا تو معلوم ہوا کہ شاعر بھی ہیں اور ماشاء اللہ خوش گو ہیں۔ اس مجموعے میں پوری احتیاط برتی گئی ہے کہ اس پر نثر کا سایہ نہ پڑنے پائے، چنانچہ اس کا دیباچہ بھی منظوم ہے اور مختصر اتنا کہ صرف دو شعر پر مشتمل ہے، اب اس کا ذکر آگیا ہے تو اسے آپ بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ غالباً اس طرح ان کا تعارف بھی مکمل ہو جائے گا:

یہی غزل مری محرومیوں کا نوحۂ غم
یہی غزل ترا آئینۂ جمال بھی ہے
جو پا سکا نہ تجھے میں، تو کھو دیا خود کو
یہ میرا عجز بھی ہے، یہ مرا کمال بھی ہے

ابھی حال میں موصوف کی ایک تحقیقی کتاب: "جائزۂ مخطوطاتِ اردو" کا پہلا حصہ موصول ہوا ہے جس کے بارے میں خود فاضل مولف نے لکھا ہے کہ: "اس کتاب کا بنیادی موضوع وہ اردو

مخطوطات ہیں جو پاکستان کے مختلف سرکاری، غیر سرکاری اور ذاتی کتب خانوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔
میں نے مخطوطات کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرنے کے ساتھ، ہر مخطوطے کے دیگر نسخوں، مطبوعہ
نسخوں، مصنف کے حالات اور مآخذ پر خاص توجہ دی ہے، اس طرح یہ کام مخطوطات کی وضاحتی
فہرست مرتب کرنے تک محدود نہیں رہا، بلکہ ایک سوانحی و کتابیاتی جائزے کی صورت اختیار کر گیا
ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپ اسے ایک ایسی کتاب حوالہ کہتے سکتے ہیں جس میں کتابوں اور ان
کے مصنفین کے بارے میں ہر طرح کی معلومات جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن یہ کام روایتی
فہرست سازی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ میں نے متعدد کتابوں اور مصنفوں کے بارے میں تحقیقی مسائل
بھی چھیڑے ہیں اور کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔" (صفحہ ۱۷)

قدیم شعرا اور نثر نگاروں کے حالات بہت ہی کمیاب ہیں اور ان کی ولادت اور وفات کی
تاریخوں میں بڑا اختلاف ہے اور بعض کی تاریخوں کا پتہ چلانا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ اس لئے ان کی
تحقیق اور تعین میں فاضل مولف کو جس قدر محنت کرنی پڑی ہوگی اس کا صحیح اندازہ اصحاب تحقیق
ہی کر سکتے ہیں۔ اردو کے شعرا، اور ادیبوں کی تاریخ ولادت اور وفات سے راقم الحروف کو خاص
طور پر دلچسپی ہے اور اس سلسلے میں چار پانچ سو ادیبوں اور شاعروں کی تاریخیں جمع کی ہیں۔
زیر تبصرہ کتاب کی تاریخوں کو اپنی مرتبہ تاریخوں سے مقابلہ کر کے دیکھا تو بہت سی تاریخوں میں اختلاف
ملا۔ چونکہ اس کتاب میں، آخر میں کتابیات کی ایک فہرست دے دی گئی ہے اور زیر تذکرہ حالات
میں کتابوں کے حوالے نہیں دیئے گئے ہیں اس لیے میرے لیے کسی فیصلے پر پہنچنا مشکل ہو گیا۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے: مذہبیات، تاریخیات، ادبیات اور معقولات اور
آخر میں ۲۲ صفحات کی کتابیات کی طویل فہرست ہے جس میں ۱۶۳ کتابوں کے نام درج ہیں۔
بلاشبہ یہ کتاب تحقیقی کتابوں میں مفید اور قیمتی اضافہ ہے۔ اور یقین ہے کہ علمی اور تحقیقی حلقوں میں
پسند کی جائے گی اور مقبول ہوگی۔ (عبداللطیف اعظمی)

پیامِ تعلیم
فوٹو آفسٹ کے ذریعے چھپنے لگا ہے۔ اب اس میں رنگ
برنگی تصویریں بھی ہیں اور کارٹون بھی سبق آموز کہانیاں بھی ہیں
اور مزیدار نظمیں بھی۔ ان کے علاوہ سیر و سیاحت، جنرل سائنس،
تاریخ، جغرافیہ اور شہریت کے آداب پر دلچسپ انداز میں بہترین
مواد بھی ہوگا۔
قیمت سالانہ :۔ دس روپے
فی پرچہ :۔ ایک روپیا
غیر ممالک کے لیے۔ سالانہ قیمت :۔ پچیس روپے
ماہنامہ پیام تعلیم۔ جامعہ نگر نئی دہلی

gd. No. D-(S)-116 VOL.

The Monthly JAMIA

JAMIA MILLIA ISLAMIA
NEW DELHI - 110025

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

شمارہ ۷، ۸	جولائی و اگست ۱۹۷۹ء	جلد ۷۶

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ :-

ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

★ طابع و ناشر :- عبداللطیف اعظمی ★ مطبوعہ :- جمال پریس دہلی ★ ٹائیٹل :- دیال پریس دہلی

شذرات

دنیا آج نفرت کے (پروردہ) اضطراب میں آپے سے باہر ہو رہی ہے
تصادم و آویزش کا بے رحم اور کرب آمیز سلسلہ جاری ہے
دنیا کی راہوں میں بے ضمیری کے کانٹے پھیل گئے ہیں —— اور
طمع و حرص کے بندھن بہت پیچیدہ ہو گئے ہیں

اے وہ کہ جو ایک حیات بیکراں ہے!
تمام مخلوق تیرے ظہور نو کے لیے مضطربانہ آرزومند ہے
انھیں بچا لے اور امید کی ابدی شمع روشن کر دے
محبت کا کنول جو کبھی نہ ختم ہونے والے شہد کا مخزن ہے
تیرے نور کے سایے میں کھل اٹھے

اے وہ کہ جو حلیم ہے، جو بے نیاز ہے!
اپنی بیکراں رحیمی اور لازوال پاکی کے دامن سے
اس زمین کے دل کے تاریک دھبے مٹا دے

اے وہ کہ جس کی بخششیں لافانی و لامتناہی ہیں!
ہمیں ترک کا حوصلہ دے اور
ہم سے ہمارے جھوٹے وقار کا احساس لے لے
عقل و ہوش کے نئے سورج کے طلوع کی تابناکی میں
بے نور آنکھوں کو روشنی عطا کر —— اور

مردہ ضمیروں کو زندہ کردے
اے وہ کہ جو حلیم ہے، جو بے نیاز ہے!
ابن آدم کا دل ایک اضطراب کے بخار میں مبتلا ہے
خود غرضی کے زہر سے
اس حرص و آز سے جس کی کوئی انتہا نہیں
اے وہ کہ جو حلیم ہے، جو بے نیاز ہے!
اپنی بیکراں رحیمی اور لازوال پاکی کے دامن سے
اس زمین کے دل کے تاریک دھبے مٹا دے

رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک نظم کے ان ٹکڑوں کو پڑھیے، بار بار پڑھیے اور آج ہمارے دیس میں ہمارے سیاست داں، اور ہم سب اپنے اپنے میدانِ عمل میں، جس بے ضمیری کا ثبوت دے رہے ہیں، اس پر غور کیجیے۔ کیا رابندر ناتھ ٹیگور کی اس دعائیہ نظم میں ہمارا اپنا حال منعکس نہیں ہے؟۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان ایک سیاسی اضطراب ہی میں نہیں بلکہ ایک اخلاقی بحران میں بھی مبتلا ہے، ہر طرف نفرت ہے، خود غرضی ہے، طمع و حرص ہے، مفادات کا تصادم ہے۔ اور ہماری زندگی ان تمام برائیوں سے پیدا ہونے والے ایک شدید اضطراب اور ایک کرب انگیز بے چینی کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہے۔ ہم نے ایک ایسے ہندوستان کا خواب دیکھا تھا جہاں محبت ہو، جہاں روحِ انسانی سچی آزادی کے مزے لوٹے، جہاں نفرت کے سایے دور دور نہ ہوں، جہاں خود غرضیاں اس طرح متصادم نہ ہوں کہ انسان کا ضمیر چور چور ہو کر رہ جائے۔ آہ! ہمارا یہ خواب اب بھی اپنی تعبیر کی تلاش میں ہے، افسوس ہماری یہ آرزو آج بھی اپنی تکمیل کے لیے سرگرداں ہے۔ کیا یہ بات سچ ہے کہ جیسی قوم ہوتی ہے ویسے ہی حکمراں اسے ملتے ہیں یا یہ بات کہ جیسے حکمراں ہوتے ہیں ویسی ہی قوم بن جاتی ہے؟ کون ہے جو اس سوال کا جواب دے!

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے صدر پروفیسر اسلوب احمد انصاری اور ان کے بعض

رفقائے کار کی توجہ سے ایک تنقیدی ششماہی مجلہ "نقد و نظر" کے نام سے نکلا ہے جس کی پہلی جلد کا شمارہ نمبر ۱ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ پروفیسر انصاری خود اس کے مرتب ہیں، اور آج اردو تنقید میں ان کا جو مقام و مرتبہ ہے اس سے اردو والے اچھی طرح واقف ہیں، اس مجلہ سے مرتب کی حیثیت سے ان کی وابستگی اس بات کی علامت ہے کہ اس کا معیار اونچا ہوگا اور اس کا انداز سنجیدہ اور متوازن ہوگا۔ مقاصد میں بتایا گیا ہے کہ "اس کے ذریعے شعر و ادب کے سلسلے میں ایک متوازن، مربوط اور بے لاگ تنقیدی نقطۂ نظر کو روشنی میں لایا جاسکے اور برتا جاسکے . . اس کا بنیادی مقصد ادبی فنی کارناموں کا احتیاط اور بغیر کسی تعصب کے مطالعہ کرنا اور دوسروں کو اس کی ترغیب دلانے کے سوا کچھ نہیں۔ اس کا دور دور کسی سیاسی یا غیر سیاسی تنظیم یا گروپ سے تعلق نہیں ہے۔ یعنی اس کی ادارتی پالیسی کلیتہً غیر طرفدارانہ (NON - PARTISAN) ہوگی۔ یہ رسالہ خالص تنقیدی مضامین کے لیے وقف کیا جارہا ہے۔ اس میں قدیم و جدید اردو ادب کے مشاہیر کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے گا . . اس رسالے کا ایک خاص پہلو یہ ہوگا کہ اس میں اقبالیات کے مطالعے کو خصوصی اہمیت دی جائے گی اور دوسرے یہ کہ ہر شمارے میں کلاسیکل غزل گو اساتذہ کی انفرادی غزلوں کا مطالعہ پیش کیا جائے گا۔ اور یہ ایک طور سے عملی تنقید کا نمونہ ہوگا۔ نظری تنقید پر مغرب کے مشاہیر تنقید نگاروں کی اہم نگارشات کا ترجمہ بھی وقتاً فوقتاً دیا جائے گا . ." ——— یہ مقاصد یقیناً بلند ہیں لیکن یہ سعی اسی وقت ثمر آور ہوگی جب اہل نظر کا تعاون اسے حاصل ہو، امید ہے کہ تنقید کی دنیا میں ایک اچھا اور معیاری اضافہ کرنے کی اس کاوش کو ارباب ذوق کی ہمدردیاں ضرور حاصل ہوں گی۔

۲۴ر اگست کو یوم الجمعہ تھا اور آخری روزہ، میں جامعہ کی مسجد میں شمالی دروازے کی محراب میں سنتیں پڑھ کر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک دوست نے مدہم آواز میں یہ تشویشناک خبر سنائی کہ جامعہ ملیہ کے قدیم طالب علم، اس کے سابق استاد اسلامیات اور ناظم دینیات، اس کی کورٹ کے ممبر، ندوۃ العلماء کے ناظم تعلیمات اور دارالمصنفین کے شریک ناظم، یعنی مولانا عبدالسلام قدوائی پر ان کے وطن بھولیسڈی (ضلع رائے بریلی) میں جہاں وہ عید منانے اعظم گڑھ سے دو ایک روز قبل ہی پہنچے تھے، فالج کا شدید حملہ ہوا ہے اور فالج کا اثر قلب کی طرف والے حصہ پر ہے۔ تمام جسم سنسنا کر رہ گیا، علالت کی نوعیت ایسی تھی

کر دماغ میں اندیشہ ہائے دور دراز راہ پانے لگے۔ دل نے کہا کہ شاید قضا و قدر کا فیصلہ کچھ اور ہے، خاص طور پر اس لیے کہ مرحوم کی زندگی بڑی پاک صاف زندگی تھی، ذہن کشادہ، قلب وسیع اور نفس مطمئن پایا تھا۔ ان کی طرف سے کبھی کسی کی دل آزاری سننے میں نہیں آئی، امانت میں اونچے اور دیانت میں چوکھے، فرض شناسی میں آپ اپنی مثال، سچے مسلمان، پکے محب وطن، اور اچھے قوم پرور، طبیعت میں نرمی، گفتار میں دھیما پن، کردار میں پختگی، یگانے اور بیگانے، سب کے حقوق کا خیال، چھوٹے بڑے سب سے یکساں ملنا، دکھ سکھ میں سب کے ساتھی، بڑے وضعدار، حد درجہ ملنسار، اس طرح ان کی پوری شخصیت ایک مومن کی حسین زندگی کی آئینہ دار ——— اب اپنے دل کی بات کیا چھپاؤں، خیال آیا کہ آج جمعہ کا دن ہے۔ مہینہ رمضان المبارک کا ہے، بھئی یہ حملہ بظاہر فالج کا حملہ ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ درحقیقت یہ پیدا کرنے والے کی طرف سے بلاوا ہے اس خطاب کے ساتھ: یٰٓاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ۝ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ۝ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝ [اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کے جوار رحمت) کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اُس سے خوش وہ تجھ سے خوش۔ پھر (ادھر چل کر) تو میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔] ——— رات میں خبر ملی کہ مولانا اسی روز تقریباً ۱۱ بجے دن کو (یعنی ہمیں بیماری کی اطلاع ملنے سے پہلے ہی) اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ان کے بیٹوں، بیٹیوں اور ان کی اہلیہ کو اس کا غم ہوگا کہ مرحوم نے انھیں خدمت کا موقع نہیں دیا، یہ ایک فطری بات ہے، لیکن جیسا کہ وہ ایک نیک اور پاک باز انسان تھے، اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تھا کہ اس کا یہ نیک بندہ فالج جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر دوسروں کا محتاج اور دست نگر بنے۔ ہم اہل جامعہ پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں کہ ہم خود مرحوم کے پسماندگان میں سے ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر جمیل عطا کرے اور یہ توفیق اور ہمت دے کہ ہم اپنے اندر [illegible] کی سی خوبیاں اور نیکیاں پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ آمین

تنویر احمد علوی

مولوی امام بخش صہبائی

صہبائی مغلوں کے آخری دور میں دلی کے ممتاز اہل علم اور ارباب ادب میں سے تھے۔ مولینا الطاف حسین حالی نے اس عہد کی دلی کا ذکر کرتے ہوئے "یادگارِ غالب" میں لکھا ہے:

"تیرھویں صدی ہجری میں جب کہ مسلمانوں کا تنزل درجۂ غایت کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے حُسنِ اتفاق سے دارالخلافہ دہلی میں چند اہلِ کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھیں اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود	بادِ در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں
مومن و نیرؔ و صہبائیؔ و علوی و انگاہ	حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں

اگرچہ جس زمانہ میں کہ راقم کا پہلی بار دلی جانا ہوا اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا مجھ کو فخر ہے گارن بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا"[1]

ڈاکٹر تنویر احمد، ریڈر شعبۂ اردو، دلی یونیورسٹی - دہلی

[1] یادگارِ غالب، طبع مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ۱۹۷۷ء

اس پس منظر میں ہم صہبائی کی شخصیت اور شعور کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

مولوی کریم الدین، صاحب طبقات شعرائے ہند نے، جو صہبائی کے شریک عصر ہیں، ان کو شاہجہاں آباد کا ساکن اور چیلوں کے کوچہ کا رہنے والا بتایا ہے:[۲]

"ساکن شاہجہاں آباد۔ چیلوں کے کوچہ میں رہتے ہیں۔"

علامہ راشد الخیری کے ایک بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ چیلوں کے کوچہ کے محلہ کٹرہ مہر پرور میں رہتے تھے۔

ان کی جائے پیدائش بھی یہی چیلوں کا کوچہ اور شہر دہلی ہے۔ بروایت صاحب گلستان سخن "... مولد گل زمین لطافت آئین حضرت شاہجہاں آباد حفظہا اللہ عن الفساد ہے۔" مفتی انتظام اللہ شہابی (اکبر آبادی) نے اپنی کتاب "غدر کے چند علما" میں ان کے والد کا نام محمد بخش بتایا ہے۔ جاوید وشسشٹ صاحب کے مضمون "مولوی امام بخش صہبائی" میں حکیم پیر بخش کو ان کا بھائی کہا گیا ہے۔[۳]

۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں مولوی کریم الدین نے صہبائی کی عمر چالیس کے قریب بتائی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ۱۲۲۱ھ/ ۱۸۰۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اس کے مقابلے میں دتاسی نے اپنے پانچویں خطبہ [۴ دسمبر ۱۸۵۴ء] میں ان کی عمر تقریباً ساٹھ سال ظاہر کی ہے[۴] اس لحاظ سے ان کی پیدائش ۱۲۱۱ ہجری مطابق ۱۷۹۶ء میں ہونی چاہیے۔ اس خطبہ کے مترجم نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ دتاسی کا ماخذ قدیم دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر اشپرنگر تھے۔

اگرچہ حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے لیکن مولوی کریم الدین کی روایت زیادہ قرین امکان معلوم ہوتی ہے کہ وہ صہبائی سے اچھی طرح واقف ہیں، ان کے مطبع میں صہبائی کی کتابیں چھپی تھیں اور پھر انھوں نے صہبائی کا جو حلیہ قلم بند کیا ہے وہ بھی ان کی تقریباً اسی عمر پر دلالت کرتا ہے۔ [قد میانہ تمام سر پر بال رنگ گندم گوں کھلا ہوا دبلے پتلے منہ پر چیچک کے بھی داغ کہیں کہیں ہیں] اس میں ان کی سن رسیدگی کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔ ان کا سلسلہ نسب والد ماجد کی طرف سے حضرت عمر فاروق تک اور والدہ مشفقہ کی طرف سے حضرت غوث الثقلین سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تک پہنچتا ہے۔[۵]

---

[۲] طبقات شعرائے ہند: ۴۱۴ [۳] دلی کالج اردو میگزین۔ قدیم دلی کالج نمبر (۱۹۵۳ء)
[۴] خطبات گارساں دتاسی: ۹۵ [۵] غدر کے چند علماء: ۶

مرزا قادر بخش صابر نے لکھا ہے:

سلسلہ ان کے نسب کا . . . والد ماجد کی طرف سے تو فاروق حق و باطل عمر فاروق ابن خطاب علیہ رضوان اللہ الوہاب تک اور . . . . حضرت والدۂ شریفہ غفر اللہ لہا کی جانب سے قدوۃ واصلان درگاہ . . . . عرفان دستگاہ محبوب سبحانی سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے[۳]

شاہجہاں آباد میں فروکش ہونے سے پہلے ان کا خاندان تھانیسر میں رہتا تھا۔ صہبائی کے آبا و اجداد میں کچھ ایسے افراد بھی تھے جو علم و فضل سے بہرہ ور ہونے کے علاوہ فی الجملہ صاحب استطاعت و اہل ثروت بھی تھے۔ مرزا قادر بخش صابر کا بیان ہے:

"وطن آبائی اس جناب مستطاب کا شہر کرامت بہر تھانیسر صانہا اللہ عن الشر (ہے) . . . حضرت کے آبائے کرام اور اجداد عظام سے اکثر ایسے ہیں کہ ان کا قامت احوال یا لباس سربلندی ظاہری سے آراستہ تھا یا زیور کمالات باطنی سے پیراستہ"[۴]

دوسرے اہل تذکرہ کے یہاں اس نوع کی کوئی اطلاع نہیں لیکن مولانا سے رشتہ تلمذ اور خصوصی تعلق کی وجہ سے صابر کے اس بیان کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تعلیم و تربیت میں گھر کے ماحول اور خاندانی روایت کا بھی ایک حصہ ہونا چاہیے اور اس کا امکان رہتا ہے کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد یا خاندان کے کسی دوسرے بزرگ سے پائی ہو۔ ان کے اساتذہ میں مولوی کریم الدین نے مولوی عبد اللہ خاں علوی کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ جو اس زمانے کے ایک بڑے فاضل شخص تھے۔

"عبد اللہ خاں فارسی خواں (کذا) جو شاہجہاں آباد میں مشہور تھے ان سے تحصیل فارسی کی اور کتب عربیہ بھی متفرق جائے سے پڑھیں۔ طب میں بھی دست قدرت رکھتے ہیں۔"

سرسید نے مولانا عبد اللہ خاں علوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

". . آئینہ دار کمالات صوری و معنوی مولوی عبد اللہ خاں متخلص بہ علوی سن شریف آپ کا چالیس سے متجاوز تھا اگرچہ اصل وطن مولا شمس آباد تھا لیکن ایام طفلی سے بود و باش

---

[۳] گلستان سخن مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی جلد دوم: ۱۳۷ [۴] ایضاً: ۱۳۸-۱۳۷

شاہجہاں آباد میں رہتے تھے۔ ہر فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے، ایک مدت گذرتی ہے کہ شاہجہاں آباد سے بامید تلاش ... ا ش پورب کی طرف تشریف لے گئے ..... ۱۲۷۲ھ میں عالم باقی کی طرف راہی ہوئے۔[۸]

درسیات پر ان کی دسترس اور بعض علمی کمالات میں ان کی یکتائی کا جو ذکر ان کے معاصرین نے کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ صہبائی علوم شعریہ اور فنون ادبیہ میں ایک صاحب فضیلت شخص تھے۔ سرسید لکھتے ہیں:

"اس حز و زماں میں ایسی جامعیت کے ساتھ کوئی کم نظر سے گذرا ہے۔ اور طرفہ یہ کہ فنون متعارفۂ سخنوری مثل تحقیق لغت و اصطلاحات زبان ذاتی اور تدقیق مقالات کتابی اور تکمیل عروض و قافیہ اور استکمال فن معما میں ایسا کمال بہم پہنچایا ہے کہ ہر فن میں یک فنی کہا چاہیے۔

شرح کتب اور رسائل قواعد زبان فارسی اور رسائل علم عروض و قافیہ و معما جو آپ کے ریختۂ قلم نزاکت رقم ہیں خصوصاً رسالۂ گنجینۂ رموز کہ صفت معما میں آپ کے خامہ معنی طراز سے جلوہ پرداز ہوا ہے"[۹]

مرزا قادر بخش صابر کے یہاں یہی روایت اس انداز سے سامنے آتی ہے:

"بساط ہستی پر اس جامعیت کے ساتھ کم کسی نے قدم رکھا ہے سخن اس مجمع فضائل کی قدر شناسی پر کیوں نہ ناز کرے کہ نکات معانی و حقائق بیان و محسنات بدیعی و تحقیق لغات، و تفتیش مصطلحات و تجسس اوزان عروضی و تفحص احوال قوافی جن تفصیل سے بیاں محقق ہیں دعویداران کمال سے کس کے خزانۂ طبع میں مشاہدہ ہوئے ہیں۔"[۱۰]

یہ کمالات صہبائی نے مسلسل ذہنی کاوش، علمی مطالعہ اور تصنیفی کاموں میں مصروف رہنے کے بعد حاصل کیے تھے جس نے بالآخر اس فن میں ان کو ایک امتیاز اور انفرادیت بخش دی۔ ان کے حالات پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ درسیات سے فراغت پا کر وہ گویا مستقل طور پر سلسلۂ درس و تدریس

---

۸ آثار الصنادید۔ ۶۲۴۔ ۶۴۳۔ جدید ایڈیشن ۹ آثار الصنادید ۶۳۱
۱۰ گلستان سخن جلد دوم: ۱۳۷

اور کار تصنیف و تالیف سے وابستہ ہوگئے تھے۔

رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد معلمی کا معزز پیشہ اختیار کیا، جس کا ذکر کرتے ہوئے، مولوی کریم الدین نے لکھا ہے:

"محنت اور فارسی دانی کا غلغلہ شاہجہاں آباد میں بلند ہوا چند جا امیروں کے لڑکوں کی تعلیم پر مقرر ہوئے چنانچہ گڑ والوں میں اور بعض متمول کشمیریوں میں چند جا متفرق اُن کے وقت تقسیم ہوئے درس دینا اور خرچ مایحتاج اپنا سب جا سے تنخواہ پاکر کرنا شروع کیا رفتہ رفتہ نواب حامد علی خاں بہادر کی سرکار میں ان کے لڑکوں کو پڑھانے کے واسطے ماموُر ہوئے۔"[اللہ]

بحیثیت مدرس فارسی مولانا کا قدیم دہلی کالج سے وابستہ ہونا ان کی زندگی کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ دہلی کالج اس زمانہ میں نئی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز تھا اور حکومت وقت کی نگرانی اور سرپرستی کی وجہ سے اسے دہلی کی ثقافتی زندگی میں دن بدن ایک خاص اہمیت حاصل ہوتی جارہی تھی۔ مولوی کریم الدین نے اس تقرر کی تفصیل پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جس سال میں کہ لفٹیننٹ گورنر بہادر یعنی طامسن صاحب جو کہ عالم کامل اور قدرشناس اہل علوم کے ہیں شاہجہاں آباد میں واسطے بند و بست مدرسہ کے تشریف لائے سب مدرسوں کا مع طلبا کے امتحان لے کر یہ تجویز کی کہ ایک مدرس فارسی کے کے واسطہ اچھا مقرر کرنا چاہئے۔

شاہجہاں آباد میں سے لوگوں مستعدوں کی تلاش ہوئی مفتی محمد صدرالدین خاں بہادر نے جو ہمارے زمانہ میں شاہجہاں آباد کے صدر الصدور ہیں جناب طامسن صاحب بہادر کی خدمت میں یہ عرض کی کہ اس شہر میں اچھے فارسی داں تین شخص منتخب روزگار ہیں ایک مرزا نوشہ صاحب دوسرے مولوی امام بخش صاحب تیسرے حکیم محمد مومن خاں۔

لفٹیننٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ صاحب نے سبب اس کے کہ ان کو نوکری کرنے سے استغنا تھی انکار کیا حکیم مومن خاں نے درخواست ایک سو روپیہ ماہواری تنخواہ کی کی مولوی امام بخش صاحب نے چونکہ کسی طرح کا وسیلہ بجز روزگار کے وجہ معیشت نہ رکھتے تھے

[اللہ] طبقات شعرائے ہند: ۴۱۵

حسب خواہش لفٹیننٹ گورنر بہادر کے حکم اجابت کے چالیس روپیہ ماہواری ان کے واسطے مقرر ہوا مدرس اول فارسی خوانوں کے مقرر ہوئے ________
۱۸۴۲ء میں درس تدریس کرنے لگے ۔"

یہ واقعہ جیسا کہ مولوی کریم الدین کے بیان سے واضح ہوتا ہے ۱۸۴۲ء یا اس کے قریبی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس وقت مولنا کی عمر ۳۲ برس ہونا چاہیے۔ اس سے پیشتر وہ ایک اچھی خاصی طویل مدت تک آزادانہ معلمی کا پیشہ کرتے رہے۔

مرزا غالب کی شخصی انا اور احساس عزت کے سلسلے میں مولنا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اس واقعہ کا ذکر اس طور پر کیا ہے :

" ۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دہلی کالج کا انتظام از سر نو منظور ہوا ٹامسن صاحب جو کئی سال تک اضلاع شمال و مغرب کے لیفٹیننٹ گورنر بھی رہے اس وقت سکریٹری تھے وہ مدرسین کے امتحان کے لیے دلی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ مہینہ کا ایک مدرس عربی ہے ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو لوگوں نے چند کاملوں کے نام بتائے ان میں مرزا کا نام بھی آیا مرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے صاحب کو اطلاع ہوئی مگر یہ پالکی سے اتر اس انتظار میں ٹھہرے کہ حسب دستور قدیم صاحب سیکریٹری استقبال کو تشریف لائیں گے ۔ جب کہ نہ وہ ادھر سے آئے نہ یہ ادھر سے گئے اور دیر ہوئی تو صاحب سکریٹری نے جمعدار سے پوچھا وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے انھوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے میں کیوں کر جاتا جمعدار نے جا کر پھر عرض کی صاحب باہر آئے اور کہا جب آپ دربار گورنری میں بحیثیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اس تعظیم کے مستحق نہیں مرزا صاحب نے فرمایا گورنمنٹ کی نوکری باعث زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں مرزا صاحب رخصت ہو کر چلے آئے صاحب موصوف نے مومن خاں صاحب کو بلایا ان سے کتاب پڑھوا کر سنی اور زبانی باتیں کرکے اسّی روپے تنخواہ قرار دی انھوں نے سو روپیہ سے کم منظور نہ کئے صاحب نے کہا سو روپیہ لو تو

ہمارے ساتھ چلو دل نے نہ مانا کہ دلی کو ایسا سستا بیچ ڈالیں [۱۲]۔"

یہاں صہبائی کا براہ راست کوئی ذکر نہیں لیکن یہ تفصیلات اسی واقعہ سے متعلق ہیں جس کے نتیجہ میں صہبائی دلی کالج میں ملازم ہوئے۔ بعد ازاں یہ تنخواہ بڑھ کر پچاس روپیہ ہو گئی۔ مولوی کریم نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

بعد ایک عرصہ کے پچاس روپیہ تنخواہ ہو گئی، ہنوز وہی تنخواہ پاتے ہیں شاہجہاں آباد کے مدرسہ میں پڑھاتے ہیں۔" [۱۳]

کچھ عرصہ کے بعد پرنسپل بوترو کے زمانے میں وہ مدرس اول کے عہدے پر سرفراز کئے گئے۔ [۱۴]

صہبائی کا یہ ترجمہ مولوی کریم الدین نے ۱۸۴۷ء میں شامل تذکرہ کیا ہے ـــــــ ان کے عام انسانی کردار اور علمی زندگی کا نقشہ صاحب" طبقات شعرائے ہند" نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے :

"شعر مجسم، فارسی میں بڑی دست قدرت رکھتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں کتب فارسی سے مثل ان کے کوئی ماہر نہیں . . . علم دوست رات دن طلبا کے پڑھانے میں رہتے ہیں تمام کتب فارسیہ پر عبور ہے کتب عربیہ میں سے صرف و نحو اور معانی و منطق بھی جانتے ہیں مگر بجز فارسی کے اردو شعر نہیں کہتے۔" [۱۵]

اسی وجہ سے مولینا کا ذکر اردو کے بہت کم تذکروں میں ملتا ہے۔ صہبائی اپنے زمانے کے ایک بڑے صاحب درس و تدریس شخص ہونے کے علاوہ ایک موقر سلسلۂ تصانیف کے بھی مالک تھے۔ فارسی زبان کے اہم اور نہایت ادق ادب پاروں کی شرح فنون شعریہ بالخصوص علم قوافی قواعد لغت اور اسرار و معمیات ان کا خاص موضوع تھے جن پر انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے اس کی مختصر سی تفصیل مولوی کریم الدین کے اس بیان میں موجود ہے :

"بموجب حکم سکریٹری سوسائٹی کے کتاب حدائق البلاغت کا ترجمہ، جو اصل میں شمس الدین فقیر کی تصنیف ہے، زبانِ اردو میں اس شخص نے بہت اچھا کیا ہے جو حق ترجمہ ہوتا ہے وہ ادا کیا ہے یہ ترجمہ درمیان ۱۸۴۳ء کے سید عبد الغفور کے اہتمام سے سید الاخبار دہلی میں درمیان

---

[۱۲] آبِ حیات طبع دوم : ۵۲۲ [۱۳] طبقات شعرائے ہند : ۴۱۵

[۱۴] غدر کے چند علماء : ۲۶۳ [۱۵] طبقات شعرائے ہند : ۴۱۴

کوچہ چیلوں کے چھپا۔ بعد ازاں ۱۸۴۳ء میں میرے اہتمام سے بھی مطبع رفاہ عام واقع حوض قاضی
میں چھپا اور ایک شرح سہ نثر ظہوری کی سید محمد خاں بہادر مصنف شاہجہاں آباد کے چھاپہ خانہ
میں عبدالغفور کے اہتمام سے یکم جولائی الاول ۱۲۶۰ھ مطابق یکم مئی ۱۸۴۴ء کو ان کی تالیف سے
چھپی۔ اور ایک اور شرح الفاظ مشکلہ [منشی] ٹیک چند بہار کی بھی ان کی تالیف سے
درمیان اس سال یعنی ۱۸۴۷ء کے چھپی ہے اور ایک رسالہ ایک معما کے حل میں انھوں نے
بہت خوب تصنیف کیا ہے اس میں ایک شعر سے سات سو نام نکلے ہیں ایک رسالہ انکی
تصنیف سے فن معما میں بھی بہت اچھا ہے۔
ایک اردو زبان کے شعرا کا مجموعہ انھوں نے طیار کرکے اس میں غزلیات اور گیت
گانے بجانے کے مع تعریف قصیدہ اور بیان عروض کے یعنی رباعی و قطعہ اور مسدس
وغیرہ کے چھپوایا ہے یہ انتخاب ۱۸۴۴ء میں چھپ کر تیار ہوا۔"

صہبائیؔ اپنے زمانہ کے ممتاز اہل علم میں سے تھے اسی کے ساتھ اس دور کے اکابر سے ان کی گہری دوستی تھی۔ مولینا ابوالکلام آزاد نے اس عہد کی علمی شخصیتوں اور تہذیبی محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"والد مرحوم دہلی کے دیوان خانوں کی مجلسوں کے جو افسانے سناتے تھے بجھنے والے چراغ کا یہ آخری اجالا تھے مرحوم دہلی کی ہفت صد سالہ زندگی کی انجمن طرازیوں کی یہ آخری بزم تھی۔
مفتی صاحب (مفتی صدرالدین آزردہ) کا دیوان خانہ دہلی کے منتخب افراد کا مجمع و مرکز تھا۔ جاڑا گرمی برسات کوئی موسم ہو لیکن شب کی مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا ہر فن کے اکابر کو وہاں آپ کے بہترین وقتوں میں دیکھا جا سکتا تھا اگر کوئی نووارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل و کمال کو بیک مجلس دیکھ لے تو سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانہ کا رخ کرتا، ان صحبتوں کے ایک رکن حضرت صہبائیؔ بھی تھے۔ کالج سے لوٹتے گھر آتے پھر شام کو ہوا خوری کے بجائے مولینا فضل حق خیرآبادی کے یہاں جاتے، وہاں سے پہر بیس تو آکہا ت کھاتے، شب میں بعد نماز عشا مفتی صاحب کے یہاں جاتے، یہاں کی محفل برخاست ہوتی تو گھر جاتے۔"[۱۶]

---

[۱۶] غدر کے چند علماء: ۲۶۵

سرسید نے فنون شعریہ میں ان کی دسترس اور فن معمہ میں ان کی ژرف نگہی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی بعض تصانیف کے بارے میں خاصی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے لیکن انشاپردازانہ طریق رسائی کی وجہ سے بہت سا حصہ محض عبارت آرائی کی نذر ہوگیا۔ بہرحال اس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

"رسالہ گنجینۂ رموز کہ صنعت معما میں آپ کے خامۂ معنی طراز سے جلوہ پرداز ہوا ہے . . . رسالہ مشتمل ہے ایک معما کی شرح میں کہ شرح و متن دونوں آپ کے نتائج طبع فیاض سے ہیں .. اور ایک رسالہ جواہر منظوم نام مشتمل رباعیات پر کہ ہر رباعی سے ایک نام نامہائے باری عز شانہ کا مستخرج ہوتا ہے ... ایک شرح چار باغ جزو کی مسمی بریزۂ جواہر سلطان عہد والی عصر محمد سراج الدین بہادر شاہ خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی مدح میں ریختۂ قلم نزاکت رقم کی ہے"

(۶۶۳ - ۶۳۱)

صاحب گلستان سخن نے ان کے کمال فن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"صناعت عروض میں تلاش اوزان کی ایسی داد دی ہے کہ خلیل ابن احمد دیار عرب میں اور مولینا یوسف گل زمین عجم میں اگر اب موجود ہوتے تھے تحقیق حقائق و تدقیق دقائق کے ارادہ سے سفر ہند پر کمر باندھتے . . . ایک رسالہ موسوم بہ کافی .. عبارت مختصر میں ترقیم کیا ہے۔ اور اس مجمل کی شرح میں ایک اور رسالہ تحریر فرمایا ہے مسمی بہ وافی کہ مسائل دقیقہ کمال تفصیل سے صورت پذیر ہوئے ہیں۔ اکثر کتب درسیہ فارسی پر شروع مبسوط مرقوم کی ہیں کہ حل حقائق متن کے سوا اور مطالب دقیق اور مسائل ماحصر پر مشتمل ہیں۔"[۱۲]

سرسید اور صاحب دونوں نے کچھ ایسے استوارھی پیش کیے ہیں جن کی شرح نگاری اور اسرار کشائی میں مولینا صہبائی نے دقیقہ رسی اور نکتہ شناسی کا وہ کمال دکھلایا ہے کہ آج اس پر حیرت ہوتی ہے عوامض فن سے یہ آگاہی اور اسرار شعریہ کی یہ پردہ کشائی ظاہر کرتی ہے کہ اس زمانہ کے فنی معیار کیا تھے۔ یہی ادبی فکر اور فن کے بارے میں ذہنی رویہ داستان نگاری اور طلسم کشائی میں بھی اپنا جادو جگاتا ہوا نظر آتا ہے۔ غالب اپنے شعر کے ہر لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم قرار دیتے تھے، غالب نے معمائی شاعری تو فی الواقع نہیں کی لیکن مشکل گوئی کے سلسلے میں ان کے ذہنی رویے کی توجیہ اس ادبی پس منظر میں ہی کی

---

۱۲ گلستان سخن (جلد دوم) : ۱۳۷

جا سکتی ہے۔

صہبائی کا کلیات ان کے ایک ہندو شاگرد منشی دین دیال، میر منشی ایجنسی ریاست بھوپال نے مرتب کیا تھا جس کی اشاعت ۱۲۹۳ھ میں مطبع نظامی کانپور سے عمل میں آئی۔ اس سے متعلق مولینا ضیا احمد بدایونی نے لکھا ہے:

"ان کے ذی علم تلامذہ مولوی محمد حسین ہجر ناظم عدالت اندور، منشی دھرم نارائن، میر منشی ایجنسی سینٹرل انڈیا اور لالہ بلدیو سنگھ نامی کے تعاون اور منشی دین دیال دہلوی میر منشی ایجنسی بھوپال تلمیذ صہبائی کی سعی سے ۱۲۹۲ھ میں مرتب ہوا اور ۱۲۹۶ھ مطبع نظامی کانپور میں چھپا تصحیح کا کام نواب سید محمد صدیق حسن خاں اور مولوی محمد حسین ہجر جیسے فضلائے روزگار نے انجام دیا۔"[18]

فارسی زبان میں صہبائی کی سب سے اہم تصنیف ریزۂ جواہر کو قرار دیا جا سکتا ہے سر سید کے علاوہ دیگر اہل علم نے بھی اس کی تعریف کی ہے مولینا ضیا احمد بدایونی نے اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

"ریزۂ جواہر کا انداز بالکل سہ نثر ظہوری سے ملتا ہوا ہے، جس طرح ظہوری نے ابراہیم عادل شاہ ثانی والی بیجاپور کی تعریف کرتے ہوئے اس کی معرفت، اتباع شریعت، شان و شوکت عدالت، شجاعت، سخاوت اور کسب کمالات کے گن گائے، اسی طرح صہبائی نے بھی بہادر شاہ ... کی سخاوت، شجاعت اور عدالت کی مدح میں مبالغے کے جوہر دکھائے ہیں ... افسوس ہے کہ صہبائی کا ممدوح مجبور تھا ورنہ ابراہیم عادل شاہ کی طرح اپنے مداح کو زر و جواہر سے مالا مال کر دیتا۔"[19]

اس کی عبارت آرائی اور کلاسیکی اسلوب سے قطع نظر بعض لفظی ترکیبیں اس قدر خوش آہنگ اور معنی آفریں ہیں کہ غالب کے اندازِ فکر کی یاد دلاتی ہیں۔ جنوں جولاں، عناں گستہ، شوق صحرانوردی، جلوۂ انتظار، آتش فکر، زانوے انفعال، نگاہ دیدہ حیراں تشنہ کامی ہائے صحرا وغیرہ صہبائی کی دوسری تصانیف یہ ہیں۔

---

۱۸ مسالک و منازل، ۳۴۲ ۱۹ ایضاً ۳۵۱

فرہنگ ریزۂ جواہر، بیاض شوق پیام، کافی دراعلم قوافی، وافی شرح کافی، گنجینۂ رموز، جواہر منظوم، قطعۂ معمائی مخزن اسرار، رسالۂ نادرہ، نتائج الافکار، غوامض سخن، اعلاء الحق۔

صہبائی نے فارسی زبان کے نہایت مشکل اور پیچیدہ عبارات پر مشتمل کتب ورسائل کی شرحیں لکھیں ان میں شرح شبنم شاداب، ظہیرائے نقرشی، شرح رسالۂ معمیات، شرح حسن و عشق نعمت خاں عالی، شرح مقالات نصیرائے ہمدانی، شرح جواہر الحروف ٹیک چند بہار، شرح سہ نثر ظہوری، شرح مینا بازار، شرح پنج رقعہ۔ آج ان کتابوں کی وہ اہمیت نہیں لیکن صہبائی کے عہد میں کلاسیکی نظم و نثر کی مبہم اور مشکل عبارتوں کے حل کے سلسلے میں ان کی اہمیت کلیدی تھی (معارضہ خان آرزو اور شیخ علی حزیں کے سلسلے میں صہبائی نے شیخ علی حزیں کی حمایت کی جو اس عہد کا ایک بڑا علمی مباحثہ تھا]

بیاض شوق پیام کا تعارف کراتے ہوئے مولینا ضیا احمد بدایونی نے لکھا ہے :

" یہ رسالہ مولینا صہبائی کے مکاتیب اور دوسری نثروں کا مجموعہ ہے شرحوں کے دیباچے خاتمے پر کتابوں کی تقریظیں اور خطوط انتہائی کاوش و تلاش اور کمال رنگینی و تصنع کا نتیجہ ہیں [۲۰] "

اردو میں ترجمہ حدائق البلاغت بہت بڑا کارنامہ ہے۔ انتخاب دواوین اردو شاعری کے اہم انتخابات میں شامل ہے۔ اس سے صہبائی کے علمی اختصاص اور ان کی تصانیف کی امتیازی حیثیت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے، جس کے باعث وہ اپنے ہم چشموں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور اپنے زمانے کے اہل ادب میں انھیں درجہ استناد حاصل تھا۔

خود صاحب تصانیف ہونے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے زمانے کے بعض مصنفین کو ان کے علمی کاموں میں نمایاں حیثیت سے مدد بہم پہنچائی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آثار الصنادید کی تالیف کے وقت وہ سرسید کے علمی مشیر اور ادبی معاون رہے ہیں، جس کا اعتراف اس طور پر کیا گیا ہے :

" سرسید ہمیشہ تعطیلوں میں عمارات بیرون شہر کی تحقیقات کے لیے شہر کے باہر جایا کرتے تھے، اور جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تھی تو رات کو بھی باہر رہتے تھے، ان کے ساتھ اکثر ان کے دوست اور ہمدم مولینا امام بخش صہبائی ہوتے تھے ... سرسید کہتے تھے کہ قطب صاحب کی لاٹ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جاتے تھے ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں

---

[۲۰] مسالک و منازل : ۲۵۸

کے بیچ میں کتبے کے برابر بندھوالیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولینا صہبائی فرط محبت کے سبب گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا"[21]

اس سے ہم اس نتیجہ پر بھی پہنچ سکتے ہیں کہ ان قدیم کتبوں کو پڑھنے میں، جو عربی اور فارسی زبانوں میں ہوتے تھے، صہبائی سے بگمانِ غالب سرسید کو کافی مدد ملی ہے، اسی کے ساتھ آثارالصنادید طبع اول میں شامل کلاسیکی اندازنگارش کی نمائندہ عبارتیں دراصل صہبائی کے قلم کی مرہونِ منت تھی جس کی طرف اشارہ خود سرسید مرحوم نے کیا تھا۔

گلستانِ سخن مولفہ مرزا قادر بخش صابر کے بارے میں تو یہ خیال خاصا قدیم ہے کہ اس تذکرہ کے مصنف دراصل مولینا صہبائی ہیں۔ گلستان سخن کا ایک قدیم مطبوعہ نسخہ جو ڈاکٹر وزیرالحسن عابدی لاہور کے ذاتی ذخیرہ کتب کی زینت ہے، وہ اس سے پیشتر کسی ایسے شخص کے مطالعے اور ذاتی لائبریری میں رہا ہے جو اس حقیقت سے واقف تھا، اس لیے اس میں اس تذکرے سے متعلق یہ بیان صہبائی کے ترجمہ کے متوازی حاشیہ پر ملتا ہے: "یہ دراصل مولوی امام بخش صہبائی کی تصنیف ہے۔" قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے ایک مقالے میں اس مسئلے پر محققانہ نظر ڈالتے ہوئے اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی مخلصانہ رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"میرے نزدیک شعرا کے حالات و اشعار بیشتر صابر اور کمتر صہبائی کے فراہم کردہ ہیں لیکن عبارت سراسر صہبائی کی لکھی ہوئی ہے اور مقدمے کے علمی مباحث کے وہ تنہا ذمہ دار ہیں ... گلستان سخن سے قطع نظر صابر کی ایک سطر بھی موجود نہیں جسے ان کے ذی علم ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جا سکے یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ یہ بات کہ عبارت میں صہبائی کی اصلاح ہے بار بار لکھی گئی ہے اور خلاف دستور سرورق میں بھی اس کا ذکر ہے میرا خیال ہے کہ صہبائی کے دہلوی معاصرین اس بات کو اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ کتاب دراصل صہبائی کی ہے اور یہ کھلا راز نساخ کو اپنے زمانۂ قیام دہلی میں انھیں سے معلوم ہوا میرا قیاس ہے کہ سری رام نے بھی یہ بات بطور روایت سنی۔"[22]

---

[21] آثارالصنادید: (جدید ایڈیشن): ۱۲-۱۱

[22] قدیم دلی کالج نمبر ۹۳-۹۲

قاضی صاحب نے اس بارے خاص میں یہ بھی لکھا ہے:

"غالب گلستان سخن کو صہبائی ہی کی تصنیف سمجھتے تھے اور نساخ (صاحب سخن شعرا) اور سری رام دیباچہ خمخانۂ جاوید جلد اول صفحہ ۲ کی بھی یہی رائے ہے۔[۲۳]"

تصنیفی کاموں کے سلسلے میں اس نوع کی علمی کاوشوں کی مثالیں ادبیات کی تاریخ میں اور بھی مل جائیں گی لطائف غیبی اس کی ایک نمایاں مثال ہے جو میاں داد خاں سیاح کے نام سے سامنے آئی لیکن اس کے اصل مصنف مرزا غالب ہیں۔

مولوی کریم الدین نے صہبائی کا جو حلیہ پیش کیا ہے اس میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے دہلی کی آخری شمع میں بعض اضافے کئے ہیں جو ان کی نسبتاً خوش حال زندگی اور بڑھتی ہوئی عمر کا خیال کرتے ہوئے محض تخیل کی مدد سے کیے گئے ہیں صہبائی کی جو تصویر ملتی ہے اس کی وضع قطع بھی کچھ ایسی ہی ہے:

"درمیانہ قد کھلتا ہوا گندمی رنگ منہ پر چیچک کے داغ مہندی سے رنگی ہوئی سرخ داڑھی پرانی وضع کا لباس ایک برکا سفید پاجامہ سفید انگرکھا کشمیری کام کا جبہ پر چھوٹا سا سفید صافہ دبے پتلے اور لاغر اندام"[۲۴]

صہبائی کی اولاد میں سے ان کے صرف ایک بیٹے مولوی عبد الکریم سوز کا ذکر بعض تذکروں میں ملتا ہے وہ ۱۲۷۰-۷۱ھ میں گلستان سخن کی ترتیب کے زمانے میں انیس بیس برس کے تھے، جس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی پیدائش ۱۲۵۰ھ کے قریب ہوئی تھی۔

اس عمر میں وہ شعر و سخن سے اپنی گہری دلچسپی اور رسمی علوم سے واقفیت کے باعث اس لائق ہو گئے تھے کہ کم مشق اور نوآموز شائقان شاعری کی نہ صرف یہ کہ اصلاح و ترتیب میں حصہ لے سکیں بلکہ اس زمانہ کے بعض دوسرے اساتذۂ سخن کی طرح مشاعرے کے موقعہ پر انھیں غزلیں کہہ کہہ دے سکیں۔ مرزا قادر بخش صابر نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"قلیل السن کثیر العلم شیریں مقال، بسیار کمال صاحب طبع سلیم مولوی عبد الکریم خلف رشید استادی و مولائی امام بخش صہبائی ہر چند سنین عمر کے اعتبار سے کہیں

---

۲۳ قدیم دلی کالج نمبر: ۹۲ نیز ملاحظہ ہو حواشی۔ ۹۲، ۹۳

۲۴ دہلی کی آخری شمع: ۲۳

پسرِ حضرت استاد ہے لیکن کثرتِ علم اور افزونی دانش کی حیثیت سے گویا اکبر اولاد ہیں سال عمر ہنوز انیس بیس سے متجاوز نہیں ہوئے۔

اس سن و سال میں اپنے پدر بزرگوار کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کر کے سب کتب درسی فارسی کی تحصیل سے خواہ نظم خواہ نثر فراغت کلی حاصل کی اور اس فن میں شب و روز افادۂ طلبۂ مدرسہ کمال میں مصروف رہے

کثرت سخن اس مرتبہ کہ مشاعرے کے روز معہود تک اس کے گنجینۂ فکر سے اکثر اہل مذاق کو کہ ہنوز استعداد شعر گوئی نے ان کو مرد میدان مشاعرہ نہیں کیا، صدہا شعر عطا ہو جاتے ہیں"[25]

سوز تاریخ گوئی میں ایک خاص کمال رکھتے تھے۔ ذوق کی وفات پر ایک طویل قطعۂ تاریخ بعنوان "واقعہ تعجب خیز"، جو انھوں نے لکھا ہے اس میں مختلف سنین، فصلی، ہجری اور عیسوی وغیرہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے بہت سے مادہ ہائے تاریخ نکالے گئے ہیں[26]

صاحب خم خانۂ جاوید نے ان کے ترجمہ کے ذیل میں لکھا ہے:

مولا بخش قلق میرٹھی مرحوم جو حضرت صہبائی کی شاگردی سے پھر کر جناب مومن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے ان سے کارزار شاعری میں مقابلے ہوئے قلق کو زار زار حزیں ہونا پڑا... ان کا ضخیم اور قلمی کلیات لالہ بنارسی داس کے پاس موجود تھا مگر افسوس کا مقام ہے کہ وہ ان کی وفات کے بعد ورثا کی کم توجہی سے ضائع ہو گیا[27]

صہبائی کے شاگردوں کی ایک اچھی خاصی تعداد تھی جس کے لیے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ سیکڑوں تک پہنچتی ہے اس میں مبالغے کو بھی دخل ہو سکتا ہے لیکن مشاعروں میں شرکت کے شوق میں جس طرح کم مشق شاعر اور کم سواد لوگ بے محابانہ اساتذۂ سخن کے پاس چلے آتے تھے اور اصلاح سخن کے نام پر ان سے غزلیں کہلوا کر لے جاتے تھے، اس کے پیش نظر ان کے ایسے بہت سے شاگرد ہو سکتے ہیں جو در اصل شاگرد نہ تھے، ان کے مائدۂ سخن کے زلہ بردار تھے۔

---

۲۵ گلستان سخن:

۲۶ ملاحظہ ہو گلستان سخن:

۲۷ خم خانۂ جاوید (جلد چہارم): ۲۸۳

صہبائی کے قابل ذکر شاگردوں میں مرزا قادر بخش صابر کے علاوہ مرزا رحیم الدین حیا، میر حسین تسکین،
ماسٹر پیارے لال آشوب، لالہ جگل کشور اوج، منشی دین دیال، مولوی محمد حسین تجر، ناظم عدالت
ندوہ، منشی دھرم پال اور لالہ بلدیو سنگھ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ منشی دین دیال کو کلیات
صہبائی کے مرتب ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔

اگرچہ صہبائی نے معارضہ شیخ علی حزیں اور خان آرزو کے سلسلے میں حزیں کے موقف کی حمایت
کی ہے مگر اپنے معاصرین سے ان کے تعلقات خوشگوار رہے۔ غالب صہبائی کو اپنے عہد کے
ممتاز اہل ادب اور فارسی زبان کے ماہرین میں شمار کرتے تھے با ایں ہمہ جب مرزا رحیم الدین قاطع برہان کے
ادبی تنازعہ میں مرزا غالب کی مخالفت کی تو مرزا نے مرزا رحیم الدین کے ساتھ ان کے استاد مولوی امام بخش
صہبائی کو بھی کم عیار اور بے رتبہ قرار دیا اور لکھا: "وائے اس ہیچ پوچ پر جیسے صہبائی کا تلمذ و جسے
افتخار ہو۔" یہ رائے غالب کے اپنے مزاج زندگی کی نمائندگی کرتی ہے ادبی معیار کی نہیں۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ دہلی کے سر پر ایک قیامت کی طرح نازل ہوا اور اس "رستخیز بے جا" میں جو
لوگ تیغ ستم کا شکار ہوئے اس میں مولوی امام بخش صہبائی اور ان کے نوعمر بیٹے مولوی عبدالکریم سوز بھی
تھے جو انگریزوں کے ہاتھوں بے جرم قتل ہوئے۔

مفتی انتظام اللہ شہابی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جو جو قلعہ سے تعلق رکھتا تھا لپیٹ میں آئے بغیر نہ رہا۔ آزردہ جیل گئے شیفتہ کو بھی
قید ہوئی مولینا فضل حق (خیرآبادی) کو انڈمان جانا پڑا وہیں سپرد خاک ہوئے ...
صہبائی گولی کا نشانہ بنے۔"[۳۲۵]

مفتی صاحب معتبر راوی نہیں خیال کئے جاتے لیکن یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ دہلی کے ان نابغوں کو
غدر کے مجرمین کی حیثیت سے قید و بند کی تکالیف برداشت کرنا پڑیں اور صہبائی گولیوں کا نشانہ بنے یا
پھانسی پر لٹکا دئے گئے۔

جاوید وششٹ صاحب نے اپنے مضموں میں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، علامہ راشد الخیری کے حوالے
سے لکھا ہے:

"مولینا قادر علی صاحب مولینا صہبائی کے حقیقی بھانجے تھے اور ان ہی کے ساتھ ان ہی کے

---

۳۲۵ قدیم دلی کالج نمبر، ۶۷ مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

گھر میں رہتے تھے ایک موقعہ پر بیان کرتے تھے کہ میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولینا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہرہ پرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دن دن کرتے آ پہنچے پہلی ہی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں شہر کی حالت نہایت خطرناک تھی اور دہلی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاعیں سرکار میں دے دی تھیں اس لیے ہم سب گرفتار ہو کر دریا کے کنارے لائے گئے۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے کہا کہ موت تمہارے سر پر ہے گولیاں تمہارے سامنے ہیں اور دریا تمہاری پشت پر ہے تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے ہیں وہ دریا میں کود پڑیں میں بہت اچھا تیراک تھا مگر ماموں جان یعنی مولینا صہبائی اور ان کے صاحب زادے مولینا سوز تیرنا نہ جانتے تھے اس لیے دل نے گوارا نہ کیا کہ ان کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا اس لیے میں دریا میں کود پڑا بچاس ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں اور صف بستہ گر کر مر گئے۔"[۲۸]

اس حادثۂ جاں کاہ کا ذکر کئی اہل تذکرہ و تاریخ نے کیا ہے بعض تفصیلات میں اختلاف ہے لیکن مولوی امام بخش صہبائی کے واقعۂ شہادت کی طرف اشارہ سب کے یہاں موجود ہے مولینا امداد صابری نے "غدر کی صبح و شام" کے حوالے سے لکھا ہے:

"دہلی میں سب سے زیادہ کوچہ چیلان میں رہنے والوں پر مصیبت آئی اس محلہ میں بڑے بڑے نامور علما اور اہل فن رہتے تھے۔ مولینا صہبائی اور ان کا خاندان بھی اسی کوچہ میں سکونت پذیر تھا معین الدین جو غدر کے زمانہ میں پہاڑ گنج کے تھانے دار تھے اپنے چشم دید حالات لکھتے ہیں۔

"نواب شیر جنگ خاں کے صاحب زادے محمد علی نے جو دادری کے راجہ کے بھتیجے تھے اپنے اپنے تحفظ کے لیے مکان کے دروازے بند کر لیے تھے چند گورکھوں اور یورپینوں نے جو لوٹ مار میں معروف تھے دروازہ کھولنے کی کوشش میں ناکام رہنے کے باعث دیواروں پر

---

۲۸ قدیم دلی کالج نمبر: (مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی): ۶۷

۲۹ ایضاً

چڑھ کر یورش کی ایک انا جو یہ دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی اپنی گود میں بچہ کو لے کر کنویں میں گر پڑی گھر کی دیگر خواتین نے بھی اس کی تقلید کی ـــــ محمد علی نے وسط مکان سے بندوق چلائی اور تین یورپیوں کو مار گرایا اس پر ایک بڑی فوج مکان پر حملہ آور ہوئی اور تمام اہل خانہ کو قتل کر ڈالا۔ محمد علی بھی مقتولین میں تھے مگر آخر وقت تک لڑتے رہے ساٹھ ہتھیار بند آدمی جن میں مولوی امام بخش صہبائی اور ان کے صاحب زادے بھی شامل تھے جو اسلامی کالج (دہلی کالج) سے متعلق تھے باغی سمجھ کر قتل کر دیئے گئے"[۳۰]

اس خوں چکاں داستان سے متعلق مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے جو روایت اپنی تصنیف "تاریخ عروج عہد انگلشیہ" میں بیان کی ہے وہ یہ ہے:

"کوچہ چیلان پر آفت یہ آئی کہ اس میں کوئی سپاہی انگریزی لشکر کا زخمی ہوا یا مارا گیا سپاہی کو کس نے مارا اس کے باب میں روایات مختلف ہیں غرض اس قصور میں کہ اس محلہ میں ایک سپاہی قتل ہوا حاکموں نے حکم دیا کہ اس کوچہ کے سارے مردوں کو مار ڈالو۔ بہت سے مردوں کو تو سپاہیوں نے ان کے گھروں میں مار ڈالا کچھ آدمی زندہ بھی گرفتار ہوئے جن کو حکم ہوا کہ جمنا کی ریتی میں قلعہ کے نیچے گولی سے مار دیئے جائیں ان مقتولین میں بے گناہ ایک صاحب کمال مولوی امام بخش صہبائی اور ان کے کنبہ کے اکیس مرد تھے جن میں مولوی صاحب کا بھانجا جو داماد بھی تھا وزیر الدین بچا باقی سب فنا ہوئے"[۳۱]

سید ظہیر الدین دہلوی نے اپنی یادگار زمانہ کتاب "داستان غدر" میں اس اندوہناک واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے اس میں کئی اشخاص نامآور اور خرد روزگار مارے گئے میاں محمد امیر پنجہ کش خوشنویس مولوی امام بخش صہبائی اور ان کے دو بیٹے اور بہت سے شریف خاندان لوگ جن کو راج گھاٹ کے دروازے سے دریا پار لے جا

---

۳۰ غدر کے مجاہد شعرا (مولوی امداد صابری): ۲۶۹

۳۱ ایضاً: ۷۱-۲۷۰

کر بندوقوں کی باڑھیں ماردی گئیں اور لاشیں دریا میں پھنکوا دی گئیں چیلوں کے کوچہ کے تمام کنوئیں عورات کی لاشوں سے پٹ گئے تھے۔[32]

ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ صہبائی کے دو بیٹوں نے بھی اپنے نامور باپ کے ساتھ جام شہادت نوش کیا۔

صہبائی کا یہ بے رحمانہ قتل ان کے احباب اور اہل دہلی کے لیے ایک بڑا سانحہ تھا جس کا اندازہ اس شعر سے بھی ہوتا ہے جو مفتی صدر الدین آزردہ نے صہبائی کے قتل سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو :: کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو

مفتی صدر الدین کا یہ شعر اس امر کا ثبوت ہے کہ صہبائی بے جرم و قصور قتل کیے گئے مرزا غالب نے بھی اپنے ایک مکتوب میں صہبائی کے قتل ہو جانے کا ذکر بڑے ملال انگیز انداز میں کیا ہے

صہبائی نے خود اپنی زبان سے گویا اپنی شہادت کے اندوہناک واقعہ کی خبر دیدی تھی

من گر شمع چون رفتم بزم برہم ساختم :: مردم دو چشم مردم عالمے تاریک گشت

کافی زمانہ گذر جانے کے باوجود اہل علم اس واقعہ کو یاد کرتے رہتے اکبر الہ آبادی کا یہ شعر اس کا گواہ ہے

نوجوانوں کو ہوئیں پھانسیاں بے جرم و قصور :: ماردی گولیاں پایا جسے کچھ زور آور

وہی صہبائی جو تھے صاحب قول فیصل :: ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر

اس موقعہ پر جو دوسرے افراد قتل ہوئے ان کا ذکر کرتے ہوئے مولینا امداد صابری نے لکھا ہے:

> مولینا صہبائی کے صاحب زادوں اور بھتیجے کے علاوہ مولینا کے شاگرد مرزا رحیم الدین ایجاد مرزا پیارے رفعت اور ان کے قرابت دار منشی اکرام الدین رند بھی فرنگیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے ۱۱ دوسرے لوگوں کے ساتھ فورٹ گرلاگا نوا کے کلکٹر کے حکم سے ان کو گولی ماردی گئی۔[33]

۳۲؎ غدر کے مجاہد شعرا۔ (مولوی امام بخش صہبائی) ۱۷۰-۲۷۰

۳۳؎ ایضاً

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی

تیسری اور آخری قسط

جدید مشرقی تنقید کا دبستان شبلی

اقبال سہیل ایک خوش گو اور قادر الکلام شاعر تھے اور ساتھ ہی اعلیٰ تنقیدی صلاحیتوں کے بھی مالک تھے۔ ذہانت و طباعی ان کی شخصیت کے نمایاں ترین جوہر تھے۔ رشید احمد صدیقی، اثر لکھنوی اور آل احمد سرور جیسے بلند پایہ نقادوں نے ان کے تغزل اور شاعرانہ کمالات کو سراہا ہے۔ سہیل کو شبلی سے غیر معمولی عقیدت تھی۔ اس کا اثر ان کی شاعری اور تنقید دونوں میں نمایاں ہے۔ شبلی کی طرح ان کی تنقیدیں بھی زیادہ تر تاثراتی انداز کی ہیں، لیکن ان کے یہاں تحلیل و تجزیہ شبلی سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ ان کا طویل مقالہ "گنجینۂ تحقیق" اس کا بدیہی ثبوت ہے۔ تنقید کے لیے فنی واقفیت کے ساتھ ساتھ ماضی اور حال کے ادب اور اس کے عروج و زوال پر بھی نظر ضروری ہے۔ سہیل کی نگاہ میں انگریزی ادب کے علاوہ عربی و فارسی اور اردو ادب بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں "دانائے راز" ہو کر لکھتے ہیں یہ صحیح ہے کہ ان کی تنقیدوں میں کبھی کبھی ان کے بعض تعصبات ابھر آتے ہیں، لیکن دراصل وہ اس دور کی پیداوار ہیں جب جذباتیت حقیقت پسندی پر غالب رہتی تھی اس لیے سہیل بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اسی طرح ان کی بعض تنقیدیں سخت و تند اور افراط و تفریط کا شکار ہو گئی ہیں۔ تاہم سہیل کی اکثر تنقیدیں عالمانہ فکر اور ناقدانہ تجزیے کے اعتبار سے جان ادب ہیں[1]

شبلی اپنی تنقیدوں میں لطافت ذوق کا ثبوت دیتے ہیں، لیکن سہیل کے یہاں مذاق بلند کے ساتھ ساتھ وسعت نظر، ترتیب و تنظیم اور تشریح و تحلیل بھی ملتی ہے۔ وہ شاعر یا ادیب کی

---

[1] افتخار اعظمی: "ذکر سہیل" (مضمون) اردو ادب سالنامہ علی گڑھ۔ ستمبر ۱۹۵۶ء

تخلیق کے ہر نقش کو ابھار کر پیش کر دیتے ہیں۔ وہ فنکار کی عظمت کو تاریکی سے روشنی میں لانے کا فن جانتے ہیں۔ سہیل کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اصغر کو دنیائے ادب سے روشناس کرایا۔ "نشاط روح" میں ان کا مقدمہ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ ان کے یہاں مبالغہ طرازی کا عنصر بھی شبلی کی تقلید اور خود ان کی جذباتیت کا نتیجہ ہے۔ سہیل کی "سیرت شبلی" اگرچہ نامکمل رہ گئی۔ لیکن اس کے جو اجزا رسالہ "الاصلاح" سرائے میر (اعظم گڑھ) میں چھپ چکے ہیں۔ اس میں ایک ادبی شان اور فنی جمال پایا جاتا ہے۔

سہیل کے نزدیک اچھی شاعری وہ ہے جس میں قوتِ تاثیر اور جوش بیان کے ساتھ سنجیدہ اور شریفانہ انسانی قدروں اور زندگی کے قیمتی و بیش بہا تجربات کا حسن اظہار ہو۔ اس کے علاوہ لطافت ذوق، بلندی فطرت، حسن ادا، صفائی و سلاست صحت زبان اور حسن خیال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیئے۔ "نشاط روح" کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

> "ہر حال میں لطافت ذوق اور اعتدال صحیح کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ یہ نہ ہو کہ زور بیان چیخ کی حد تک پہنچ جائے۔ شکوہ الفاظ طبل بلند بانگ کا مصداق بن جائے متانت و سنجیدگی خشکی و پژمردگی کے مترادف ہو جائے۔ اور رنگین بیانی، نسائیت اور عریانی خیال کا روپ بھرے۔ شعر کا خطاب شریف ترین جذبۂ انسانی سے ہوتا ہے اس سے شعر کی موسیقی کو بھی شریفانہ ہونا چاہیئے۔"[۵۲]

ان کے تصور کے مطابق شاعری نہایت سنجیدہ، شریف اور باوقار فن ہے۔ وہ اس فن کے قائل ہیں جو زندگی کے حسن میں اضافہ کا باعث بنے۔ اور روح انسانی میں ارتقاع پیدا کرے۔ وہ چاہتے ہیں کہ فن نشاط زندگی اور امید و آرزو سے معمور ہو اس لیے وہ اردو شاعری میں ماتمی لے کے شدید ترین مخالف ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اردو غزل کے حزنیہ لہجہ کی رسم کہن کو جس قدر جلد فنا کر دیا جائے بہتر ہے۔ چنانچہ سہیل نے خود اپنی شاعری کو امید کے نور سے روشن کر کے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا ہے۔

سہیل کو ترقی پسند شاعری سے فی نفسہٖ اختلاف نہیں تھا، جیسا کہ عام طور پر خیال

---

۵۲ افتخار اعظمی: تابشِ سہیل (مقدمہ)

با جاتا ہے بلکہ وہ اس کی بے راہ روی کے شاکی تھے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ:

"قدیم رنگ تغزل کی جدید پیداوار جو مغربی لباس میں جلوہ گر ہے، وہ عریاں نگاری اور فحاشی ہے، جس کو آج کل نیا ادب کہہ کر اچھالا جا رہا ہے، اور جس کی تائید میں یہ کہا جاتا ہے کہ ادب کو زندگی سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ واقعات سے چشم پوشی بے بصری ہے۔ اور جانتے ہوئے انھیں چھپانا کتمان حق ہے ... ان مجددین سے میری گزارش ہے کہ زندگی کے تمام اعمال و وظائف اس لائق نہیں ہوتے کہ برسرِ عام عمل میں لائے جائیں یا بے ضرورت ان کا اظہار لفظوں میں کیا جائے۔ یورپ کی عریاں پسند جماعت کے افراد بھی غالباً زندگی کے بعض فطری فرائض ایک دوسرے کے سامنے نہیں انجام دیتے، ورنہ عام حیوانات اور انسان کے مابین کوئی حد فاصل نہ رہے"[۵۳]

سہیل کے نزدیک بھی حقیقت کا اظہار شاعری میں اہمیت ضرور رکھتا ہے۔ لیکن خوش سلیقگی شرط اولین ہے۔ یہاں سہیل کی تنقید نگاری کا تفصیلی جائزہ مقصود نہیں ہے۔ سطور بالا کے اجمال سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ شبلی کے مشرقی دبستان تنقید میں سہیل کا کیا مرتبہ ہے اور انھوں نے کس حد تک مشرقی انداز تنقید اور اس کے اصول و روایات کا اتباع کیا ہے۔

مرزا احسان احمد بھی دبستان شبلی ہی کے ایک گل سرسبد تھے۔ ان کے سولہ ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ "مقالاتِ احسان" کے نام سے ۱۹۶۸ء میں دار المصنفین سے طبع ہو چکا ہے جس میں "علامہ شبلی بحیثیت محقق و نقاد"، "عرفانیات فانی"، "افغر اور ان کے ناقدین پر ایک نظر"، "اردو شاعری"، "نغمۂ دل"، "مقدمہ داغ جگر"، "مقدمہ نشاطِ روح"، "قدیم مذاق سخن کے نائب" اور "اسلم کی افسانہ نگاری" وغیرہ مضامین خصوصیت کے ساتھ مرزا صاحب کے اعلیٰ تنقیدی شعور اور پاکیزہ ادبی بصیرت کے شاہد عدل ہیں۔

مرزا احسان احمد تنقید میں ان ہی روایات کے امین تھے، جو شبلی کا خاصۂ امتیازی شمار ہوتی ہیں۔ ان کے اسلوب نگارش اور انداز تنقید دونوں پر شبلی کی سب سے زیادہ گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے، صاحب ذوق نثر نگار بھی اور نکتہ سنج نقاد بھی۔

---

۵۳ افتخار اعظمی: "ذکر سہیل" سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ ستمبر ۱۹۵۶ء ص ۶۸

مرزا صاحب کا مجموعہ کلام " پیامِ کیف " سنہ ۱۹۴۰ء میں شائع ہو کر ذوق شناسانِ ادب سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ جگر کے کلام کا سب سے پہلا مجموعہ " داغِ جگر "[۱] سنہ ۲۱ء میں مرزا صاحب ہی نے اپنے ۱۴ صفحے پر مشتمل مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اور اس کے بعد ہی جگر مراد آبادی کے مرغ شہرت کے بال و پر پیدا ہوئے۔ مرزا صاحب نے متعدد دلائل اور مثالوں سے ثابت کیا تھا کہ جگر کا کلام اس وقت کے اقلیم سخن کے جم و کے عزیز، جوش اور ثاقب کے پائے کا ہے۔ جس وقت انھوں نے یہ جرأتِ رندانہ کی تھی جگر کی حیثیت محض ایک رند لاابالی سے زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ علمی و ادبی حلقوں میں مرزا صاحب کا مقدمۂ داغِ جگر پر کافی مخالفت اور استہزا کیا گیا تھا، مگر بقول مرزا صاحب :

" بالآخر وہ وقت آگیا جب اہلِ ذوق نے دیکھا کہ وہ داغ جگر جو چالیس سال قبل نمایاں ہوا تھا کسی شکستہ مزار کا ٹمٹماتا چراغ نہ تھا بلکہ اس میں شعلہ طور اور آتشِ گل کے تڑپتے ہوئے جلوے بھی پوشیدہ تھے۔ جن کے پرتو سے عرصہ گاہ تغزل جس پر ایک مدت سے بدمذاقی کی تیرگی چھائی ہوئی تھی ایک دفعہ پھر وادی ایمن بن گیا۔ اور بقول جگر " کا ریگران شعر " کو اپنے طلسم باطل کی شکست کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔"[۴]

وہ جگر کے شاعرانہ محاسن پر تبصرہ کرتے ہوئے اس میں جوشِ بیان، وسعتِ تخیل، جذبات نگاری، نکتہ آفرینی، محاکات، سوز و اثر، تصوف، جدتِ ادا اور حسنِ زبان کی نشاندہی کرتے ہیں[۵]۔ اصغر کی شاعری کی نمایاں خصوصیات فلسفہ و حکمت، لطافتِ خیال، ندرتِ ادا، جوش و مستی، سوز و گداز، نزاکت و لطافت اور سادگی و صفائی بیان کرتے ہیں[۶]۔ ان کے نزدیک لفظی صناعی، ظاہری زینت و آرائش اور ایک ہی قافیہ و ردیف پر دو غزلہ سہ غزلہ لکھنے کا نام شاعری نہیں۔ بلکہ

" شاعری نام ہے جذبات کی تپش کا۔ شاعری نام ہے احساس کی حرارت کا، شاعری نام ہے دل کی بے تابی اور روح کے سوز و گداز کا۔ شاعری نام ہے تڑپنے اور تڑپانے کا۔ شاعری نام ہے ایک زندہ اور بیدار دماغ کی آتش فشانی کا۔ شاعری نام ہے فطرتِ انسانی کے بلند اور شریفانہ احساسات کی مصوری کا۔ شاعری نام ہے صحیفہ کائنات کے

---

۴ مرزا احسان احمد : مقالاتِ احسان ص ۴۲۵ (اشاعت اول ۱۹۶۸ء

۵ مصدر سابق ۳۹۵ ۶ مصدر سابق ص ۴۱۶

پر کیف اسرار و حقائق کی گرہ کشائی کا۔[۷]

وہ غزل کو " خمخانہ کیف و سرور " اور غزل گوئی کے لیے ذوق سلیم اور احساس محبت کی رنگینیوں سے کیف اندوز ہونے کی صلاحیت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔[۸] ان کے نزدیک قدیم رنگ تغزل کا سب سے بڑا عیب اس کی اخلاقی پستی اور معنوی ابتذال ہے۔[۹] مرزا صاحب کے خیال میں حقیقی شاعری وہ ہے جو حیات انسانی کے اسرار و معارف کا آئینہ ہو جس میں ہر قسم کے لطیف و بلند جذبات و احساسات کی مصوری کی گئی ہے[۱۰] وہ دبستان لکھنؤ کی شاعری کو نوحہ گری اور آلائش سے تعبیر کرتے ہیں۔[۱۱]

یہ اور اسی طرح کی بکثرت مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا احسان احمد مغربی ادب سے براہ راست استفادہ کے باوجود مشرقی انداز رندانہ تنقید کی زلفوں کے اسیر تھے۔ اور ان کے تنقیدی مضامین کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنقید نگاری کے وقت ہر لحظہ اور ہر آن شبلی کی انتقادی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہی مختلف عنوانات کے تحت نثری و شعری تخلیق کے محاسن کی تقسیم اور پھر اس پر مختصر تبصرہ اور نمونہ۔ پھر انداز تحریر میں شبلی کی کامل اتباع ان کو مشرقی دبستان تنقید میں شبلی سے سب سے زیادہ قریب کر دیتی ہے۔ مرزا صاحب نے کہیں اپنے تنقیدی نظریات پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔ مگر ہم ان کی عملی تنقیدوں سے ان کی امتیازی خصوصیات کو بآسانی اخذ کر سکتے ہیں۔ راقم سطور کا خیال ہے کہ وہ شاعر اور نقاد سے کہیں زیادہ ایک صاحب اسلوب نثر نگار کی حیثیت سے کامیاب ہیں ان کی تنقید نگاری میں کوئی اختراع ذہنی اور جدت واضح نہیں ہے لیکن طرز تحریر کی دلکشی و رعنائی قاری کو وجد و اہتزاز کے عجیب عالم میں پہنچا دیتی ہے۔

شاہ معین الدین احمد بھی شبلی کی تنقید نگاری کے طرز کے کامیاب مقلد ہیں۔ ان کے اسلوب تحریر میں بھی وہ تمام محاسن بوجہ احسن پائے جاتے ہیں جو دبستان شبلی کا طرۂ امتیاز ہیں۔ شاہ صاحب کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ان ادبی مضامین سے ہوتا ہے جن کا مجموعہ " ادبی نقوش " کے نام سے ۱۹۶۶ء میں ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔ ایک مضمون میں اردو شاعری میں ہندو کلچر اور ہندوستان کے طبعی و [illegible] ات کی نشاندہی کی ہے۔ ایک میں اردو زبان و شاعری کی لسانی، علمی اور تمدنی اہمیت پر

---

[۷] مصدر سابق ص ۴۵۱ — [۸] مصدر سابق ص ۴۵۰

[۹] " " ص ۴۵۴ — [۱۰] " " ص ۴۷۵

[۱۱] " " ص ۴۷۸ [illegible]

روشنی ڈالی ہے۔ ایک میں اقبال کے فرقہ پرست شاعر ہونے کی مدلل تردید کی ہے۔ اسی مجموعہ میں شاہ صاحب نے ریاض، مجذوب، اصغر اور جگر کے کلام کے مجموعوں پر سیر حاصل نقد و تبصرہ کیا ہے۔ اور ہر ایک کا انفرادی رنگ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

"ریاض رضواں" پر تقریظ لکھتے ہوئے ریاض خیرآبادی کی شاعری میں زورِ کلام، شوخی و رنگینی، نفاست زبان، شراب و شباب، تشبیہ خمریات، شوخی رندانہ، بادۂ عرفان، تخیل کی رنگینی اور بیان کی شوخی وغیرہ ذیلی عنوانات کے تحت رائے زنی کرتے ہوئے ان کے اشعار پیش کیئے ہیں۔ مضمون "وادیٔ ایمن" خواجہ عزیز الحسن مجذوبؔ کے کلام کا مجموعہ ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے مجذوبؔ کے کلام کا جائزہ بادۂ معرفت شیخ و زاہد و محتسب، نغمہ و ساز، تغزل، سلاست و روانی و صفائی، سوز و گداز، تشبیہات اور محاکات کے عنوانوں کے ذیل میں بہت شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے اور حسن انتخاب کے ساتھ اصل کلام سے اس کو مزین کیا ہے۔ "شعلہ طور" پر انتقاد کرتے ہوئے جگر کی شاعری کی خصوصیات، الفاظ کا انتخاب اور ان کی نشست، سلاست و روانی، فارسی تراکیب، معنوی خصوصیات، خیالات کی بلندی اور وسعتِ اسرارِ حقیقت، گداز عشق، خمریات، شوخی رندانہ اور اخلاق کے عنوانات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اصغر کے مجموعۂ کلام "سرودِ زندگی" پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "سرودِ زندگی میں پختگی ہے، گہرائی ہے، فکر و تدبر ہے بیانِ حقیقت ہے، اخلاق ہے، فلسفہ ہے، تصوف ہے۔ غرض اس سرود کے تمام نغمے لاہوتی ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں مجاز کا رنگین خواب بھی نظر آتا ہے۔ لیکن وہ اتنا لطیف و ہلکا ہے کہ اندر سے حسن حقیقت صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے"[12]

ان مثالوں سے بیک نظر اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاہ صاحب کی تنقید قدیم رنگ یا بالفاظ دیگر مشرقی انداز کی ہے۔ وہ اپنے دعوے کی دلیل میں بے شمار برمحل اشعار پیش کرتے ہیں۔ دراصل ان کو مغربی ادب کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ اور انھوں نے اس کا ثانوی حیثیت سے بھی مطالعہ نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف عربی و فارسی زبان و ادب پر ان کی گہری نظر اور مطالعہ وسیع تھا۔ اس لیے کچھ تو غیر شعوری طور پر اس کا اثر اور زیادہ تر تقلیدی دھن کے باعث وہ اپنی عملی تنقیدوں میں مشرقی طرز تنقید کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ شاہ

---

[12] شاہ معین الدین: ادبی نقوش ص ۲۵۳ (ادارہ فروغ اردو لکھنؤ)

صاحب کے اسلوب نگارش میں شگفتگی ایجاز، جامعیت، دل آویزی، متانت و وقار اور حسن بیان کے جو نمایاں جوہر ملتے ہیں۔ اس سے ان کے اعلیٰ ادبی ذوق، سخن فہمی اور نکتہ رسی کا اظہار ہوتا ہے۔[۱۳]

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا اصل موضوع تو ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی سیاسی و تمدنی تہذیب ہے۔ اس پر انھوں نے متعدد محققانہ کتابیں تالیف کی ہیں جو دارالمصنفین سے شائع ہو کر اہل علم کے حلقے میں عام طور پر پسند کی گئیں۔ لیکن اس کے ساتھ انھوں نے اردو ادب و تنقید کے مسائل پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ سید صباح الدین نے ۱۹۵۸ء میں اشرف علی فغاں کے دیوان کو مختلف خطی نسخوں کی مدد سے بڑی کاوش و محنت کے ساتھ مرتب کر کے اس پر ایک مبسوط فاضلانہ مقدمہ لکھا، جو انجمن ترقی اردو سے شائع ہوا۔ بقول پروفیسر سید حسن:

> "خالص ادبی تحقیق کے شعبے میں صباح الدین کا گراں قدر کارنامہ اشرف علی فغاں کے دیوان کی ترتیب ہے۔"[۱۴]

بلاشبہ انھوں نے "فغاں" کو گوشۂ عزلت سے نکال کر اس کے دیوان کو گم ہونے سے بچا لیا۔ اس کے علاوہ صباح الدین نے ایک اور ادبی کتاب "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" کے نام سے لکھی ہے جو دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد حال ہی میں شائع ہو چکی ہے اور دوسری زیر طبع ہے۔[۱۴-الف] اس کتاب میں مرزا غالب کی زندگی سے عصر جدید تک ان کی حمایت و مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو نقد و تبصرہ کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے ـــــ اس کی تالیف میں مولف نے جو کاوش و محنت کی ہے وہ یقیناً مستحق آفریں ہے۔ لیکن تنقیدی حیثیت سے اس کتاب کا کوئی بلند مقام اور اعلیٰ معیار نہیں ہے۔ اس کتاب کی اشاعت اس حیثیت سے ذخیرۂ غالبیات میں ایک قیمتی اضافہ ضرور ہے کہ یہ غالب پر بکثرت کتابوں کے مطالعہ سے مستغنی کر دیتی ہے۔ لیکن راقم سطور کے نزدیک اس سے ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا ہے کہ تحقیقی سہل انگاری میں (جو اب بھی کچھ کم نہیں ہے) مزید اضافہ ہو جائے گا۔ اور اصل مآخذ سے رجوع و استفادہ کے بجائے ثانوی مآخذ پر اعتماد کرنے کے افسوس ناک رجحان کو فروغ حاصل ہوگا جس کی بہرحال حوصلہ شکنی کی ضرورت ہے۔

سید صباح الدین کے تنقیدی مضامین اور ادبی تصانیف کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے

۱۳؎ ابوالحسن علی۔ پرانے چراغ ص ۲۶۲ (مکتبہ فردوس لکھنؤ)

۱۴؎ سید حسن: ماہنامہ "صنم" پٹنہ بہار نمبر اپریل ۱۹۵۹ء ص ۲۱۴ ۱۴-الف: اب شائع ہو گئی ہے (جامعی)

تنقیدی افکار و نظریات، عملی تنقید کے نمونوں اور اسلوب تحریر سب میں ذہنی طور پر شبلی سے زیادہ حالی کے دبستان تنقید سے متاثر اور قریب ہیں۔ غالباً یہ ان کے علی گڑھ اور دوسری جدید تعلیم گاہوں میں طویل قیام کا نتیجہ ہے۔ بہرحال دارالمصنفین سے وابستگی اور یہیں تمام علمی خدمات انجام دینے کے باعث ان کا شمار بھی دبستان شبلی ہی کے نقادوں میں کیا جاتا ہے۔

(۴)

علامہ سید سلیمان ندوی کے قصر عظمت کے ستون علم و تحقیق کی بنیادوں پر قائم ہیں۔ مذہب و تاریخ ان کی تحقیقات کے خصوصی جولانگاہ تھے، لیکن خالص ادبی و تنقیدی موضوعات بھی ان کے دائرۂ فکر و نظر سے باہر نہیں رہے۔ اس سلسلے میں ان کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تنقید کو تحقیق سے گلے ملایا ہے تحقیق و تنقید کا اتنا کامیاب، مکمل اور متناسب امتزاج اس سے پہلے ان کے استاد شبلی کے علاوہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ سید صاحب کے مضامین: ہاشم کا مجموعۂ مراثی، اردو کیوں کر پیدا ہوئی، جواہر الاسرار، پرانے لفظوں کی نئی تحقیق، تہنید، اور ہماری زبان کا نام اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

"خیام" سید سلیمان ندوی کا ایک اہم ادبی کارنامہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کتاب کا تحقیقی پایہ اس کی دوسری تمام حیثیتوں پر غالب ہے اور بلا شبہ یہ بھی حقیقت ہے کہ کتاب کا بیشتر حصہ سیرت نگاری پر مشتمل ہے، لیکن بایں ہمہ جہاں عمر خیام کی شاعری اور رباعی کے آغاز و ارتقا پر بحث کی گئی ہے، سید صاحب کا تنقیدی شعور نمایاں اور روشن نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ:

> "خیام میں تنقید کا پہلو نام کو نہیں ملتا۔ شاید تحقیق کی دھن میں انھوں نے تنقید سے چشم پوشی اختیار کر لی ہے۔"[۱۵]

یہ نہایت انتہا پسندانہ رائے ہے۔ پروفیسر عبدالشکور جن کا کسی نقاد کو سند قبول و اعتراف عطا کرنے کا معیار کلیم الدین احمد ہی کی طرح سخت ہے "خیام" کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> "خیام اردو تنقیدی ادب میں ایک بڑا یادگار اضافہ ہے۔ اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اتنی بلند تنقیدی کتاب اردو تنقید کے گذشتہ دور میں کمیاب ہے۔"[۱۶]

۱۵؎ عبادت بریلوی: اردو تنقید کا ارتقاء ص ۲۶۵

۱۶؎ عبدالشکور: تنقیدی سرمایہ ص ۱۲۱

سید سلیمان ندوی کی براہ راست تنقیدی تحریریں ان مضامین اور مقدمات پر مشتمل ہیں، جن کا مجموعہ نقوش سلیمانی کے نام سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوچکا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید صاحب کی تنقیدی نگارشات میں وہی آب و رنگ پایا جاتا ہے جو علامہ شبلی کا خاصۂ امتیازی تھا۔ دونوں کے یہاں یہ خصوصیت بھی مشترک ہے کہ وہ کسی ادیب یا شاعر کو پسند پہلے کرتے ہیں اور اپنے پسند کے جواز کے معقول وجوہ بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً شبلی نے انیس اور فردوسی کے بارے میں جس طرز کی تنقید نگاری کی ہے، سید صاحب نے جگر، اکبر، شاد، امجد کی شاعری کا جائزہ بعینہٖ اسی انداز میں لیا ہے۔ محمود الحسن رضوی نے درست لکھا ہے کہ:

"سلیمان ندوی نے ان روایات کی نمائندگی کی جن کی بنیاد شبلی نے قائم کی تھی۔ شبلی نے مذہبی مسائل، اسلامی معاشرت، مشرقی تمدن اور قدیم عربی نظریات کو زیادہ سے زیادہ مقبول عام بنانے کی کوشش کی تھی۔ سلیمان ندوی بھی انھیں کے خیالات و اصولوں کو وسعت دینے کی کوشش کرتے رہے۔ اسی لیے ان کی ادبی تصانیف میں بھی مشرق کے قدیم انداز تحریر اور فنی معیار کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔"[۱۷]

چوں کہ سید صاحب نے ہر آں اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ تنقید میں شبلی کے نقش قدم پر چلیں، اس لیے ان کے تنقیدی نظریات پر شبلی کے گہرے اثرات مرتسم نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ بھی شبلی کی طرح شاعری کو جذباتی اظہار اور دلی احساسات و تاثرات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری کی صحیح تعریف یہ ہے:

"وہ لفظوں میں شاعر کے جذبات و تاثرات کی تصویر ہے اور جذبات و تاثرات صرف ذاتی واردات ہوسکتے ہیں اور نقالی اور اخذ و سرقہ سے ادا نہیں ہوسکتے۔ یہ ہار سچے موتیوں سے تیار ہوتا ہے۔ جھوٹے موتی اس کے لیے بیکار ہیں۔"[۱۸]

یہ وہی خیالات ہیں جن پر شبلی نے اپنے تنقیدی نظریات کی بنیاد رکھی تھی اور جس کے جلوے شعر العجم (جلد چہارم) اور مقالات شبلی کے اوراق میں نظر افروز ہوتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی شاعری کے مقصد

---

۱۷ محمود الحسن رضوی: اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر ص ۴۰۰

۱۸ سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی ص ۴۵۴

ہونے کے بھی قائل ہیں، اسی باعث وہ اکبر الہ آبادی کی شاعری کو پسند کرتے تھے کہ اس کے پیچھے ایک گہرے اور دوررس مقصد کی کارفرمائی تھی۔ اکبر مغربی تہذیب و تمدن کے سیل رواں اور مضرات سے ہندوستانی قوم اور بالخصوص مسلمانوں کو آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ سید صاحب نے اکبر کے کلام پر تفصیلی ریویو کرتے ہوئے ان کی نصب العینیت اور مقصدیت کا نمایاں طور پر ذکر کیا ہے۔[19] ان کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ تبدیلی حالات کے ساتھ شاعری کے مقاصد بھی تغیر پذیر ہو جاتے ہیں۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"اب سلاطین کی فتوحات کی طاقت نہیں، بلکہ قوم کی فاتحانہ اور اولوالعزمانہ طاقت اہل سخن اور اصحاب قلم کے سینوں میں جوش، زبانوں میں تیزی اور قلموں میں روانی پیدا کرتی ہے۔ اب زمانہ سلاطین کے درباری شعراء کا نہیں بلکہ قومی اور ملی شاعروں کا ہے جو بادشاہوں کے مدحیہ قصیدوں کی جگہ ملک و ملت کے جذبات کی ترجمانی کریں اور اپنی رجز خوانی سے اس کے سپاہیوں کا دل بڑھائیں۔"[20]

سید سلیمان ندوی شعر و ادب میں ماحول کے اثرات کی اہمیت سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ انھیں اس بات کا احساس ہے کہ ہر زمانے کے حالات ہی اس زمانے کے ادب کی تشکیل کرتے ہیں۔ سماجی زندگی میں جو کیفیت ہوتی ہے۔ حالات جو کروٹ لیتے ہیں، اس کی جھلک براہ راست یا بالواسطہ ادب اور شعر میں نمایاں ہوتی ہے، لکھتے ہیں:

"یہ عجیب بدنصیبی ہے کہ ہماری شاعری کی پیدائش اس وقت ہوئی جب قوم پر مردنی چھائی تھی۔ اس کی ساری قوتیں ٹھنڈی تھیں اور یاس و ناامیدی اس کو ہر طرف سے گھیرے تھی، ایسی قوم کے دل و دماغ میں قوٰی کا اشتعال، واقعیت کی قوت، مقصد کی بلندی اور عزم و ہمت کا جوہر کبھی پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ فردوسی نے محمود کو پیدا کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ محمود نے فردوسی کو پیدا کیا۔ اگر محمود کی تلوار یہ ہنگامہ آفریں عہد پیدا نہ کرتی تو رستم و سہراب اور کیکاؤس و افراسیاب کے بوسیدہ ڈھانچوں میں یہ جان نہیں پڑسکتی تھی اور نہ رزم و جنگ کی یہ رجز و نہیب، تلواروں کی یہ جھنکار اور داد شجاعت کے یہ افسانے فردوسی کی زبان و قلم سے ادا ہو سکتے تھے۔"[21]

---

[19] مصدر سابق ص ۱۷۲ [20] مصدر سابق ص ۴۵۷ [21] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی ص ۴۵۶

اس سے صاف ظاہر ہے کہ سید صاحب کے خیال میں ماحول اور حالات و واقعات سے ادب اثر قبول
کرتا ہے اور اس کے تمام شعبے سماجی حالات کے سانچے میں ڈھلتے ہیں، لیکن سید صاحب اپنی نگارشات
میں اس بات پر زور کم ہی دیتے ہیں کہ ادب و شعر بھی ماحول میں تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ شعر و ادب
کے مقصدی و نصب العینی ہونے کے قائل تو ضرور ہیں، لیکن ان کو انقلاب و ارتقا کی منزل تک
پہنچانے کے خیال سے ان کی تنقید کے پر جلتے ہیں۔

سید صاحب کے یہاں تکنیک کا شعور موجود ہے۔ وہ بعض ہیئتوں کو بعض خاص نوعیت کے خیالات
کی ترجمانی کے لیے موزوں خیال کرتے ہیں گویا ان کے خیال میں مواد و ہیئت میں ایک ہم آہنگی ہونی چاہئے۔
"مسدس حالی" پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے انھوں نے اس خیال کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے اور بتانے
کی کوشش کی ہے کہ حالی نے جن خیالات کو پیش کیا ہے وہ مسدس ہی میں بہتر طریقہ سے ادا ہو سکتے تھے۔

سید سلیمان ندوی اپنی تنقیدی تحریروں میں تنقید کی مشرقی اصطلاحات سے ہی کام لیتے ہیں۔ مثلاً
فصاحت و بلاغت، تشبیہات و استعارات، لطافت و روانی، بے ساختگی، آمد، آورد، جدت ادا،
غرض اس طرح کی تمام اصطلاحات ان کی تنقیدوں میں ملتی ہیں۔ انھوں نے کہیں کہیں سادگی اور
جوش بیان وغیرہ کی اصطلاحات وغیرہ سے بھی کام لیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنگامۂ غدر
کے بعد عہد قدیم کے ادب میں جو تغیرات رونما ہوئے تھے اور تنقید کے پرانے سانچوں میں جو تبدیلیاں
پیدا ہو رہی تھیں سید صاحب ان سے بھی کسی حد تک متاثر ہوئے تھے۔

اب ذیل میں سید صاحب کی تنقیدی نگارشات کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔ جن سے سطور بالا
کی تصریحات کی وضاحت ہوگی اور اس کے ثبوت فراہم ہوں گے۔ "وہ کلام شاد" پر اظہار خیال کرتے ہوئے
شاد عظیم آبادی کی شاعری کو صحت الفاظ، فارسی تراکیب، سنجیدگی و متانت، حسن و عشق کی داستان
سرائی، سادگی و صفائی اور رقت میں میر تقی میر کا مماثل قرار دیتے ہیں۔[۳۲] شاہ رکن الدین عشق کے کلام کے
بارے میں رقم طراز ہیں:

"عشق کے عاشقانہ کلام کی اصل خوبی سادگی، لطافت، جوش بیان اور روانی ہے مصرعوں
میں اتنی برجستگی ہوتی ہے کہ ہر شعر خوبی فصاحت کی ایک صاف و مصفا سلسبیل ہے نہ پیچیدگی ہے

۳۲۔ سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی ص ۳۹۹

نہ اشکال ہے، نہ ثقل تراکیب ہے۔ ساتھ ہی فصاحت و بلاغت کی یہ جوئے رواں ابتذال اور مضامین پامال کے خس و خاشاک سے پاک ہے"[۲۳]

جگر کو "تنہا شاعر بلکہ ہمہ شاعر" قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ان کا طرز ابنائے زمانہ کے طرز سے الگ لکھنؤ اور دہلی دونوں حکومتوں سے آزاد ہے۔ موزوں الفاظ اور دلکش ترکیبوں کے باوجود بے ساختگی اور آمد سے معمور، ہر تکلف اور تعمق اور آورد سے پاک، طلسم الفاظ سے خیالات کی ایک دنیا بنا کر کھڑی کر دینے والا معنوی حیثیت سے سرمستی اور سرشاری، تاثر اور دل نگاری اس کے ہر مصرع کی جان ہے"[۲۴] صہبائی کے مجموعۂ کلام "خمستاں" کے تبصرے میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

"رباعی گوئی کے لیے ضرورت ہے کہ زبان صاف اور شیریں ہو۔ ترکیبیں چست اور رواں ہوں اور پہلے مصرعہ سے بتدریج ترقی کر کے چوتھے مصرعہ میں پورا زور نمایاں ہو جائے یہ لفظی خوبیاں ہیں۔ معنوی خوبی یہ ہے کہ اس میں بلند حقائق اور معانی ادا ہوں"[۲۵]

مسدس حالی کی نمایاں خصوصیت سید صاحب کے نزدیک سادگی، بے تکلفی، روانی، سلاست، برجستگی، زبان کی گھلاوٹ، بیان کی حلاوت، لفظوں میں فصاحت اور ترکیبوں میں لطافت ہے (نقوش سلیمانی ص ۴۵۰)۔ یہ درست ہے کہ سید سلیمان ندوی کی اکثر تنقیدیں تاثراتی انداز سے قریب تر ہیں۔ لیکن اس میں بعض وقت تجزیاتی تنقید کے بھی اچھے نمونے مل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مہدی افادی کے مکاتیب پر مقدمہ سپرد قلم کرتے ہوئے اس میں نہ صرف مکتوب نگاری کے عہد بعہد ارتقا کا عالمانہ جائزہ لیا ہے۔ بلکہ مہدی کی خطوط نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے اس میں حسب ذیل محاسن کی نشاندہی کی ہے :

تصویر[۱] فطرت کا جمال، قلم کا[۲] چنبلاپن اور البیلاپن، تلمیحات[۳]، متین[۴] رنگینی اور سنجیدہ شوخی، جدت[۵] تراکیب، اختراع[۶] الفاظ، لطافت[۷] ذوق۔

اور محض تجزیہ کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اپنے تجزیے کو اصل خطوط کی متعدد مثالیں نقل کر کے مدلل اور مبرھن بھی کیا ہے۔ مذکورہ تفصیلات سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ سید صاحب کی تنقید نگاری کا

۲۳۔ سید سلیمان ندوی : نقوش سلیمانی ص ۴۱۸
۲۴۔ " " : مصدر سابق ص ۴۳۰
۲۵۔ " " : مصدر سابق ص ۴۰۸

تمام ساز اور سازوسامان مشرقی تنقید کے کارخانے میں تیار ہوا ہے۔ وہ دیدہ و دانستہ مشرقیت کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتے، اگر کہیں شاذونادر اس کے خلاف نظر آتا ہے تو وہ غیر شعوری طور پر یا تقاضائے عصر کی لہروں سے تاثر کا نتیجہ ہے۔ عہد تغیر کے تمام نقاد تنقید و ادب کے جدید تقاضوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ واقف ضرور تھے، لیکن بعض نقاد ان تقاضوں سے منحرف ہو کر تنقیدی طور پر کسی مخصوص دبستان تنقید سے وابستہ ہوگئے اور اس کی خصوصیات اور انداز نقد کی اتباع کی۔ سید سلیمان ندوی بھی ایسے ہی نقادوں میں ہیں۔

سید سلیمان کا تنقیدی پایہ کتنا ہی متنازعہ فیہ ہو، لیکن شبلی کے دبستان تنقید کے انفرادی امتیازات کی جس شدت عقیدت اور کامل کامرانی کے ساتھ انھوں نے اتباع کی ہے اس کا اعتراف ہر مورخ تنقید نے کیا ہے۔ اردو تنقید نگاری کی تاریخ میں سید صاحب کا ایک اور امتیاز بھی قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ انھوں نے تنقید کی خشکی و بے لطفی کو (جو فنی طور پر اس کا لازمی عنصر خیال کرلی گئی ہے) باغ و بہار اور گل و گلزار بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر غالب کی خطوط نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اردو میں غالب نے جب سے ادب کے گرم مجمر میں عود ہندی جلایا ہے، اردوئے معلیٰ اس کی خوشبو سے بس گئی ہے۔ علماء اور صوفیا کے خطوط اور مکتوبات تو اپنی روحانی برکتوں علمی بحثوں اور مذہبی عقیدتوں کے سبب سے ہماری عقیدت مندیوں کا صحیفہ ہیں۔ مگر غالب کے خطوط میں جو مزہ ہے وہ صرف ادبی نکتہ پردازیوں کے چٹخارہ سے ہے۔ مرزا غالب کیا کیا خون جگر کھا کر اپنے فارسی نامے لکھا کرتے تھے۔ مگر تقدیر کی عجائب کاری دیکھئے کہ ان کے خوں جگر کا ایک قطرہ بھی ہمارے ادبی خزانے کا کوئی قیمتی لعل نہ بن سکا۔ اور ان کی اردو کے چند فقرے جو ہنستے بولتے، چہکتے اور چہچہاتے ان کی زبان قلم سے نکل گئے۔ ان کا ہر لفظ قدر دانوں میں موتیوں سے زیادہ قیمتی ٹھہرا۔ اور آج وہ ہمارے ادبی خزانے کا بیش قیمت سرمایہ ہے"[۵۲]

علامہ شبلی کی طرح سید سلیمان ندوی بھی شعر و ادب کو اپنے علمی دسترخوان کی چٹنی کہا کرتے تھے۔ یعنی جس طرح ثقیل غذا کے ساتھ ذائقے کی تبدیلی کے لیے چٹنیاں استعمال کی جاتی ہیں، اسی طرح علمی

۵۲۔ سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی ص ۳۷۸

ذائقہ بدلنے کے لیے یہ دونوں ارباب علم ادب وشعر کی طرف مائل ہوتے تھے۔ ورنہ دراصل ان کو قرآن و حدیث، تاریخ وسیرت سیر و رجال اور تحقیق و جستجو میں فرط انہماک کسی اور طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ دیتا تھا۔ مگر جب وہ ان علوم کے مطالعے اور احاطے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے ذہنی تفریح کرنا چاہتے تھے تو میدان ادب میں اپنے اشہب قلم کو مہمیز دے دیتے تھے اور چونکہ ان کے علم میں گہرائی اور نظر میں وسعت تھی، اس لیے جو ادبی تحریریں محض تفریحاً ہی ان کے قلم سے تراوش کر گئیں وہ میزان قدر میں گراں پایہ قرار پائیں اور اس سے ان کی ہمہ گیری کے حدود میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔ سید سلیمان ندوی کے ادبی ذوق کی بہار صرف خالص ادبی موضوعات ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ علمی و تحقیقی اور مذہبی موضوعات مثلاً ارض القرآن، سیرت النبی، سیرت عائشہ اور عرب و ہند کے تعلقات وغیرہ میں بھی حسن ادب وانشا کی چاندنی بکھری نظر آتی ہے۔

قارئین جامعہ سے

مولانا محمد علی نمبر کی وجہ سے ماہنامہ جامعہ کی اشاعت میں کچھ تاخیر ہو گئی ہے، بعد میں کاغذ کی قلت اور مسطر کی نایابی کی وجہ سے اس تاخیر میں اور اضافہ ہو گیا۔ رسالے کو جلد سے جلد وقت پر لانے کے لیے، جولائی اور اگست کا مشترک شمارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ چونکہ ضخامت میں تقریباً دوگنا اضافہ کر دیا گیا ہے، اس لیے یقین ہے کہ دو ماہ کی مشترکہ اشاعت پر خریداروں کو کسی قسم کی شکایت نہیں ہوگی ہمیں امید تھی کہ یہ مشترک شمارہ ستمبر کے وسط میں پوسٹ کر دیا جائے گا۔ مگر اتفاق انھیں دنوں دلی کے اس علاقے میں کرفیو لگ گیا جہاں یہ رسالہ چھپتا اور تیار ہوتا ہے اس کی وجہ سے مزید تاخیر ہو گئی اور اب پوسٹ کرنے کے لیے دوبارہ اجازت لینی پڑے گی جس میں وقت لگ سکتا ہے۔

(مینیجر ماہنامہ جامعہ۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵)

محمد مشتاق شارق

تذکرہ نویسی میں میرٹھ کا حصہ

اردو تنقید کے ارتقا میں تذکروں کا اہم حصہ ہے۔ نکات الشعراء سے شعرالہند تک جتنے تذکرے لکھے گئے، ان میں میرٹھ میں تحریر کردہ تذکرے اپنی جگہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل تذکرے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں:

۱۔	طبقاتِ سخن	مولفہ	غلام محی الدین عشق و مبتلا
۲۔	گلشنِ بیخار	مولفہ	نواب مصطفیٰ خان شیفتہ
۳۔	بہارستان ناز	مولفہ	فصیح الدین رنج میرٹھی

ذیل میں ان کا مختصر جائزہ ملاحظہ فرمائیں:

طبقاتِ سخن

اٹھارہویں صدی کا نصف آخر اور انیسویں صدی کا نصف اول وہ دور ہے جس میں فن تذکرہ نویسی اپنے عروج پر تھا۔ "اس زمانے میں سب سے زیادہ تذکرے میرٹھ اور بلند شہر کے علاقوں میں تالیف ہوئے"[1] اس کی ایک خاص وجہ تھی کہ جب شاہِ عالم بادشاہ دہلی کی سیاسی حیثیت ختم ہو گئی تو اس کے پاس سوائے شعر و شاعری اور مجلس آرائی کے اور کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ قلعہ کے اثرات عام ہو کر مضافات پر بھی اثر انداز ہوئے۔ میرٹھ چونکہ دہلی سے کچھ زیادہ دور نہ تھا، اس لیے اس کا اثر وہاں بھی پڑا۔ چنانچہ جگہ جگہ محفلوں کا انعقاد شروع ہو گیا۔ ان میں

جناب محمد مشتاق صاحب شارق، پرنسپل رحمانیہ کالج۔ راگول (رہیمرلید) یوپی

[1] شعرائے اردو کے تذکرے، از ڈاکٹر حنیف نقوی ص ۱۶۹

مرکزی حیثیت غلام محی الدین عشق و مبتلا (متوفی ۱۸۲۶ء) کے گھر کو حاصل تھی جہاں مہینے میں کئی بار مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ شاہ نصیر جو اس عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے، اکثر ان کے یہاں آجاتے مشاعرے منعقد کراتے۔ مصحفی کے تذکرے اس وقت عام تھے۔ چنانچہ عشق و مبتلا نے بھی، ایک تذکرہ بعنوان "طبقات سخن" مرتب کیا جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور جس کے صرف تین نسخے اس وقت دستیاب ہیں۔ ایک ناقص نسخہ گاندھی فیض عام کالج، شاہجہاں پور کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

چونکہ اُس زمانے میں، عام طور پر کتابوں کے نام تاریخی ہوتے تھے، اس لیے مبتلا نے بھی اپنے تذکرے کا تاریخی نام 'طبقات سخن' رکھا جس سے ۱۲۱۳ھ کا سال برآمد ہوتا ہے۔ اس میں مولف نے محمد شاہ بادشاہ کے عہد سلطنت (۱۷۱۹ء - ۱۷۴۸ء) سے شاہ محمد اکبر (۱۸۰۷ء) کے عہد تک کے شعراء کا ذکر کیا ہے۔

یہ تذکرہ دو طبقات میں تقسیم ہے[۲]

۱۔ اشعار ہندی شعراء، زبان ماضی و حال

۲۔ اشعار فارسی خود بضمن خاتمہ و بعضے از احوال

حمد و نعت کے بعد، مبتلا نے ابتدا میں فن شعر سے بحث کی ہے پھر تقابلی مطالعے کی غرض سے شمالی ہند میں رائج مختلف زبانوں اور بولیوں کے اشعار درج کئے ہیں۔ اس سے ہندوستانی زبانوں کے تدریجی ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے بعد اصل تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ معلومات کی فراہمی کے لیے مولف نے خط و کتابت اور ملاقات دونوں کو ذریعہ بنایا ہے۔ اس کے علاوہ ماضی میں لکھے ہوئے تذکروں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ خاص طور سے قائم، میر حسن اور مصحفی کے تذکروں سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔

جہاں تک تذکرہ نویسی کے انداز کا تعلق ہے، مبتلا نے کوئی جدت پیدا نہیں کی، شعراء کے تعارف میں بقول ڈاکٹر حنیف نقوی "انھوں نے بیشتر اجمال و اختصار سے کام لیا ہے۔ نام، تخلص

---

[۲] نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ یادگار شعراء کے مقدمہ میں مسعود حسن رضوی ادیب کے بیان سے غلط بحث ہوتا ہے۔ تذکرے میں طبقات نہیں ہیں۔ یہ صرف شعراء کا تذکرہ ہے اور محض تاریخ کے التزام کی وجہ سے طبقات سخن نام رکھ دیا گیا ہے۔ یہ صرف شعراء اردو کا تذکرہ ہے۔ (طبقات سخن۔ نگار ستمبر ۱۹۵۹ء)

اور سکونت کی صراحت پر اکتفا کی ہے۔ جو مثالیں ابتدائی زمانے کے تذکروں میں علی العموم نظر آتی ہیں، اس تذکرے میں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں[۳]۔ مثلاً

"۱۔ اشرف۔ اشرف خاں خلف حکیم شریف خاں دہلوی، عالم شاہی، عالی طبع، بلند فکر است" ص ۱۹

"۲۔ افغان امام علی خاں نام۔ لکھنوی است" ص ۲۴

تذکرہ فارسی میں ہے۔ عام طور پر سنین کے حوالوں سے عاری ہے۔ جن شعراء سے ذاتی تعلقات تھے ان کے سنہ پیدائش و وفات البتہ ضرور درج کر دیئے ہیں۔ انھیں شاعروں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ان کے علاوہ ان شاعروں کے ذکر میں بھی تفصیل سے کام لیا گیا ہے جو اپنا مقام پیدا کر چکے تھے۔ تذکرہ کی خاص خوبی یہ ہے کہ کہیں کہیں خصوصیات کلام کے علاوہ شعراء کے کمالات شاعری سے بھی بحث کی ہے۔ مگر یہ بحث تنقید کے دائرے میں کم آتی ہے، تقریظ کے دائرے میں زیادہ۔ پھر بھی جہاں تک ہو سکا ہے مبتلا نے پچھلے تذکروں کے احوال کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کسی شاعر کے حالات میں کسی نے غلط معلومات پیش کی ہیں تو انھوں نے اپنے یہاں اس کی درستی کر دی ہے مثلاً مصحفی نے فدوی لاہوری کو نومسلم بقال پسر بتایا ہے۔ مبتلا نے اپنے تذکرے میں اس کی درستی کر دی ہے۔ لکھتے ہیں "آں چہ مصحفی اورا در تذکرۂ خود بقال پسر و غلام مغل نوشتہ محض غلط است[۴]"۔ ان کے نزدیک وہ مغل تھے۔ اسی طرح فدوی کی جائے پیدائش کی بھی تصحیح کی ہے۔ مصحفی نے لکھا تھا "باجل طبعی در قصبہ مراد آباد درگزشت"۔ مبتلا نے لکھا ہے کہ ان کی جائے وفات بریلی ہے۔ اور وجہ وفات بھی بتا دی "آخر در بریلی آمد بر یکے از افغان پسر فریفتہ شدہ از دست رقیب بر تیغ بے دریغ شہید گشت۔"

دوسرے تذکروں کے مقابلے میں مبتلا نے شاعری کی دوسری اصناف کے نمونے بھی دیئے ہیں کہیں کہیں نثر نگاری کے نمونے بھی پیش کئے ہیں جن سے نثر کے ارتقا کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان خصوصیات کے پیش نظر طبقات سخن کی اہمیت مسلّم ہے۔ اور اس کے گراں قدر ہونے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے مولفین نے طبقات سخن سے استفادہ

---

[۳] شعرائے اردو کے تذکرے از حنیف نقوی ص ۶۴۶ [۴] مخطوطہ شاہجہاں پوری ص ۱۸۸

کیا ہے۔ اس سلسلے میں خیراتی لعل بے جگر کی تحریر کو دیکھا جا سکتا ہے جس میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ سب سے زیادہ مدد اُسے مبتلا میرٹھی کے طبقات سے ملی ہے۔ شیفتہ نے بھی گلشن بیخار کی تالیف کے وقت اسے پیش نظر رکھا ہے۔

گلشن بیخار

تذکروں میں 'گلشن بیخار' کی حیثیت گل سرسبد کی ہے۔ اس کے مولف نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ہیں جن کی اصابت فکر و نظر کی قائل عہد کی دوسری ممتاز شخصیتوں کے علاوہ، غالب جیسی دیدہ ور شخصیت بھی۔ انیسویں صدی کے اس عہد آفریں کارنامے میں' ابتداء سے لے کر تیرھویں صدی ہجری کے وسط تک کے فنکاروں کے حالات اور اشعار کے نمونے ملتے ہیں۔ 'گلشن بیخار' ۱۸۳۲ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا اور ۱۸۴۳ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ مومن نے تاریخ کہی،

ہاتف نے کہا، ہے اس کی تاریخ   گلدستۂ گلستان معنی

گلشن بیخار کی تالیف میں شیفتہ نے ذاتی کاوش کے علاوہ اخذ و استفادہ سے بھی کام لیا ہے۔ اسپرانگر اور دتاسی دونوں اس کا ماخذ مجموعۂ نغز کو بتاتے ہیں لیکن وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی تالیف کے وقت شیفتہ کے پیش نظر مصحفی کے تذکروں کے علاوہ مقامی تذکرہ نگاروں کے طبقات سخن مولفہ عشق و مبتلا اور تذکرۂ شعرائے اردو مولفہ شرف الدین مسرور بھی رہے ہیں۔[۵] اس کی تالیف میں شیفتہ نے جن باتوں کا زیادہ خیال رکھا ہے وہ ہیں پسندیدہ اشعار کا انتخاب اور اس کی مناسب ترتیب۔ اس کے علاوہ "شیفتہ نے پوری کوشش کی ہے کہ ہر شاعر کے زیادہ سے زیادہ حالات معلوم کر کے جمع کئے جائیں۔"[۶]

'شعرائے اردو کے تذکرے' میں ڈاکٹر حنیف نقوی کو عبدالشکور کی مندرجہ بالا رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ " . . . یہ اور اس قسم کی دوسری تمام رائیں کسی غائر تجزیے اور بسیط مطالعے پر مبنی نہیں بلکہ مولف کی سخن شناسی اور دیدہ دری کے بارے میں ان کے مداحین و متاثرین

---

[۵] شرف الدین مسرور عشق و مبتلا کے فرزند تھے۔ خیراتی لال بیجگر، شیفتہ اور لالہ سری رام کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسرور نے بھی ایک تذکرہ لکھا تھا جو لالہ سری رام کے کتب خانے میں تھا مگر اب ناپید ہے۔

[۶] تنقیدی سرمایہ اول مولفہ عبدالشکور ص ۵۴

کے تاثرات کی صدائے بازگشت ہیں"[۵] ڈاکٹر حنیف نقوی نے غالباً یہ خیال نہیں کیا کہ "تذکرے" کتنے شعراء اور ان کے احوال کو محیط ہے۔ عبدالشکور کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مقابلتہً شیفتہ نے دوسرے تذکرہ نگاروں سے زیادہ شعراء کے انتخاب و حالات کا ذکر کیا ہے۔ آگے چل کر وہ اس پر معترض ہیں کہ بعض جگہ انھوں نے تقلیل اور بعض جگہ شرح و تفصیل سے کام لیا ہے۔ ان کا یہ اعتراض بھی کچھ زیادہ وقیع نہیں۔ جو شعراء شیفتہ کے نزدیک تھے، ان کے حالات کا انھیں ذاتی اور زیادہ علم تھا۔ ان کا ذکر طویل ہونا ہی چاہئے تھا۔ البتہ جو شعراء ان سے دور تھے یا زمانۂ بعید سے تعلق رکھتے تھے، ان کا حال دوسرے تذکروں سے ہی اخذ کر کے لکھ سکتے تھے۔ اس پر بھی انھوں نے کچھ نہ کچھ شعراء کے حالات پر اضافہ ہی کیا ہے۔

شیفتہ کے گلشن بیخار کی خاص اہمیت اس کے تنقیدی پہلو کی وجہ سے ہے۔ شیفتہ نے جس شاعر کے بارے میں جو رائے لکھ دی ہے وہ حرف آخر نہیں تو بڑی حد تک صحیح اور وقیع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گلشن بیخار شیفتہ کا عہد آفریں کارنامہ ہے۔ ان کے علم کا مرتبہ اور بڑھ جاتا ہے جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کے اس زمانے کی تالیف ہے جب ان کی عمر صرف چھبیس برس کی تھی۔

تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور اس میں آٹھ سو شعراء کے حالات درج ہیں اور ان کے کلام کا بہترین انتخاب دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے نظیر اکبرآبادی کو شاعر نہیں سمجھا مگر معترضین نے اس پر غور نہیں کیا کہ شیفتہ کے عہد میں معیار تنقید کیا تھا انھیں سوچنا چاہئے کہ شیفتہ اپنے زمانے کے تنقیدی معیاروں کے خلاف کیسے جا سکتے تھے۔

تذکرے کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں بعض عہد آفریں شخصیتوں کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ قاری کے دل میں ان کے کلام کے مطالعے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے جس سے اس کے مذاق کی تربیت ہوتی ہے اس طرح قاری اور فنکار کے درمیان ہم آہنگی کا رشتہ استوار ہوتا ہے جو تذکرہ نویسی کا بنیادی مقصد ہے۔

تذکرہ بہارستان ناز

تذکرہ بہارستان ناز کے سبب تالیف کے سلسلے میں رنج لکھتے ہیں:

---

۵ شعرائے اردو کے تذکرے ص ۵۲۷

اس اضطرار و انتشار میں شوق تصنیف و تالیف دامن گیر حال ہوا۔ فکر اور بڑھی۔ تفکر کو دونا کمال ہوا۔ تذکرۂ شعرا کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ اس سے فی الجملہ دل کی لگی حاصل ہوئی، مگر طرز جدید کا دل خواستگار ہوا "لکل جدید لذۃ" پر دارومدار رہا۔ آٹھ پہر تذکروں پر نظر رہی۔ اسی زمانے میں مخفی کا کلام نظر سے گزرا۔"

اسے دیکھ کر رنج "شاعرات کے کلام کی طرف متوجہ ہوئے" اور انھوں نے ان کا کلام فراہم کرنا شروع کر دیا۔ پہلی بار یہ تذکرہ بعنوان بہارستان ناز ۱۸۶۴ء میں مطبع دارالعلوم میرٹھ سے شائع ہوا۔ تیسری بار یہ تذکرہ مصنف کی زندگی میں ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا۔ یہ اردو میں شاعرات کا پہلا تذکرہ ہے۔ دوسرے تذکرے فارسی میں ہیں۔ شاعرات کا تذکرہ باعتبار حروف تہجی کیا گیا ہے۔ ابتدا میں شاعرات کے حالات زندگی دیے گئے ہیں مگر اختصار کے ساتھ۔ انتخاب کلام اردو و فارسی دونوں زبانوں کے اشعار پر مشتمل ہے۔ رنج کو زبان و بیان دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ جابجا شوخی بیان اور رنگینی زبان کے جلوے نظر آتے ہیں۔ ایک خوبی ان کی تحریر کی یہ ہے کہ اس میں شروع سے اخیر تک ہمواری پائی جاتی ہے۔ ان کے انتخاب اشعار میں بھی شان دلآویزی نمایاں ہے۔ ان کے اسلوب نگارش کا اندازہ مندرجہ ذیل فقروں سے لگائیے۔

۱۔ امیر کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔" رشک حسن فردشان بازاری ہے۔ بے وفائی کی دوست اور دشمن وفاداری ہے۔"

۲۔ مخفی (بادشاہ بیگم) کے بارے میں دیکھیے۔" معاش سے دنیا میں اور عقوبات سے عقبیٰ میں بے اندیشہ ہے۔"

فصیح الدین رنج نے شستہ اور ناقدانہ طبیعت پائی تھی۔ وہ ہر جگہ اپنے تاثرات کا بے باکانہ اظہار کرتے ہیں اور کسی قسم کی مروّت سے کام نہیں لیتے۔ چند فقرے دیکھیے:

۱۔ امیر کے سلسلے میں لکھتے ہیں: "ایک مقطع کے سوا باقی کلام اس کا بکائن کا پھول ہے۔"

۲۔ امیر کے لیے کیا کہتے ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

---

۵ بہارستان ناز سے پہلے شاعرات کا صرف ایک تذکرہ موجود عبدالحی صفا بدایونی کا شمیم سخن تھا جس کا سنہ اشاعت ۱۸۶۲ء ہے۔ اس کے بعد ۱۸۷۶ء میں درگا پرشاد نادر کا تذکرہ گلشن ناز شائع ہوا۔

"یہ شعر جو ذیل میں درج ہے اگر اس کے نام سے مشہور ہے الا
اس کی طبیعت سے کوسوں دور ہے۔"

اگرچہ تذکرہ دلچسپ ہے مگر بعض مقامات تاریخی شواہد سے عاری ہیں۔ مثلاً آرام (زوجہ جہانگیر) کے بارے میں جتنی باتیں لکھی ہیں وہ محل نظر ہیں۔ مخفی کے سلسلے میں رتنج عام مغالطے سے نہ بچ سکے یہ کلام زیب النساء مخفی کا نہیں بلکہ ایک ایرانی شاعر کا ہے جو شاہجہاں کے زمانے میں وارد ہندوستان ہوا تھا۔

تذکرے کا انداز نگارش کیسا ہے، اس کے اندازے کے لیے دو مختصر نمونے درج کیے جاتے ہیں

یاسمن۔ یاسمن تخلص۔ چنبیلی نام۔ یہ عورت منجملہ کنیزان انشاء اللہ خاں مرحوم تھی۔ نہایت طباع اور فہیم تھی۔ اپنا نکاح نہ کرتی تھی۔ ایک روز انشاء اللہ خاں نے بعد فہمائش تمام اس کا نکاح ایک شخص سے کر دیا۔ سنا ہے کہ بعد نکاح تین روز زندہ رہی پھر مر گئی۔ یہ حال نہ کھلا کہ باعث کیا تھا۔ القصہ یہ اشعار اس کے تحریر ہوتے ہیں:

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا[۹] ۔۔۔ یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت
پھر مرے دل سے یار تو نہ گیا ۔۔۔ صبر جاتا رہا قرار کے ساتھ

یادؔ۔ یاد تخلص۔ یہ عورت دہلی کی شہزادیوں میں تھی۔ ۱۲۹۴ھ میں اس نے انتقال کیا۔ ہنگام نزع جو اس نے قطعہ لکھا تھا، وہی گوش زد ہوا۔ اور کچھ کلام ہاتھ نہ آیا۔

کہ اب یادؔ تو یاں سے جانے لگی[۱۰] ۔۔۔ عبث فکر درماں ہے اے اقربا
تن زار سے جاں نکلنے لگی ۔۔۔ سر انجام غسل و کفن کر رکھو

---

۹ غالب کا یہ شعر بھی دیکھیے۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ؎ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آتا ہے

۱۰ میرے خیال میں اس شعر کا قافیہ 'چلنے' ہوگا ورنہ 'جانے اور چلنے' آپس میں قافیے نہیں ہو سکتے یہ چھاپے کی غلطی ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی

غزل کی زبان

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے !
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے !

غالبؔ نے یہ بات صرف اپنے تعلق سے کہی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ غزل کے ہر اچھے اور سچے شعر پر صادق آتی ہے اور لفظوں کی طلسماتی قوت کے سب سے زیادہ کرشمے ہمیں غزلوں میں نظر آتے ہیں۔ ہر لفظ اپنی جگہ پر ایک تجربہ ہوتا ہے۔ زبان لفظوں کی ترتیب سے تشکیل پاتی ہے۔ نثر میں زبان کی غایت ہے ترسیل معانی لیکن شاعری میں زبان معانی کی ترسیل کے علاوہ احساسات، جذبات اور تصورات کی صورت گری اور اظہار کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔ بالفاظ دیگر، شاعری میں لفظوں کا استعمال عام زندگی کی گفتگو سے مختلف انداز میں ہوتا ہے جسے لفظ کا استعاراتی، تاثراتی اور جذباتی استعمال کہنا مناسب ہوگا۔ نثر میں الفاظ اپنی مانوس حالتوں میں استعمال ہو کر متکلم کا مافی الضمیر براہِ راست سامع تک منتقل کرتے ہیں۔ شاعر کا استعاراتی قرینہ لفظ کے لغوی مفہوم میں وسعت، تہ داری اور گہرائی پیدا کر دیتا ہے۔ شاعری میں الفاظ کے تخلیقی اور غیر یقینی استعمال سے ان کے معانی میں کئی سطحیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ایسا ابہام تخلیق پاتا ہے جس کی نوعیت یکسر طلسمی ہوتی ہے۔

یہ تو عام شاعرانہ زبان کی بات ہوئی۔ غزل کے سلسلے میں بات بہت آگے تک جاتی ہے غزل کا ہر شعر دراصل کسی خاص جذبے یا احساس کی انتہائی شدت کا مکمل لیکن مختصر ترین

ڈاکٹر مظفر حنفی، لیکچرر شعبۂ اردو۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی

اظہار ہوتا ہے اس لیے یہاں شاعر کو الفاظ کے انتخاب میں حد درجہ مہارت، احتیاط اور تخلیقی صلاحیت سے کام لینا ہوتا ہے۔ بقول آتش:

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

پھر غزل گو لفظوں کے یہ نگینے مرصع ساز کی طرح شعر میں جڑنے سے قبل آپس میں ان کی چولیں بٹھلا کر، اکثر ترکیبوں کی شکل دے کر انھیں تراش خراش کر، گوہر آبدار بناتا ہے۔ غزل کو عورتوں سے گفتگو کرنے کا فن بھی کہا گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ غزل میں ہم ویسی کھلی ڈلی، بے تکلف زبان استعمال نہیں کر سکتے جیسی کہ دوستوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے استعمال کرتے ہیں۔ یہاں غزل گو انتہائی سبک، شیریں، لطیف، نرم اور نازک الفاظ ویسی متانت اور شائستگی کے ساتھ برتنے پر مجبور ہوتا ہے جیسی کہ خواتین کے سامنے مہذب مرد استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ غزل عام طور پر داخلی کیفیات اور واردات قلب کی ترجمانی کے لیے وقف رہی ہے اور یہ داخلی کیفیات بھی زیادہ تر حسن و عشق کے معاملات سے متعلق ہوتی تھیں اس لیے موضوع کی رعایت بھی نرم و ملائم لفظیات کا تقاضہ کرتی تھی چنانچہ قصیدے، مرثیے، مثنوی، رباعی اور دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں غزل کی زبان کے لیے صفائی، رچاؤ، سلاست، شیرینی اور ملائمت کی زیادہ کڑی شرطیں عائد کی گئیں اور غزل کے مخصوص مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے نرم و سبک الفاظ کے ساتھ ساتھ لہجے کی اس شائستگی پر بھی زور دیا گیا جس پر ضرورت سے زیادہ اصرار نے آگے چل کر انفعالیت کی شکل اختیار کر لی۔ غزل کی ہیئت بھی بڑی حد تک اس کی زبان کی حصار بندی کرتی ہے۔ بحر اور قافیہ تو غزل کے لیے ناگزیر ہیں ہی، ردیف کی بندش غزل گو اپنے طور پر قبول کر لیتا ہے کیونکہ یہ موسیقیت اور ترنم میں اضافہ کرتی ہے لیکن ردیف اور قافیہ کی چولیں بٹھانے اور انھیں باہم ایک دوسرے سے شیر و شکر کرنے کی کاوش میں الفاظ کے انتخاب اور جملے کی ساخت کا عمل زیادہ دشوار اور پیچیدہ تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ بحر قافیے اور ردیف کی یہی بندشیں غزل کے ایجاز اور اختصار کا سبب بھی بنتی ہیں چنانچہ عام نظم نگاروں کے مقابلے میں غزل گو مجبور ہوتا ہے کہ اپنی بات کو سمیٹ کر زیادہ سے زیادہ پر تاثیر لہجے میں کم سے کم الفاظ کے ساتھ ادا کرے۔ قافیے اور ردیف کے سنگم پر اکثر فصاحت اور بلاغت کی لہریں غیر ارادی طور پر ابھر آتی ہیں اور بامحاورہ زبان کے خوبصورت

نمونے بھی ہمیں اکثر اسی مقام اتصال پر نظر آتے ہیں۔ اسمار کے قافیوں پر مشتمل غزلیات ہیں خوبصورت اور نادر ترکیبوں کی تخلیق ناگزیر ہو جاتی ہے اور افعال پر ٹوٹنے والی ردیفوں ہیں محاورے اور زبان کی دلچسپ نزاکتیں گل کھلاتی ہیں۔ چونکہ افعال کو زیادہ سے زیادہ اعمال سے متعلق کیا جا سکتا ہے جب کہ اسمار کے متعلقات محدود ہوتے ہیں، اس لیے زیادہ تر ردیفوں کا انحصار اسمار پر کم اور افعال پر زیادہ ہوتا ہے۔ اپنے غنائی مزاج اور لطافت بیان کے تحت غزل کے قافیے بھی اکثر تنگ ہوتے ہیں چونکہ ہر ہم قافیہ لفظ پر شعر نہیں کہا جا سکتا اور جہاں ایسا کیا گیا وہاں شاہ نصیر، انشا، یا ناسخ جیسی مضحکہ خیز غزل ہاتھ آئی۔ لہٰذا بہت کم قافیے غزل کی روح سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان پیچ در پیچ پابندیوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اچھی غزل سات، نو یا گیارہ اشعار سے زیادہ نہیں پھیل پاتی۔

چونکہ غزل کا پودا، قصیدے کے توسط سے اور فارسی کے زیر اثر اردو میں پروان چڑھا ہے، اس لیے دیگر تمام قدیم اصناف سخن کی مانند ابتدا ہی سے اردو غزل پر فارسی کی پرچھائیاں پڑتی رہی ہیں۔ امیر خسرو کے یہاں پہلی بار غزل کے نام پر جو چیز نظر آتی ہے اس کے ہر مصرع کا نصف حصہ فارسی اور بقیہ نصف ہندی میں ہے۔ بعد ازاں اردو زبان کی کفالت کا فریضہ آئندہ تقریباً تین چار صدیوں تک دکن کے فنکاروں نے انجام دیا۔ قدیم دکنی زبان کی غزلیں فارسی کی تقلید کرتی نظر نہیں آتیں۔ ان پر بھاشا کے اثرات واضح ہیں۔ ہندی تشبیہات اور استعارات دکن کی غزلوں میں بکثرت استعمال کیے گئے ہیں اور ہندی کے علاوہ دیگر علاقائی زبانوں کے الفاظ بھی اشعار میں جگہ پا جاتے ہیں۔ ہندو اساطیر اور طرز معاشرت کی گہری چھاپ دکنی غزل کی زبان پر نظر آتی ہے اور مذہب و تصوف کی اصطلاحات بھی خوب استعمال کی گئی ہیں۔ ابتدائی تخلیقات میں جو پیچیدگی نظر آتی ہے وہ رفتہ رفتہ سادگی اور صفائی میں تبدیل ہوتی رہتی ہے حتیٰ کہ ولیؔ تک پہنچ کر دکن کی بڑی شستہ اور منجھی ہوئی ترقی یافتہ شکل سامنے آتی ہے، جس میں فارسی اور ہندی کے الفاظ کی آمیزش بڑے حسین اشعار کا قالب اختیار کرتی ہے:

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا
جادو ہیں تیرے نین غزالاں سے کہوں گا

دلچسپ بات یہ ہے کہ ولی نے شاہ سعد اللہ گلشن کے مشورے سے فارسی مضامین سے بیش از بیش استفادہ کیا لیکن ان کی غزل کی زبان مقامی عناصر اور بھاشا کے اثرات سے چھٹکارا نہیں پا سکی۔

ولی کی شمالی ہند میں آمد کے بعد اور ان کے دیوان کی دہلی میں مقبولیت کے زیر اثر یہاں کے فارسی گو شعرا اردو میں غزل کہنے کی جانب مائل بھی ہوئے تو ایہام کے خارزار میں الجھ کر رہ گئے اور لفظ کے تخلیقی استعمال کی جگہ زیادہ توجہ ذو معنی الفاظ کی تلاش پر صرف کی جانے لگی آبرو مضمون وغیرہ اس بدعت میں مبتلا رہے لیکن مرزا مظہر جان جاناں اور خان آرزو وغیرہ کی کوشش سے غزل نے یہ ہفت خواں سلامتی کے ساتھ پار کر لیا اور میر و سودا کے دور میں داخل ہو گئی۔ اس عہد میں غزل کی زبان میں اصلاح اور تراش خراش کا صحت مند رویہ اختیار کیا گیا۔ الفاظ کی تراش خراش، نئی اور دلکش ترکیبوں کی اختراع اور بھاشا کے غریب اور نامانوس الفاظ کو متروک قرار دینے کی مہم نے زور پکڑا اور ان اصلاحوں کا ایک مضر پہلو اس طرح سامنے آیا کہ اردو غزل دوبارہ فارسی کی تقلید پر آمادہ ہو گئی لیکن میر کی زبان کی سادگی گھلاوٹ اور شیرینی، سودا کی غزل کا طمطراق اور طنطنہ نیز میر درد کی خود کلامی اور رچاؤ بھی غزل کی زبان کو اسی دور کی سوغات ہے۔ اسی زمانے میں تذکیر و تانیث کے بہت سے مسائل حل کیے گئے۔ روزمرہ اور محاورہ بندی کو اس دور کی زبان میں قبول کر لینے کا رجحان بھی اپنایا گیا۔

جب مغلیہ سلطنت کے زوال نے اردو کی مرکزیت کا تاج لکھنؤ کے سر پر آراستہ کیا اور بیشتر دہلوی شعرا دہلی سے اودھ کے دارالخلافہ میں منتقل ہو گئے تو وہاں کے فنکاروں کی اگلی نسل نے دہلی کی فوقیت کے احساس سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک بار پھر زبان کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا اور جو تھوڑے بہت ہندی الفاظ ان حال غزل کی زبان میں شامل تھے انھیں بھی متروکات کے کباڑ خانے میں ڈال دیا۔ تذکیر و تانیث میں بھی اکثر دہلی سے اختلاف کیا گیا، بعض محاورات کے معانی اور مفاہیم بدل دیے گئے اور اس طرح دلی اور لکھنؤ کی زبان میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا یہ بھی ہوا کہ موضوعات غزل واردات قلب اور کیفیات حسن و عشق کی جگہ خارجیت اور متعلقات حسن سے وابستہ ہو گئے جس کے نتیجے میں زبان پر تکلف اور آرائشی ہو گئی۔ رعایت لفظی، صنائع

بدائع اور خارجی آراستگی پر زور دیا جانے لگا جس سے غزل کی زبان کی سادگی، روانی، صفائی اور بے ساختگی مجروح ہوئی۔ ایسے دور میں آتش جیسے اِکّا دُکّا شاعر بھی نظر آجاتے ہیں جن کے ہاں لکھنوی تکلفات اور تصنع کے ساتھ دہلوی اوصاف بھی مل جاتے ہیں۔ اس عہد میں نظیر اکبر آبادی اپنی غزل کے ذریعے زبان میں عامیانہ عناصر داخل کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ ادھر ایسا ہوا کہ اس دورِ انتشار میں ۱۸۵۷ء سے قبل ایک بار پھر دہلی میں شعری روایتوں کی تجدید کی گئی اور یہاں ذوق، غالب، مومن، ظفر جیسے غزل گو سطح عام پر آئے ہیں جنھوں نے موضوعات غزل میں خوشگوار تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ غزل کی زبان کو بھی بہت متاثر کیا۔ ان کی غزلوں میں ہندی الفاظ کے دوش بدوش دل آویز فارسی ترکیبیں اور نادر اسالیبِ بیان نظر آتے ہیں۔ غالب کی ندرتِ ادا، مومن کی لطافتِ بیان، ذوق کی صفائی، برجستگی اور محاورہ بندی نیز ظفر کی پُرتاثیر سادگی غزل کی زبان میں قیمتی اضافے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد سر سید اور ان کے رفقاء نے زبان و ادب کو اصلاحی اور افادی کاموں کے لیے وقف کرنے کی تحریک چلائی، حالی جیسے اچھے غزل گو نے چولا بدل کر اصلاحی غزلیں کہیں لیکن داغ اور امیر مینائی جیسے اساتذۂ غزل نے اس صنف کے تقاضوں سے انحراف کرنا مناسب نہیں سمجھا لیکن داغ کے نامور شاگرد علامہ اقبال نے غزل کی علامات اور لفظیات میں تبدیلی اور اضافے کرکے اسے اپنی پیامیہ شاعری کے قابل بنایا اور اس میں خاصے کامیاب بھی ہوئے۔ پھر ترقی پسند شعرا میں سے بطور خاص فیض، مخدوم، مجروح وغیرہ نے غزل کی زبان کو اپنے اشتراکی نظریات کی تبلیغ کا وسیلہ بنانے کی کوشش کی اور ان کے معاصرین میں بطور خاص یگانہ اور شاد عارفی نے غزل کی زبان کو غیر ضروری تکلفات اور انفعالیت سے نجات دلاکر اپنے دور کی کھردری اور سفاک حقیقتوں کو بے باکی کے ساتھ فنی پیرایہ میں اظہار کرنے کے لائق بنایا اور عصرِ حاضر کی نئی غزل کی زبان کا کھردرا پن، واشگاف لہجہ اور علامتی انداز دراصل اسی بغاوت کی توسیع ہے جس کی جھلک ظفر اقبال، ندا فاضلی، پرکاش فکری، شہریار، محمود سعیدی، بانی، سلیم احمد اور بہت سے دیگر نئے شاعروں کے ہاں نظر آتی ہے اور غزل کی زبان کو بول چال کی زبان سے آمیز کر دیتی ہے۔

فیروزہ قمر

امیر خسرو ــــ ایک اجمالی نظر

(۱۷ رشوال ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۰ ستمبر ۱۹۷۹ء) کو حضرت امیر خسرو کی ۶۷۴ ویں برسی ہے۔ اسی مناسبت سے یہ مضمون شائع کیا جارہا ہے۔)

سلطان الاولیا حضرت نظام الدین کے مرید خاص، حضرت امیر خسرو ایک مشہور شاعر گذرے ہیں، وہ نسلی اعتبار سے ترک تھے ان کے والد غزنین سے ہندوستان آئے۔ خسرو ۶۵۱ ہجری/۱۲۵۳ء میں اترپردیش کے ضلع ایٹہ میں پٹیالی موٴمن پور میں پیدا ہوئے۔ وہ ہندی اور فارسی کے باکمال شاعر تھے ان کے کلام کی ایک ظاہری اور بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے فارسی اور ہندی دونوں زبانوں کو ملا کر اشعار کہے ہیں۔ امیر خسرو کے دور میں اردو اپنی ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی بلکہ یوں کہنا بیجا نہ ہوگا کہ دو زبانوں کی آمیزش اور اختلاط کی بدولت ہی وہ نئی زبان وجود میں آئی جو ایک عرصہ تک ریختے کے نام سے پکاری جاتی رہی۔

امیر خسرو پہلے شاعر ہیں جن کو ہندو اور مسلمانوں کی اس مخلوط تہذیب کا صحیح نمائندہ اور ہندوستان کا پہلا قومی شاعر کہا جاتا ہے۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ ہندوستان کے لوگ اپنے ملک سے کس قدر محبت کرتے ہیں انھوں نے ہندوستان کی عظمت، اس کے حسن اس کی بے مثال حکمت و دانائی اور اس کے شاندار ادب کے گیت گائے ہیں۔

بحیثیت شاعر امیر خسرو اپنے وقت کے بے مثال تخلیقی فنکار گزرے ہیں وہ نہ صرف ہندوستان

محترمہ فیروزہ قمر ایم اے (اردو) متعلمہ بی ایڈ ٹیچرز کالج جامعہ ملیہ۔ نئی دہلی

بلکہ ایران میں بھی مشہور تھے ان کی ہمہ گیر شخصیت اور جامعیت کو دیکھتے ہوئے انھیں اُس عہد کا عظیم فنکار کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ایران اور ہندوستان کے دوسرے شعراء شعر و سخن کے کسی ایک میدان کے شہسوار رہے ہیں، لیکن خسرو فارسی شاعری کی تمام اصنافِ سخن میں یکساں بلند مرتبہ رکھتے ہیں جو چیز انھیں فارسی زبان کے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کے کلام اور شخصیت کی بے پناہ موسیقیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو ترنم اور موسیقیت کا ایک مجسمہ اور اپنے وقت کی ایک بے مثال شخصیت تھے۔ بلاشبہ امیر خسرو بے پناہ خصوصیات کے مالک تھے وہ اپنے اچھے شاعر، نثر نگار اور موسیقار تھے۔ انھوں نے سیاسی زندگی بھی گزاری ہے اور دہلی کے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا ہے اور سات بادشاہوں کے دربار میں کام بھی کیا ہے اس کے علاوہ وہ ایک بہت بڑے بزرگ بھی تھے۔

ان کی تصنیفات کا اندازہ سو کے قریب کیا جاتا ہے اور مصرعوں کی مجموعی تعداد چار پانچ لاکھ کے درمیان سمجھی جاتی ہے ہندوستانی زبانوں میں ان کے کلام کا بیشتر حصہ جو خود ان کے اندازے کے مطابق فارسی کلام کے مقابلے میں تقریباً ایک تہائی سے زائد ہی ہوگا، اب تقریباً ضائع ہو چکا ہے۔

خسرو کا سب سے بڑا کارنامہ غزل ہے، لیکن وہ شعر و سخن کے معاملے میں قدیم روایات کے پابند نہیں ہیں۔ ان کی تشبیہات و استعارات ان کے اپنے ہیں۔ اور ان کا طرز بیان ناقابل تقلید ہے، وہ اس قدر اچھوتا ہے کہ اس کی تقلید ممکن ہی نہیں ہے۔

شاعر کی حیثیت سے خسرو کو قبول عام حاصل ہوا وہ عام لوگوں کی دلچسپی کے لیے انھیں کی زبان میں شعر کہتے تھے ان کی ہندوستانی شاعری جس کے اب چند اشعار ہی دیکھنے کو ملتے ہیں اس بات کا بین ثبوت ہے کہ انھیں کھڑی بولی، برج بھاشا، اودھی، ہندی وغیرہ تمام زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان زبانوں کے اولین شعراء میں سے ایک خیال کیے جاتے ہیں۔ انھیں ہر چیز سے عشق تھا جو عوام الناس سے تعلق رکھتی تھی اور اس ملک کی تھی، معمولی معمولی بات اور موضوع پر ان کے یہاں شعر مل جائیں گے وہ ہندوستان کے ذرے ذرے سے پیار کرتے تھے اور ہر موضوع پر شعر کہنا چاہتے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہندوستانی الفاظ کے گرویدہ تھے۔ اور اس

محبت کی بنا پر ہی انھیں اپنے اشعار میں استعمال کرتے تھے۔ خسرو کے علاوہ کسی شاعر نے اپنی فارسی کلام میں اس کثرت سے ہندی الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں ان کی بعض اعلیٰ درجہ کی غزلیں تو ایسی ہیں جن کا ایک مصرعہ فارسی کا اور دوسرا ہندی کا ہوتا تھا مثلاً :

زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف وروز وصلش چوں عمر کوتہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
چوں شمع سوزاں چوں ذرہ حیراں ہمیشہ گریاں بہ عشق آں ماہ!
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آئیں نہ بھیجیں پتیاں

اس کے علاوہ خسرو نے فارسی شاعر نظامی کی مثنوی "ہفت آسمان" کے جواب میں "نہ سپہر" کے عنوان سے ایک مثنوی لکھ کر بادشاہ قطب الدین کو نظر کی تھی اور ایک ہاتھی کے وزن کے برابر چاندی کے سکے انعام پائے تھے۔ اس مثنوی کے تیسرے باب میں خسرو نے ہندوستان کا ذکر کیا ہے اور اس ملک کی عظمت، حسن اور اس کی ثقافتی برتری کے ثبوت میں دلائل پیش کیے ہیں۔ انھیں اپنے ہندوستانی ہونے پر بڑا فخر تھا۔ اس حقیقت کا اندازہ ان کے کلام سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں علوم و فنون کی فراوانی ہے۔ ہندوستان کے باشندے دوسرے ملکوں کی زبانیں شستگی اور روانی کے ساتھ بول سکتے ہیں۔ جب کہ ترک، مغل اور عرب ہندوستان کی زبان اچھی طرح نہیں بول سکتے۔ غیر ملکی ہندوستانی علم کی تلاش میں یہاں پہنچے لیکن ہندوستان کے برہمنوں نے دوسروں سے علم کی بھیک مانگنے کے لیے کبھی ہندوستان سے باہر قدم نہیں رکھا۔ وہ ہندوستانی ہی تھے جنھوں نے علم ہندسہ اور صفر ایجاد کیا جسے یونانی بھی اپنانے پر مجبور ہو گئے "پنچ تنتر" ہندوستان ہی میں لکھی گئی۔ ہندوستانی موسیقی تمام دنیا میں موسیقی سے برتر ہے اور آخر میں اپنے متعلق فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہندوستان اس لیے بھی افضل اور برتر ہے کہ اس نے خسرو جیسے انسان کو پیدا کیا۔ انھوں نے اپنے کو "طوطی ہند" کہا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی تعریف کرتے ہوئے اس کرۂ خاکی کو جنت نشان کہا ہے اور یہاں

کی زبان کے لیے لکھا ہے کہ ہندوی فارسی سے کم نہیں ہے۔ انھوں نے ہندو مسلم فرق کو بھی کم کرنے کی کوشش کی ہے۔

خسرو نے ہندوستانی موسیقی پر بھی چند کتابیں تصنیف کی ہیں جو نایاب ہیں۔ ہندوستانی موسیقی میں مسلمانوں کے اثر سے جو تبدیلیاں رونما ہوئیں وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ امیر خسرو نے غزل کی عنائیت کو موسیقی کا جامہ پہنانے جو کوشش کی ہے اس کے لیے ان سے بہتر کوئی اور شخص نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ اس دور کے راگ راگنیوں کی زبان سنسکرت اور پراکرت تھی اور موضوعات مذہبی یا رسوماتی نوعیت کے ہوتے تھے۔ حضرت امیر خسرو نے قول، ترانہ اور گل وغیرہ نوئے راگ ایجاد کیے جن کی زبان ہندی اور فارسی کا مرکب یعنی دلی کی مقامی زبان تھی۔

امیر خسرو نے نہ صرف راگ کی طرف توجہ کی بلکہ آلات موسیقی کے معاملے میں بھی کافی جدت سے کام لیا، چنانچہ ستار اور ڈھولک کی ایجاد کا سہرا خسرو کے سر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے ایجاد کردہ راگ اور نغمے ستار اور ڈھولک پر ہی گائے جا سکتے تھے۔ ان کے راگوں میں فارسی اور ہندوستانی موسیقی کی آمیزش، قابل دید ہم آہنگی اور سُروں بے مثال موزونیت کے ساتھ کی گئی ہے اور وہ ان کی شاعری کی طرح عنائی اور رومانی بھی تھی۔ اس کے علاوہ خسرو نے ستار اور ڈھولک کے لیے سترہ تانیں بھی ایجاد کیں جو چند کو چھوڑ کر آج بھی ہندوستان میں عام طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔

موسیقی میں خسرو کی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ موسیقی کے میدان میں مانا ہوا فنکار اور خسرو کا حریف نانک گوپال تھا ایک بار بادشاہ نے خسرو اور گوپال کا مقابلہ کرلیا گوپال موسیقی کے سلسلہ میں خسرو کی ایجادات سے ناواقف تھا اس لیے وہ خسرو کے مقابلے پر نہ چل سکا اور خسرو نے قول گاکر میدان جیت لیا اس موقع پر بادشاہ نے خوش ہوکر "قوال" یعنی قول گانے والے کا خطاب دیا جو اب پیشہ ور گانے والوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

چونکہ خسرو ایک اعلیٰ درجہ کے موسیقار اور علم و فضل کے ستون تھے اس لیے قرأت کے طلبا نے بھی ان سے پورا پورا استفادہ کیا۔ شرفا کے بچے ان کے پاس قرأت سیکھنے کے لیے آتے تھے یعنی وہ ایک اچھے قاری بھی تھے۔

امیر خسرو کی پہیلیاں بھی بڑی دلچسپی کی چیز تھیں اور آج تک بچوں کی زبان پر ہیں حالانکہ ان کے

الفاظ میں بڑی حد تک ردوبدل ہوگئی ہے مگر قافیہ اور ردیف وہی ہیں مثلاً

دس ناری کا ایک ہی نر
بستی باہر واکا گھر
پیٹھ سخت اور پیٹ نرم
منھ میٹھا تا شیر گرم
سر کاٹو تو امن رہے پیر کاٹو تو پیالہ !
امیر خسرو یوں کہیں کہ رنگ ہے اس کا کالا !

بچوں کو تو آج بھی ان کی پہیلیاں بوجھنے میں بڑا مزا آتا ہے خسرو کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ بچوں کے لیے ان کی زبان میں شعر کہتے تھے امیر خسرو کو فی البدیہہ شعر کہنے میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی ۔ ان کی متعلق مشہور ہے کہ امیر خسرو ایک بار کسی کنویں کے پاس سے گزرے جہاں چند لڑکیاں کھڑی تھیں خسرو کو پیاس محسوس ہوئی وہ ان کے پاس گئے اور پانی مانگا، لڑکیوں نے خسرو کو پہچان لیا اور فرمائش کی کہ پہلے وہ اپنا کلام سنائیں اس کے بعد پانی ملے گا۔ شرط یہ رکھی کہ ہم چاروں اپنی اپنی پسند کی چیز کا نام بتائیں گے اور ان چیزوں کو شعر میں استعمال کرنا ہے لہٰذا ایک لڑکی بولی مجھے کھیر پسند ہے دوسری نے کہا مجھے "چرخا" تیسری کو کتا پسند تھا اور چوتھی کو ڈھولک۔ خسرو نے سب کی پسندیدہ چیزوں کے نام سن کر کہا ۔

کھیر پکائی جتن سے اور چرخا دیا جلائے
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجائے

" لا پانی پلا "

لڑکیاں اس شعر کو سن کر بہت خوش ہوئیں اور خسرو کو پانی پلا دیا۔

خسرو نے بہت سے گیت بھی لکھے ہیں ہندوستان کے ہندی بولنے والے علاقوں میں مشکل سے کوئی ایسا شخص ملے گا جس نے ساون کے مہینہ میں لڑکیوں کو امیر خسرو کے گیت گاتے ہوئے نہ سنا ہو وہ بچپن ہی سے بے انتہا ذہین تھے اور کم عمری میں فارسی اور ہندی میں اچھے شعر کہنے لگے تھے انھوں نے لڑکیوں کی شادی کے موقع پر گائے جانے والی رخصتی بھی لکھی ہے مثلاً

کاہے کو بیاہی بدیس رے سن بابل مورے !

بھیا کو دیئے محلے دو محلے تو ہم کو دیا پردیس رے۔ سن بابل !

انھوں نے اپنے پیر حضرت نظام الدین اولیا کی شان میں اور ان کی وفات کے بعد ان کی یاد میں بیچین ہو کر بھی چند اشعار کہے ہیں۔

وہ تقریباً نو برس کی عمر میں حضرت نظام الدین اولیا کے مرید ہو گئے تھے ان کی مریدی کا واقعہ بہت دلچسپ اور پراثر ہے ایک دن امیر خسرو کے والد نے ان سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا اس وقت دہلی میں بڑے بزرگ ہیں چلو میں تم کو ان کے پاس لے چلوں تاکہ وہ تم کو دعا دیں اور تم ان کے مرید بھی ہو جانا۔ اس غرض سے یہ دونوں حضرات خانقاہ کے دروازے پر آئے تو امیر خسرو نے اپنے والد سے کہا کہ میں اندر نہیں جاؤں گا جب تک میرے دل میں خود مرید ہونے کی عقیدت پیدا نہ ہو اس وقت تک میں مرید نہیں بننا چاہتا۔ لہٰذا امیر خسرو باہر بیٹھ گئے اور ان کے والد اندر چلے گئے حضرت امیر خسرو نے باہر بیٹھے بیٹھے دل ہی دل میں ایک رباعی موزوں کی اور سوچا کہ اگر حضرت نظام الدین اولیا میرے پیر بننے کے قابل ہیں تو میرے دل کی بات کو معلوم کر کے اس رباعی کا جواب بھیجیں گے ورنہ میں واپس چلا جاؤں گا وہ رباعی یہ تھی

تو آں شاہے کہ بر ایوان قصرت

کبوتر گر نشیند باز گردد !!!

غریبے مستمندے بر در آمد !!!

بیاید اندروں یا باز گردد !!

یعنی آپ ایسے بادشاہ ہیں کہ اگر آپ کے محل کی منڈیر پر کوئی کبوتر آبیٹھے تو برکت کے اثر سے باز بن جائے۔ آپ کے دروازے پر ایک غریب اور ناچیز آدمی آیا ہے اندر آجائے یا واپس چلا جائے۔

حضرت نظام الدین اولیا خاموش بیٹھے تھے سیکڑوں آدمی مجلس میں حاضر تھے، سب ادب سے خاموش تھے، یکایک حضرت نے گردن اونچی کی اور اپنے خدمتگار بشیر نامی کو پکارا فرمایا "دیکھو باہر ایک ترک بچہ بیٹھا ہے اس کے پاس جاؤ اور یہ رباعی پڑھ کر چلے آؤ

سوائے رباعی کے اور کچھ نہ بولنا۔ یہ رباعی بھی فارسی میں تھی جس کا مطلب ہے :

" حقیقت کے میدان کا مرد سامنے آجائے تو ہمارے ساتھ کچھ دیر ہم راز بن جائے
لیکن اگر وہ واقعی نادان اور ناسمجھ ہے تو جس راستہ سے آیا ہے اسی سے واپس چلا جائے۔"

جس وقت بشیر نے حضرت نظام الدین اولیا رکی یہ رباعی امیر خسرو کے سامنے پڑھی تو امیر خسرو رونے لگے اور خانقاہ میں جاکر حضرت کے قدموں پر سر رکھ دیا اور مرید ہونے کی درخواست کی حضرت نے ان کی درخواست قبول کرلی اور ان کو مرید کرلیا۔

حضرت امیر خسرو اپنے پیر کے ممتاز ترین اور محبوب ترین مریدوں میں سے تھے۔ ان کے پیر کا انتقال ہوا تو چھ مہینے کے بعد ٹھیک اسی دن اور اسی تاریخ تاریخ شوال ۲۵ ۷ ھ بروز پیر مطابق ۲۷ ستمبر ۱۳۲۵ ء کو ان کے محبوب مرید نے بھی انتقال کیا اور اپنے پیر کے پائینتی ان کو جگہ ملی۔

حضرت امیر خسرو کی شخصیت گوناں گوں کمالات کی حامل تھی، پھر بھی ان کی شہرت کا دارومدار زیادہ تر ان کی شاعری پر ہے، شاعری میں بھی آپ لو۔ تو ہر صنف میں ماہر تھے مگر آپ کی شہرت میں سب سے زیادہ دخل آپ کی غزل گوئی کو ہے۔ آپ ہندوستان کے سب سے بڑے غزل گو تھے۔ آپ کی غزلوں میں سوز وگداز، عشق و محبت عجز و نیاز، سادگی، بے تکلفی، شوخی، تصوف، ہم آہنگی، موسیقی، نزاکت اور تناسب جیسے عناصر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ محمد عبد الغنی لکھتے ہیں: "زبان کی شیرینی اور دل سے دل کی بات کہنے میں ان کی غزل اتنی موثر ہے کہ صرف رودکی اور سعدی ہی اس درجے تک پہنچ سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اس میں ایک اور چیز کا اضافہ کیا اور وہ یہ کہ اپنی غزلوں میں موسیقی کا رنگ دیا جس سے خاص فارسی غزل کے آہنگ میں اضافہ کیا اور صوفیوں کی محفل میں زیادہ مقبول بنا دیا۔"

پروفیسر امیر حسن عابدی (خسرو شناسی صفحہ ۱۹۲)

غلام مرسلین

جاہلی ادب

ظہور اسلام سے قبل کا زمانہ دورِ جاہلیت کہلاتا ہے، اس لیے اس زمانے کے عربی ادب کو جاہلی ادب کہتے ہیں۔ جاہلی ادب کا جو سرمایہ آج موجود ہے اس میں نثر کا حصہ بہت کم ہے، البتہ اشعار اور قصائد کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ظہور اسلام سے قبل عربوں میں تحریر کا رواج عام نہیں تھا، صرف گنے چنے لوگ ہی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اہل عرب عام طور سے اپنے قوت حافظہ پر ہی بھروسہ کرتے تھے۔ وہ تمام واقعات، روایات، حادثات اور اخبار و اشعار کو زبانی یاد رکھتے تھے بلکہ بعض لوگوں کا کام ہی یہی تھا کہ وہ اپنے قبیلے کے تمام اہم واقعات اور شاندار کارناموں کو اور ممتاز شعراء کے قصائد کو یاد رکھیں اور مناسب مواقع پر ان کو سنایا کریں۔ ایسے لوگوں کو راوی کہا جاتا تھا۔ چنانچہ ان کا ادبی سرمایہ اور خاص طور پر شعری سرمایہ اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ظہور اسلام کے بعد عہدِ عباسی کی ابتدا میں جب تحریر کا رواج عام ہوا اور علوم و فنون کی طرف عربوں نے توجہ کی تو یہ سارا ادبی سرمایہ قلم بند کر لیا گیا اور کتابوں کی شکل میں محفوظ کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اشعار کو یاد رکھنا بہ نسبت نثری عبارت کے زیادہ آسان ہوتا ہے اس لیے اس زمانے کے نثری ادب کا بہت کم حصہ ہم تک پہنچ سکا ہے۔ اور جس قدر پہنچا ہے اس میں زیادہ تر ضرب الامثال، کچھ خطبات اور چند وصیت نامے ہیں۔

جناب غلام مرسلین، ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ضرب الامثال

عربوں میں مثل کا رواج بہت زیادہ تھا جو کہاوت کے طور پر بول چال میں استعمال ہوتے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں جن میں کوئی حکمت اور دانائی کی بات ہوتی ہے یا کسی واقعہ اور قصہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے اس لیے ان کی دو قسمیں کی جاتی ہیں۔ ایک امثال حکمیۃ جو حکیمانہ اقوال پر مشتمل ہیں۔ ان کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ حضرت سلیمان کے زمانے سے اسی طرح نقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ دوسرے امثال مبینہ جن کی بنیاد کسی واقعہ پر ہے ان سے بھی زندگی کے تجربے اور سبق حاصل ہوتے ہیں امثال کی تدوین و تالیف میں مختلف مصنفین نے دلچسپی لی ہے اور ان کو مختلف کتابوں میں جمع کیا ہے جن میں زیادہ مشہور المیدانی کی مجمع الامثال اور زمخشری کی المستقصیٰ فی الامثال ہے۔

خطبات

زمانۂ جاہلیت کے جو خطبے ہم تک پہنچ سکے ہیں وہ زیادہ طویل نہیں ہیں۔ بلکہ بہت مختصر اور چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل ہیں اور ان کے اکثر جملے مقفّیٰ اور مسجّع ہیں۔ شاید اسی وجہ سے راویوں کے لیے ان کا یاد رکھنا آسان تھا اور انھوں نے ان کو محفوظ رکھا اور ہم تک پہنچا دیا۔ ان کے علاوہ جو طویل خطبے رہے ہوں گے ان کو وہ یاد نہیں رکھ سکے۔ بہرحال اس زمانے کے جو خطبے موجود ہیں ان میں بڑی سلاست اور روانی اور فصاحت و بلاغت پائی جاتی ہے۔ خیالات میں بلندی اور انداز بیان میں صفائی اور وضاحت ہے، ان سے خطیبوں کی ذہانت اور ان کی آزاد پسندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

عرب میں شعراء کی طرح خطیبوں کی بھی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ یہ خطباء عرب کے میلوں اور بازاروں میں تقریریں کیا کرتے تھے جن میں موقع و محل کے لحاظ سے لوگوں کو نصیحت کیا کرتے تھے۔ وہ اپنی تقریروں کے دوران قومی واقعات و روایات کا ذکر کرتے اور اپنے قبیلے کے کارناموں کو بیان کرتے تھے۔ ان کی تقریر میں بڑا اثر ہوتا تھا۔ خاندانی اختلافات اور آپس کے جھگڑوں کو اپنی

تقریر کے ذریعہ سلجھانے کی کوششیں کرتے۔ جب کبھی کسی قبیلے کو کسی دوسرے قبیلے کے لوگوں تک یا کسی بادشاہ تک کوئی پیغام پہنچانا ہوتا تھا تو سفارت کی خدمت بھی یہی خطباء انجام دیتے تھے۔

عرب کے خطبا کسی اونچے مقام یا ریت کے ٹیلے پر کھڑے ہو کر بلند آواز میں تقریریں کیا کرتے تھے تقریر کے دوران وہ ہاتھوں سے اشارے بھی کرتے جاتے اور کسی عصا یا نیزے کا سہارا لیے رہتے تھے۔ ان کی تقریر بہت پر جوش اور پر اثر ہوتی تھی۔ عام طور پر وہی خطیب زیادہ مقبول اور مشہور ہوتا تھا جو حسین و جمیل بلند قد و قامت اور گرجدار آواز کا مالک ہوتا تھا۔ جاہلیت کے مشہور خطباء میں قس بن ساعدہ، عمرو بن معدیکرب اور اکثم بن صیفی کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے خطباء کا نام ملتا ہے۔

وصیّت نامے

نثر کی ایک قسم وصیت نامے ہیں۔ یہ وصیتیں مخصوص لوگ مخصوص موقعوں پر کیا کرتے تھے، مثلاً جب کوئی شخص لمبے عرصہ کے لیے کہیں دور سفر پر جانے والا ہوتا تھا تو اپنے گھر والوں کو کچھ وصیتیں کر جایا کرتا تھا یا اسی طرح مرنے والا مرنے سے پہلے مختلف معاملات کے بارے میں وصیت کرتا تھا۔ اس قسم کے کچھ وصایا بھی راویوں کو یاد تھے جو بعد میں کتابوں میں جمع کر لیے گئے۔ ان وصیتوں میں پند و موعظت اور حکمت و نصیحت کے اقوال ہیں اور ان کے جملے بھی چھوٹے چھوٹے اور عموماً مقفیٰ و مسجع ہیں جو بہت موثر، دلنشین اور فصیح و بلیغ ہیں۔ وصایا کے سلسلے میں زہیر بن جناب الکلبی کو بڑی شہرت حاصل تھی۔

شاعری

ما قبل اسلام عربی ادب کا اہم ترین سرمایہ جو ہم تک پہنچ سکا ہے وہ اشعار کی صورت میں ہے یہ اشعار کافی مقدار میں موجود ہیں اور یہ کل سرمایہ پانچویں صدی اور زیادہ تر چھٹی صدی عیسوی کے عرب شعراء کی طرف منسوب ہے جو زبانی روایات کے ذریعہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں اس کو مدوّن کیا گیا۔

یہ اشعار و قصائد اور قطعات کی شکل میں پائے جاتے ہیں اور ان کا مرتبہ زبان و بیان اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔ سب سے پرانا قصیدہ جو ملتا ہے وہ مہلہل بن ابی ربیعہ کی طرف منسوب ہے جو قبیلہ بنی تغلب کے سردار کلیب بن ربیعہ کا بھائی تھا۔ اس نے یہ قصیدہ حرب بسوس کے سلسلہ میں کہا تھا۔ لیکن یہ قدیم ترین قصیدہ بھی بہت فصیح و بلیغ اور ریختہ و منظم ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب سے پہلا قصیدہ نہیں ہو سکتا کیونکہ شاعری اپنے ابتدائی دور میں اس قدر منظم اور مکمل صورت میں نمودار نہیں ہو سکتی۔ یقیناً اس سے پہلے عربی شاعری پر مختلف ادوار گذرے ہوں گے اور صدیوں تک اس میں مشق و محنت اور تراش خراش ہوئی ہوگی تب کہیں جاکر ایسی اعلیٰ اور شائستہ شاعری وجود میں آئی ہوگی۔

شاعری کی ابتدار

عربی شاعری کی ابتدار کب ہوئی اور کس طرح رفتہ رفتہ اس نے ترقی کی منزلیں طے کیں، آج اس کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ قرائن سے یہی اندازہ ہے کہ عربوں نے پہلے آزاد نثر سے مسجع و مقفیٰ نثر کی طرف قدم بڑھایا ہوگا۔ مسجع نثر سے رجز کی طرف پھر رفتہ رفتہ قصیدے کی طرف ترقی کی ہوگی۔

عربی شاعری کے وجود کے بارے میں علمائے ادب کی مختلف رائیں ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کی ابتدار قریض سے ہوئی۔ قریض اس آواز کو کہتے ہیں جو اونٹ کے منہ سے جگالی کرتے وقت نکلتی ہے اور بعض کے خیال میں اس کی ابتدار گانے سے ہوئی کیونکہ وزن اور قافیہ سے الفاظ میں جو موسیقیت پیدا ہوتی ہے وہ ہر شخص کو اچھی معلوم ہوتی ہے اور اس کا فطری طور پر بہت اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ عرب میں اشعار پڑھنے کو گانا ہی کہتے ہیں جس کے لیے انشاد اور نشید کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ مجلسوں میں شعرار اپنا کلام گا کر ہی سنایا کرتے تھے۔ اموی اور عباسی خلفار کے درباروں میں بھی یہی رواج عام تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی شاعری کو وجود میں لانے کے لیے موسیقیت کو پہلی اور سب سے اہم حیثیت حاصل ہے۔ اس کی بدولت عربی نثر میں سجع کا ظہور ہوا۔ سجع کبوتر کی آواز کو کہتے ہیں، اس آواز میں ایک خاص طرح کا ترنم ہوتا ہے جو دل پر بہت اثر کرتا ہے۔

مسجع نثر میں ہی کاہنوں کے اقوال بھی ملتے ہیں۔ عوام غیب کی باتیں پوچھنے کے لیے کاہنوں کے پاس جاتے تو وہ اپنے دیوتاؤں سے مناجات کے بعد دعاؤں کے ذریعے جواب طلب کرتے تھے، اس کے بعد جو جواب ملتا تھا اسے وہ مسجع و مقفیٰ جملوں میں بناتے تھے۔

سجع میں وزن نہیں تھا صرف قافیہ ہوتا تھا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد اس میں وزن بھی شامل ہوگیا اور غالباً سب سے پہلے رجز کا وزن ظہور میں آیا، کیونکہ یہ وزن بہت آسان ہے اور اونٹوں کی رفتار میں جو چڑھاؤ اتار ہوتا ہے اس سے یہ بہت مشابہ ہے، لہٰذا لمبے لمبے سفر میں دل بہلانے کے لیے اور تھکے ماندے اونٹوں کے اندر تازگی پیدا کرنے کے لیے اس وزن میں کچھ اشعار گائے جانے لگے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مضر بن نزار رجز کا بانی ہے۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی، ایک مرتبہ کسی سفر کے دوران وہ اونٹ سے گر کر زخمی ہوگیا اور اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا، اس کی تکلیف کی وجہ سے وہ کراہتا تھا اور اس کے منہ سے 'وایداہ، وایداہ' (ہائے میرا ہاتھ، ہائے میرا ہاتھ) کے الفاظ نکلتے تھے۔ اس کی اس سریلی آواز کا تھکے ہوئے اونٹوں پر بڑا اثر پڑا اور وہ خوشی کے ساتھ تیزی سے چلنے لگے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ نغمہ اور ترنم کا اونٹوں پر بھی بہت اثر پڑتا ہے۔ یہیں سے حدیٰ خوانی کا رواج شروع ہوگیا اور عرب کے بدو طویل سفروں میں تھکے ہوئے اونٹوں میں نشاط پیدا کرنے کے لیے اشعار گانے لگے جن کو حدیٰ خوانی کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ نئے نئے وزن ظہور میں آئے اور اشعار کی تعداد بھی زیادہ ہونے لگی، اور ان کو حدیٰ خوانی کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔

شاعری کی عظمت

رفتہ رفتہ عربوں میں شاعری کا رواج بڑھنے لگا اور شعراء کی تعداد میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ بات یہ ہے کہ عربوں میں باہمی مفاخرت اور مخالفت کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔ جب کسی قبیلے کا کوئی شاعر اپنے اشعار میں اپنے قبیلے کے کارناموں کو بیان کرتا تو دوسرے قبیلے کے لوگوں کے دلوں میں یہ شوق پیدا ہوتا کہ کاش ان کا بھی کوئی شاعر ہوتا جو ان کے کارناموں کو اپنے اشعار کے ذریعہ زندہ کر دیتا۔ اس کے علاوہ عربوں کے اندر فطری طور پر شاعری کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے اور عربی زبان میں

ہر قسم کا مفہوم ادا کرنے کے لیے بڑی قابلیت موجود ہے۔ مزید برآں عربوں کی طبیعتوں میں احساس اور جوش بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ خوف اور خوشی، غم و غصہ اور عیش و مسرت کے جذبات ان کو بہت جلد بے خود اور بے قابو کر دیتے ہیں۔ ان اسباب کی بنا پر اشعار کا ان کے دلوں پر بہت اثر پڑتا تھا۔ بعض وقت ایک ہی شعر ان کے اندر انقلاب پیدا کر دیتا تھا۔ اس سلسلہ میں بہت سے واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن میں سے ایک یہاں پر پیش کیا جاتا ہے۔

اعشیٰ زمانۂ جاہلیت کا ایک مشہور شاعر ہے۔ اسی زمانہ میں محلّق نامی ایک غریب شخص تھا جس کی کئی لڑکیاں تھیں اور ان کی شادی نہیں ہو رہی تھی۔ ایک بار اس کے قبیلہ کی طرف سے اعشیٰ کا گذر ہوا۔ چاروں طرف اعشیٰ کے آنے کی خبر مشہور ہو گئی۔ محلّق کی بیوی کو بھی معلوم ہوا تو اس نے اپنے خاوند محلّق سے کہا کہ اعشیٰ ایک مشہور شاعر ہے اس کی دعوت کرو اور خوب خاطر تواضع کرو۔ شاید اس طرح وہ ہم سے خوش ہو کر اپنے اشعار میں ہمارا ذکر کر دے تو ممکن ہے کہ کچھ کام بن جائے۔ چنانچہ محلق نے ایسا ہی کیا اور اعشیٰ کو اپنے گھر لا کر اس کی بڑی اچھی ضیافت کی اور نہایت عمدہ شراب پلائی دوسرے دن اعشیٰ نے محلق کی تعریف میں ایک قصیدہ سنایا جس کا ایک شعر اس طرح ہے ؎

تُشَبُّ لِمَقْرُورَيْنِ يَصْطَلِيَانِهَا   وَبَاتَ عَلَى النَّارِ النَّدَى وَالْمُحَلَّقُ

(دو سردی کے ماروں کے لیے آگ بھڑکائی جاتی ہے جسے وہ تاپ رہے ہیں اور اس آگ پر سخاوت اور محلّق دونوں نے رات گذاری۔)

اس قصیدہ کو سنتے ہی مختلف قبیلوں کے بڑے بڑے سردار محلّق کے گھر دوڑ پڑے۔ انھوں نے محلّق کو مبارک باد دی اور شادی کا پیغام دیا۔ اس طرح جلد ہی محلّق کی تمام لڑکیوں کی شادیاں بڑے بڑے سرداروں کے ساتھ ہو گئیں۔

شاعر کا درجہ

اسی لیے عرب میں شاعروں کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ چنانچہ جب کسی قبیلے میں کوئی شاعر پیدا ہوتا تھا تو سارے قبیلے میں خوشی منائی جاتی اور جشن کیے جاتے جس میں عورتیں

بھی شریک ہوتی تھیں جو گانے گاتیں اور باجے بجاتیں دوسرے قبیلے کے لوگ بھی اس میں شریک ہوکر اس قبیلے کے لوگوں کو مبارکباد پیش کرتے ،کیونکہ شاعر ہی قبیلے کی شہرت اور عزت کا ضامن ہوتا تھا۔ اپنے اشعار میں وہ اپنے قبیلے کے لوگوں کی بہادری، فیاضی اور دیگر خوبیوں کا ذکر کرتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ قبیلے کے دشمنوں کی برائیاں بھی بیان کرتا تھا۔ یہ اشعار جلد ہی چاروں طرف پھیل جاتے اور بچے بچے کی زبان پر چڑھ جاتے تھے۔ لڑائی کے موقع پر شاعر اپنے اشعار کے ذریعہ اپنے قبیلے کے لوگوں کی ہمت بڑھاتا اور ان کے اندر جوش و ولولہ پیدا کرتا تھا اور امن وامان کے زمانے میں اس کے اشعار تفریح کا سامان ہوتے تھے۔ اس وجہ سے قبیلے کے تمام معاملات میں شاعر کا بڑا دخل ہوتا تھا اور اکثر قبیلے کا سردار بھی وہی ہوتا تھا۔

شعراء کے بارے میں عربوں کا تصور یہ تھا کہ ان میں ایک خاص قسم کی طاقت ہوتی ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ وہ ایسا موثر اور دلنشیں کلام پیش کرتے ہیں جو دوسرا شخص نہیں پیش کرسکتا۔ چنانچہ عام لوگوں کا خیال تھا کہ ہر شاعر کے قبضے میں ایک جن ہوتا ہے اور وہی یہ اشعار اس کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ اس عقیدے سے بھی شاعر کی عظمت اندازہ ہوتا ہے۔

اصنافِ شعر

ہیئت کے لحاظ سے زمانۂ جاہلیت میں شاعری کی ایک ہی قسم تھی جس کو قصیدہ کہا جاتا تھا۔ قصیدے کے اشعار کی کوئی تعداد مقرر نہیں تھی۔ ایک قصیدے میں دس بارہ اشعار سے لے کر سو ڈیڑھ سو اشعار تک ہوسکتے تھے۔ ہر شعر دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے تھے لیکن اس کے بعد تمام اشعار میں صرف دوسرے مصرعے میں قافیہ کی رعایت کی جاتی تھی۔

البتہ معنی کے لحاظ سے جاہلی قصائد کی متعدد قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً فخر، حماسہ، مدح ہجو، مرثیہ، غزل، وصف اور حکمت وغیرہ۔ ان میں سے دو تین یا اس سے زیادہ مضامین ایک قصیدہ کے اندر ہوتے تھے۔ چند مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں صرف ایک ہی مضمون

پورے قصیدے میں بیان کیا گیا ہے۔

قصیدے کی ترتیب

جاہلی قصائد عام طور پر مختلف مقامات اور کھنڈروں کے نشانات کے ذکر سے شروع ہوتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اس سے قبل کبھی وہاں قیام کیا تھا اور اب اپنے سفر کے دوران اتفاقاً دوبارہ یہاں آگیا ہے اور ان نشانات کو دیکھ کر پرانی یاد اس کے ذہن میں تازہ ہو گئی ہے جاہلی شعراء کا انداز بیان بالکل فطری اور قدرتی ہوتا ہے کیونکہ عرب قبائل ہمیشہ خانہ بدوشوں کی طرح چراگاہوں اور چشموں کی تلاش میں گھومتے رہتے تھے۔ چند روز کسی ایک چراگاہ میں قیام کرتے پھر وہاں سے کوچ کر جاتے، اس عارضی قیام کے زمانے میں مختلف قبیلوں کے درمیان محبت یا عداوت کے متعدد واقعات پیش آتے تھے۔ لہذا جب کبھی دوبارہ اس مقام سے ان کا گزر ہوتا تو پرانی یادوں کا تازہ ہو جانا بالکل قدرتی بات تھی۔ چنانچہ ان کھنڈروں کو دیکھتے ہی شاعر کی نگاہوں کے سامنے گزشتہ زندگی کی تصویر کھنچ جاتی تھی۔ وہ بچے کھچے آثار کو غور سے دیکھتا ہے اور قرب و جوار کی پہاڑیوں، ٹیلوں اور درختوں پر نظر ڈالتا ہے ان سے بچھڑے ہوئے ساتھیوں کے بارے میں سوال کرتا ہے کہ وہ سب کہاں گئے پھر اپنی محبت کی واردات اور جدائی کی کیفیات کا اظہار کرتا ہے۔ قصیدے کا یہی حصہ تمہید یا تشبیب کہلاتا ہے اور اکثر قصائد کے شروع میں کم و بیش یہی مضمون ملتا ہے۔ اس کے بعد شاعر اپنے نفس کو تسلّی دیتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے سفر کا حال بیان کرتا ہے، کبھی اپنے گھوڑے یا اپنی ناقے کی رفتار کی تعریف کرتا ہے، کبھی اپنی شہسواری پر فخر کرتا ہے، کبھی سفر کی مشکلات اور دشواریوں کا ذکر کرتا ہے۔ کبھی اپنے آباء و اجداد کے کارناموں کو بیان کرتا ہے، کبھی مناظر فطرت کی عکاسی کرنے لگتا ہے، اس طرح مختلف قصائد میں مختلف قسم کے مضامین ملتے ہیں۔

جاہلی شاعری کی خصوصیات

جاہلی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت سچائی اور سادگی ہے۔ جاہلی شعراء کا کلام تصنّع

اور تکلف سے خالی ہوتا ہے جو جذبہ اور جو خیال ان کے ذہن میں جس طرح آتا ہے اس کو وہ اسی طرح اپنے اشعار میں بیان کر دیتے ہیں۔ ان کی زندگی میں جو سادگی اور آزادی تھی وہی ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ زندگی میں جن امور سے ان کا واسطہ پڑتا تھا اور جو واقعات و مناظر ان کی نظر کے سامنے ہوتے تھے انھیں کو وہ بے کم و کاست اپنی شاعری میں بیان کر دیتے تھے۔ فطری جوش، جذبۂ انتقام جرأت، شجاعت، محبت، نفرت اور آزادی کے عجیب و غریب تصورات، میزبانی کے بلند تخیلات، عاجزی و بےکسی سے نفرت، کسی کا احسان لینے سے انکار، ہمسایے کی حفاظت، بےکسوں کی امداد، وعدے کی پابندی اور فخر و مباہات کے تذکرے۔ یہی ساری باتیں ان کی زندگی کے معمولات میں داخل تھیں اور یہی سب ان کے اشعار کی خصوصیات میں شامل ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری میں ان کی معاشرت، تمدن، رسم و رواج، اخلاق و عادات، غرض ان کی زندگی کا ہر پہلو نمایاں طور پر ملتا ہے۔

معانی کے علاوہ جو تشبیہات و استعارات انھوں نے استعمال کیے ہیں ان میں صداقت اور اصلیت کی روح پائی جاتی ہے، جو عام طور پر ان کے مشاہدات میں آتی تھیں انہی کو وہ تشبیہ و استعارے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح جو واقعات بیان کرتے تھے وہ بھی بڑی حد تک صداقت پر مبنی ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ جو باتیں فحش اور معیوب سمجھی جاتی تھیں انھیں بھی جوں کا توں بیان کر دیتے تھے۔ چنانچہ ان کے بہت سے اشعار بڑے ہی فحش اور گندے ہیں۔ اسی طرح مدح اور ہجو میں بھی سچائی کا لحاظ رکھتے تھے۔ صرف چند ہی شعراء ایسے ملتے ہیں جنھوں نے شاعری کو پیشہ بنا لیا تھا اور وہ حیرہ اور غسّان کے بادشاہوں کی تعریف صلہ اور انعام حاصل کرنے کے لیے کیا کرتے تھے، ورنہ باقی تمام شعراء صرف اس شخص کی تعریف کرتے تھے جو صحیح معنوں میں تعریف کا مستحق ہوتا تھا اور اس کی تعریف میں صرف وہی باتیں کہتے تھے جو اس کے اندر پائی جاتی تھیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ کسی نے ایک شاعر سے کہا کہ تم میری تعریف کیوں نہیں کرتے تو اس نے جواب دیا "إفعل حتی أقول" یعنی تم کچھ کر کے دکھاؤ تو میں کہوں۔ اسی طرح جب وہ کسی کی ہجو یا برائی کرتے تھے تو اس میں بھی صحیح بات بیان کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی ہجو سمّ قاتل سے بڑھ کر ہوتی تھی اور جب کوئی شاعر کسی کی ہجو کر دیتا تھا تو ہمیشہ کے لیے اس کا سر نیچا ہو جاتا تھا۔

ان قصائد میں تسلسل اور ربط بہت کمزور ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مختلف مضامین کے درمیان کوئی ربط ہی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اگر شعروں کی ترتیب میں تقدیم وتاخیر کردی جائے یا بعض اشعار کو بالکل حذف ہی کردیا جائے تو بھی کوئی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دورِ جاہلیت کے بدو اور دیہاتی فلسفیانہ نظر سے محروم تھے، ان کی نگاہ میں تمام اشیاء اور واقعات ایک دوسرے سے الگ اور بے تعلق ہوتے ہیں جن میں کوئی باہمی رشتہ نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری دراصل ان کی زندگی کی بھی ترجمان ہے۔ چنانچہ مشہور ہے: " الشعر دیوان العرب"۔ یعنی شاعری عربوں کا دفتر ہے جس میں ان کی زندگی کی مکمل تاریخ موجود ہے۔

شعری مجموعے

جیسا کہ شروع میں بیان کیا جا چکا ہے ظہورِ اسلام سے قبل عرب میں تحریر کا رواج عام نہیں تھا، شعراء اپنے کلام زبانی یاد رکھتے تھے، اس کے علاوہ ہر شاعر کے ساتھ اس کا ایک خاص راوی ہوتا تھا جو اپنے شاعر کے تمام اشعار کو یاد رکھتا تھا اور مختلف مواقع پر انھیں سناتا تھا جنھیں سن کر دوسرے لوگ بھی یاد کرلیا کرتے تھے اور اسی طرح سینہ بہ سینہ یہ اشعار نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے رہتے تھے یہاں تک کہ اسلام کے آنے کے بعد دوسری، و تیسری صدی ہجری میں جب تحریر کا رواج عام ہوا تو یہ اشعار قلم بند کرلیے گئے۔ اس وقت جاہلی شاعری کے مختلف مجموعے مختلف بنیادوں پر تیار ہوگئے۔ بعض کتابوں میں صرف جاہلی شعراء کے ہی اشعار جمع کیے گئے اور بعض میں جاہلی اور اسلامی دونوں قسم کے اشعار شامل کرلیے گئے۔ بعض کتابوں میں بڑے بڑے قصائد رکھے گئے اور بعض میں چھوٹے بڑے ہر قسم کے اشعار جمع کیے گئے۔ اسی طرح بعض مجموعے میں صرف ایک ہی قبیلے کے اشعار کو جمع کیا گیا ہے۔ غرض مختلف قسم کے شعری مجموعے تیار ہوئے جن میں سب سے زیادہ مشہور 'معلقات' پھر 'مفضلیات'، 'جمہرۃ اشعار العرب' اور 'کتاب الاغانی' ہیں۔ اس موقع پر صرف معلقات کے بارے میں مختصر طور پر عرض کیا جاتا ہے کیونکہ ما قبل اسلامی شاعری میں ان کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔

معلقات

معلقہ کے معنی ہیں لٹکایا ہوا، پس معلقات کا مطلب یہ ہے کہ وہ قصیدے جو لٹکائے گئے تھے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ خانۂ کعبہ کے دروازے پر لٹکائے گئے تھے۔ مشہور روایت یہ ہے کہ ہر سال مکہ کے قریب جو عکاظ کا میلہ لگتا تھا اس میں بہت سے شعرا بھی جمع ہوتے تھے اور ان کے درمیان شاعری کا مقابلہ ہوتا تھا۔ تمام قبائل کے بڑے بڑے شعرا اپنے اپنے قصیدے سناتے تھے پھر جس کا قصیدہ سب سے اچھا سمجھا جاتا تھا اسے ریشمی کپڑے پر سونے کے پانی سے لکھ کر خانۂ کعبہ کے دروازے پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ تاکہ لوگ سال بھر تک اسے دیکھیں اور اگر کوئی قابل اعتراض بات اس میں پائیں تو اعتراض کریں ورنہ تسلیم کریں کہ اس سال کے لیے اس قصیدہ کا مالک ملک الشعراء ہے اس کے بعد اس کا درجہ چوٹی کے شاعروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ بعض محققین اس روایت کو صحیح نہیں مانتے اور وہ اس کی دوسری توجیہ بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ قصائد خانۂ کعبہ کے دروازے پر نہیں لٹکائے جاتے تھے بلکہ جس قصیدہ کو عرب کا بادشاہ پسند کرتا تھا اس کے متعلق وہ حکم دیتا تھا کہ اس کو میرے خزانے میں لٹکا دو۔ لہٰذا لوگ سنہرے حرفوں میں لکھ کر بادشاہ کے خزانہ میں داخل کر دیتے تھے۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو یہ قصائد ہمیشہ سے بہت اعلیٰ درجہ کے سمجھے جاتے رہے ہیں۔

ان قصائد کے متعلق مشہور روایت یہ ہے کہ ان کو حماد الراویہ (۱۵۶ھ) نے جمع کیا ہے۔ اس شخص کے متعلق مشہور ہے کہ اس کو ستائیس ہزار (۲۷۰۰۰) قصائد زبانی یاد تھے، وہ بھی اس ترتیب سے کہ ہر حرف تہجی کے ایک ایک ہزار اور اس میں بھی بیس اشعار لے کر سو اشعار والے قصیدے تک کہا جاتا ہے کہ جب خلیفہ ولید کو اس کا علم ہوا تو اس نے حماد کا امتحان لیا پھر جب وہ امتحان میں کامیاب ہو گیا تو اس کو ایک لاکھ درہم انعام میں دیا۔ بہرحال یہ روایتیں کہاں تک صحیح ہیں ان کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ راویوں کو بہت بڑی تعداد میں اشعار یاد رہتے تھے۔

ان معلقات میں سات قصیدے عام طور پر شامل کئے جاتے ہیں، ان لیے ان کو 'سبع معلقات' کہا جاتا ہے۔ یہ قصائد حسب ذیل شعراء کی طرف منسوب ہیں:۔

(۱) امرؤ القیس (۲) زہیر بن ابی سلمیٰ (۳) طرفہ (۴) لبید (۵) عمرو بن کلثوم (۶) عنترہ (۷) حارث بن حلزہ

کبھی کبھی ان میں مزید دو، تین یا زیادہ سے زیادہ چار شاعروں کو اور بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کی تعداد گیارہ تک پہنچ جاتی ہے، ان چار شعراء کے نام یہ ہیں:

(۱) نابغہ (۲) اعشیٰ (۳) عبید بن الابرص (۴) علقمہ

ذیل میں جاہلی شاعری کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں:

امرؤ القیس اپنے گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے:

وقد اغتدی والطیر فی وکناتہا　　بمنجرد قید الاوابد ہیکل

(اور میں بہت سویرے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کے لیے روانہ ہو جاتا ہوں جو چھوٹے بال والا اور بھاری جسم والا ہے اور وحشی جانوروں کو قید کر لیتا ہے جبکہ پرندے ابھی اپنے گھونسلوں کے اندر ہوتے ہیں۔)

مکرّ مفرّ مقبل مدبر معاً　　کجلمود صخر حطّہ السیل من علٍ۔

(وہ گھوڑا بہت حملہ کرنے والا، بہت بھاگنے والا، آگے بڑھنے والا اور پیچھے ہٹنے والا ہے جیسے کوئی بھاری پتھر ہو جسے سیلاب نے اوپر سے نیچے گرا دیا ہے۔)

طرفہ اپنی بہادری کے بارے میں اس طرح کہتا ہے:

اذا القوم قالوا من فتی خلت اننی　　عُنیتُ فلم اکسلْ ولم اتبلّد

(جب لوگ کہتے ہیں کہ کون جوان ہے جو ہماری مدد کرے تو میں خیال کرتا ہوں کہ میں ہی مراد لیا گیا ہوں تو میں سستی نہیں کرتا اور نہ ہی حیران ہوتا ہوں بلکہ فوراً ان کی مدد کے لیے دوڑ پڑتا ہوں۔)

عمرو بن کلثوم فخریہ طور پر کہتا ہے:

ألا لا یعلم الاقوام أنّا　　تضعضعنا وأنا قد ونینا

(خبردار! لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کمزور اور سست پڑ گئے ہیں۔)

ألا لا یجهلن احدٌ علینا　　فنجهل فوق جهل الجاهلینا

(خبردار! کوئی ہم سے جہالت نہ کرے ورنہ ہم جاہلوں سے بڑھ کر جہالت کریں گے۔)

وانا المانعون لما اردنا وانا النازلون بحيث شينا

(اور ہم جس چیز کو چاہیں اسے روک دیں اور ہم جہاں چاہیں وہاں اتر پڑیں۔)

وانا العاصمون اذا اطعنا وانا العازمون اذا عصينا

(جب ہماری اطاعت کی جائے تو ہم حفاظت کرتے ہیں اور جب ہماری نافرمانی کی جائے تو ہم سختی سے پکڑ لیتے ہیں)

ونشرب ان وردنا الماء صفوا ویشرب غیرنا کدرا وطینا

(جب ہم کسی چشمہ پر اترتے ہیں تو صاف پانی پیتے ہیں اور دوسرے لوگ ہمارا بچا ہوا گدلا اور کیچڑ والا پانی پیتے ہیں۔)

اذا بلغ الفطام لنا صبی تخر له الجبابر ساجدینا

(جب ہمارے قبیلہ کا کوئی بچہ دودھ چھوٹنے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کے آگے بڑے بڑے بادشاہ بھی سجدے میں گر پڑتے ہیں۔)

المصادر والمراجع

۱۔ تاریخ الادب العربی از عمر فروخ ج ۱

۲۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ از جرجی زیدان ج ۱

۳۔ الادب الجاہلی از طہٰ حسین

۴۔ تاریخ ادب عربی از حسن زیات

۵۔ تاریخ ادبیات عربی از ابو الفضل

۶۔ عربی ادب از علی احمد رفعت

۷۔ تمدن عرب از محمد احسان الحق سلیمانی

۸۔ ہسٹری آف دی عربس از پی۔ کے حتی

۹۔ اے لٹریری ہسٹری آف دی عربس از نکلسن

ڈاکٹر رشید الوحیدی

شکر کی حقیقت - اور - اصلاحِ معاشرہ

جب ہم شکر کی حقیقت پر غور کرتے ہیں تو ہمیں عقلی استدلال کے مقابلے میں قلبی واردات اور باطنی کیفیات کا عمل دخل زیادہ ہی کارفرما نظر آتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شکر [illegible] ہوتا ہے، انعام پانے والے پر انعام دینے والے کے سبب جس قسم کے جذبات واحساسات طاری ہوں گے اسی کے موافق شکر کی تعریف میں فرق نظر آئے گا۔

اس لحاظ سے بعض ایسے بلند ہمت، عالی ظرف اور نیک لوگ ٹھہرے جو انعام پانے کے بعد انعام دینے والے کی اس توجہ، کرم اور عزت افزائی پر نازاں ہوں گے کہ اس کی وجہ سے منعم نے انھیں انعام دینے کے قابل سمجھا۔ ایسے لوگوں کے یہاں انعام کی حیثیت ثانوی ٹھہری اولیت اس نظر کرم کو حاصل ہے جو ان پر پڑی ہے اور انعام دینے والے نے انہیں اس قابل سمجھا۔

مشہور ہے کہ محمود نے ایک بار خزانے کا منہ کھول دیا اور اعلان عام کر دیا کہ لوگ آئیں اور خزانے لے جائیں، جم غفیر زر و جواہر سے دامن بھرتا رہا۔ خود محمود کا وزیر ایاز اس کی مجلس میں کھڑا ہوا اپنے مالک محمود کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ محمود نے پوچھا، تم کیوں نہیں لے رہے ہو، کیا تمہیں ضرورت نہیں ہے؟ کمالِ محبت، رضا اور استغنیٰ کے ساتھ ایاز نے جواب دیا:

> "خزانے سے زیادہ مجھے خزانے کے مالک کی قربت، رضا اور محبت عزیز ہے سو وہ مجھے اس جگہ حاصل ہے۔"

شکر کی اس تعریف کو ایک جملے میں یوں کہا گیا ہے: عکوف القلب علی محبۃ

ڈاکٹر رشید الوحیدی، لکچرر شعبۂ اسلامیات و عرب و ایرانین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

المنعم" (شکر کیا ہے) قلب کا منعم کی محبت میں مشغول رہنا۔ یا پھر کہا گیا ہے: الثناعلى المحسن بذکر احسانه" محسن کے احسان کو یاد کرکے اس کی تعریف کرنا۔ شبلیؒ نے اس جذبے اور کیفیت کا اظہار اس طرح کیا ہے: رویة المنعم لا رویة النعمة" منعم کا خیال رہے نعمت کو نہ دیکھے۔

ایک تعریف شکر کی بالکل دوسرے طریقے سے کی گئی ہے جس کے مطابق شکر کی ادائیگی میں اپنے عجز کا اعتراف کرلینا یعنی یہ سمجھنا کہ مجھ پر انعام بے انتہا اور ہر لمحہ ہے جس کا شکر ادا کرنے سے میں قاصر ہوں، عاجز ہوں، یہی شکر ہے۔

حضرت ابو عثمان ہارونیؒ کا قول ہے: الشکر معرفة العجز عن الشکر (شکر کیا ہے) اس کی ادائیگی سے اپنے کو عاجز سمجھنا۔ جیسا کہ حضرت داؤدؑ نے خدائے پاک سے سوال کیا: یارب کیف اشکرک و شکری نعمة علیّ من عندك تستوجب بها شکراً" اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر میں ان تمام نعمتوں پر جو تو نے مجھے عطا فرمائی ہیں، شکر ادا کروں تو شکر ادا کرنے کی یہ توفیق بذات خود ایک نعمت ہوگی تو اس نعمت پر پھر شکر ادا کرنا چاہئے اب تو ہی بتا کہ میں بندۂ عاجز کس طرح تیرے شکر سے عہدہ برآ ہوسکتا ہوں؟ اس سوال پر حضرت حق جل شانہ کا جواب جو مذکور ہے وہ تقریباً وہی ہے جو شکر کی تعریف میں حضرت عثمان نے فرمایا ہے۔ جواب ملتا ہے: آلآن شکرتنی۔ یعنی شکر کی ادائیگی پر یہ اعترافِ عجز، یہ اظہار مجبوری اور ساتھ ہی میرے احسانات و انعامات کا یہ نیازمندانہ استحضار ہی آپ کی طرف سے شکر ہے۔

بندگی کا سب سے بڑا اظہار اور حاکم مطلق کی حاکمیت کا اعتراف یہ ہے کہ بندہ تمام اسباب اور وسائل کو نظر انداز کرکے اپنی تمام حاجتوں، ضرورتوں، نفع نقصان اور ہر قسم کی امداد کا واحد سہارا خدا کو مان لے۔ اس احساس کے بعد لازمی طور پر بندے کی اطاعت و فرماں برداری کا مرکز ایک ہی ذات رہ جاتی ہے، اسی کے سامنے وہ اپنی ہر ضرورت پیش کرتا ہے، تمام طاقتوں اور قوتوں کا مرجع اسی کو مانتا ہے، خود کو اس کے سامنے مجبور محض پاتا ہے اور قلبی طور پر اس کی یہی کیفیت شکر کے مترادف قرار پاتی ہے۔

شکر کی تین قسمیں ہیں یا یوں کہہ سکتے ہیں اظہار شکر کے تین طریقے ہیں، شکر کبھی زبان سے ہوتا ہے، کبھی اعضاء بدن سے اور کبھی قلب کے ذریعے۔ پھر شکر کی اعلیٰ قسم یہ ہے کہ یہ تینوں طریقے

ہمہ وقت ادائیگئی شکر میں مشغول ہوں۔ قلب کا ماسوئی اللہ سے ہٹ کر مالک حقیقی کے تصور میں خشوع و خضوع کے ساتھ مشغول رہنا اسی کے تئیں اظہارِ محبت و عقیدت کرتے رہنا یہ قلب کا شکر ہے۔
زبان سے اس کی حمد و تعریف کرنا اس کی نعمتوں کا ذکر کرنا یہ زبان کا شکر ہے، اس کے اوامر اور احکام کے مطابق ظاہری طور پر اعضاء کے ذریعے اطاعت و عبادت کے امور کو انجام دینا یہ اعضاء کا شکر کہلائے گا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شکر کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے یہ چیزیں اگرچہ شکر کی حقیقت میں تو داخل نہیں ہیں مگر اس کے لیے شرط کی حیثیت رکھتی ہیں:
اول۔ شکر کرنے والے کے دل میں اس کے لیے نیازمندی کے جذبات ہوں جس کا شکر ادا کیا جا رہا ہے
دوم۔ شکر کرنے والے کے دل میں اس کی محبت ہو جس کا شکر ادا کیا جا رہا ہے۔
سوم۔ شکر کرنے والے کے دل میں اس کے انعامات و احسانات کا اعتراف ہو جس کا شکر کیا جا رہا ہے۔
چہارم۔ شکر کرنے والا اس کی اس کرم فرمائی پر اس کی تعریف کرتا رہے۔
پنجم۔ شکر کرنے والا ان نعمتوں کو برائی اور مکروہات میں استعمال نہ کرے۔
ان شرطوں میں سے پانچویں شرط کے بارے میں کچھ مزید عرض کرنا ہے۔ دنیا میں حکیم مطلق نے جتنی چیزیں بنائی ہیں (اس میں وہ انعام بھی شامل ہے جو وہ کسی کو عطا فرماتا ہے) اس چیز کی پیدائش اور اس کے استعمال میں ایک حکیمانہ مناسبت بھی پیدا فرما دی ہے۔ اب اگر کوئی چیز اپنے موقع و محل کے خلاف استعمال ہوتی ہے تو یہ کسی شئے کا اپنی جگہ، مقام اور اس مناسبت کے خلاف استعمال کرنا ہے اور یہ بات جس طرح حکیم مطلق کی حکمت کے خلاف ہے۔ اسی درجے میں عقل سلیم کے نزدیک بھی بالاجماع معیوب ہے۔ زبان کا مقصد یہ ہے کہ اس سے خدا کا ذکر کیا جائے، قرآن پاک کی تلاوت، حدیث سے اشتغال رکھا جائے، تبلیغ ارشاد و ہدایت، صدق مقال، تحدیث نعمت اور اللہ و رسول کی باتیں لوگوں کو بتائی جائیں۔ ان کاموں کے لیے زبان کو استعمال کرنا یہی زبان کا شکر ہے اور اس کے خلاف تمام بری باتوں میں اس کا استعمال اس نعمت کی ناشکری اور کفران نعمت ہے۔
اسی طرح ظاہری عبادت نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اس کے علاوہ مخلوق کے ساتھ ہر قسم کی

بھلائی سے پیش آنا مظلوموں، کمزوروں، ضعیفوں، بیماروں کی مدد کرنا۔ ظالم کو اس کے ظلم سے روکنا اللہ کی راہ میں عملاً جدوجہد کرنا، مال و دولت اس نیت سے کمانا کہ کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرنا پڑے اور اپنے مال سے مخلوق خدا کی خدمت ہو، یہ اعضا بدن کا صحیح استعمال اور اس کے ذریعے شکر کی ادائیگی ہے۔ اس کے برخلاف کسی ایسے کام میں استعمال کرنا جو اللہ اور انسان دونوں کے لیے ناراضگی یا تکلیف کا سبب ہو، یہی بدن کی ناشکری ہے۔

پھر ایمان وعقیدے کی درستگی، دولت یقین کا حصول، ہر ہر قسم کے عمل صالح کا ارادہ مثلاً آپس میں محبت، انسانوں کی عزت، ہر ایک سے مروت وہمدردی کا احساس، غیبت، بدگمانی حسد، گالی گلوچ، بدگوئی، جھوٹ، چغلی وغیرہ اخلاق رذیلہ اور دوسرے ہوائے نفسانی و خواہشات شیطانی سے دور رہنے اور بچنے کا ہمہ وقت خیال، یہ قلب کا اصل کام ہے، اسی اصل کام کو انجام دینا قلب کا شکر ہے، اس کے برخلاف دوسرے برے اور ناپسندیدہ خیالات و افکار اگر دل میں پیدا ہوتے ہیں اور آدمی ان کے مطابق عمل کا ارادہ کرتا ہے تو یہ قلب کی ناشکری ہے ایک مرتبہ حضرت حافر نے حضرت معاویہ سے فرمایا تھا: "کم سے کم جو بات انعام پانے والے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ انعام سے کسی معصیت اور گناہ کا کام نہ لیا جائے۔ اس نصیحت کا مقصد یہ بھی تھا کہ ہاتھ پیر آنکھ کان زبان قلب اور دوسری تمام نعمتیں جو خدا نے عطا فرمائی ہیں ان کو ایسے کاموں میں استعمال کرنا جو شریعت میں منع ہیں اور جس سے خدا اور اس کا رسول ناراض ہو، یہ ان نعمتوں کے ساتھ ناانصافی اور خدا کی ناشکری ہے۔ اور بھی دوسری خارجی قسم کی نعمتیں مال و دولت، طاقت و قوت، عزت و شوکت، علم وحکمت، ان تمام ہی چیزوں میں یہ اصول ہمہ وقت سامنے رکھنا ہوگا۔ ان تمام نعمتوں کا غلط کاموں میں استعمال ان نعمتوں کی توہین اللہ کی ناشکری، احسان فراموشی بھی ہے۔ یہ تمام باتیں شکر کی انھیں پانچوں شرطوں میں سے شرط پنجم سے انکار اور اختلاف کا نتیجہ ہیں کہ نعمتوں کو بجائے اس کے کہ صحیح استعمال کر کے خدا کا شکر ادا کیا جاتا، غلط استعمال سے ناشکری کا الزام اپنے سر اوڑھ لیا ہے اور انسان جو اس کائنات پر خدا کا خلیفہ اور رحمت بن کر آیا تھا باعث زحمت بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے بار بار مختلف پیرایۂ بیان اور الگ الگ اسلوب سے شکر کی تاکید فرمائی ہے۔ کبھی شکر کا حکم

دیا جاتا ہے۔ وَاشکروا نعمۃ اللہ ان کنتم صادقین (اگر تم سچے ہو تو میری نعمتوں کا شکر ادا کرو) اور واشکروا لی ولا تکفرون = (میرا شکر ادا کرو کفران نعمت نہ کرو) ایک جگہ سچائی کا انحصار ہی شکر پر رکھ دیا گیا ہے کیونکہ اگر تم شکر گذار بندے نہ بنو گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اس کی نعمتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور محسن یا اس کے احسان کو ہلکا یا حقیقت جاننا بہرحال بندگی سے فروتر بات ہے پھر اگر اپنے ایمان میں کس طرح سچے ہو سکتے ہو۔ ایک اور آیت میں شکر نہ کرنے کی صورت میں کفر کی طرف اشارہ ملتا ہے، یعنی نا شکری کرنے والا کفر و ضلالت کا مرتکب ہے اور ایسے مجرم کے لیے ایک جگہ صاف اعلان ہے: ولئن کفرتم ان عذابی لشدید =(اگر تم کفر کرو گے تو جان لو پھر میرا عذاب بڑا دردناک ہے) یہاں کفر سے مراد کفر مطلق نہ لیا جائے کیونکہ اس آیت میں 'کفر' کا لفظ شکر کے مقابلے میں لایا گیا ہے جس کا مطلب "ناشکری" جس کو اس ٹکڑے سے پہلے والا ٹکڑا واضح کرتا ہے اور وہ یہ ہے: لئن شکرتم لازیدنکم = (اگر تم شکر کرو گے تو بے شک ہم تم پر اپنی نعمتیں بڑھا دیں گے) کہیں قرآن پاک کرنے والوں کو اپنی رضا و خوشنودی کی دولت سے سرفراز فرمانے کا وعدہ کرتا ہے: وان تشکروا یرضہ لکم۔ کہیں اللہ پاک کی عبادت کے لیے قرآن نے شکر کو بطور شرط ذکر کیا ہے کہ اگر تم اللہ کی عبادت کرتے ہو تو اس کا شکر ادا کرو: واشکروا نعمۃ اللہ ان کنتم ایاہ تعبدون۔ (اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو اگر تم صرف کی عبادت کرتے ہو۔) اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہاں ضمیر منفصل " ایاہ " لاکر یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ دوسرے تمام معبود باطلہ کی نفی کردی گئی ہے خواہ وہ مظاہر کائنات کی نفع بخش اشیاء ظاہری ہوں یا خواہشات انسانی کی خفیہ طاقتیں۔ کیونکہ انسان اگر کسی بھی قوت کے سامنے اپنے عجز اور نیازمندی کا اظہار کرتا ہے یا کسی طاقت کو اپنا ملجا و ماویٰ تسلیم کرتا ہے تو فطرت انسانی کے تقاضے کے مطابق ہر نفع بخش وسیلے اور ذات کے لیے اس کے دل میں شکر کے جذبات ضرور موجزن ہوں گے لہذا ضروری ہے کہ معبود اور لائق عبادت ایک ہی ذات ابدی کو سمجھا جائے اور وہ وہی اللہ کے بندے ہیں جن کی تعداد گو بہت تھوڑی ہے مگر وہ خواص میں سے ہونگے۔ قرآن نے ایک دوسری جگہ ان کا ذکر کیا ہے: وقلیل من عبادی الشکور (میرے شکر گذار بندے بہت کم ہیں۔) یہاں وہی بندے مراد ہیں

جو صرف خدا کی عبادت کرتے ہیں، اسی لیے اللہ نے "عباد" کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کیے جا چکے تھے جو معصوم عن الخطار تھے جن کو اللہ پاک کی رضا اس کی محبوبیت اس کے انعام و اکرام بدرجہ اولیٰ حاصل ہو چکے تھے، تمام عمر باری تعالیٰ کے حضور میں شکر ادا کرتے رہے اور جب عرض کیا گیا: تفعل هذا وقد غفرلك ما تقدم من ذنبك وما تاخر۔ آپ اتنی محنت فرماتے ہیں (ساری رات نفلیں ادا فرماتے کہ پائے مبارک پر ورم آجاتا) حالانکہ آپ کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف ہو چکے ہیں تو آپ نے فرمایا: افلا عبداً شکورا = کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ آپ نے کمال محبت و محبوبیت میں شکر کا وہ طریقہ اختیار فرمایا جس میں زبان ذکر الٰہی میں، قلب فکر و توجہ الی اللہ میں اور دوسرے اعضاء عبادت میں مشغول رہ کر شکر کے تینوں طریقے پر عمل کرتے تھے۔

انسان کی اعلیٰ سے اعلیٰ بے نفسی اور بے غرضی، خلوص و للّٰہیت کے باوجود یہ بات خارج از امکان قرار نہیں دی جا سکتی کہ وہ احسان کر کے اپنے احسان کا ذکر اور احسان کرنے والے سے اظہار تشکر و امتنان چاہتا ہے تو اس سے اس کی غرض یہ ہو سکتی ہے کہ اس کی داد و دہش اور سخاوت کا اظہار ہو، اسے اس سے یک گونہ خوشی حاصل ہوتی ہے گویا عطا و بخشش کا ردعمل، اس کے تحت الشعور میں سہی، ایک ردعمل کا منتظر رہتا ہے جس سے اس کے جذبے کو تسکین ہو یہ احساس خواہ کتنا ہی ضعیف ہو تہذیب نفس، تزکیۂ قلب سے اس جذبے کو خواہ کتنا ہی کم اور ہلکا کر دیا ہو مگر بہرحال انسانی فطرت اس کا تقاضہ کر سکتی ہے مگر قرآن پاک نے خدا تعالیٰ کے لیے اس قسم کے تمام خیالات کی بنیاد ہی ختم کر دی ہے اور فرمایا ہے: ومن شکر فانما یشکر لنفسه = جو شکر کرے گا وہ اپنے ہی لیے شکر کرے گا۔ اللہ تو تمام اغراض سے پاک، ہر قسم کی چیزوں سے مستغنی ہے، تعریف سے بلند و بالا ہے، بدلے اور عوض کا اس کے لیے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اگر وہ بندوں سے شکر کا مطالبہ کرتا ہے یا فرماتا ہے، واما بنعمة ربك فحدث = (اللہ کی نعمتوں کا ذکر کیا کرو۔) اور اس طرح اپنی نعمتوں کا اظہار چاہتا ہے تو اس سے اس کو اپنی ذات کے لیے کسی قسم کا فائدہ یا نفع مقصود نہیں ہے بلکہ اس کا شکر کر کے یا تحدیث نعمت کر کے تم خود اپنے ہی لیے نفع اور برکتیں حاصل کر رہے ہو کیونکہ تم شکر گذار بندے کہلاؤ گے، خدا تم سے راضی ہوگا اور تمہارے لیے مزید نعمتیں

عطا فرمائے گا تو یہ سراسر تمہارا ہی فائدہ ہے۔

حدیث اور قرآن سے ایک اور نکتے کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ اللہ پاک کی نعمتوں کا اظہار کرتے رہو اور اس کا ذکر کرتے رہو یہ بھی شکر ہے۔ ذکر اگر زبان سے ہوگا تو یہ "زبان قال" سے اظہار کہلائے گا اور ذکر اگر افعال و اعمال کے ذریعے ہوگا تو یہ "زبان حال" سے اظہار ہوگا۔ اس اظہار کے لیے حدیث کا مضمون ہے: ان اللہ اذا انعم علیٰ عبدٍ بنعمتہ احب ان یری اثر بنعمتہ علیٰ عبدٍ "اللہ پاک جب بندے کو کوئی نعمت عطا فرماتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس بندے سے اس کے آثار و نشانات بھی ظاہر ہوں۔" اسی مضمون کو نہایت جامع اور مختصر لفظوں میں قرآن نے بھی ذکر فرمایا ہے وَ امّا بنعمتِ ربك فحدث۔۔ اور اپنے رب کی نعمتوں کا ذکر کرتے رہو حدیث مذکور میں نعمتوں کو ظاہر کرنے کا اشارہ ہے تو آیت میں اس کے ذکر کا حکم ہے مطلب دونوں کا ایک ہے کیونکہ فرمایا گیا ہے: کتمان النعمۃ کفر۔ نعمت کو چھپانا کفر (ناشکری) ہے۔ ایک مرفوع روایت میں تو صاف صاف تحدیث نعمت کو شکر کہا گیا ہے: والتحدیث بنعمت اللہ شکر و ترکہ کفر یعنی نعمت کا ذکر کرنا شکر ہے اور ذکر چھوڑ دینا کفر ہے۔

آیئے غور کریں قرآن و حدیث کا شکر کے بارے میں یہ حکم جو "تحدیث نعمت اور اظہار نعمت" کی صورت میں دیا گیا ہے، انسانی سماج اور معاشرے کے لیے اپنے اندر کتنی برکتیں رکھتا ہے ظاہر ہے انسان کے اعضاء و جوارح ہوں یا عقل و ذہن کی صلاحیتیں سب کی سب اللہ کی نعمتیں ہیں اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ ان کا صحیح اور مناسب استعمال ہی شکر ہے، پھر یہی صحیح استعمال تحدیث نعمت یا اظہار نعمت کو مستلزم بھی ہے۔ اس طرح زبان، اعضاء اور قلب کے استعمال اور ان کے مناسب و برمحل اعمال و افعال کی جو تفصیل پیچھے گذر چکی ہے اس سے یقیناً انسانی سوسائٹی اور معاشرے میں امن و سلامتی کی فضا عام ہو جائے گی، کس طرح۔

جواب کے لیے آیئے ایک بار پھر اس گذشتہ تفصیل کا اعادہ کرلیں۔

زبان۔ لوگوں کو بھلی باتیں بتاتے میں، شیریں کلامی میں ذکر الٰہی وعظ و نصائح، نرم گفتاری، راست گوئی اللہ اور اس کے رسول کی تعریف و توصیف میں، انسانی خوبیوں اور اچھائیوں کے اعتراف میں چھوٹوں کے لیے کلماتِ محبت اور بزرگوں کے لیے مدح و ستائش میں مصروف ہے

اعضاء وجوارح ۔ خدمت خلق میں، ضعیف و ناتواں و کمزور و مظلوم غریب و بیمار کی مدد میں، ظالم سے انتقام لینے اور اس کے ظلم سے بچانے میں، دیانت داری کے ساتھ اللہ اور انسان کے حقوق کی ادائیگی میں، انسانی منافع کے حصول اور مضرتوں کے دفع کرنے میں مشغول ہو۔

قلب ۔ اللہ و رسول پر اس کے بتائے ہوئے جملہ امور پر ایمان کامل میں خشوع و خضوع اور انابت الی اللہ میں، حسد، غیبت، جھوٹ، چغلی، کینہ، دھوکہ دہی جیسے فاسد خیالات سے خود کو پاک رکھنے میں، خدا کے ذکر میں، معرفت خالق کے لیے مخلوقات میں غور و فکر کرنے میں، حوادثات میں عبرت پذیری کے لیے، تدبر و تفکر میں مستعد رہے تو کیا عجب ہے کہ ایک ایسا پاکیزہ، پُر امن سماج جنم لے سکے جہاں انسان انسان سے محبت کرتا ہو، انسانیت کا احترام ہو اور خالق دو جہاں کی اطاعت و بندگی کا حق ادا ہوتا ہو ۔ یہ جبھی ممکن ہے جب اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا صحیح اظہار ہو، زبان سے اس کا ذکر ہو، دل میں عام بھلائی اور خیر اندیشی کے چشمے پھوٹتے ہوں۔ اسی کو کہا گیا ہے: والتحدث بنعمة الله شکر۔ یوں بھی انسانی برادری میں اس مقصد کے لیے کہ آپس میں محبت اور ہمدردی کی فضا بنی رہے، آدمی آدمی کے لیے ایثار و قربانی کے جذبے سے سرشار ہو۔ ایک دوسرے آپس میں شیر و شکر ہو کر رہیں پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ آپس میں دل ملنے کے سامان ہوں، ہر شخص میں دوسرے کے لیے اعتماد اور خلوص پایا جائے، دشمنی، نفرت اور بدگمانی سے قلوب پاک ہوں۔

اسی طرح بلا وجہ شک و شبہات سے دل میں جو فرق پیدا ہو جاتا ہے آدمی آدمی کی طرف سے بدگمان ہو کر نفاق و دشمنی کے محل تعمیر کرتا چلا جاتا ہے اس فتنے کے استحصال کے لیے بنیادی بات قرآن نے بتلادی: ان بعض الظنّ اثم (بدگمانی سے بچو کیونکہ) بعض بدگمانی گناہ ہے۔ اور ولا یغتب بعضکم بعضاً۔ آپس میں غیبت مت کیا کرو۔ بہرحال آپس میں محبت و یگانگی اور حسن معاشرت کی بہت سی صورتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر کوئی بھائی کسی بھائی کے ساتھ بھلائی یا مدد کا برتاؤ کرتا ہے تو وہ اس کی قدر کرے اپنے عمل سے اور زبان سے اسے سراہتا رہے، اس سے محبت، تعلق اور خلوص کا اظہار کرے، احسان فراموشی اور طوطا چشمی نہ کرے کہ اس سے رنج بھی ہوتا ہے آپس میں بھلائی و ہمدردی کا جذبہ بھی مر جاتا ہے اور جب معاشرے میں ہر فرد اسی مرض میں گرفتار

ہوجائے گا تو خود غرضی اور نفرت کی فضا عام ہوجائے گی اس قسم کی برائی سے انسانی برادری کو بچانا اسلام کا اولین مقصد ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے: من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ۔ جو انسانوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ خدا کا بھی شکر ادا نہیں کرسکتا یعنی اگر شقاوت قلبی اور بے حسی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ آدمی اپنے بھائی کے احسان کا بدلہ شکرگذاری سے نہیں دے سکتا، تو وہ اللّٰہ کا شکر کیا ادا کرے گا۔

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی یاد میں (بہ سلسلہ صفحہ ۴۲۴)

اچانک انتقال ہوگیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم حاصل کی ان کا شمار ممتاز طلباء میں ہوتا تھا۔ وہ ذہین محنتی طالب علم اچھے مقرر، اور موثر مضمون نگار تھے۔ جامعہ سے تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ ماضی کے مشہور روزنامہ "خلافت" (بمبئی) کے عملہ ادارت سے منسلک ہوگئے، اس طرح انھوں نے کچھ عرصے تک ایک صحافی کی حیثیت سے ملک و قوم کی مفید خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد وہ اپنی مادر علمی، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد کی حیثیت سے واپس آئے۔ جامعہ آنے سے قبل انھوں نے لکھنؤ میں ادارہ تعلیمات اسلام کی بنیاد ڈالی جہاں کم سے کم وقت میں قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی خاطر ضروری عربی زبان سکھانے کا انھوں نے ایک کامیاب تجربہ کیا۔ وہاں سے وہ استاد کی حیثیت سے جامعہ واپس آئے، اور درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ناظم دینیات کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔

جامعہ کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ خاموشی اور یکسوئی کے ساتھ علم، مذہب اور تصنیف و تالیف کی خدمت میں لگ گئے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی درخواست پر مہتمم معتمد تعلیم کا اعزازی عہدہ اور دارالمصنفین کی درخواست و اصرار پر شریک ناظم اور مبصر علمی کی حیثیت سے تصنیف و تالیف کی ذمہ داریاں قبول کیں اور آخر دم تک خلوص و دیانت کے ساتھ یہ خدمات انجام دیتے رہے۔

مولانا اگرچہ اپنے مسلک کے سلسلے میں خاصے راسخ تھے پھر بھی ان کی شخصیت میں ادعائیت کی رعونت نام کو نہ تھی۔ ان میں حیرت انگیز وسعت خیال تھی۔ وہ فکر کی بلندی، جان کی پرسوزی اور سخن کی دلنوازی کی وجہ سے علمی اور مذہبی حلقوں میں یکساں طور پر مقبول و ممتاز تھے۔ وہ کثرت میں وحدت اور اختلاف میں اتفاق کے پہلو ڈھونڈھ لیا کرتے تھے۔ وہ ہر رنگ میں بہار کے اثبات کا ہنر جانتے تھے، یہ ایک ایسا ہنر ہے جس کے جاننے والے اب کم سے کم ہوتے جارہے ہیں۔

افسوس کہ ایسے ہردل عزیز اور شفیق استاد، مقبول خطیب اور جید عالم و مصنف سے ہم محروم ہوگئے۔ اللّٰہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ مراتب سے نوازے اور متعلقین کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تعارف و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے کا آنا ضروری ہے)

شعلۂ نیم سوز   از:۔ فضا ابن فیضی

سائز $\frac{20\times26}{8}$، حجم ۲۵۷ صفحات، مجلد مع گرد پوش۔ قیمت: ۴۰ روپے۔

سنہ اشاعت ۱۹۷۸ء۔ ملنے کا پتہ:۔ فیضی پبلیکیشنز، مئو ناتھ بھنجن (یوپی)۔ ۲۷۵۱۰۱

فضا ابن فیضی صاحب اردو کے ان شعرا میں ہیں جن کے نام اور کام سے پڑھا لکھا طبقہ ہی نہیں بلکہ عوام بھی بخوبی واقف ہیں۔ وہ ایک مدت سے بڑی خاموشی اور لگن کے ساتھ شعر و سخن کی خدمت میں مصروف ہیں۔ خاموشی سے کام کرتے رہنا اور ستائش و صلہ کی تمنا نہ کرنا اگرچہ جواں مردی و جواں ہمتی کی بات ہے، مگر اس شور و شغب کی دنیا میں جو شاعر یا ادیب خاموشی اور لگن ہی سے کام کرتا رہتا ہے اور دنیا کے شور و شغب میں حصہ نہیں لیتا اس کو اپنی اس روش کی قیمت اس طرح ادا کرنی پڑتی ہے کہ وہ مناسب اور حقیقی اعتراف سے بھی محروم رہتا ہے۔ فضا ابن فیضی کو بھی اپنی خاموشی اور لگن کی یہی قیمت ادا کرنی پڑی ہے، مگر یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ وہ یہ قیمت ادا کرنے کے باوجود اپنے کام میں مستقل مزاجی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔

"شعلۂ نیم سوز" سے پہلے فضا صاحب کی غزلوں اور رباعیوں کا ایک مجموعہ "سفینۂ زرگل" کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔ پتہ نہیں کیوں فضا صاحب نے اپنے اشعار کے مجموعے مرتب کرتے وقت اصناف سخن کا لحاظ رکھا ہے۔ اگر سفینۂ زرگل میں ان کی کچھ نظمیں بھی شامل ہوتیں اور شعلۂ نیم سوز میں غزلوں اور رباعیوں کو بھی جگہ مل جاتی تو ان کی شاعری کے بارے میں مجموعی رائے قائم کرنے میں ایک عام قاری کو بڑی آسانی ہوتی، لیکن اب جب کہ وہ صنف وار اپنا مجموعۂ کلام

مرتب ہی کر چکے ہیں تو تبصرہ نگار بھی مجبور ہے کہ ان کی کسی ایک ہی صنف سخن کا جائزہ لے۔ زیر نظر تبصرہ میں صرف ان کی نظم نگاری کی طرف چند اشارے کئے جا رہے ہیں۔

اردو غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دیجئے یا شاعری کی آبرو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صنف سخن اردو دنیا پر اس قدر حاوی و مستولی ہو گئی ہے کہ دوسری اصناف کی ترقی پر ایک جمود سا آگیا ہے اقبال، جوش، احسان دانش، حفیظ جالندھری اور ان کے بعد کی نسل میں سردار جعفری، اختر الایمان قاضی سلیم وغیرہ نے اردو نظم کو ہر چند آگے بڑھانے کی کوشش کی مگر غزل کی دیوار برابر سد راہ ہوتی رہی اور لوگ لوٹ لوٹ کر غزل ہی کی طرف واپس آتے رہے۔ غزل کی طرف یہ مراجعت اگر ایک طرف خوش کن ہے تو دوسری طرف مایوس کن بھی ہے۔ خوش کن تو یوں کہ ہر مراجعت کے بعد اردو غزل ایک نئے رنگ و آہنگ میں ڈوب کر ابھرتی رہی، اور مایوس کن یوں ہے کہ غزل کے پے درپے تجربات اور ڈوب ڈوب کر ابھرنا دوسری اصناف سخن کی ترقی کو برابر متاثر کرتا رہتا ہے۔ اس صورت حال کے باوجود ہمارے بہت سے شعرا صنف نظم کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور اس کی اہمیت و معنویت آشکار کر رہے ہیں۔ ایسے ہی شعرا میں فضا ابن فیضی صاحب بھی ہیں جو غزل گو ہونے کے باوجود نظم کی اہمیت و معنویت کو خوب سے خوب تر انداز میں اجاگر کر رہے ہیں۔

فضا صاحب عصر حاضر کے ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں، جنھوں نے دل کی دنیا سے نکل کر وسیع و عریض کائنات پر نہ صرف نظر ڈالی ہے بلکہ اس کے اسرار و رموز کو سمجھنے اور سمجھانے کی بھی کوشش کی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس مادی دنیا سے ان کا رشتہ بڑا محکم اور اٹوٹ ہے۔ جہل و ناداری کا مسئلہ ہو یا فرقہ وارانہ فسادات کا، بھوک اور بیکاری کا مسئلہ ہو یا عوام کی ناآسودگی و اضطرار کا، یہ تمام مسائل فضا ابن فیضی کو نہ صرف متاثر کرتے ہیں بلکہ ان کا حل تلاش کرنے پر بھی اکساتے ہیں۔ ان کی منظومات کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے یہ مسائل ان کے دکھی دل کو کس قدر مزید دکھی بنا دیتے ہیں۔ اس احساس درد کے باوجود فضا صاحب کے یہاں قنوطیت، تلخی اور بیزاری راہ نہیں پانے پاتی بلکہ ان کی فکر اور لہجہ دونوں ہی تعمیری رہتے ہیں۔ "خون صد ہزار انجم" کے عنوان سے انھوں نے اپنی جو نظمیں اس مجموعہ میں یکجا کر دی ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے سماج کے کن کن مسائل پر ان کی نظر ہے اور وہ ان مسائل کے بارے میں کیا نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ اس سلسلے

میں ان کی نظمیں صلیبوں کا شہر، از تنگیٔ داماں گلہ دارم اور لہو کا المیہ خاص طور سے قابلِ مطالعہ ہیں ۔

زیر تبصرہ مجموعۂ کلام میں فضا صاحب کا منتخب منظوم کلام جمع ہو گیا ہے جس کے مطالعے سے ان کی شاعری کی ظاہری اور تہ در تہ معنویت کو سمجھنا آسان ہو سکے گا۔ آخر میں ان کی ایک نظم کے دو اشعار پیش خدمت ہیں ۔

میں نے چاہا تھا کہ بازار میں رسوائی کے
آج پاکیزگیٔ لوح و قلم تو نہ بکے
ذہن میں جال تو بنتا رہے گیتوں کا طلسم
فن تو زندہ رہے، شاعر کا قلم تو نہ بکے

ہماری دعا ہے کہ فضا صاحب کے سر سے خواہ جوئے خوں ہی کیوں نہ گزر جائے ان کا قلم کسی بھی طرح اور کسی حال میں بکنے نہ پائے ۔

اس مجموعے کا مطالعہ ادب کے شائقین کے لیے مسرت بخش بھی ہوگا اور بصیرت افروز بھی۔

کتاب کی کتابت، طباعت اور کاغذ صرف معیاری ہی نہیں بلکہ دیدہ زیب بھی ہے۔ ظاہری حسن و خوبی کو بھی مدِ نظر رکھتے ہوئے اس مجموعۂ کلام کی قیمت کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔

(ڈاکٹر) کبیر احمد جائسی

آپ بیتی

مولانا عبدالماجد دریا آبادی

سائز ۱۸×۲۲/۸ حجم ۴۰۲ صفحات، مجلد مع گرد پوش، کتابت و طباعت عمدہ
قیمت: ۲۵ روپے، سنہ اشاعت: ۱۹۷۸ء۔ ناشر: مکتبۂ فردوس۔ مکارم نگر (بروليا) لکھنؤ ۲۲۶۰۰۷

مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم (۱۸۹۲ - ۱۹۷۷) اردو کے صاحب اسلوب اور ممتاز طنز نگار تھے، نیز اردو کے کامیاب صحافت نگار اور قرآن حکیم کے جید مفسر تھے۔ زیر تبصرہ کتاب ان ہی کی آپ بیتی ہے، جو انھوں نے اپنی وفات سے تقریباً ۱۲ سال پہلے مکمل کر لی تھی جس کی تفصیل خود فاضل مصنف کے الفاظ میں ملاحظہ ہو: "تسوید و تحریر کی پہلی بنیاد جولائی ۵۴ء میں پڑی، اس وقت خود گزشت کی ترتیب تاریخی پیش نظر تھی مگر اس طرح تحریر بڑی ہی طویل و ضخیم ہوتی جا رہی تھی،

چند ہی ورق کے تجربے کے بعد کام روک دینا پڑا اور جنوری ۱۹۵۶ء کے اخیر سے نقشہ بدل کر اور طوالت سے بچ کر، قلم برداشتہ از سرِ نو لکھنا شروع کر دیا۔ ... جوں توں مسودۂ اول ۴؍ اگست ۱۹۵۶ء کو ختم ہو گیا، لکھنے کی واقعی مدت کل ۵ مہینے رہی۔ مسودہ کٹ پٹ بہت گیا تھا، میرے بعد کسی کے چلائے نہ چلتا، اس لیے یوم جمعہ ۲۲؍ جون ۱۹۵۶ء (۸؍ ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ) کو اپنے ہاتھ سے دوبارہ لکھنا شروع کیا اور ظاہر ہے کہ یہ صفائی محض نقل نہ رہی، اضافہ، ترمیم، کانٹ چھانٹ اچھی خاصی ہو گئی اور مکمل ستمبر ۱۹۵۹ء میں ہو پائی۔ نظرثانی کا سلسلہ ہر سال دو سال کے بعد وقتاً فوقتاً ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۵ء کی نظرثانی اچھی طرح یاد ہے اور اب تازہ نظرثانی کی نوبت ۱۹۶۷ء میں آ رہی ہے، جب سن کا ۷۴ واں سال ختم ہو کر ۷۵ واں شروع ہونے کو ہے اور یہ سطریں اللہ کا نام لے کر آج جمعرات ۲؍ فروری ۱۹۶۷ء (۲۱؍ شوال ۱۳۸۶ھ) کو ختم ہو رہی ہیں۔" (صفحہ ۱۳) باوجود اس کے کہ آج سے ۱۲ سال پہلے یہ آپ بیتی مکمل ہو گئی تھی، مگر کسی مصلحت کی وجہ سے فاضل سوانح نگار نہیں چاہتے تھے کہ یہ ان کی زندگی میں شائع ہو، اس لیے ان کے انتقال کے بعد، مرحوم کے بھتیجے اور داماد حکیم عبد القوی صاحب دریابادی (مدیر صدق جدید) کی کوششوں اور مکتبۂ فردوس (لکھنؤ) کی عنایت سے، پچھلے سال کے اواخر میں شائع ہوئی ہے۔

قدرت نے مرحوم کو ۸۴ سال کی طویل عمر عطا کی تھی اور علمی زندگی کی مدت بھی کوئی ستر اکہتر سال ہے۔ اس طویل مدت کو مرحوم نے علم و ادب، مذہب و ملت اور اردو صحافت کی خدمت میں صرف کیا۔ موصوف کا خصوصی مضمون فلسفہ تھا، اس لیے آپ کی پہلی کتاب "فلسفہ جذبات" ۱۹۱۴ء کے اوائل میں انجمن ترقی اردو حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ دوسری کتاب انگریزی میں "سائیکالوجی آف لیڈرشپ" کے نام سے ۱۹۱۵ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ تیسری کتاب بھی فلسفے ہی سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا نام "فلسفۂ اجتماع" ہے اور پہلی کتاب کی طرح یہ بھی انجمن ترقی اردو حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی کی ایک کتاب کا ترجمہ "تاریخ اخلاق یورپ" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوا۔ ان کتابوں کی اشاعت سے موصوف کی اتنی شہرت ہوئی کہ ۱۹۱۷ء میں حیدرآباد کے مشہور دارالترجمہ میں تقرر ہو گیا، مگر گیارہ مہینے تک کام کرنے کے بعد لکھنؤ واپس آ گئے۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں مولانا محمد علی مرحوم نے اپنے مشہور روزنامے "ہمدرد" کو دوبارہ جاری

کیا تو مولانا کی خدمات حاصل کیں۔ بنیادی طور پر ان کا قیام دریاآبادی ہی تھا، یہیں سے لکھ لکھ کر بھیجتے رہے اور خود مولانا کے الفاظ ہیں: "خدا معلوم کتنا اس کے لیے لکھ ڈالا، شذرے بھی، تبصرے بھی، مقالے بھی، مراسلے بھی، کتنے نام سے کتنے گمنام۔" نیز جب بھی ضرورت پڑتی ہر دوسرے تیسرے مہینے دہلی کا چکر لگا ڈالتے۔ ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ سے "سچ" کے نام سے خود اپنا ہفتہ وار اخبار نکالا۔ بعض قانونی وجوہ کی بنا پر مئی ۱۹۳۵ء میں اس کا نام "صدق" کر دیا گیا اور دسمبر ۱۹۵۰ء میں "صدق جدید" اور اب تک اسی نام سے نکل رہا ہے۔ مولانا دریاآبادی کی وفات کے بعد سے حکیم عبدالقوی صاحب دریاآبادی اس کے اڈیٹر ہیں جو دسمبر ۱۹۵۰ء سے مددگار ایڈیٹر اور منیجر کی حیثیت سے کام کرتے چلے آرہے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریاآبادی کی زندگی بڑی ہی ہنگامہ خیز اور ایک حلقے میں ان کی شخصیت خاصی متنازع فیہ رہی ہے۔ ندوہ کے طالب علم کی حیثیت سے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک راقم الحروف کا لکھنؤ میں قیام رہا ہے۔ اس زمانے میں مخالفین سے مولانا کی جو قلمی جنگ رہی ہے خاص طور سے مدیر نگار سے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ مولانا بڑے ہی کامیاب طنز نگار تھے، ان کے قلم کی زد میں جو کوئی بھی آجاتا تو وہ مدتوں یاد رکھتا۔ مرحوم کا اخبار دو وجہوں سے بہت مقبول تھا، ایک اس کے مستقل کالم "سچی باتوں" کی وجہ سے، دوسرے مغرب اور جدید تہذیب کے خلاف ان کے شذرات (اداراتی نوٹ) کی وجہ سے۔ ان دونوں خصوصیات کی وجہ سے مولانا کا یہ اخبار اپنی نوعیت اور انفرادیت کے اعتبار سے اپنے دور کا ایک ہی تنہا اخبار تھا۔

مولانا کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ طبیعت کے لحاظ سے انتہاپسند تھے۔ وہ ایک مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور تربیت دینی ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے بچپن میں بالکل ملا تھے بقول خود: "چچا صاحب نے وضع قطع بالکل بچپن میں مولویانہ کرادی تھی، جسم پر چھوٹی سی عبا، ہاتھ میں بڑے دانوں کی خوش رنگ تسبیح، سر پر صندلی عمامہ، ... ساتویں آٹھویں درجے میں جب پہنچا، ۱۲-۱۳ سال کی عمر میں تو گویا پورا ملا تھا" (صفحہ ۲۲۳)، مگر جب گھر کے تنگ اور محدود ماحول سے نکل کر لکھنؤ کی وسیع دنیا اور کالج کی آزاد فضا میں پہنچے تو کایا پلٹ ہوگئی اور بقول مولانائے مرحوم: "اسلام و ایمان کی دولت عظیم بات کہتے، ارتداد کے خس و خاشاک میں تبدیل ہوگئی" (صفحہ ۲۳)

"الحاد و ارتداد کا یہ دور کہنا چاہیے کہ دس سال تک رہا۔ ۱۹۰۹ء میں یا اس سے کچھ قبل ہی شروع ہوا تھا اور ۱۹۱۸ء کی آخری سہ ماہی تک قائم رہا" (صفحہ ۲۴۵) مگر اب جو پلٹا کھایا تو دوسری انتہا پر تھے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ان میں ضد بہت زیادہ تھی، جس بات پر اڑ جاتے، چاہے کوئی کچھ کہے، وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہٹتے، جس کسی کے پیچھے پڑ جاتے اس کو آخر تک پہنچا کر دم لیتے، مگر زیر تبصرہ آپ بیتی کو پڑھ کر مجھے یہ حیرت ہوئی کہ وہ اس میں بالکل ہی نئی شکل اور مختلف انداز سے سامنے آئے ہیں۔ اس کتاب کے تین ابواب کے عنوانات ہیں: (۱) چند مخصوص عادات و معمولات (۲) موثر، محسن، عزیز شخصیتیں (۳) چند مظلوم و مرحوم شخصیتیں۔ ان میں مرحوم نے بڑی فراخدلی کے ساتھ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا کھلے دل سے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ جن جن لوگوں کے خلاف طنز و تعریض اور تضحیک و توہین کے تیر چلائے تھے یا جن جن لوگوں کی کسی قسم کی حق تلفی یا ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کی تھی ان سے بہت ہی خلوص دل کے ساتھ معافی مانگی ہے۔

اردو میں جس قدر آپ بیتیاں شائع ہوئی ہیں ان میں سے شاید ہی کوئی ایسی ہو جو میری نظر سے نہ گذری ہو۔ گاندھی جی کے علاوہ شاید ہی کسی نے، جہاں تک مجھے معلوم ہے، اس قدر صفائی اور فراخ دلی کے ساتھ اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کا اعتراف کیا ہے جتنی مولانا دریاآبادی مرحوم نے اپنی اس آپ بیتی میں کیا ہے۔ کمزوریاں کم و بیش ہر انسان میں ہوتی ہیں، اگر کوئی شخص پوری ایمانداری اور صفائی کے ساتھ اپنی خامیوں کا، کسی وقت بھی جائزہ لے سکے تو بذات خود یہ بہت ہی اہم اور قابل تعریف بات ہے۔ (عبداللطیف اعظمی)

اقبال ۔ جامعہ کے مصنفین کی نظر میں

مرتبہ: گوپی چند نارنگ

سائز $\frac{18 \times 22}{8}$، حجم ۲۹۲ صفحات، مجلد، قیمت: ساڑھے پچیس روپے۔

تاریخ اشاعت: فروری ۱۹۷۹ء۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

برصغیر ہند و پاک اور بعض دوسرے ممالک میں ۷۸-۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کا جشن صد سالہ

منایا گیا تو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے بھی، جس کا علامہ سے گہرا اور خصوصی تعلق تھا، اپنے حوصلے اور استطاعت کے مطابق اس میں شرکت کی۔ اس وقت کے شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب کے مشورے پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ایک آل انڈیا سیمنار منعقد کیا جس کے مقالوں کا مجموعہ بہت جلد چھپنے والا ہے۔ اسی زمانے میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا تھا کہ جامعہ اور کتاب نما کے خصوصی شمارے شائع کیے جائیں۔ جامعہ کا اقبال نمبر اسی زمانے میں شائع ہو گیا تھا، مگر کتاب نما کے اقبال نمبر میں بوجوہ تاخیر ہو گئی اور وہ امسال شائع ہوا ہے۔

علامہ اقبال کے انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء ہی میں طلبائے جامعہ کے قلمی ترجمان جوہر کا ایک خصوصی نمبر شائع ہوا تھا جس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا، مگر ایک طویل عرصے سے اب وہ کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ کتاب نما کی ترتیب کے وقت فیصلہ کیا گیا، کہ اس کے اہم مضامین اس خصوصی شمارے میں شامل کر لیے جائیں اور جامعہ کے موجودہ ادیبوں اور مصنفوں کے مضامین بھی شریک کیے جائیں۔ چنانچہ زیر تبصرہ خصوصی شمارے کے جو کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا ہے اور وہی اس وقت پیش نظر ہے، دو حصے ہیں: پہلے حصے میں "جوہر اقبال" کے اہم مضامین شامل ہیں، جن میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا پیغام، ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم کا مضمون: عقل و عشق اقبال کی شاعری میں، پروفیسر محمد مجیب صاحب کا سوانحی خاکہ ڈاکٹر اقبال، خواجہ غلام السیدین مرحوم کا مقام عقل و عشق، مولانا محمد اسلم جیراجپوری کا تبصرہ مثنوی اسرار خودی اور سید نذیر نیازی کا علامہ اقبال کی آخری علالت خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور دوسرے حصے میں جامعہ کے موجودہ ادیبوں اور مصنفین کے مضامین ہیں، جن میں پروفیسر مسعود حسین صاحب کا مضمون اقبال کی دو طویل نظموں کی باز آفرینی، ضیاء الحسن فاروقی صاحب کا اقبال اور تصوف، انور صدیقی صاحب کا اقبال کی عصری معنویت، ڈاکٹر عنوان چشتی صاحب کا اقبال کی علامتی تخئیل اور پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کا اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام اہم اور قابل توجہ ہیں۔ شروع میں فاضل مرتب نارنگ صاحب کا مقدمہ ہے اس طرح یہ مجموعہ جامعہ کے قدیم اور جدید مصنفین کے رشحات قلم کا بہترین نمائندہ ہے۔ ابتدا میں مہاتما گاندھی کے اس خط کا عکس بھی شائع کیا گیا ہے جو جوہر کے اقبال نمبر کے لیے علامہ مرحوم

کے بارے میں لکھا گیا تھا۔

اقبال صدی کے دوران اور اس کے بعد علامہ اقبال کے بارے میں جو کتابیں اور خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں، ان میں زیر تبصرہ کتاب / خصوصی شمارہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اور بلاشبہ اقبالیات میں ایک مفید اضافہ ہے۔ اس کامیاب اور خوبصورت اشاعت پر ہم فاضل مرتب نارنگ صاحب اور ناشر مکتبہ جامعہ کو مبارکباد دیتے ہیں۔ (عبداللطیف اعظمی)

فن کار سے فن تک

از:۔ ابوذر عثمانی

سائز $\frac{22 \times 18}{8}$، حجم ۲۳۹ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳۰ روپے
سنہ اشاعت: ۱۹۷۸ء۔ ناشر: ارشد عثمانی۔ کریم منزل۔ بھٹی کڈوا۔ رانچی (بہار)

جناب ابوذر عثمانی کے ادبی و تنقیدی مضامین کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔ فاضل مضمون نگار رانچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر ہیں اور ایک عرصے سے مختلف رسالوں میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ زیر تبصرہ مجموعے میں پیش لفظ کے علاوہ ۱۴ مضامین ہیں جن کا تعلق اردو کے مختلف موضوعات اور مباحث سے ہے، ان کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

(۱) غالب کی ناقدانہ بصیرت (۲) اکبر اور مسئلہ زبان (۳) اختر اورینوی کا اسلوب۔ (۴) پرویز شاہدی کا طرز سخن (۵) انشائیہ کی ہیئت کے تعین کا مسئلہ (۶) تدریس ادب کے جدید تقاضے اور اردو نصاب (۷) ادبی تنقید کی تدریس کا مسئلہ (۸) بہار میں اردو تنقید کے ابتدائی کارنامے (۹) انجم مان پوری (۱۰) ایک تعارف (۱۰) حدیث اقبال (۱۱) رام چرت مانس (۱۲) کچھ مضمون کے بارے میں (۱۳) جدید شاعری میں اظہار و بیان کا پہلو (۱۴) عملی تنقید کیا ہے؟

ان مضامین کے بارے میں فاضل مصنف نے پیش لفظ میں لکھا ہے: "ان میں بعض مضامین بعض ادبی حلقوں میں پسند بھی کیے گئے ہیں۔ ان مضامین کو اس مجموعے میں شامل کرتے ہوئے ان پر ضروری حد تک نظر ثانی کی گئی ہے اور ان میں جابجا حواشی کا اضافہ کرکے انھیں نسبتاً جامع اور اپ ٹو ڈیٹ بنانے کی کوشش کی گئی۔" آگے چل کر مزید لکھا ہے کہ: "اس مجموعے

کو ترتیب دیتے ہوئے یہ خیال پیش نظر رہا ہے کہ اس کے مطالعے سے تازگی اور تنوع کا احساس ہو سکے اور اس سے آج کے ادبی مذاق اور مزاج کی بھی نمائندگی ہو سکے۔ میرے نزدیک اس وقت یہی ان مضامین کی اشاعت کا جواز بھی ہے۔"

راقم الحروف کو بعض مضامین پسند آئے، مثلاً "انشائیہ کی ہیئت کے تعین کا مسئلہ" "تدریس ادب کے جدید تقاضے اور اردو نصاب"۔ "ادبی تنقید کی تدریس کا مسئلہ" مجھے فاضل مضمون نگار کی اس رائے سے بالکل اتفاق ہے کہ: "انشائیہ کا موضوع خاصا الجھا ہوا ہے اور اس کی فنی ہیئت اور حدود کا تعین ہنوز ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔" فاضل مضمون نگار نے اس الجھاؤ کو دور کرنے اور فنی ہیئت اور حدود کے تعین کی کوشش کی ہے اور انھیں بڑی حد تک اپنی کوشش میں کامیابی حاصل ہوئی ہے، مگر یہ مسئلہ اب بھی مزید وضاحت کا محتاج ہے، ضرورت ہے کہ اس پر صاحب نظر ادیبوں کا سیمنار کیا جائے اور بعض گوشوں کو، جو اب تک پوری طرح واضح نہیں ہیں، مبسوط مقالوں اور سیر حاصل بحث کے ذریعہ واضح کر دیا جائے۔

ادب کی تدریس ہو یا کسی اور مضمون کی تعلیم، ظاہر ہے اس کی کامیابی و ناکامی میں نصاب تعلیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور جس نے اردو ادب کے موجودہ نصاب تعلیم پر سنجیدگی سے غور کیا ہے، وہ یقیناً تسلیم کرے گا کہ موجودہ نصاب تعلیم میں بہت سی خامیاں ہیں، مگر میرے خیال میں عثمانی صاحب کی اس رائے میں کسی حد تک مبالغہ ہے کہ: "اس سے نہ تو طلبہ کی مناسب ذہنی، تعلیمی، علمی و ادبی تربیت ہو پاتی ہے، نہ ہی عملی زندگی میں ان کے لیے ترقی کی راہیں کھلتی ہیں اردو تعلیم سے طلبہ میں جو یک گونہ بے اطمینانی اور بددلی پائی جاتی ہے، اس کا ایک بڑا سبب یہی ہے۔ اردو تعلیم و تدریس کے معیار پر بھی اس صورت حال کا بڑا ناخوشگوار اور غلط اثر مرتب ہو رہا ہے، جو میری نظر میں اس مسئلے کا ایک بے حد المناک اور افسوسناک پہلو ہے۔" (صفحہ ۱۱۵)

میرا ذاتی خیال ہے کہ فاضل مضمون نگار نے جن خرابیوں کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کا بڑا سبب ملک اور یونیورسٹیوں اور کالجوں کا ماحول ہے۔ اگر نصاب تعلیم کی تمام خامیاں دور کر دی جائیں اور یہی ماحول اور فضا قائم رہے، اساتذہ کو نہ پڑھانے سے دلچسپی ہو اور نہ طلبا کو پڑھنے سے تو نتائج وہی نکلیں گے جن کا اس مضمون میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ "ادبی تنقید کی تدریس کا

مسئلہ" میں موصوف نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "ایک معلم کا اصل منصب یہ ہے کہ وہ طلبہ کے اندر علم و ادب سے سچا شغف پیدا کرے اور انھیں تعلیمی مقاصد کا واضح شعور عطا کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اپنے فرائض سے اسی وقت کامیابی سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے جب وہ اعلیٰ لیاقت کا مالک اور گہرے مطالعے اور ریاض کا خوگر ہو" وغیرہ وغیرہ (صفحہ ۱۳۵)

مجھے سب سے زیادہ کمزور وہ مضمون معلوم ہوا جس کا عنوان ہے: "کچھ مضمون کے بارے میں" بحث کچھ الجھی ہوئی ہے اور خیالات صاف اور واضح نہیں ہیں۔ مختلف اصنافِ ادب کے مضمون نگاروں کے نام پیش کرتے وقت پوری طرح غور و فکر سے کام نہیں لیا گیا ہے، مثلاً علمی و تعلیمی موضوعات پر لکھنے والوں میں صرف ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور خواجہ غلام السیدین صاحب کا ذکر کیا گیا ہے (صفحہ ۳۲۰) ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور پروفیسر محمد مجیب کو معلوم نہیں کیوں نظرانداز کر دیا گیا، اسی طرح رفقائے دارالمصنفین (اعظم گڑھ) میں سے مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا بھی ذکر رہ گیا ہے، نئی نسل میں بہت سے اہم نام رہ گئے ہیں مثلاً علی جواد زیدی، عتیق صدیقی، خلیق انجم، ڈاکٹر تنویر احمد علوی وغیرہ جامعہ ملیہ کی نئی نسل کے لکھنے والوں کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مختلف مضمون نگاروں کی کوئی مکمل فہرست پیش کرنا دشوار اور اختلافی مسئلہ ہے، مگر جب کسی بحث یا مضمون میں کچھ نام پیش کیے جائیں اور اسی معیار اور درجے کے کچھ نام رہ جائیں تو اعتراض یا اختلاف پیدا ہونا لازمی ہے۔

مضمون کی بہت سی قسمیں ہیں، زیرِ بحث مضمون میں زیادہ تر مزاحیہ و طنزیہ اور تنقیدی و تحقیقی مضامین کی طرف توجہ کی گئی ہے، علمی اور صحافتی مضامین اور تبصرہ نگاری کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے۔

پیش لفظ میں اس پر معذرت کی گئی ہے کہ: "اس مجموعے میں اردو املا کی جدید اور اصلاح یافتہ شکل کی پابندی نہ کی جا سکی۔" میرا اپنا خیال ہے کہ اردو املا کی کوئی جدید اور اصلاح یافتہ شکل سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ ایک مخصوص حلقے کی طرف سے کچھ تجاویز ضرور پیش کی گئی تھیں اور اردو کے ایک سرکاری ادارے نے ان کی سفارش کی تھی، مگر یہ تجاویز، عام طور پر، قبول نہیں کی گئیں، حتیٰ کہ اس کمیٹی کے کچھ اراکین نے جس نے ان تجاویز کی سفارش کی تھی، کمیٹی کے

جلسے میں کہدیا تھا کہ ہم تو اسی طرح لکھتے رہیں گے جس طرح لکھتے آئے ہیں۔ اس لیے فاضل مصنف کو کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اگر وہ ان نامقبول تجاویز پر عمل کرتے تو شاید مختلف مشکلات میں گرفتار ہو جاتے۔

ان چند خامیوں سے قطع نظر جن کی طرف مختصراً اشارے کیے گئے ہیں، بحیثیت مجموعی زیرِ تبصرہ کتاب مفید اور قابلِ مطالعہ ہے اور امید ہے کہ ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔ (عبداللطیف اعظمی)

نظیر نامہ   مرتبہ: شمس الحق عثمانی

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۵۱۲ صفحات۔ قیمت: ڈی لکس ایڈیشن مجلد ۶۰ روپے۔ طلبہ ایڈیشن ۴۰ روپے
ملنے کا پتہ: صبوحی پبلی کیشنز۔ ۱۱۸۶۔ بلی ماران۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

زیرِ نظر کتاب میں مشہور ادیبوں اور نقادوں کے مضامین شامل ہیں، اس کے چار حصے ہیں، پہلے حصے (صفحات: ۲۵ تا ۱۸۴) میں "نگار (آگرہ) کے نظیر نمبر کے منتخب مضامین شامل ہیں۔ جو جنوری ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا، دوسرے حصے (صفحہ ۱۸۵ تا ۳۲۹) میں ان اہم مضامین کا انتخاب شامل ہے جو نگار کے خصوصی نمبر کے بعد لکھے گئے ہیں، تیسرے حصے (صفحات ۳۳۱ تا ۴۳۰) میں تازہ مضامین شامل ہیں جو فاضل مرتب کی درخواست پر اس مجموعے کے لیے لکھے گئے ہیں، چوتھے حصے (صفحات ۴۳۲ تا ۵۱۲) میں منتخب نظمیں شامل ہیں، چونکہ یہ مجموعہ بنیادی طور پر طالب علموں کے لیے شائع کیا گیا ہے، اس لیے بقول فاضل مرتب: "نظموں کا انتخاب کرتے وقت خیال رکھا گیا ہے کہ اس میں وہ تمام نظمیں آجائیں جو بی اے۔ بی اے آنرز اور ایم اے کے نصابات میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں وہ نظمیں بھی منتخب کی گئی ہیں جو کسی نصاب میں تو شامل نہیں لیکن مطالعۂ نظیر کے لیے ناگزیر ہیں۔" (صفحہ ۹)

جن بنیادی مقاصد کے تحت یہ مجموعہ شائع کیا گیا ہے، ان میں سے ایک مقصد، فاضل مرتب کے الفاظ میں، یہ ہے کہ: "نظیر جیسے ہمہ گیر اور ہمہ جہت شاعر کے سلسلے میں ان مختلف النظر مضامین کو یکجا کیا جائے، جن کے ذریعے نظیر کی شعری شخصیت اور فن کے لامحدود و بیکراں پہلوؤں کو شناخت کیا جا سکے۔" اس نقطۂ نظر سے یہ مجموعہ بہت کامیاب اور بھرپور ہے، صرف

طالب علموں ہی کے لیے نہیں، عام قارئین کے لیے بھی اور نظیر پر کام کرنے والوں کے لیے بھی۔ جو شخص نظیر کی شاعری، فن شاعری اور اس کے شعری موضوعات کو سمجھنا چاہے اس کے لیے یہ مجموعہ بہت ہی مفید ہے، البتہ حالاتِ زندگی کے لحاظ سے یہ مجموعہ بہت ہی تشنہ ہے۔ "نظیر کے مختصر سوانح" کے عنوان سے ۱۶ صفحے کا صرف ایک مضمون شامل ہے جو قطعاً ناکافی ہے۔

نظیر کی تاریخ وفات تقریباً طے ہے جو ۲۶ صفر ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء ہے۔ البتہ سنہ پیدائش اور جائے پیدائش میں اختلاف ہے۔ اردو ادب کے عام قارئین، بالخصوص طالب علموں کی واقفیت کے لیے ضروری تھا کہ محض اسی مسئلے پر کوئی تحقیقی مضمون لکھ کر یا لکھوا کر اس کتاب میں شامل کیا جاتا۔ زیر تبصرہ کتاب سے اگر کوئی شخص سنہ پیدائش سمجھنا چاہے تو وہ بڑی الجھن میں پڑ جائے گا، کیونکہ اس کتاب کے مختلف مضامین میں مختلف سنہ درج ہیں، مثلاً: صفحہ ۲۶ پر سنہ پیدائش ۱۱۴۸ھ درج ہے جس کا سنہ عیسوی ۱۷۳۵ء ہے، صفحہ ۶۳ پر نام کے بعد قوسین میں (۱۷۳۰ - ۱۸۳۰) لکھا ہے، اس کے مطابق ہجری ۱۱۴۳ھ ہوا، صفحہ ۱۷۱ پر اختر اورینوی مرحوم کے مضمون میں لکھا ہے کہ: "شیخ ولی محمد نظیر اکبرآبادی میر تقی میر کا ہم عصر تھا، اس نے ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۲۴ء میں انتقال کیا۔ یہاں سنہ عیسوی غلط ہے، ۱۸۳۰ء ہونا چاہیے تھا۔ صفحہ ۲۱۶ پر ہجری سنہ وفات ۱۲۶۴ھ چھپا ہے، غالباً کتابت کی غلطی ہے، صحیح ۱۲۴۶ھ ہے۔ اسی طرح عمر میں بھی اختلاف ہے۔ صفحہ ۳۹ پر ۹۸ سال عمر درج ہے، نیاز فتحپوری مرحوم نے لکھا ہے کہ: تقریباً سو سال زندہ رہے۔" (صفحہ ۹۱) پروفیسر احتشام حسین مرحوم نے لکھا ہے کہ: "نظیر کی صحیح تاریخ پیدائش کا پتہ نہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ ان کا انتقال ۱۸۳۰ء میں ہوا۔ عمر سے متعلق تذکرہ نویسوں اور تاریخ ادب لکھنے والوں کا خیال ہے اسی پچاسی سال سے کم نہیں جئے، اس لیے اگر ہم ان کی تاریخ پیدائش ۱۷۴۰ء اور ۱۷۵۰ء کے درمیان مان لیں تو ہمارا کام چل جاتا ہے۔" (صفحہ ۱۳۱-۱۳۲)

مختلف مضامین کے مجموعوں میں یا بالخصوص جن میں بہت پرانے مضامین شامل ہوں۔ حاشیہ نگاری بہت ضروری ہوتی ہے۔ جا بجا زیر تبصرہ کتاب میں اس کی کمی محسوس ہوئی مثلاً صفحہ ۴۰ پر ہے: "علامہ سیماب اکبرآبادی مقبرہ تعمیر کرانے کی فکر میں ہیں۔" یہاں پر حاشیہ کی ضرورت تھی کہ

آیا وہ کامیاب ہوئے یا نہیں؟ اس سے پہلے نظیر کی قبر کے بارے میں لکھا ہے کہ: "آج کل شکستہ حال میں ہے"۔ ۳۸۔۳۹ سال کے بعد اس مجموعے میں کوئی شخص اس جملے کو پڑھے گا تو قدرتی طور پر اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوگا کہ اب اس کی کیا حالت ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب حاشیہ ہی سے مل سکتا تھا۔ اسی صفحہ پر یہ بھی درج ہے کہ: "اس خاندان میں سے مرزا داصف علی صاحب و مرزا سخاوت علی صاحب موجود ہیں۔ فاضل مرتب اگر اس کتاب کے قارئین کو یہ اطلاع دینے کی زحمت کرتے کہ اس کتاب کی ترتیب یا اشاعت کے وقت یہ دونوں حضرات "موجود" تھے یا نہیں تو یہ ایک مفید خدمت ہوتی۔

تحقیقی اور تنقیدی مضامین یا کتابوں میں "کذا" کا استعمال نہ جانے کس نے شروع کیا ہے، بہرصورت جس نے بھی شروع کیا ہو، میرے خیال میں اس نے تحقیق کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ "کذا" لکھنے کے بجائے حاشیے میں صحیح بات لکھ دینی چاہیے۔ اور اگر صحیح بات معلوم نہ ہو سکے تو صفائی کے ساتھ اس کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ اس کتاب کے صفحہ ۶۵ پر ایسے ہی دو "کذا" نظر آئے، ملاحظہ ہو: "زمانے کے لحاظ سے وہ [نظیر] سودا (۱۷۱۳-۱۷۸۱) میر [۱۷۹۳-۱۸۱۰) جرأت (۵-۱۸۱۰) [کذا] انشا (۵-۱۸۱۷) [کذا] اور مصحفی (۱۷۵۰-۱۸۲۴) کا معاصر تھا"۔ اس کتاب میں جرأت اور انشا کے سنہ پیدائش کی جگہ ۵ (پانچ) چھپا ہوا ہے، میرا قیاس ہے کہ مضمون نگار (محمود اکبرآبادی) کو ان دونوں شاعروں کا سنہ پیدائش معلوم نہیں ہو سکا تو اس کی جگہ صفر (۰) لکھ دیا ہوگا جو کتابت میں یا نقل کرتے وقت صفر (۰) کے بجائے پانچ (۵) ہو گیا۔ بہر نوع فاضل مرتب کی جو بھی توجیہہ ہو، کذا کے بجائے وہی لکھنا چاہیے

ان معمولی خامیوں سے قطع نظر اس میں شبہ نہیں کہ مضامین کا انتخاب اچھا اور جامع ہے اور بحیثیت مجموعی نظیر اکبرآبادی کے مطالعے اور ان کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ امید ہے کہ ادبی اور تحقیقی حلقوں میں مقبول ہوگی۔ (عبداللطیف اعظمی)

کوائف جامعہ

مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کی یاد میں جلسہ

۳۰ رمضان المبارک مطابق ۲۴ اگست کو جمعۃ الوداع کے دن مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی کی شدید علالت کی اطلاع ملی۔ مولانا چند روز پیشتر، ۲۰ رمضان مطابق ۲۲ اگست کی سہ پہر میں دارالمصنفین اعظم گڈھ سے اپنے وطن تھولینڈی (ضلع رائے بریلی) تشریف لائے تھے۔ موصوف کی طبیعت پہلے ہی سے کچھ خراب تھی، روزوں کی وجہ سے کمزوری بڑھ گئی تھی اور طویل سفر کی بنا پر شدید تکان اور اضمحلال محسوس کر رہے تھے۔ حسب معمول ۳۰ رمضان مطابق ۲۴ اگست کو سحری کے لیے اٹھے تو فالج کا سخت حملہ ہوا اور چند گھنٹوں کی کشمکش موت و حیات کے بعد تقریباً ۲ بجے دن کو اپنے مولا سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دوسرے دن بعد نماز عیدالفطر سپرد خاک کئے گئے۔

جامعہ میں اُس زمانے میں عید کی چھٹیاں تھیں۔ پیر کے دن، ۲۷ اگست کو جامعہ کھلی تو مرحوم کے غم میں چھٹی کا اعلان کر دیا گیا۔ اگلے جمعہ مورخہ ۳۱ اگست کو بعد نماز جمعہ جامعہ کی مسجد میں قرآن خوانی ہوئی اور ۲ ستمبر کو شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی کی صدارت میں جامعہ کے اساتذہ، کارکنوں اور طالب علموں کا ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں شیخ الجامعہ صاحب کے علاوہ مرحوم کے ساتھیوں اور شاگردوں نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ شیخ الجامعہ جناب قدوائی صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ مرحوم کے میرے خاندان کے متعدد حضرات سے تعلقات تھے، مگر میری زندگی کچھ ایسی گذری کہ ان کی صحبت سے محروم رہا، مگر مجھے اس کا فخر حاصل ہے کہ میرے زمانے میں وہ وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے یہاں آئے اور ان سے

ایک دو مرتبہ ملنے کا موقع ملا۔ خیال تھا کہ ان سے تفصیلی ملاقات ہوگی، مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ کالج کے پرنسپل اور ڈین جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے اپنی مختصر تقریر میں مرحوم کی سیرت و شخصیت کے متعدد گوشوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرمایا کہ مرحوم اپنی طالب علمی کے زمانے ہی میں ایک پرجوش مقرر اور اچھے مضمون نگار تھے۔ ایک استاد کی حیثیت سے وہ اپنے طالب علموں اور ساتھیوں میں بہت ہر دلعزیز تھے، ان کی زندگی بہت ہی سادہ مگر بڑی پروقار تھی، وہ خود نیک تھے اور دوسروں کو نیکی کی تلقین کرتے، وہ جس بات کو صحیح سمجھتے تھے، اس کو ضرور کہتے، مگر اس انداز سے کہ لوگوں کو برا معلوم نہ ہو۔ ان کی تحریروں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ صحت کا بڑا خیال رکھتے تھے، ان کا اسلوب سادہ مگر دلکش تھا۔ مولانا عبدالسلام صاحب طالب علم کی حیثیت سے جامعہ تشریف لائے تھے تو جناب سعید انصاری صاحب اس وقت استاد تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ اس وقت جامعہ ملیہ نئی نئی علی گڈھ سے منتقل ہو کر دہلی میں آئی ہوئی تھی۔ مولانا کو یہاں کی فضا بہت سازگار نظر آئی، ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب نئے نئے یورپ سے تشریف لائے تھے اور اپنے ساتھ مغربی افکار اور تعلیم کے بہترین نمونے ساتھ لائے تھے۔ مولانا کو یہ سب چیزیں دعوت فکر و عمل دے رہی تھیں اور ان چیزوں نے مولانا پر اپنا بھرپور اثر ڈالا۔ مولانا اسلم جیراجپوری اور مولانا سورتی کے علم و فضل، کیلاٹ صاحب کی تربیت جسمانی اور یہاں کی اقامتی زندگی سے بھی بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ سعید انصاری صاحب دار المصنفین کی مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔ مرحوم نے دار المصنفین میں جو خدمات انجام دی ہیں، ان کا تفصیل سے ذکر کیا اور انھوں نے معارف میں جو شذرات لکھے ہیں ان کی بیحد تعریف کی اور فرمایا کہ وہ شاہ معین الدین ندوی مرحوم کے صحیح معنی میں جانشین اور نعم البدل ثابت ہوئے۔ پروفیسر مشیر الحق صاحب نے، جو اس جلسے کے ناظم کے فرائض انجام دے رہے تھے، اپنی تقریر میں فرمایا کہ وہ میرے استاد بھی تھے، رفیق کار بھی اور سرپرست بھی۔ انھوں نے مجھے تعلیم بھی دی، میری تربیت بھی کی اور حسب ضرورت قدم قدم پر مدد بھی کی۔ مرحوم نے لکھنؤ میں ادارۂ تعلیمات اسلام کے نام سے قرآن مجید کی تعلیم اور عربی سکھانے کے لیے جو ادارہ قائم کیا تھا اس میں مشیر صاحب مولانا کے رفیق کار تھے۔ اس سلسلے میں

انھوں نے مولانا کی خدمات اور طریق کار پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم جب جامعہ میں ناظم مجلس دینیات تھے تو مولوی بدرالدین صاحب نائب ناظم کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور مولانا جمعہ کے موقع پر جو خطبات دیا کرتے تھے، بعد میں انھیں نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ موصوف نے اس جلسے میں مولانا کے خطبات پر ایک مفصل مضمون پڑھا۔ اسی طرح جامعہ کے ایک کارکن جناب محمد شبیر ندوی صاحب نے بھی مرحوم کی سیرت و شخصیت اور علمی و مذہبی خدمات پر ایک مضمون پڑھا جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم ۱۹۰۷ء میں ضلع رائے بریلی کے ایک قصبہ تھولینڈی میں پیدا ہوئے۔ موصوف کی ابتدائی تعلیم تھولینڈی میں ہوئی۔ بچپن ہی سے درسی کتابوں کے علاوہ علمی و ادبی کتابوں کے مطالعے کا شوق تھا، چنانچہ اوائل عمری میں ہی مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی وغیرہ کی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں اور مذہبی و ادبی موضوعات پر ان کا مطالعہ اچھا خاصا تھا۔ ان کے ان میلانات اور رجحانات کو دیکھتے ہوئے، غالباً ۱۹۲۴ء میں لکھنؤ کی مشہور عربی درس گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انھیں داخل کر دیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ کچھ ساتھیوں کے ساتھ انھیں ندوہ سے الگ ہونا پڑا، ان ساتھیوں میں مولانا رئیس احمد جعفری بھی تھے، جنھیں بعد میں صحافتی اور تصنیفی دنیا میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ دونوں ساتھی، مولانا عبدالسلام صاحب اور جعفری صاحب جامعہ ملیہ چلے آئے اور درجۂ خاص میں داخلہ لے لیا۔ اگرچہ یہ دونوں حضرات رسمی طور سے طالب علم تھے، مگر ندوہ کی تعلیم اور کثرت مطالعہ کی وجہ سے ان کا مرتبہ بہت بلند تھا اور ان کا شمار اساتذہ کی صفوں میں ہوتا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں رئیس احمد جعفری صاحب روزنامہ خلافت کے اڈیٹر کی حیثیت سے بمبئی چلے گئے اور کچھ عرصے کے بعد اپنے دوست اور ساتھی مولانا عبدالسلام صاحب کو بھی بلا لیا۔ مگر مولانا نے صرف ایک سال وہاں کام کیا اور ۱۹۳۴ء میں اپنی پہلی مادر درس گاہ ندوہ میں استاد کی حیثیت سے واپس آگئے اور یکم مارچ ۱۹۴۳ء تک وہاں کام کیا، مگر حالات نے پھر پلٹا کھایا اور مولانا کو وہاں سے الگ ہونا پڑا۔ مولانا نے ندوہ سے الگ ہونے کے بعد لکھنؤ ہی میں تعلیمات اسلام کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھی جس میں قرآن کی تعلیم دی جاتی تھی اور عربی زبان سکھائی جاتی تھی۔ ۱۹۵۱ء میں جامعہ ملیہ میں اسلامیات کے استاد کی جگہ

خالی ہوئی تو ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی دعوت پر ۷ اگست کو وہ اپنی دوسری مادر علمی جامعہ ملیہ میں آگئے یہاں انھوں نے ۲۲-۲۳ سال تک اسلامیات کے استاذ اور ناظم دینیات کی حیثیت سے کام کیا اور اسی حیثیت سے ۳۰ اپریل ۱۹۷۲ء کو ریٹائر ہوئے۔

مولانا کے بیشتر لڑکے اور لڑکیاں دہلی ہی میں جامعہ نگر کے علاقے میں رہتے ہیں۔ جامعہ سے ریٹائر ہونے کے بعد مولانا اپنی اہلیہ کے ساتھ انھیں کے ساتھ رہنے لگے۔ اسی سال اکتوبر میں وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اعزازی معتمد تعلیمات مقرر ہوئے۔ اس سلسلے میں کبھی کبھی وہ لکھنؤ جاتے اور حسب ضرورت ندوہ میں قیام فرماتے، مگر بنیادی طور پر ان کا قیام جامعہ نگر ہی میں تھا اور بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی باقی ماندہ زندگی یہیں بسر کریں گے اور علم و مذہب کی جو بھی خدمت کر سکتے ہیں یہیں سے کریں گے، مگر دارالمصنفین اعظم گڈھ کے ناظم اور معارف کے اڈیٹر مولانا شاہ معین الدین ندوی صاحب کے انتقال کی وجہ سے جو جگہ وہاں خالی ہوئی اس کو پُر کرنے کے لیے ارباب حل و عقد کی نظر مولانا پر پڑی اور بالآخر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے اصرار پر انھیں دارالمصنفین جانا پڑا اور تادم حیات اس کی خدمت انجام دیتے رہے۔

حضرت مولانا کے ساتھ تقریباً ۳۱ سال تک ایک جگہ رہنے سہنے کی مجھے سعادت حاصل ہے، وہ میرے درجے کے استاد تھے، یہی نہیں بلکہ میری زندگی کے مشیر، رہنما اور مربی بھی تھے اور زندگی کے تمام معاملات میں ان کے مشورے اور رہنمائی کی مجھے عزت حاصل تھی، افسوس کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے اور میں اُن جیسے شفیق استاد اور ہمدرد و مخلص مشیر سے محروم ہو گیا۔

جلسے کے آخر میں صدر جلسہ کی اجازت سے پروفیسر مشیر الحق صاحب نے حسب ذیل ریزولیوشن پڑھ کر سنایا جسے حاضرین جلسہ نے اپنی دعاؤں کے ساتھ منظور کیا:

"جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قدیم طالب علم، سابق استاد اور ناظم دینیات نیز انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رکن مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کا، جن کی یاد میں جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ اور کارکنان کا یہ جلسہ منعقد کیا گیا ہے، رمضان المبارک کے آخری دن جمعہ ۲۴ اگست ۱۹۷۹ء کو ان کے اپنے وطن میں

(بقیہ صفحہ ۲۰۷ پر)

1. No. D-(S)-110 Vol. 76 No. 7 - 8 August, 1979

The Monthly JAMIA

Subscription Rates

India	Rs. 6-00
Pakistan	Rs. 26-00
Foreign	$ 4 (US) or £ 1.50

Advertisement Rates

Cover IV	Full page Rs 200/-	Half page Rs 100/-
Cover III & II	Full page Rs 150/-	Half page Rs. 75/-
Ordinary	Full page Rs. 100/-	Half page Rs. 50/-

JAMIA MILLIA ISLAMIA
NEW DELHI - 110025

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

سالانہ چندہ
چھ روپے

جامعہ

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۷۶	بابت ماہ ستمبر ۱۹۷۹ء	شمارہ ۹

فہرست مضامین

تمام کی تمام ضلالت و گمراہی میں مبتلا ہو جاتی۔

مولانا مودودی مرحوم کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تنقیحات سے مغربی فکر و تمدن کے داخلی تضادات اور کھوکھلے پن کو وا شگاف کیا اور نوجوانوں کے ایک بڑے طبقے کو اس مرعوبیت سے محفوظ رکھا جو غالب تہذیب و تمدن کی بہائے جانے والی جلوہ آرائی سے پیدا ہوتی ہے۔ فکری و کلامی محاذ پر مولانا کی تحریروں نے شروع میں ایک حد تک وہی کام کیا جو معتزلہ کے مقابلے میں علماء کی ایک جماعت نے کیا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک بڑا کارنامہ ہے اور اس کی اہمیت سے کوئی انصاف پسند انکار نہیں کر سکتا۔ علامہ شبلی سے لے کر مولانا مودودی تک ہمیں مسلمانوں میں خصوصاً مسلم نوجوانوں میں، مغرب کے مقابلے میں اپنی تاریخ، اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی مذہبیت و ایمانیات پر خود اعتمادی پیدا کرنے کی ایک مسلسل کوشش ملتی ہے۔ اس کوشش میں شاہراہ عام سے ہٹ کر چلنے کی ایک خواہش بھی ملتی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر مقصد کے اعتبار سے یہ ساری کوششیں کامیاب رہیں، البتہ تنوع اور کوشش کرنے والوں کی طبیعت اور مزاج اور پھر ماحول کے اختلاف کے اعتبار سے ان میں کچھ فرق بھی ملتا ہے جو ایسا انوکھا اور غیر فطری بھی نہیں۔ ایسے تمام مصنفین و مفکرین میں مولانا مودودی مرحوم اس لحاظ سے منفرد تھے کہ انھوں نے مغربی تمدن کی کوکھ سے جنم لینے والے نظریاتی نظاموں اور مغرب میں پیدا ہونے والی سماجی و معاشی و سیاسی تحریکوں کے جواب میں اسلام کو ایک جامع اور مکمل دین اور نظام حیات کے طور پر پیش کیا، لیکن اس سلسلے میں دین کی تشریح و تعبیر سے متعلق بعض ایسی باتیں ان کے قلم سے نکلیں جو برصغیر ہندو پاک کے علماء کی ایک جماعت کے نزدیک روایت سے بغاوت کے مترادف تھیں اور جن سے دین کی تشریحات و تعبیرات کے صدیوں کے سرمایے کے لٹ جانے کا خطرہ محسوس کیا گیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ سامنے آیا کہ مولانا کے بہت سے ساتھی علماء اور اہل قلم ان کی تحریک سے الگ ہو گئے اور علماء کے ایک طبقے اور جماعت اسلامی کے مابین خاصی کشیدگی پیدا ہو گئی۔ ہمارا خیال ہے کہ جن امور سے متعلق یہ صورت حال پیش آئی، ان پر اظہار خیال کے بغیر بھی مولانا کی اقامت دین کی تحریک کامیابی سے چل سکتی تھی۔ بلاشبہ مولانا مودودی کی یہ ایک صریح غلطی تھی۔

دوسری بھول مولانا مرحوم سے یہ ہوئی کہ انھوں نے اصلاح معاشرہ کے پیغمبرانہ کام کو چھوڑ کر
جماعت اسلامی کو ایک سیاسی تحریک بنا دیا۔ ان کی امارت و قیادت میں پاکستان میں جماعت اسلامی
کی جب اس قلب ماہیت کی خبر ہمیں ملی تو بڑی مایوسی ہوئی۔ آج کی سیاست کچھ ایسی ہے کہ آدمی اس
میں الجھ جائے تو اس کے لیے بعض اقدامات ناگزیر ہو جاتے ہیں (جنھیں خواہ وہ 'حکمت عملی' ہی کا
نام کیوں نہ دے) جو اس کے اپنے ہی اصولوں اور تصورات سے متصادم ہوتے ہیں۔ جماعت اسلامی
جس کا مقصد اولین مسلمانوں کی سیرت سازی اور تعمیر کردار تھا تاکہ ایک صالح معاشرہ وجود میں
آئے، اپنی راہ سے ہٹ گئی اور وہ سیاست اور سیاسی مطالبات کے داؤں پیچ میں ایسا الجھی
کہ وہ اپنے ہی افراد کی اصلاح و تربیت کی طرف سے غافل رہی۔ پاکستان میں اس کے اپنے
وجود کے مختلف مرحلوں میں جو سیاسی حالات رونما ہوئے اور جس طرح پاکستانی معاشرہ بہت
بڑی حد تک مادی زندگی کی آخرت فراموش فریب کاریوں میں مبتلا ہوتا چلا گیا، اس کے پیش نظر
ضرورت تھی کہ مولانا جماعت اسلامی کے فکر و نظام میں تبدیلی لاکر اسلامی حکومت کے قیام کے
بجائے اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے جد و جہد کرتے اور اپنی جماعت کی ساری توانائیوں کو
اس اہم کام پر مرکوز کر دیتے۔

لیکن اس سب کے باوجود، ایک مفکر، ایک صاحب طرز مصنف اور ایک فعال شخصیت کی
حیثیت سے مولانا مودودی کا جو مقام ہے وہ اپنی جگہ مستند اور مسلّم ہے۔ ان کے بعض خیالات سے
ہمیں اختلاف کا حق حاصل ہے۔ ان کی بعض تحقیقات' 'ریسرچ اور تحقیقات کے جدید معیار
پر پوری نہیں اترتیں اور ان سے انھوں نے جو نتائج اخذ کیے وہ بے بنیاد ہیں۔ پھر بھی ان کے تصنیفی و
فکری کارناموں سے کوئی بھی متوازن ذہن انکار نہیں کر سکتا۔ ہمارا بھی عجیب حال ہے، کسی کی ایک بات
پسند آگئی اور اس سے ہمیں عقیدت ہوگئی تو پھر اس عقیدت میں اتنا غلو کریں گے کہ اس پر کسی تنقید و تبصرہ
کو برداشت نہیں کریں گے اور کسی سے کسی امر میں اگر اختلاف ہوا تو پھر اس میں اتنی دور چلے جائیں گے
کہ اس کی ہر بات ہمیں غلط اور گمراہ کن نظر آئے گی۔ مولانا مودودی کے عقیدت مندوں اور ان سے
اختلاف رکھنے والوں کی بھاری تعداد ایسے ہی انتہا پسندوں پر مشتمل رہی ہے۔ درحقیقت صحیح راہ

ایرو فلوٹ کا جہاز اڑا اور تاشقند کے وقت کے مطابق ایک بجے سے پہلے ہی جہاز وہاں پہنچ گیا۔ وہاں لوگوں کو میری آمد کی اطلاع تھی، اس لیے ہوائی اڈے پر ازبکستان کے مذہبی بورڈ کے اہم لوگ مثلاً ڈاکٹر عبدالغنی عبداللہ۔ ڈاکٹر یوسف شاکر اور جناب میر محمود شرف الدین وغیرہ موجود تھے انھوں نے میرا خیر مقدم کیا، اور مجھے لے کر ہوٹل ازبکستان پہنچے جہاں تمام مہمانوں کے قیام کا انتظام تھا۔ یہ اٹھارہ منزلہ خوبصورت ہوٹل ابھی چند سال پہلے بن کر تیار ہوا ہے اور ایک طرح سے شہر کے قلب میں اس باغ کے بالکل سامنے واقع ہے جہاں کارل مارکس کا ایک جیتا جاگتا اسٹیچو نصب ہے، میں نے دنیا کی کافی سیر کی ہے، ایسے بولتے ہوئے اسٹیچو میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔ ہوٹل پہنچ کر نصف گھنٹے کے بعد میں نے میزبانوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا اور ظہر کی نماز پڑھ کر آرام کے لیے لیٹ گیا، پھر عصر کے لیے تھوڑا ہی وقت باقی رہا تھا کہ آنکھ کھلی، عصر کی نماز کے بعد تلاوت کلام پاک کی اور پھر مغرب کی نماز کے بعد کمرے سے نیچے لاؤنج میں آیا، وہاں اخبارات پر سرسری نظر ڈالی اور ہوٹل کے باہر آگیا۔ تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ دو لڑکیاں اور تین چار لڑکے میرے پاس آئے، میں نے چونکہ شیروانی پہن رکھی تھی، ایک لڑکی نے جو انگریزی جانتی تھی، مجھ سے پوچھا کہ آپ پاکستانی ہیں، میں نے کہا نہیں میں ہندوستانی ہوں اور دہلی سے آیا ہوں، پھر اس نے کہا کہ آپ تو مسلمان معلوم ہوتے ہیں، میں نے کہا آپ نے کیسے سمجھا کہ میں مسلمان ہوں، کہا کہ داڑھی سے، میں نے کہا کہ آج کل تو داڑھیوں کا عام رواج ہے، بہت سے غیر مسلم بھی داڑھی رکھتے ہیں، جواب میں وہ بولی کہ نہیں، آپ کی داڑھی مسلمانوں جیسی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے صحیح صحیح اندازہ لگایا۔ میں نے پوچھا کہ آپ اور آپ کے ساتھی کیا کرتے ہیں، اس نے بتایا کہ ہم سب یونیورسٹی کے طالب علم ہیں اور ہم میں سے دو غیر ملکی زبانیں سیکھ رہے ہیں، میں انگریزی پڑھ رہی ہوں۔ میں نے خوشی کا اظہار کیا، میں نے رخصت ہو کر آگے بڑھنا چاہا لیکن اس لڑکی نے جس کا نام فاطمہ تھا، کہا، اگر آپ کچھ خیال نہ کریں تو ہمیں قرآن کی چند آیتیں سنائیے۔ اس سوال پر میں چونکا، لیکن سنبھل کر تبسم سے سورۂ اخلاص پڑھی، پھر میں نے پوچھا کہ آپ کو کچھ قرآن یاد ہے، اچھا سورۂ فاتحہ سنائیے، اس نے سورہ فاتحہ صحیح صحیح پڑھ دی، پھر میں نے پوچھا کہ آپ کو نماز آتی ہے۔ جواب ملا کہ ہاں، مجھے نماز آتی ہے اور میں پابندی کے ساتھ تو نہیں مگر کبھی کبھی نماز پڑھتی ہوں لیکن رمضان میں روزے پورے رکھتی ہوں اور نماز بھی پڑھتی ہوں، میں نے آخری سوال یہ کیا کہ آپ کو

قرآن کس نے کس نے پڑھایا، جواب ملا کہ میری والدہ نے جو بڑی مذہبی ہیں۔
یہ تھا تاشقند میں پہلا مسرت بخش تجربہ جس کی حلاوت میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ بمشکل سات آٹھ منٹ لگے ہوں گے اس گفتگو میں، میں فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا سنا تھا اور کیسا پایا، نئی ازبک نسل کی اس خوبصورت لڑکی کو جو یونیورسٹی کی طالبہ ہے، اپنے مذہب سے کیسا گہرا تعلق ہے، اور ایک پردیسی و اجنبی مسلمان سے مل کر اسے کیسی خوشی ہوئی ہے، یہ سب کیا ہے، کیسے ہے اور کیوں ہے، یہ تو ایک دلآویز خواب ہے، یا ایسی حقیقت جس کا سامنا کرنے کے لیے میں ذہنی طور پر بالکل تیار نہ تھا، بس اچانک بجلی کے کوندے کی طرح یہ حقیقت سامنے آگئی، اللہ! تیری قدرت بڑی ہے اور وسیع ہے، تو ہی اپنے دین کا محافظ ہے۔
سیر کے بعد لوٹا تو ہوٹل کے کمرے کی میز پر کئی قسم کے پھلوں سے بھری ایک بڑی پلیٹ دیکھی، ایک دوسری پلیٹ میں کئی روٹیاں تھیں، یا اللہ، یہ کیا ماجرا ہے، میں تیرا کوئی خاص بندہ نہیں جس کے لیے آسمان سے من و سلویٰ اترے، ذہن ہوٹل والوں کی طرف گیا کہ شاید یہاں کی یہ رسم ہو، تھوڑی دیر بعد شرف الدین صاحب آگئے، میں نے پوچھا کہ یہ سب کیسے اور کہاں سے؟ انھوں نے کہا کہ ہماری طرف سے مہمانوں کی تواضع کے طور پر، اسی ہوٹل کے کمرے میں ہم نے اپنا ایک آفس بنا لیا ہے تاکہ ہم قریب رہیں اور مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ ہو، انھوں نے اپنا کمرہ نمبر اور ٹیلیفون نمبر دیا، وہ اپنے ساتھ سگریٹ لائے تھے وہ میرے حوالے کی اور کہا کہ رات کے کھانے کے لیے تیاری کیجئے میں ابھی تھوڑی دیر میں آؤں گا۔ یہ شرف الدین صاحب بخارا اور تاشقند کے مدرسوں سے فراغت کے بعد اب دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعہ میں زیر تعلیم ہیں، اردو خوب جانتے ہیں، دو تین بار ہندوستان آچکے ہیں، پچھلی مرتبہ ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بین الاقوامی اجلاس میں شرکت کے لیے آئے تھے، ہندوستانی مسلمانوں کے دینی و تعلیمی اداروں سے خوب واقف ہیں، خندہ جبیں، حسین اور متواضع ازبک ہیں، بظاہر "اپ ٹو ڈیٹ" لیکن رکھ رکھاؤ اور آداب میں مشرقیت کے اچھے نمائندے۔ ان کی وجہ سے مجھے یہ آسانی رہی کہ وسط ایشیا کے مسلمانوں سے متعلق نجی گفتگوؤں میں، مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں، وہ شاید اور کسی طرح حاصل نہ ہو سکتیں۔
کوئی نصف گھنٹے بعد انھوں نے دق الباب کیا، میں تیار تھا، ان کے ساتھ ہوٹل کے وسیع و عریض

ڈائننگ ہال میں پہنچا، کھانا شروع ہوا اور دیر تک چلتا رہا، ڈائننگ ہال کا ایک گوشہ ڈانس کرنے والوں کے لیے مخصوص تھا، وہاں مغربی موسیقی کی مختلف دھنیں سننے میں آئیں جن پر ڈانس کرنے والے وہ دسیوں جوڑے جو ٹورسٹ تھے اور جن میں بیشتر مغربی یورپ کے ممالک سے آئے تھے، موسیقی و رقص کے ساتھ اپنی خوشی و سرمستی کا اظہار کرتے تھے، کھانے میں دو خاص چیزیں تھیں، شوربہ ایک بڑے پیالے میں جسے یہاں کاسہ کہا جاتا ہے اور سیخ کباب، کھانا لذیذ تھا، سرخ مرچوں کا یہاں استعمال نہیں اور مسالے بھی بہت ہی کم، کھانے کے دوران ازبک معاشرت سے متعلق گفتگو جاری رہی اور کھانے اور برتنوں کے نام جو سننے میں آئے، وہ عموماً وہی تھے جو ہمارے یہاں ہیں، میں نے شرف الدین صاحب سے پوچھا کہ یہاں ہوٹل میں جو خواتین اور لڑکیاں کام کرتی ہیں، وہ مسلمان ہوں گی، معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے، عام طور پر یہاں کے مسلمان اسے پسند نہیں کرتے کہ ان کے گھر کی عورتیں ہوٹلوں میں کام کریں۔ ہوٹلوں میں زیادہ تر روسی عورتیں کام کرتی ہیں، کھانے کا سلسلہ کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک رہا۔ پھر میں میزبانوں سے رخصت ہو کر لاؤنج میں آ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ دو عورتیں (ایک بوڑھی خاتون اور دوسری جوان) اور ایک مرد میرے پاس آئے۔ بوڑھی خاتون نے پوچھا، آپ مسلمان ہیں؟ میں نے کہا، جی ہاں۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم لوگ یوگوسلاؤ ہیں، سیرایوو کے رہنے والے ہیں، یہ لڑکی میری بہو ہے اور مرد میرا بیٹا، ہم مسلمان ہیں اور آپ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس ہوٹل میں نماز کس رخ پڑھیں۔ میں نے انھیں قبلہ رخ بتایا اور کہا کہ تشریف رکھیے کچھ باتیں ہو جائیں وہ لوگ بیٹھ گئے اور یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کے متعلق میں نے پوچھنا شروع کیا، میں نے کہا کہ آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی، آپ لوگوں کے لباس اور صورت شکل سے میں یہ نہ جان سکتا کہ آپ مسلمان ہیں، لیکن غالباً میری داڑھی نے جو اگرچہ زیادہ لمبی نہیں ہے، آپ کو میری طرف متوجہ کیا اور شاید لباس نے بھی۔ اس بات میں ہمارے سوچنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق بھی بہت کچھ دریافت کیا اور کہا کہ سال دو سال بعد ہمارا ارادہ ہندوستان کی سیر کا ہے۔ انشاءاللہ۔ میں نے انھیں بتایا کہ مجھے ترکوں کی تاریخ کے مطالعہ سے یوگوسلاویہ کے مسلمانوں سے متعلق کچھ معلومات ہیں، آپ کا شہر تو اس دیس میں مسلم تہذیب کا مرکز رہا ہے اور وہاں مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد ہے۔ وہاں کی یونیورسٹی میں بھی علوم اسلامیہ کا ایک شعبہ ہے اور اس کے

دم سے یوگوسلاویہ میں عربی، فارسی اور ترکی کتابوں کے مخطوطے بڑی حد تک محفوظ ہو گئے ہیں۔ ان کے لیے یہ نئی بات تھی کہ وہ اس میدان سے آشنا نہ تھے، پھر میں نے ان سے صوفی سلسلوں کے بارے میں پوچھا، معلوم ہوا کہ وہاں قادری اور نقشبندی سلسلہ مقبول رہا ہے اور اب بھی یہ سلسلے سرگرم ہیں لیکن ظاہر ہے کہ وہ پہلے جیسی بات نہیں، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ یوگوسلاویہ میں اسلام زندہ ہے اور وہاں مسلمانوں کو اپنے مسلمان ہونے کا احساس ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ہمارے یہاں میلاد کی محفلیں ہوتی ہیں، رمضان شریف میں خاص اہتمام بھی ہوتا ہے اور عیدین دو بڑے تہوار ہیں جو جوش و خروش سے منائے جاتے ہیں، گھروں میں تاریخ اسلام کے واقعات اور بزرگوں کے قصوں اور کارناموں کا ذکر بھی رہتا ہے ـــــــ ان یوگوسلاو مسلمانوں سے یہ ملاقات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی کہ گفتگو میں خلوص اور اسلامی اخوت کا احساس صاف نمایاں تھا۔

لاؤنج سے اٹھ کر میں اپنے کمرہ میں آیا جو پانچویں منزل پر تھا، کپڑے تبدیل کئے، نوٹس لیے انگور کے چند دانے کھائے، پھر وضو کر کے نماز پڑھی، خدا کا شکر ادا کیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔

زہے روانی عمرے کہ در سفر گذرد

نیند گہری آئی، لیکن شکر للہ کہ آنکھ حسب معمول وقت پر کھلی، اور سارے معمولات پورے ہوئے۔ آٹھ بجے ناشتہ ہوا، ناشتہ میں دہی اور بہی کے مربے کی لذت ہمیشہ یاد رہے گی۔ دہی اتنا اچھا اور لذیذ اب تک کہیں کھانے کو نہ ملا تھا، دہی دو گلاسوں میں تھا، تھوڑا خالص ہی پیا، پھر اس میں پانی اور برف کے ٹکڑے ملا کر قدرے مربے کے شیرے کی آمیزش کی، لیجئے لذیذ لسی تیار ہو گئی۔ اب بتائیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو کس طرح جھٹلا سکتے ہیں۔

کوئی دس بجے (یکم جولائی) میں اور اسلامک کلچر فورم (ٹوکیو) کے چیف ایڈیٹر ابوبکر موری موتو شرف الدین صاحب کی قیادت میں شہر تاشقند کی سیر کو نکلے۔ سڑکیں چوڑی ہیں اور ان پر دو رویہ لمبے اور گھنے درختوں کی قطاریں شہر کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں، چوڑی سڑکوں پر شاندار عمارتوں کے سامنے سے گذرتے ہوئے ہم لوگ پہلے سرخ چوک (ریڈ سکوائر) پہنچے۔ یہ چوک نہایت خوبصورت اور بہت بڑا ہے۔ اسے لینن چوک بھی کہتے ہیں۔ چوک کے وسط میں ایک طرف تقریباً بیس میٹر اونچے چبوترے پر لینن کا چالیس بیالیس فیٹ اونچا مجسمہ ہے جسے دیکھ کر مجسمہ ساز کی عظمت کا احساس

ہوتا ہے، میں اس مجسمے کو دیر تک دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ لینن کے عقائد خواہ کچھ بھی رہے ہوں، لیکن تھا وہ بڑا آدمی، ایک لحاظ سے وہ مارکس سے بڑا تھا کہ اس نے سختیاں جھیل کر اور ایثار و قربانی کی مہتمم بالشان مثالیں پیش کر کے، تاریخ عالم کا ایک عظیم انقلاب برپا کیا، اور ایک ایسے علاقے میں برپا کیا جہاں صنعتیں بہت کم تھیں اور مزدور بھی کم تھے اور جہاں مارکس کی پیش گوئی کے مطابق مارکسی انقلاب نہیں ہونا چاہئے تھا، اور یہ انقلاب کامیاب ہو کر دنیا میں ایک نئی طرز کی تہذیب کا جسے سوویٹ تہذیب کہتے ہیں، بانی قرار پایا۔ اس مجسمے کی طرف بار بار نظر اٹھتی تھی اور اقبال کی وہ نظم یاد آ رہی تھی جس کا عنوان ' لینن (خدا کے حضور میں)' ہے۔ خاص طور سے اس نظم کے یہ اشعار زبان پر تھے:

یوروپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہیں کہ سوویٹ وسط ایشیا میں، میں نے جو کارخانے دیکھے اور مزدوروں کے معاشی و معاشرتی حالات جو معلوم ہوئے، اس سے خدائے قدوس کی قدرت اور عدالت پر میرا یقین اور پختہ ہو گیا، خدا اپنی مشیئت کی تکمیل مختلف طریقوں سے کرتا ہے، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ وسط ایشیا میں خواہ کارخانوں کے مزدور ہوں یا ریاستی اور اجتماعی فارم کے مزدور، ان کے اوقات، بہت شیریں اور خوش آیند ہیں، سب جانتے ہیں کہ مکافاتِ عمل

کی سنت الہٰی بروئے کار آئی اور سوویٹ یونین میں افراد کی سرمایہ پرستی کا سفینہ غرق ہو کر رہا۔
لینن چوک کی شاہراہ کے مشرق کی طرف حوض ہیں، فوارے ہیں، حکومت کے دفتر کی عمارت ہے، پارک ہے، گلاب کے تختے ہیں، بید مجنوں کی الجھی الجھی شاخیں ہیں جن کا اپنا ایک حسن ہے، قریب ہی چھوٹا سا پہاڑی دریا ہے جسے انہار کہتے ہیں اس کے کنارے چہل قدمی کے لیے جو روش ہے اس پر درختوں کے ٹھنڈے اور گھنے سایے محیط ہیں۔ فضا میں خوشبوؤں سے معمور پرکیف خنکی قلب و نظر کو تازہ کرتی ہے اور زبان پر بے اختیار سبحان اللہ کا ورد جاری ہو جاتا ہے، انسان خدا کی کن کن نعمتوں کی تکذیب کرے گا۔
تاشقند میں دوسرا خوبصورت چوک نوائی تھیٹر چوک ہے۔ علی شیر نوائی (۱۵۰۱-۱۴۴۰) تیموری خانوادہ کے سلطان حسین بن منصور بن بیقرہ (م ۱۵۰۶) کا لائق و فائق وزیر تھا، اس کی علم دوستی اور اہل قلم اور شعراء کی سرپرستی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی (م ۱۴۹۲) اُس کے گہرے دوستوں میں تھے اور وہ مولانا کی علمی قابلیت اور روحانیت دونوں کا قدرداں تھا۔ اُس عہد کے مشہور مصور بہزاد اور شاہ مظفر، اور موسیقار گل محمد، شیخ نائی اور حسین عودی، سبھی کی شہرت اور کامیابی میں اس کی سیر چشمی اور سرپرستی کا حصہ تھا۔ وہ خود بھی ایک کامیاب موسیقار، کمپوزر، مصور اور شاعر تھا، ترکی زبان میں اس کی شاعری بے مثل سمجھی گئی ہے، فارسی میں بھی وہ شعر کہتا تھا اور فانی تخلص کرتا تھا۔ لیکن ترکی کے مقابلے میں اس کی فارسی شاعری پھیکی ہے۔ طبعاً وہ صوفی تھا، کہا جاتا ہے کہ مولانا جامی نے اسے نقشبندی سلسلے میں مرید بھی کیا تھا
ایسے عظیم فنکار اور ایسی پہلو دار اور دلآویز شخصیت کی یاد کو اہل ازبکستان نے طرح طرح سے زندہ رکھا ہے۔ نوائی تھیٹر کی عمارت بہت خوبصورت ہے اور اس کی محرابیں اور دروازوں میں سنگ تراشی کے فنکارانہ نمونے دامن دل کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، جی چاہتا ہے کہ دیکھتے رہیئے۔
۱۹۶۶ء میں تاشقند کا تقریباً نصف حصہ زلزلے کے شدید جھٹکوں کے سبب تباہ و برباد ہو گیا تھا اور ہزاروں کی تعداد میں مرد، عورتیں اور بچے لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ ہم نے شہر کا یہ حصہ دیکھا تو وہاں بلند عمارتیں نظر آئیں، زلزلے کی تباہی کے آثار دکھائی نہ دیئے۔ معلوم ہوا کہ شہر کے اس علاقے کی تعمیر نو میں سوویٹ دیس کی سبھی قوموں نے دل کھول کر حصہ لیا اور صرف سامان اور پیسے سے ہی مدد

نہیں کی بلکہ کاریگر اور انجینیر بھیج کر گہری انسانی دوستی کا ثبوت دیا۔ ہم نے زیر زمین ٹرین ٹیوب میں بیٹھ کر تاشقند کے شہریوں کی شرافت و مروت اور صفائی ستھرائی کے اعلیٰ ذوق کا تجربہ بھی کیا۔ ٹیوب کا کافی حصہ منصوبے کے مطابق بن چکا ہے۔ میں ٹرین میں داخل ہوا تو مجھے دیکھتے ہی ایک خاتون اور ایک نوجوان لڑکا، دونوں کھڑے ہو گئے اور سیٹ پیش کی، میں نے خاتون سے درخواست کی کہ وہ تشریف رکھیں اور نوجوان سے کہا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو شکر گذار ہونے کا موقع دے سکتے ہیں اور میں ان کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ خاتون کا کھڑے ہو کر اپنی سیٹ کی پیش کش کرنا خالص مشرقیت تھی، ورنہ مغربیت کا تقاضا تو کچھ اور ہوتا۔ یہ پیش کش بالکل برجستہ تھی اس میں کوئی تصنع یا تکلف نہ تھا، اس سفر میں مشرقیت کے ایسے اور اس طرح کے دوسرے تجربے بار بار ہوئے اور اس بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ باوجود ترقی اور خوشحالی کے، سوویٹ وسط ایشیا کا نیا تمدن وہاں کی مشرقیت کو ختم نہیں کر سکا ہے۔

ٹیوب سے نکلے تو ایک چائے خانے میں پہنچے، یہ سن رکھا تھا کہ چائے خانوں کو اس علاقے کی معاشرتی زندگی میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ جس چائے خانے میں ہم پہنچے وہ ایک بڑے باغ میں تھا جس میں دریا کے پانی کی چھوٹی چھوٹی کئی نہریں جاری تھیں۔ صاف و شفاف پانی، انھیں نہروں کے درمیان چار پانچ، اسٹیج جیسے۔ اونچے اور بڑے لکڑی کے تخت کی شکل کے چائے خانے تھے، اوپر سے گھنے درختوں کا سایہ تھا، نہ ایک پر لکڑی ہی کی چھت تھی، نیچے تخت کے چاروں طرف خوبصورت ریلنگ تھی، تخت پر قالین بچھے تھے، کہیں کہیں نیچی چوکیاں بھی تھیں، جن پر شطرنج کی بساط بچھی تھی، کچھ بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے لوگ ریلنگ کے سہارے بیٹھے تھے، سامنے چائے تھی اور گپ شپ جاری تھی۔ ایک گوشے میں چائے خانے کی پختہ اور خوبصورت عمارت تھی، اس میں داخل ہوئے تو ایک طرف کاؤنٹر تھا، پھر کچھ کرسیاں اور میز جن پر دو تین ازبک خاندان کے افراد (جن میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی) بیٹھے تھے، پھر دوسرے سرے پر فرشی نشست کا ایک اونچے پلیٹ فارم پر انتظام تھا جس پر خوشنما قالین بچھے تھے۔ ماحول پر سکون تھا، ہم ایک میز کے گرد بیٹھ گئے، چائے اور سموسے آئے، سموسے تندوری تھے اور ان میں قیمہ بھرا ہوا تھا۔ یہاں سموسے تلے ہوئے نہیں ہوتے تندوری ہوتے ہیں، سموسے گرم اور

لذیذ تھے، چائے کا معاملہ یہ ہے کہ اس علاقے میں پیالیوں اور پرچوں کے بجائے پیالے ہوتے ہیں چینی کے بغیر دستے کے سبک، نقشین خوبصورت پیالے، پیالوں میں کیتلی سے چائے ڈالتے رہئیے اور پیتے رہئیے۔ اس پورے سفر میں تاکو تک پیالیوں کے بجائے پیالے ہی ملے، انھیں پیالہ ہی کہا جاتا ہے۔ وسط ایشیا میں لوگ چائے کے شوقین ہیں، اسی لیے چائے خانے شہروں، قصبوں اور گاؤں میں بھی ہوتے ہیں، پارکوں اور سیرگاہوں میں بھی، یہاں تک کہ خوشحال گھروں کے اندر صحن میں بھی، چائے خانے درحقیقت ایک روایت بن گئے ہیں اور یہ روایت یہاں کی سماجی زندگی کا ایک ضروری حصہ ہے۔ ایک اور خصوصیت ان چائے خانوں کی یہ میں نے دیکھی کہ سب صاف ستھرے تھے، مرغیلان جاتے ہوئے ایک چھوٹی سی بستی میں ایک معمولی درجہ کے چائے خانے پر بھی نظر پڑی، میں نے وہاں بھی صفائی پائی۔ اس بات سے میں بہت متاثر ہوا، میرے ذہن میں خیال آیا کہ ایک یہ مسلمان ہیں جنھیں پاکی اور صفائی کا اتنا خیال ہے اور ایک ہم ہندوستانی مسلمان ہیں جن کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا ہے کہ کسی شہر میں اگر گندے محلے سے گذرو تو سمجھ لو کہ یہ مسلمانوں کا محلہ ہے۔ اس بات میں اگرچہ ایک حد تک مبالغہ ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وسط ایشیا میں نظافت اور صفائی کا جو معیار ہے اس کی گرد کو بھی ہم ہندوستانی مسلمان نہیں پہنچ سکتے۔ مذہب اسلام میں پاکی اور صفائی کی بڑی تاکید ہے اور اس سلسلے میں احادیث بھی ہیں۔ لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ اس اصول پر وسط ایشیا کے مسلمان عامل ہیں یا ہم ہندوستانی مسلمان جن کا دعویٰ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اسلام اگر باقی ہے تو ہندوستان میں۔

تاشقند کی سیر سے کوئی ڈھائی بجے ہم اپنے ہوٹل واپس آئے، بھوک خوب چمکی ہوئی تھی اس لیے فوراً لنچ ہوا، پھر ہم سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے، ظہر کی نماز پڑھ کر میں لیٹ گیا، تھکا ہوا تھا اس لیے سو گیا، کوئی چھ بجے اٹھا، عصر کی نماز کے لیے وقت کم تھا۔ جلدی جلدی نماز پڑھی اور پھر کچھ پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس دن پھر ہم اور کہیں نہیں گئے۔

دوسرے دن یعنی ۲ر جولائی کا مجھے بے چینی سے انتظار تھا کیونکہ اس دن ہمیں یعنی باہر سے آئے ہوئے تمام مہمانوں کو مفتی ضیاء الدین بابا خان (خانوف) ابن ایشان بابا خان سے ملنا تھا، انھوں نے ہمیں پرانے تاشقند میں بڑا خان مدرسہ میں جس کے قریب ہی ان کی رہائش ہے، مدعو کیا تھا، ہم لوگ پرانے تاشقند

کی سڑکوں سے گذرتے ہوئے جنہیں نئے تاشقند کی چوڑی سڑکوں کے مقابلے میں گلیاں ہی کہا جا سکتا ہے، دس بجے وہاں پہنچے۔ یہ گلیاں صاف ستھری تھیں جن کے دونوں طرف پرانی وضع کے مکان تھے بعض مکان دو منزلہ بھی تھے، مکانوں کے صحن میں سیب، شفتالو اور زبی کے درخت، پھلوں سے لدے کھڑے تھے اور انگور کی بیلیں بھی انہیں کی خوش ذوقی کی ترجمانی کر رہی تھیں، ہماری موٹروں کے قافلے کے استقبال کے لیے گھروں کے باہر مرد عورتیں اور بچے کھڑے تھے، اپنے قومی لباس میں، یہاں بیشتر عورتوں اور لڑکیوں کے لباس میں جو بات نمایاں تھی وہ تنگ پائچوں کی اونچی شلوار اور لمبے کرتے یا فراکیں تھیں، نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کے سر پر اسکارف اور بوڑھی عورتوں کے سر پر چادر جس سے چہرے کا ایک حصہ ڈھکا ہوا۔ چھوٹے بچوں کے سر عام پر استرے سے منڈے ہوئے۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ مردوں میں یہاں لمبے بالوں کو پسند نہیں کیا جاتا، ہاں عورتیں اپنے بال توجہ سے بڑھاتی ہیں۔ براخاں مدرسہ کے اونچے دروازے پر پہنچے تو ہمارا شاندار استقبال ہوا۔ یہ مدرسہ سولھویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی عمارت قابل دید ہے۔ اب اسی مدرسہ میں وسط ایشیا اور قزاقستان کے مسلم مذہبی بورڈ کا دفتر ہے۔ مدرسے کے ایک خوبصورت بڑے کمرے میں جس کی دیواروں پر قدیم طلاکاری کے بہترین اور دیدہ زیب نقش دیکھنے کو ملے، مفتی صاحب سے ہماری ملاقات ہوئی، ان سے مل کر طبیعت خوش ہوئی، تدبر، دانش مندی اور تواضع و انکسار کے پیکر، چہرے پر عبادت و ریاضت کی تابانی اور وضع قطع سے علم دین کے اچھے ترجمان، سلام و کلام اور تعارفی مراسم کے بعد وہ ہمیں مدرسے سے متصل ٹیلہ شیخ مسجد دکھانے لے گئے جس کا صحن بہت وسیع ہے، مسجد خاصی بڑی ہے اور مسقف حصہ کافی ہوادار، اس کے ایک طرف مہمانوں کے لیے کمرے بنے ہیں اور امام و موذن وغیرہ کے کمرے بھی ہیں، ایک طرف طہارت خانہ اور وضوخانہ ہے، بڑے صاف ستھرے، وضوخانے میں قدیم طرز کے صراحی نما بڑے اور وزنی لوٹے جن میں ایک طرف دستہ اور دوسری طرف ٹونٹی۔ مسجد ہی کے احاطے میں ایک طرف کتاب خانہ (لائبریری) ہے جس میں کوئی پچیس ہزار منتخب کتابیں ہیں، یہاں وہ قدیم مخطوطے دیکھنے کو ملے جو بڑی محنت اور توجہ سے جمع اور محفوظ کئے گئے ہیں، میں نے اس کتاب کتاب خانے میں خاصا وقت گذارا، باہر نکلا تو سبز چائے کا ایک دور ہو چکا تھا، دوسرے کی تیاری تھی، بابا خان نے مجھ سے پوچھا کہ کہاں چھپے ہوئے تھے، فوراً چائے منگائی گئی اور "پیالہ گیر" و "خوش باش" کی آواز سنائی دی۔ میں نے کہا، جی ہاں، جی ہاں،

ما در پیالہ عکس رُخ یار دیدہ ایم

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر عبدالحسین زرّیں کوب
ترجمہ :۔ ڈاکٹر شعیب اعظمی

فتوت

فتوت یعنی جوانمردی کی تعلیم جس طرح نیشاپوری ملامتیوں کے یہاں دی جاتی تھی۔ وہ خاص طور سے ریا سے پرہیز اور صدق کے التزام پر مبنی تھی۔ ابوعثمان حیری کے شاگرد، ابوعمرو نجید ان اشخاص میں سے تھے جن کے لیے طریقہ ملامت اہل فتوت کی روش سے مربوط سمجھا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ابوعثمان نے اپنی مجلس میں اپنے یاروں سے کچھ نقدی چاہی تاکہ اسے ثغور ــــ کو بھیجیں۔ جب وہ نقدی نہیں مہیا ہوسکی تو رنجیدہ ہوئے اور یاروں کے سامنے رو دیئے۔ رات گئے ابوعمرو ان کے پاس گئے اور دو ہزار درم انھیں پیش کیے۔ ابوعثمان نے انھیں دعائیں دیں اور جب دوسرے روز مجلس میں بیٹھے تو یاروں سے کہا کہ ابوعمرو نے تمام لوگوں کی نیابت کی اور اتنے درم لے آئے، خدا انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ ابوعمرو فوراً ایستادہ ہوئے اور بولے کہ وہ نقدی میں نے ماں سے مانگ کر دی تھی اور وہ رضامند نہیں ہیں۔ پس وہ نقدی مجھے لوٹا دیجئے تاکہ میں انھیں لوٹا دوں۔ ابوعثمان نے حکم دیا اور وہ نقدی انھیں واپس کردی گئی۔ اور لوگ بھی مسجد سے نکل کر چلے گئے۔ جب دوسری رات آئی تو ابوعمرو شیخ کے پاس گئے اور دوبارہ وہ نقدی ان کے سامنے پیش کی لیکن اس بار شیخ سے التماس کرتے ہوئے کہا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کے اور میرے علاوہ کسی اور کو

فاضل مصنف تہران یونیورسٹی۔ ایران میں تاریخ ادبیات ایران کے استاد ہیں اور فاضل مترجم جامعہ کے شعبۂ اسلامیات و عرب ایرانین اسٹڈیز میں ریڈر ہیں۔ یہ مضمون تہران یونیورسٹی کے مجلّہ دانشکدہ ادبیات و علوم انسانی میں "اہل ملامت و راہ قلندر" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

اس واقعہ کی خبر نہ ہو ؟ ابو عثمان ان کی اس ہمت اور اخلاص پر رو دیئے اور سمجھ گئے کہ وہ لوگوں کی مدح وثنا اور شہرت اور قبول عام سے اجتناب برتتے ہیں۔

بے شبہ یہ چیز اہل ملامت کی ایک خاص قسم کی جوانمردی تھی لیکن قدیم صوفیاء بھی بارہا جوانمردی سے موسوم اور منسوب ہوئے ہیں۔ جیسے سُلمی اپنی طبقات الصوفیا کی فہرست میں معروف کرخی (م ۲۰۰ھ) احمد خضرویہ (م ۲۴۰ھ) ابو تراب نخشبی (م ۲۴۵) شاہ بن شجاع کرمانی (م ۳۰۰ھ) ممشاد دینوری (م ۲۹۹ھ) ابو الحسن بوشنجی (م ۳۴۸ھ) ابو العباس دینوری (م ۳۴۰ھ) اور ابو عبداللہ مقری (م ۳۶۶ھ) جیسے معروف مشائخ کو فتوت کے وصف سے متصف کرتے ہیں۔ اور فتوت کے بارے میں مشائخ کے ایک اور گروہ کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ در حقیقت فتوت جو آگے چل کر عامیانہ تصوف کے پہچان کی ایک قسم بن گئی، شروع میں تصوف سے مخصوص نہ تھی اور اس عہد کے نوجوانوں کی اکثریت کے لیے اخلاقی مقاصد کا منتہائے کمال سمجھی جاتی تھی۔ اخلاقی مقاصد کا یہ کمال خاص طور سے شیعی دائرہ کے نزدیکی گروہوں میں کہ جن سے خلافت عباسیہ کے زیادہ تر مخالفین ایک قسم کا ربط ضبط رکھتے تھے، بتدریج رواج پاگیا اور انھوں نے علی ابن ابی طالب کی سیرت اور طریقۂ زندگی کو اُن کے معروف قول " لا فتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار" کو سند بنا کر اس کا مکمل نمونہ سمجھا۔ اس طرح اسلامی فتوّت کا مفہوم اس عربی مروت کے مفہوم سے کہ جس کی اصل جاہلیت تھی مختلف تھا اور یہ فصل مدنی زندگی اور بدوی زندگی کے درمیان منتہائے کمال کے تفاوت پر مبنی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بدوی عربوں کی زندگی کے مقابلے میں رسولؐ کی سیرت اور صحابہؓ کی زندگی کے حالات میں مدنی زندگی مجسم ہوتی تھی اور اس میں فتوّت جھلکتی تھی۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیم کے بارے میں جنھوں نے اپنے شہر میں تمام بتوں کو مسمار کر دیا تھا، قرآن میں فتی اور اصحاب کہف کو جنھوں نے بت پرستوں کے شہر کو خیرباد کہہ دیا تھا، فتیۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ شہروں میں تجارتی کاروبار اور معاملات میں جو اخلاقی اثر قول و قرار کی پابندی کراتا ہے وہ جوانمردی ہی کی اخلاقی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ اور قدرت کے مراجع سے بے نیازی جو کہ شہری حرفت کا لازمہ تھی اور قبیلہ کے شیخ کے بارے میں بدوی زندگی کی پابندی اور عہد کے برعکس تھی۔ یہ بھی اس کی دوسری بنیاد ہے۔ اور یہ دونوں

چیزیں شہری زندگی میں جوانمردی کے مفہوم کے برتے جانے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مدنی زندگی کے ساتھ جوانمردی کے مفہوم کا تعلق ان پیشہ ور گروہوں سے بھی ان کے ربط کی نشاندہی کرتا ہے جو عہد عباسی کے شروع کے عراق میں زیادہ تر گھوڑوں کے مالک رہے تھے۔ یہ بات کہ بعض پیشے کسی حد تک فتوت کے متضاد مانے جاتے تھے، شاید اس خیال کی یاددہانی ہوں جو تیسفون کے مزدیسنوں کی سوسائٹی میں خاص پیشوں کے بارے میں مروج رہا ہے۔ دراصل مزدیسنوں کے خیال میں آج کی زبان میں بعض پیشے مکروہ سمجھے جاتے تھے اور خاص طور سے وہ جو ان کے اعتقاد کے مطابق عناصر کی آلودگی سے پاک ہوتے تھے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ اس تصور کا تسلسل اور رواج اس چیز کا سبب بنا کہ ساسانی معاشرہ کی مانند خراسان اور عراق کی اسلامی سوسائٹی میں بھی کچھ پیشے مکروہ گردانے گئے ہوں گے اور اہل فتوت کی شان سے گرے ہوئے بھی۔

یہ بات بھی کہ پیغمبر صلعم کے چچا زاد بھائی، داماد اور خلیفہ علی ابن ابی طالب اہل فتوت کے مراتب کے سرخیل ہوئے اور انھیں شاہِ مردان کا خطاب دیا گیا، شاید ایک حد تک اس بنا پر تھی کہ مدینہ اور عراق کی عرب سوسائٹی میں وہ پہلے شخص تھے جو ان موالیوں سے ایک قسم کی ہمدردی اور محبت برتتے تھے جن سے اس زمانہ کے پیشہ ور طبقات منسوب تھے اور عرب مسلمان جنگ اور فتوحات کے موقعوں کے علاوہ کسی اور کام کے لیے انھیں اپنی شان کے مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ جس طرح ابو لولو فیروزی کے ہاتھوں حضرت عمرؓ کے قتل ہو جانے کے نتیجہ میں انھوں نے کوشش کی کہ عبید کو ہرمزان کے قاتل کی حیثیت سے سزا دیں اور دین کے کام میں لحاظ، تکلف اور رعایت کو نظرانداز کر دیں اہل فتوت کے ساتھ سلمان فارسی کا رشتہ بھی مدائن میں پیشہ ور طبقات کی انجمنوں سے ان کی نسبت کو ایک طرف شیعوں کے ساتھ طریقہ فتوت کے مستحکم تعلقات اور دوسری جانب دوسرے پیشہ ور طبقات کے درمیان ربط کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ غلط نہیں ہے کہ اخوان الصفا، قرامطہ اور اسمٰعیلی بھی پیشہ ور طبقات کی انجمنوں سے وابستہ رہے ہیں اور ان سے ایک قسم کا خفیہ تعلق قائم رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ابومسلم خراسانی نے جس سے منسوب روایات میں اب بھی ایک مخصوص ایرانی جواں مرد کا قیافہ دیکھا جا سکتا ہے۔ خلافت اُمویہ کو جو موالیوں کے خیال میں ایک بزدلانہ تعدّی اور ظلم کا

نشان بھی، خاص طور سے ایک ایسے لشکر کی طاقت سے ختم کر دیا جو خراسان کے پیشہ ور دیہات کے طبقات سے مرکب تھا اور جنھیں عرب اشراف طعنہ سے سراجان یعنی زین گر یا سائیس یا بیطار کہا کرتے تھے۔ بعد میں کیا عراق اور کیا خراسان دونوں ملکوں میں پیشہ ور طبقات اپنی خاص صنعتی انجمنیں رکھتے تھے اور اپنے عہد کے واقعات میں قابل توجہ نقوش مرتسم کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یعقوب لیث صفار، عبداللہ خجستانی اور عمر لیث جیسے سرداروں نے جو انھیں طبقات سے وابستہ تھے۔ ابومسلم کی کچھ روایات اور قدروں کو اسی شکل میں باقی رکھ لیا اور شاید اسی کی طرح حضرت ابراہیم اور اصحاب کہف کی فتوت کو محفوظ رکھ سکے تھے۔

بہرحال جوانمردی تاریخ کے مختلف ادوار اور حالات کے تقاضوں کے مطابق مختلف شکلیں اختیار کر چکی ہے۔ اور یہی بات اس کی تحقیق میں مشکلیں پیدا کرتی ہے۔ پیشہ ور طبقات سے اہل فتوت کا تعلق بھی اس قسم کا نہیں رہا ہے کہ وہ مختلف طبقات کو ایک دوسرے سے جدا رکھیں بلکہ ان کا مقصد زیادہ تر یہ رہا ہے کہ مختلف اصناف اور تمام پیشہ ور طبقات کے درمیان اتصال اور پیوند کی ابتدا ہو۔ جیسے کہ قدیم صوفیا کی تعلیم تھی، اہل فتوت کا طریقہ بھی بہت سے اسباب کی بنا پر اہل ملامت کے شیوہ کی یاد آوری تھا۔ ابوجعفر یزدانیار اپنی روضۃ المریدین کے ۳۷ ویں باب میں لکھتے ہیں کہ لوگوں نے ایک صوفی سے پوچھا کہ (فتی) جوانمرد کون ہے؟ کہا وہ نہ تو جس کے دل میں ادعا ہو اور نہ اس کے ظاہر میں تصنع اور ریا یعنی جس طرح وہ راز جو اس کے اور خدا کے درمیان ہے اگر اس کا دل خود ہی با خبر نہیں تو خلق کو کیا ملے گا؟ جواں مردی کی اس قسم کی تعبیر اس تعریف سے مختلف نہیں ہے جو صوفیا نے اہل ملامت کے باب میں کی ہے۔ اور خود ان کے ابتدائی اتحاد اور تعلق کی نشاندہی کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ابوحفص نیشاپوری ایک بار عراق گئے اور وہاں کی ایک مجلس میں جس میں جنید اور عراق کے تمام صوفیا تشریف فرما تھے جوانمردی کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔ جب ابوحفص نے کہا کہ جواں مردی عبارت ہے انصاف کرنے اور انصاف نہ چاہنے سے تو جنید نے اپنے ساتھیوں سے کہا اٹھو چلو کہ ابوحفص نے آدم اور اس کی تمام ذریت پر سبقت حاصل کر لی یعنی جوانمردی میں بازی لے گیا۔ فتوت کی یہ تعریف جو ملامتیوں کے شیخ نے اس باب میں بیان کی ہے درحقیقت اہل ملامت کی اس

روش کی تعریف ہے کہ جس کی تمام تر بنیاد اس پر تھی کہ یاروں کی ستائش کریں اور اپنے آپ کو ملامت کریں۔ اپنے لیے تکلیف چاہیں اور دوسروں کے لیے آرام۔ اگر بعد میں بعض اہلِ فتوت نے اس کے برعکس عمل کیا ہے تو در حقیقت ان کا یہ عمل راستہ سے ایک قسم کا انحراف اور حد سے گذر جانا رہا ہے اور جیسے کہ بعض محققین نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جوان مردی کی بنیاد دعوے اور نمائش پر رہی ہے اور ملامت کی بنیاد خاکساری اور ادعائی پر۔

اس صورت میں ان کے درمیان ارتباط نہ صرف بعید نہیں بلکہ مسلّم بھی ہے۔ جیسے کہ احمد خضرویہ جنھیں قشیری اور شعرانی نے اہلِ فتوت میں شمار کیا ہے اور ہجویری کے خیال میں جن کا طریقہ اہل ملامت کا طریقہ کہا گیا ہے۔ اور حمدون قصّار نے بھی جو کہ نیشاپور میں طریقہ ملامت کے مروّج کہے گئے ہیں، ایک بار نوح عیّار سے گفت و شنید کی اور ان کی گفتگو کا موضوع جوانمردی تھا۔ قدیم صوفیا میں شاہ شجاع کرمانی بھی بظاہر اہل ملامت کے قدیم مشائخ اور اہلِ فتوت کے درمیان ایک واسطہ تھے جو بقول خواجہ عبد اللہ انصاری، اجلہ فتیان یعنی عظمائے جوانمرداں تھے اور حتیٰ امام اور حکیم بھی کہے جاتے تھے، مانند اہلِ ملامت نام و نمود اور ریا سے عاری تھے۔ نہ صوفیوں کا خرقہ پہنتے تھے اور نہ ہی زاہدوں کی عبا۔ عوام کی طرح معمولی قبا پہنتے تھے اور ان کے بعض ساتھی کردوں کی گدڑی یا سپاہیوں کے چست چلتہ تک پہن کر باہر نکل آتے تھے۔ اس طرح ایک حد تک ان کی تعلیم پشمینہ پوشی پر معترض ہونے پر مبنی تھی۔ کہتے ہیں کہ ابو عثمان حیری ان کے شاگرد تھے اور بعد میں شیوخ اہل ملامت میں سے ابوحفص نیشاپوری سے متعلق ہو گئے۔ وہ خود ابوحفص سے ایک انجانی ملاقات میں نیشاپوری شیخ کی تعریف و تعجیب کا سبب بنے۔ کہتے ہیں کہ ابوحفص نے جس وقت یہ دیکھا کہ ان کے اندر صوفی کی علامات نہیں ہیں لیکن تعلیماتِ صوفیہ کا بیان کرتے ہیں تو حیران رہ گئے۔ لیکن شاہ نے ان سے کہا کہ "ہم نے عبا میں جو تلاش کیا وہ قبا میں پا گئے" باوجود اس کے کہ متعدد روایات کے مطابق وہ خود "ملوک کی اولاد" میں شمار ہوتے تھے، ایسے سادہ اور بے تکلف تھے کہ ان کی ہیئت اور ان کا لباس ملامتی مشائخ کے لیے بھی عجیب و غریب نظر آتا تھا۔ یحییٰ بن معاذ رازی کے ایک رسالہ کی رد میں جس میں انھوں نے دعویٰ کیا تھا کہ تونگری درویشی سے بہتر ہے انھوں نے ایک رسالہ لکھا اور واضح کیا کہ جو کچھ

بہتر ہے وہ درویشی ہے ہے۔ اسی طرح ان کی جوانمردی طریقہ اہل ملامت کے عنوان سے دی جانے والی ابوحفص نیشاپوری اور حمدون قصار کی تعلیم سے مختلف نہیں تھی اور یہی وجہ تھی کہ ان کا شاگرد نیشاپور میں اہل ملامت کے شیخ کے نزدیک اپنی تہذیب و تربیت حاصل کر سکا۔ وہ بھی اہل ملامت کے مانند یہ تعلیم دیتے تھے کہ جوانمرد کو چاہئے کہ اپنے کو درمیان میں نہ دیکھے اور اپنے اوپر یا اپنے کردار پر غرور نہ کرے۔ ابوعثمان حیری سے بھی، جو کہ بیک وقت ان سے اور ابوحفص حداد سے نسبت رکھتے تھے، لوگوں نے پوچھا کہ جواں مرد کون ہیں؟ کہا وہ جو اپنے آپ کو نہ دیکھیں۔ بے شبہ یہ طرزِ فکر اہل ملامت کے مشربِ نفس کو نادیدہ تصور کرنے والے طریقہ کے صوفیا سے نزدیک تر کرتا ہے اور اہل حرفہ کی جوانمردی کو ایک خاص رنگ دیتا تھا لیکن خلیفہ ناصر کی نیم فوجی اور نیم اشرافانہ جواں مردی جو مغل عہد میں شام، عراق اور مصر میں رواج پا گئی، قدرتی طور پر اتنا رواج نہ پا سکی ہوگی۔

درحقیقت طریقۂ جواں مردی کی تنظیم و ترویج میں ناصر خلیفہ (م ۶۲۲ھ) کی کوششیں زیادہ تر جوانمردوں کی تنظیمی قوت، اور مخالف امرا اور حکام کی طاقت کے برخلاف ان کو مسلح کرنے کے استفادہ پر مبنی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ یہ بات جوانمردی کو ایک قسم کا اشرافانہ اور سرکاری رنگ بھی دیتی تھی اور اسے شوالری کے اخلاقی نظام سے نزدیک تر کرتی تھی لیکن بہرحال خلیفہ کا یہی منصوبہ صوفیا جوانمردی کی پرانی روایات اور اقدار کے احیاء اور حفاظت کے لازمی جز سے عبارت تھا۔ اگرچہ خلافتِ عباسی (۶۵۶ھ) کے ساتھ یہ ناصری جوانمردی عراق میں دم توڑ گئی لیکن سلاجقہ روم کی سلطنت میں اسی طرح جاری و ساری رہی اور اس کا حاصل فتوت کے آداب و آئین میں فتوت ناموں کا ایک سلسلہ تھا۔ بہرحال وہ جوانمردی جو خلیفہ ناصر نے شروع کی، ایک قسم کی سیاسی تنظیم سمجھی جاتی تھی، مختلف مملکتوں کے سلاطین، امراء اور اعیان سلطنت جن پر ناصر خلیفہ اپنا اثر رکھتا تھا، اس سے نسبت پا گئے اور آہستہ آہستہ اس سے ایسی چیز ظہور میں آئی جو یورپ کے قرون وسطی کے فوجی نظام سے مشابہ تھی۔ اس قسم کے جواں مردوں کے حالات صرف نمائش اور مبالغہ آرائی پر مبنی تھے اور یہی بات حقیقی جواں مردی کے لوازم کے زوال کا سبب بنی۔

ایک قابل توجہ چیز جو اس زمانہ میں اہل فتوت سے جدا ہو گئی اور جداگانہ حیثیت سے

تصوف کی آغوش میں وسعت اور فروغ پا گئی، وہ ورزش گاہوں میں برتے جانے والے اخلاق و رسوم سے تعبیر ہوئی۔ ورزش گاہوں کے اخلاقی مقاصد کا یہ کمال آج بھی جوانمردی کی اس نشانی کو رائج کئے ہوئے ہے اور جس کی بنیاد بزرگ استادوں کے احترام اور پیش کسوت، میاندار اور کہنہ سوار جیسے پہلوانی القاب کے مراتب کی رعایت پر مبنی ہے چنانچہ اس حلقہ میں تصوف کی نشانیوں میں لفظ مرشد کی یاد آج بھی باقی رکھی گئی ہے۔ لیکن جو کچھ خاص طور سے ورزش گاہ کو لنگر اور خانقاہ سے مربوط کرتا ہے وہ خوارزمی پہلوان محمود پوریائے ولی کی یاد سے وابستہ ہے۔

کشتی گیری اور طریقۂ جوانمردی کے مابین تعلق کے سلسلہ میں شاید قدیم ترین مآخذ وہ دلچسپ باب ہے جو حسین کاشفی نے اس بارے میں اپنی کتاب فتوت نامہ سلطانی میں لکھا ہے۔ اس زمانہ کے پہلوانوں کے حالات کی ایک زیادہ جاندار تصویر زین الدین محمود واصفی کی کتاب بدائع الوقائع میں دیکھی جا سکتی ہے، جو سلطان حسین بالقیرا کے عہد کے بارہ میں ہے۔ سلطان حسین بالقرا کے پہلوانوں میں ایک نامور پہلوان محمد سعید نام کا تھا جو اپنے زمانہ کے اکثر علوم و فنون میں طاق تھا اور قلندرانہ شاعری بھی کیا کرتا تھا۔ اس کی بہن کا بیٹا بھی جس کا نام درویش محمد تھا ایک نامی پہلوان تھا اور اس کا سلسلہ نسب دونوں طرف سے خواجہ عبداللہ انصاری اور شیخ ابوسعید ابوالخیر تک پہنچتا تھا اور یہ دونوں پہلوانی کے ایام میں درویش اور اہل فقر بھی شمار ہوتے تھے۔ امیر علی شیر اپنی مجالس النفائس میں پہلوان محمد ابوسعید کو "پیشوائے اہل فقر" کے عنوان سے یاد کرتا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اکھاڑوں کی روایات اور اہل فقر کے شیوہ کے درمیان قدیم روابط قائم رہے ہیں۔

بہرحال اکھاڑوں کی رسم میں پوریائے ولی کے وجود میں عرفان اور جوانمردی کے مدعائے کمال کی ایسی تجسیم ہوئی کہ آج بھی پہلوان اس کے نام کی قسم کھاتے ہیں اور اکھاڑوں میں زور کرنے سے پہلے "یا پوریائے ولی کا" وظیفہ پڑھتے ہیں۔ اس بوڑھے پہلوان کے حالات زیادہ تر افسانوں کی تاریکی اور خرافات میں داخل ہو گئے ہیں، لیکن یہی کہانیاں ٹھیک اسی صورت میں قدیم ایرانی معاشرے میں ایک جوانمرد صوفی کا منتہائے کمال سمجھی جانے والی تصویر کا پتہ دیتی ہیں۔ افسانوں نے اس کے نام تک کو اپنے اندر سمو لیا ہے کیونکہ عام شہرت کی بنا پر اس کا

اصل نام محمود یعنی محمود خوارزمی پہلوان رہا ہے لیکن وہ کیوں پوریا کہا گیا ہے؟ یہ واضح نہیں ہے اور اس لفظ کو بعضوں نے پوربائی لکھا ہے اور بتایا ہے کہ اس کے والد بائی یعنی بیگ کا لقب رکھتے تھے اور اسے اسی وجہ سے اس نام سے پکارا ہے۔ بعضوں نے بگ یار بھی کہا ہے کیونکہ اس میں بھی نام کا پہلا حصہ وہی بگ لفظ ہو سکتا ہے۔ دوسرے اسباب کی بنا پر اسے بوکیار اور برباید کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے اور جن کا قبول کرنا مشکل ہے اور صحیح نہیں کہا جا سکتا کہ اصل لفظ کیا ہے؟ اور اگر مجالس العشاق کی روایت جو دوسری شہادتوں کے معاملہ میں افسانہ آمیز ہے۔ اس بارے میں صحیح تسلیم کرلی جائے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ایک بات کا پتہ لگانے کی کوشش میں جو کہ اپنے ایک غیر معروف مقابل سے دیدہ و دانستہ شکست کھا جانے کی صورت میں واقع ہوئی اور جس کی طرف آئندہ صفحات میں اشارہ کیا جائے گا، اس نام سے پکارا گیا۔
بہرحال جو کچھ اس کے نام میں مشہور ہے وہ پوریا ہے یعنی پوریائے ولی۔ لیکن تذکروں میں جا بجا اسے قتالی یعنی قتّالی خوارزمی کہا گیا ہے اور اس تخلص کی نسبت اس کے پہلوانی نام سے ظاہر ہے۔ خوارزم میں اسے محمود آتا اور پہلوان آتا (عطا نہیں) بھی کہتے تھے جو محمود بابا اور پہلوان بابا کے مرادف کہا جاتا ہے۔ اور یہ احتمال ہے کہ لفظ پوربا بھی انھیں معنوں میں ہوگا یا اسی سے ملتا جلتا ہوگا۔ اس کے احوال کے مآخذ میں نفحات جامی، بائقرا کی مجالس العشاق، صفی کی لطائف الطوائف اور جعفر بدخشی کی خلاصۃ المناقب کے علاوہ ہدایت کی ریاض العارفین بھی ہے اور طرائق الحقائق کا مآخذ بھی وہی ہے اور غالباً علامہ قزوینی اس سے متعلق جو تردید ریاض العارفین کے مندرجات کے بارے میں کرتے ہیں اسے بہت زیادہ توجہ کے قابل نہیں سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ ہدایت نے یہ معلومات خوارزم میں اپنی تقرری کے دوران مقامی مآخذ میر عبدالکریم جیسے رسائل اور کچھ سنے سنائے واقعات اور ذاتی مشاہدات سے اخذ کی ہوں گی جس طرح اس کی تاریخ وفات کے بارے میں بھی جیسے وہ ۷۲۲ھ بتاتے ہیں، ٹھیک یہی تاریخ مجالس العشاق میں بھی دی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ ہدایت نے خود اسے نہیں بنایا ہے۔ جامی بھی جو کہ نفحات الانس میں ظہیر الدین خلوتی کے حالات کے ساتھ اس کے اور شیخ محمد خلوتی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، اس قسم کا بیان دیتے ہیں کہ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ظہیر الدین خلوتی اپنے استاد کے چالیس پچاس

سال بعد فوت ہوا ہوگا تو شیخ محمد خلوتی کی وفات آٹھویں صدی کے ابتدائی ثلث میں واقع ہوئی ہوگی تو اس صورت میں اس کے نزدیک دوسرے شاگرد پوریائے ولی کی تاریخ وفات ۷۲۲ھ کو تسلیم کر لینے میں کوئی مشکل نہ ہوگی۔

جوانمردی اور پہلوانی کی خصوصیت کے علاوہ پوریائے ولی جس کے وجود میں فکر ملامت اور جوانمردی کے امتزاج کا ایک متوازن خاصہ تھا۔ صوفیانہ ادب کے لحاظ سے بھی قابل ذکر ہے۔ نہ صرف اس کی رباعیات اور قطعات کا کچھ حصہ بچ رہا ہے بلکہ چند غزلیں جن میں سے ایک مجالس العشاق میں بھی مذکور ہے، اس سے منسوب ہیں۔ اس کے علاوہ کنز الحقائق نام کی ایک مثنوی کو بھی اس سے منسوب کیا گیا ہے۔ اور جیسے ٹھیک اسی صورت میں شیخ عطارؔ اور اسی طرح شیخ محمود شبستری سے بھی نسبت دی گئی ہے۔ یہ ایک نظم ہے جو گلشن راز کے طرز اور وزن میں ہے لیکن خیال اور گہرائی میں اس پایہ کی نہیں۔ بظاہر اس بنا پر کہ اس کے بعض اشارے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والا محمود نامی ہے اسے شیخ شبستری سے جو کہ پوریائے ولی کے معاصر بھی رہے ہیں، نسبت دے دی گئی ہوگی، دوسرے قرائن اور شواہد کے اضافہ کے ساتھ اسی محمود نام کی نسبت عطار سے صرف اس لیے کہ شاعر کا طرز بیان کہیں کہیں ان کے طرز سے مل جاتا ہے، اس مفروضہ کو رد کر دیتا ہے۔ کیونکہ حقائق دین، تحقیق اسلام کے عنوان کے تحت طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد، نفس، شیطان بہشت، دوزخ، صراط، حشر و نشر اور ان کے علاوہ دوسری چیزیں بیان کرنے میں شاعر کا انداز تلقین اس سے زیادہ سادہ اور عامیانہ ہے کہ جسے صاحب گلشن راز محمود شبستری سے نسبت دی جا سکے۔ استاد سعید نفیسی بھی مضبوط دلائل کی بنا پر اس کی نسبت عطار سے رد کرتے ہیں لیکن ان دلائل میں ایک اور عطار یعنی عطار تونی یا ہمدانی کے بارہ میں ان کی دلیلیں کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں ہیں۔ کتاب کے متن ہی میں اگر اس "امیر المومنین" اور "غازی" کو کہ جسے شاعر اس انداز میں یاد کرتا ہے جیسے بہت آسانی سے "اکھاڑے کے ایک پہلوان" کا انداز کہا جا سکتا ہے اور اس کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ کندبا کا فران "شمشیر بازی" تو اس چیز کو دلچسپی کے طور پر بھی اس زمانے کے خوارزمی میں سے کسی ایک سے بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ۷۱۰ھ کی تاریخ بھی جو کتاب کے منظوم ہونے کے بارے میں دی گئی ہے پوریائے ولی کے زمانۂ حیات سے بالکل ملتی ہے اور جب ہدایت اور دوسرا

اور مجالس العشاق کے مصنف بھی کتاب کو اسی سے منسوب کرتے ہیں تو جب تک کہ کوئی قابل تائید سند اس انتساب کی مخالفت میں ہمارے ہاتھ میں نہیں آتی ہے اس وقت تک کنز الحقائق کو پوریائے ولی کی تصنیف سمجھا جا سکتا ہے۔

بموجب روایات، جوانی کے زمانہ میں اس کی جسمانی طاقت ایران اور توران کے تمام پہلوانوں پر غالب آجانے کا باعث ہوئی اور ضعیفی کے دنوں میں وہ روحانی طاقت جو اس کے اندر تھی اس عہد کے تمام اولیا اور زہاد پر برتری حاصل کرنے کا سبب بن گئی۔ کہتے ہیں کہ جو بات اسے معنوی دنیا میں لانے کا سبب بنی وہ یہ تھی کہ (جونی کی مجالس العشاق کے مطابق) وہ بنگال گیا جہاں کا بادشاہ دربار میں ایک نامی پہلوان رکھتا تھا اور طے پایا کہ وہ خوارزم کے پہلوان سے کشتی لڑے اور پنجہ آزمائی کرے۔ یہ پہلوان جو کہ محمود کے مقابلے میں اپنے آپ کو سمندر میں قطرہ کے مانند دیکھ رہا تھا، انتہائی پریشان ہو گیا۔ اسی سبب سے کوشش کی تاکہ نذر و نیاز کی پیشکش اور دعا اور گریہ وزاری کے ذریعے دشمن پر غالب آجائے۔ اس کی ماں نے حلوہ تیار کیا اور مسجد میں لے گئی اور اہل مسجد سے خواہش ظاہر کی کہ وہ کھائیں اور اس کے لیے دعا کریں۔ خوارزمی پہلوان مسجد میں تھا اور بوڑھی عورت جو اسے نہیں پہچانتی تھی، حلوہ کا برتن اس کے سامنے لے گئی اس سے ایک لقمہ کھانے کی درخواست کی اور اپنے فرزند کی کامیابی کے لیے دعا کی خواہش ظاہر کی۔ پہلوان نے دریافت کیا کہ اس نذر کا سبب کیا ہے؟ اور تمہاری نیاز کیا ہے؟ پھر میں دعا کروں۔" پیرزن گویا ہوئی کہ میں چند عزّہ کے ساتھ اس شہر میں بادشاہ کی داد و دہش پر گذارہ کرتی ہوں۔ اگر خوارزمی پہلوان میرے فرزند زمین پر دے مارے گا تو اس کا وظیفہ بند ہو جائے گا اور ہم سب روزی سے محروم ہو جائیں گے۔

صاحب مجالس العشاق کی ایک دوسری روایت کے بموجب جس مقررہ دن کو بادشاہ کے حضور میں کشتی لڑی جانے والی تھی، اس سے ایک دن قبل پہلوان گورستان کی زیارت کو گیا اور اچانک ایک قبر کے قریب پہنچ کر ایک عورت کو سربسجود دیکھا جو خدا کے حضور گریہ وزاری میں مصروف کہہ رہی تھی میرے بیٹے کو سرخرو فرما تاکہ کل وہ خوارزمی پہلوان کو زیر کر دے۔ ایک اور روایت جو مجالس العشاق کا بیان کردہ ہے وہ یہ ہے کہ محمود پہلوان کشتی لڑے جانے والے دن سے قبل کی شب اپنے حریف کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کے ارادے سے اس پہلوان کے گھر کی چھت پر رات گئے آیا اور اس

کی ماں کو گریہ وزاری میں مشغول پایا۔ بہرحال یہ خیال کر اس کشتی کا کوئی بھی نتیجہ حریف کی تشویش اور اس کی ماں کی پریشانی کا باعث ہوگا۔ پہلوان کے دل پر بہت اثر کر گیا۔ کہتے ہیں کہ اس نے پیرزن سے جس نے مسجد یا قبرستان میں انجانے پہلوان سے گفتگو کی تھی۔ تسلی آمیز بات کی اور کہا کہ رنج نہ کر تیرا مقصد حاصل ہوگا۔ دوسرے روز جب دونوں مقابل آمنے سامنے آئے تو محمود پہلوان تماش بینوں کی حیرت زدہ نگاہوں کے سامنے چت ہوگیا۔ اور مقابل سب کی نگاہوں کے سامنے تحسین و آفرین کا سہرہ پہن بیٹھا۔ دوسرے روز بادشاہ شکار کو نکلا اور ایک درّہ کی بلندی کے کنارہ پہنچ کر جب کہ نزدیک تھا کہ اس کا گھوڑا درّہ کے اندر لڑھک جائے اور بالکل اسی وقت جب کہ اس کے گھوڑے نے اپنے پیر اٹھالیے تھے اور کھاڑی میں گرنے والا ہی تھا کہ محمود پہلوان جو بادشاہ کے ہمرکاب تھا اسی حال میں گھوڑے کو تھامے رہ گیا بادشاہ جو اپنے فاتح درباری پہلوان میں اس طاقت کا نام ونشان بھی نہ پاتا تھا، محمود پہلوان کی اس قدرت اور طاقت پر حیرت زدہ ہوگیا اور سمجھ گیا کہ ہندی پہلوان کے ہاتھوں اس کی شکست عمداً اور جوانمردی کا لحاظ کرتے ہوئے ہوئی ہے۔ یہ داستان جو غالباً افسانوی عنصر سے خالی نہیں ہے اکھاڑوں کے افراد کے طرز تلقین کو صوفیانہ جوانمردی اور اس کے لوازم کی طرف کاملاً اشارہ کرتی ہے۔

سید علی ہمدانی کے حالات کے بارے میں جو باتیں جعفر بدخشی کی خلاصۃ المناقب میں بیان کی گئی ہیں اس کے مطابق پہلوان محمود اہل ملامت میں شمار ہوا ہے اور کبھی کبھار وہ میخوانوں تک میں بھی گیا ہے لیکن وہاں رندوں سے توبہ اور استغفار کی باتیں کی ہیں اور خود اس طرح رویا ہے اہل خرابات اس کے اثر سے رو دیئے ہیں اور اس روز میخوار اور ساقی پاکیزہ اور طاہر رہے ہیں اور ہنگاموں کو خیرباد کہہ بیٹھے ہیں۔ اس کے آخری وقت کے حالات کے بارے میں لطائف الطوائف میں ایک روایت بیان کی گئی ہے جو ایک ملامتی کی جوانمردی کے اخلاص جویانہ اور شاعرانہ ذوق کے طرز تفکر کی حکایت بیان کرتی ہے۔ روایت میں ہے کہ جس وقت وہ بستر مرگ پر تھا کسی نے اس سے پوچھا! مخدوم یہ وقت رخصت ہے آپ کا دل کیا چاہتا ہے؟ جواب میں ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ "سوائے دیدار الٰہی کے کسی اور چیز کا آرزومند نہیں ہوں اکھاڑے کے قواعد وضوابط اور رسوم میں بے شبہ طریقۂ جوانمردی کا اثر محسوس ہوتا۔

لیکن جوانمردی کی یہ میراث صرف پہلوانی کے اداروں تک ہی محدود نہ رہ گئی بلکہ اس کا کچھ حصہ لوطیوں (آزادہ رووں) اور داس مشدیوں (امام رضا کے سرمست زائرین کا گروہ) کے طبقہ میں بھی پہنچ گیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس گروہ کی جوانمردی لشکریوں کی جوانمردی کی باقیات کا حصہ ہیں اور ان کے یہاں جوانمردی کی ترویج ناصری فتوت کی ایک یادگار رہے۔ ناصری جواں مردی کے طریقہ کو شیخ شہاب الدین سہروردی کی سرکاری مسافرت اور سلاجقہ روم کی سلطنتوں میں ناصر خلیفہ کے اثرات نے مشتہر کیا اور مصر میں بھی عباسیوں کی باقیات، جو کہ سقوطِ بغداد کے بعد مصر میں مدتوں تک ممالیک حکام کی حمایت کے زیر اثر ایک قسم کی برائے نام خلافت چلاتے رہے تھے اسی طرح اس کی تشہیر کرتے رہے۔

آل عثمان بھی، اخیوں اور اناطولی جوانمردوں کو اپنے عروج پر پہنچنے کے لیے ایک زینہ کی مانند استعمال کرتے رہے۔ ان میں سے بعض، مخصوصاً اس کے بعد بھی جب کہ انھوں نے خلافت کے نام کو اپنی سلطنت کے نام کا جز سمجھا، ناصری فتوت کے وارث بن بیٹھے۔ لیکن یہ جوانمردی اکثر و بیشتر صرف اشرافانہ وضع کی حامل تھی اور غالباً اعلیٰ طبقات ہی اس سے نسبت رکھتے تھے۔ اس صورت میں جب کہ جوانمردی صرف پیشہ اور صنعت گروں کے حلقہ سے مربوط تھی اور اگرچہ بعض عثمانی سلاطین اس سلسلہ میں اشرافانہ حمایت کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی مشترک دلچسپی رکھتے تھے پھر بھی اس قسم کی جوانمردی غالباً شیعی میلان کا رنگ رکھتی تھی اور کبھی کبھار ابومسلم خراسانی کی یاد تک سے مربوط ہوجایا کرتی تھی۔ شاید یہ بات بھی کہ سراجوں کا طبقہ ان کی تشکیلات میں ایک خاص وقعت اور اثر حاصل کر گیا تھا ایک حد تک ابومسلم کی یادگار کے ساتھ اسی ربط کی بنا پر متعلق ہو کر افسانے اس کی شخصیت کو اسی پیشہ سے منسوب کرتے تھے۔ شیخ صفی الدین اردبیلی کے اخلاق و اطراف میں اہل فتوت دراخیوں کی ایک بڑی تعداد کی موجودگی اور یہ چیز بھی کہ شاہ اسمٰعیل صفوی اپنے ترکی دیوان میں خود "اخی" نام کو اپنے ہمدردوں اور فرماں برداروں کے لیے استعمال کرتا ہے، پیشہ ور جواں مردوں اور اطولیہ کے شیعوں اور قزلباشوں کے مابین ارتباط کا پتہ دیتی ہے۔ "فتوت نامہ کبیر" جو سید علاؤ الدین امین سے منسوب ہے اور ۹۳۱ھ کے آس پاس میں لکھی گئی ہے، قلمرو عثمانی میں پیشہ وروں کی (جوان)مردی سے متعلق عمدہ رسائل کے مآخذ میں شمار ہوتی ہے اور جس میں شیعی رجحان کے رنگ کی

عام جوانمردی پائی جاتی ہے۔ ہندوستانی مغلوں کی سلطنت میں بھی "کسب نامے" مروج تھے جن میں بالکل اسی قسم کا شیعی رجحان نظر آتا ہے۔ پیشہ ورگروہوں کے تعلیم نامے یا سوال وجواب نامے جو ہند اور ماورا ءالنہر کے علاقہ میں اس وقت کی صنعتوں کی انجمن یا اداروں میں موجود تھے اور اس کی حفاظت اور نگرانی اس طبقہ سے متعلق افراد کی مذہبی اور اخلاقی ذمہ داریوں میں شمار ہوتی تھی، غالباً "رسالہ" کہے جاتے تھے اور ان کی تعلیم کا لُب لباب بھی جوانمردی کے آداب سے تعبیر کیا جاتا تھا انھیں رسالوں میں رسالہ نساجان اور رسالہ سقایان جیسے دوسرے رسائل کی تحقیق سے ان طبقات اور صوفی مشائخ کے درمیان روابط کا پتہ چلتا ہے۔ یہ رسالے ان خاکسار درویشوں کے رسالوں کی یادآوری ہیں جنھوں نے پیشہ ور طبقات کی مانند اپنے رسالوں کی حفاظت اور نگہبانی بھی ایک قسم کی روحانی اور مذہبی ضرورت سمجھی ہے۔ ان سب کے باوجود، صدیوں پہلے قبل اس کے کہ طریقہ فتوت اپنے انحطاط کے دوران جلالی اور خاکساری درویشوں کے طریقہ پر ختم ہو، اہل ملامت کی جوانمردی سے ایک دوسرا فرقہ ظہور پذیر ہوا یعنی ـــــ قلندر

کوائف جامعہ (بسلسلہ صفحہ ۴۸۰)

کے بعد پرویز کی شعری کائنات میں ایک نئی روحانی اور ماورائی انسپریشن اور نئی شعری جہت کا اضافہ ہوا ہے۔ گویا ان کے سینے میں صدیوں کی اسلامی روایت کا بیج پھوٹ کر نور کے ایک پیڑ کی طرح نمو پذیر ہو رہا ہے۔ یہ سارا عمل غیر شعوری معلوم ہوتا ہے۔ موصوف اس وقت ایسے دشتِ تخلیق سے گذر رہے ہیں جس میں دور دور تک کسی پیڑ کا سایہ نہیں اور ان کے تلوے جلتی ریت پر ہیں۔ اگر اسی طرح چلتے اور چلتے رہنا ان کا مقدر رہا تو ان سے ہماری بہت سی توقعات پوری ہوں گی۔

کبیر احمد جائسی

حیاتِ عینی ۔ چند جھلکیاں

سوویتی ۔ تاجکی ادبیات کے بابائے آدم صدرالدین عینی نے اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور دوسرے کوائف کے بارے میں اپنی کتاب "یادداشتہا" اور "مختصر ترجمۂ حال خودم"[1] میں اتنا مواد فراہم کردیا ہے کہ ہم کو کسی دوسرے مآخذ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی یادداشتہا ۲۲×۱۸ سائز کے ۱۴۵۲ صفحات پر مشتمل ہے اور "مختصر ترجمۂ حال خودم" میں عینی کی تحریر اسی سائز کے ۴۶ صفحات پر محیط ہے ۔ اس طرح عینی نے ڈیڑھ ہزار صفحات میں اپنی داستان حیات قلم بند کردی ہے جو صرف ان کی داستان حیات نہیں بلکہ وسط ایشیا کی علمی، ادبی، تمدنی، سیاسی معاشی اور معاشرتی تاریخ بھی ہے ۔ عینی نے ان دونوں کتابوں میں جو معلومات فراہم کی ہیں ان کا ایک ہلکا سا عکس ذیل کی سطور میں پیش کیا جاتا ہے ۔

صدرالدین عینی غجدوان کے ایک دیہات قشلاقِ ساکتری میں ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد ایک معمولی سے کسان تھے ۔ کاشت کے لیے جو زمین ان کے پاس تھی وہ ان کے خاندان کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی نہیں تھی اس لیے ان کے ماں اور باپ دونوں ہی دستی کام کر کے اپنے کنبہ کا پیٹ بھرتے ۔ عینی جب مکتب جانے کے قابل ہوگئے تو ان کو گاؤں ہی ایک مکتب میں داخل کردیا گیا جو قدیم وضع کا تھا ۔ اس مکتب میں دو تین سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کے والد نے ان کو بخارا کے ایک مدرسے میں داخل کردیا ، ابھی عینی کو بخارا آگئے ہوئے ایک ہی سال کا عرصہ ہوا تھا کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا ۔ یہ زمانہ عینی کے لیے انتہائی پریشانی اور عسرت کا

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی، لکچرر شعبۂ اسلامک اینڈ عرب ایرانین اسٹڈیز ۔ جامعہ ملیہ ۔ دہلی ۔

[1] خوش قسمتی سے یہ دونوں کتابیں قدیم تاجکی رسم الخط (فارسی) میں ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ میں موجود ہیں ۔

تھا۔ کوئی ہمدرد تھا نہ مددگار لیکن انھوں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنی تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ عینی کو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے شریف جان مخدوم کی حویلی میں خانگی ملازم کی حیثیت سے کام کرنا پڑا، جہاں ان سے کام تو دس آدمیوں کا لیا جاتا تھا مگر صرف دو وقت کی بچی کچی روٹیاں ہی ان کا صلہ قرار پاتیں۔ شریف جان مخدوم کی ملازمت سے عینی کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ یہاں آنے جانے والے تمام شعرا، ادبا و دانشوروں سے واقف ہوگئے۔ احمد مخدوم دانش کا نام پہلی بار انھوں نے یہیں سنا، شعر فہمی کی تربیت ان کو یہیں ملی لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹ گیا تو وہ مدرسے کے ایک تنگ و تاریک حجرے میں رہنے لگے۔ اسی مدرسے کی تعلیم کے زمانے میں ان کی شناسائی حیرت[1] سے ہوئی جو بڑھتے بڑھتے دوستی اور محبت میں بدل گئی۔ حیرت بڑے باصلاحیت اور اچھے شاعر تھے مگر زندگی کی سختیوں اور محرومیوں نے ان کو سل کے مرض میں گرفتار کر دیا تھا۔ عینی کی تعلیم کے اختتام کا زمانہ تھا جب حیرت کا انتقال ہوا۔ اس حادثے سے عینی بہت متاثر ہوئے، انھوں نے خود لکھا ہے کہ: "میں اپنی ماں کی موت پر نہ رویا تھا مگر حیرت کی موت پر اپنے آنسو نہ روک سکا اور چلّا چلّا کر رو دیا۔"

بخارا کی تعلیم ختم کرنے کے بعد عینی کو سمرقند کے ایک تاتاری مدرسے میں تاجیکی زبان کے استاد کی حیثیت سے ملازمت مل گئی لیکن اس مدرسے میں وہ زیادہ دنوں تک نہ رہ سکے اور اپنے تجربوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنا ایک مکتب کھولا اور اس میں پڑھانے کے لیے خود ایک کتاب لکھی جس کا نام تہذیب الصبیان ہے۔ جب اس مکتب کے سالانہ امتحان کا وقت آیا تو ان کے نواح کے علمار نے ان کے مدرسے کی مخالفت کرنی شروع کر دی اور عینی پر یہ الزام لگایا کہ وہ بچوں کو "بے دین" بنا رہے ہیں۔ جب علمار کی مخالفت حد سے زیادہ بڑھ گئی تو امیر بخارا کے حکم پر مدرسہ بند کر دیا گیا۔ ان کے مخالفین ان کو مار ڈالنا چاہتے تھے اس لیے وہ کچھ دنوں کے لیے روپوش ہوگئے اس زمانہ میں امیر بخارا کے حکم سے استادوں پر بڑی کڑی نظر رکھی جا رہی تھی روز ہی استادوں کی ایک اچھی خاصی تعداد پکڑ کر امیر کے دربار میں حاضر کر دی

---

[1] حیرت کے مزید حالات کے لیے رسالہ جامعہ دہلی جنوری ۱۹۶۲ء میں راقم الحروف کا مقالہ "دانش اسکول کے تین شعرا" ملاحظہ ہو۔

جاتی اور ان پر الزامات عاید کر کے ان کو سزا دی جاتی ۔

اگست سنہ ۱۹۱۵ء میں عینی کچھ دنوں کے لیے اپنے وطن آئے یہ زمانہ اور بھی افراتفری کا زمانہ تھا۔ روز سیکڑوں آدمی پکڑے جاتے ان پر الزام لگتا کہ وہ لوگ سیاسی گفتگو کرتے ہیں کچھ کو تو ڈرا دھمکا اور ڈانٹ پھٹکار کر چھوڑ دیا جاتا بقیہ کو کچھ نہ کچھ سزا ضرور دی جاتی ۔ عینی کی شخصیت بھی اس ہنگامہ میں شبہ سے بالاتر نہ رہی ۔ چنانچہ ان کو قوشبیگی (اعلیٰ ترین منصب دار بخارا) کے پاس جانا پڑا ۔ عینی سے دیر تک سوال جواب ہوتا رہا مگر کوئی بدمزگی نہیں ہونے پائی اور عینی بلا کوئی سزا پائے اپنے گھر واپس آگئے ۔ یہ حالات دیکھ کر وہ سیر و سیاحت پر نکل کھڑے ہوئے اور تقریباً ایک سال تک اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے رہے اکتوبر سنہ ۱۹۱۶ء میں ان کو ایک تار ملا جس کا مضمون یہ تھا کہ "فوراً بخارا آؤ تم کو مدرسۂ خیابان کا مدرس مقرر کر دیا گیا ہے ان کو اس تار پر بڑا تعجب ہوا بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کو خریدنے کی کوشش کی جا رہی ہے پھر بھی انھوں نے بخارا جانے کا فیصلہ کیا ، بخارا پہنچ کر انھوں نے اپنا تقررنامہ حاصل کیا اور مدرسہ چلے گئے ۔ ابھی ان کو وہاں ایک سال ہی گزرا تھا کہ روس میں انقلاب آگیا ۔ اہل بخارا کو اول تو اس انقلاب کی خبر ہی نہ تھی اور جن کو خبر تھی وہ لوگ اس انقلاب کے بارے میں صرف کانا پھوسی پر اکتفا کرتے لیکن دھیرے دھیرے لوگ اس انقلاب سے واقف ہونے لگے اور اس کی حمایت میں جلسے بھی کرنے لگے ۔ جو لوگ ان جلسوں میں شریک ہوتے ان کے نام قوشبیگی اور قاضیٔ کلاں کو لکھ کر حکومت کے جاسوس بھیج دیتے ۔ یہ دونوں عہدے دار لوگوں کو اپنے پاس بلا کر برا بھلا کہتے اور دوبارہ ایسے جلسوں میں شریک ہونے سے منع بھی کرتے لیکن لوگ اِن جلسوں میں شرکت سے باز نہ آتے ۔

عینی کی زندگی میں ایک نازک گھڑی وہ بھی آئی جب امیر بخارا کے حکم سے ان کو گرفتار کر لیا گیا پہلے تو ان کو امیر بخارا کے محل میں لے جا کر اچھی طرح مارا پیٹا گیا پھر جیل خانے میں بند کر دیا گیا اس واقعہ کی پوری تفصیل انھوں نے اپنی کتاب " مختصر ترجمۂ حال خودم " میں لکھ دی ہے ۔ جیل خانے میں بھی برابر ان کو مارا پیٹا گیا ۔ ایک دن جب کہ ان کو مارا جا رہا تھا انھوں نے جیل خانے کا تالہ کھلنے کی آواز سنی ۔ فوراً ہی ایک روسی فوجی نمودار ہوا جس نے اعلان کیا کہ روس کی انقلابی حکومت نے تم لوگوں کو آزاد کر دیا ہے ۔ اس کے بعد اس فوجی نے تمام قیدیوں کو اپنے ساتھ لیا اور شہر بخارا کے

کے باہر ایک جلسے میں لیے چلا گیا، جہاں روسی فوجی نے اس بات کا وعدہ کیا کہ اب عوام پر کوئی ظلم وستم نہ ہونے پائے گا اور امیر نے جو کچھ بھی عوام پر ظلم کیا ہے اس کا بدلہ لیا جائے گا۔

عینی کو اتنی چوٹیں آئی تھیں کہ ان کو اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ وہ تقریباً دو ماہ تک اسپتال میں داخل رہے اس عرصے میں پچیس بار ان کا آپریشن ہوا تب جا کر کہیں ان کی تکلیف ختم ہوئی ابھی وہ کمزور ہی تھے کہ ان کو اسپتال چھوڑنے کی اجازت مل گئی اور وہ سمرقند چلے گئے۔ پہلے تو وہ درس وتدریس کا کام کرتے رہے۔ مگر جلد ہی اعصاب کی کمزوری کی وجہ سے شعبۂ مطبوعات سے متعلق ہو گئے۔

یہیں سے ان کی اصل ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے ایک کتاب "تاریخ امیران منغت بخارا" کے نام سے لکھی یہی وہ زمانہ ہے جب پان ترکیت حامی عناصر انقلاب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور تاجیکی قوم کی شناخت کو معدوم کر دینے کے درپے تھے یہ گروہ جس نے اپنا نام "انقلابچیان بخارا" رکھ چھوڑا تھا عوام کے ذہنوں میں زہر بھر رہا تھا۔ عینی نے اس گروہ کے پروپیگنڈے کو رد کرنے کے لیے عملی اور علمی دونوں طرح سے کوشش کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک کتاب "نمونۂ ادبیات تاجیک" کے نام سے لکھی جس میں انھوں نے رودکی سے لے کر اپنے زمانے تک شعراء کے حالات اور نمونۂ کلام کو بڑے اچھے انداز سے مرتب کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تاجیک ایک جداگانہ قوم ہیں اور ان کا ادب رودکی کے زمانے سے لے کر آج تک کے زمانے پر محیط ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے "جلادان بخارا" "ماتریالہای تاریخ انقلاب بخارا" لکھ کر نہ صرف اپنی تاریخ دانی کا ثبوت دیا بلکہ اس کے دیرپا اثرات بھی چھوڑے۔

تاجیکی ادبیات کا دامن ناول نگاری سے خالی تھا، عینی نے "آدینہ" "داخوندہ" "غلامان" "مرگ سودخور" "احمد دیو بند" اور "یتیم" جیسے ناول لکھ کر تاجیکی زبان میں ناول نگاری کی بنیاد ڈالی۔ نثر کے ساتھ ساتھ شاعری کی طرف بھی حسب معمول ان کی توجہ قائم رہی۔ ان کا مجموعۂ کلام "یادگاریں" ان کی شاعری کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔ عینی نے اپنی جو قلمی یادگاریں چھوڑی ہیں ان کی فہرست بڑی طویل ہے اس لیے یہاں صرف چند کا ہی ذکر کر دیا گیا ہے۔

ان کی اس محنت کا اعتراف عوام نے بھی کیا اور حکومتوں نے بھی۔ تاجیکستان کی حکومت نے ان کو "بیراقِ سرخ محنت" سے نوازا اور مرکزی روسی حکومت نے لینن انعام سے۔ ۱۵ر جولائی ۱۹۵۴ء کو ایک انتہائی مصروف اور کامیاب زندگی گزارنے کے بعد انھوں نے انتقال کیا۔ تاجیکی ادبیات پر وہ جو نقوش چھوڑ گئے ہیں ان کی یاد بہت دنوں تک قائم رہے گی۔

جامعہ کا ایک اور مولانا محمد علی نمبر

ماہنامہ جامعہ کے مولانا محمد علی نمبر کو برصغیر ہند و پاک میں بہت پسند کیا گیا اور علمی حلقوں میں بڑی تعریف کی گئی۔ اس پسندیدگی اور تعریف و توصیف کی غالباً ایک وجہ یہ تھی کہ اس کے بعض مضامین اور تصاویر اور تحنیل نوعیت کی تھیں۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مولانا مرحوم پر اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ زیادہ تر تاثراتی نوعیت کا ہے۔ ان میں نہ تو تفصیل سے مولانا کی شخصیت اور خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور نہ ہی پوری تحقیق و تفتیش سے کام لیا گیا ہے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جامعہ کا ایک اور نمبر نکالا جائے، جس میں مولانا کی شخصیت و خدمات کے ان پہلوؤں پر خاص طور سے مضامین لکھوا کر شامل کیے جائیں۔ جن پر پچھلے نمبر میں یا تو سرے سے کوئی مضمون تھا ہی نہیں یا اگر تھا تو تشنہ تھا۔ اس کی مزید تفصیل اگلے شمارے میں پیش کی جائے گی

یہ خصوصی نمبر نومبر اور دسمبر کے دو شماروں پر مشتمل ہوگا۔ اور ان شاء اللہ جنوری ۱۹۸۰ء کے اوائل میں شائع ہوگا۔

ادارہ ماہنامہ جامعہ۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

مولانا محمد علی نمبر کے بارے میں مراسلہ

محترمی، تسلیمات

"جامعہ" کے مولانا محمد علی نمبر کا بیشتر حصہ پڑھ چکا ہوں۔ آپ کی محنت کی داد دیتا ہوں اور "صدق جدید" (لکھنؤ) کی اس رائے سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ "مولانا محمد علی پر اب تک مختلف رسائل کے جو خاص نمبر نکلے ہیں ان سب پر بہ لحاظ کمیت و کیفیت یہ خاص نمبر تفوق رکھتا ہے۔"

اس نمبر کی چند جزئی فروگذاشتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں:

۱۔ پروفیسر محمد سرور کے مضمون مولانا محمد علی کی آپ بیتی پر معاون مدیر جناب عبداللطیف صاحب نے جو حاشیے دیے ہیں ان میں دوسرے حاشیے (ص ۱۳) کی یہ عبارت پڑھ کر حیرت ہوئی کہ:

"مولانا کے والد ، عبدالعلی خاں ، نواب رامپور جناب یوسف علی خاں کے ہر دل عزیز اور ممتاز درباریوں میں سے تھے"

ویسے یہ حاشیہ خود اعظمی صاحب کا نہیں ہے بلکہ "مائی لائف — اے فریگ منٹ" کے مرتب، افضل اقبال کا ہے۔ اس میں دوسرے جملے کا اضافہ (جسے یہاں نقل نہیں کیا گیا ہے) اعظمی صاحب نے اپنی طرف سے کیا ہے۔ افضل اقبال کے حاشیے کا متن یہ ہے:

"His father, Abdul A Khan was a favourite courtier of Nawab Yusuf Ali Khan, the then ruler of Rampur."

حیرت ہے کہ اعظمی صاحب نے افضل اقبال کے اس بیان کو اصل ماخذوں کی کسوٹی پر پرکھے بغیر جوں کا توں قبول کر لیا، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد علی کے دادا علی بخش خاں ۱۸۴۲ء [۱۹۴۲ء] میں

لکھنؤ سے رامپور آکر نواب یوسف علی خاں کے ملازم ہوئے نہ کہ ان کے والد عبدالعلی خاں جو ۱۸۴۰ء
میں خود رامپور میں پیدا ہوئے تھے، اور نواب موصوف کے انتقال (۱۸۶۵ء) کے وقت مشکل سے
سولہ سترہ برس کے تھے۔ ان کی ملازمت کا زمانہ نواب کلب علی خاں کا دورِ حکومت (۱۸۶۵ء تا
۱۸۸۷ء) تھا۔ یہ حقیقت 'جامعہ' کے اسی نمبر میں شامل جناب عتیق صدیقی کے "مولانا محمد علی کے
خاندانی حالات ــــ مقتبس از "تذکرۂ کاملان رامپور" کے مطالعے سے پوری طرح واضح ہوجاتی ہے۔

مولانا محمد علی کے دادا، علی بخش خاں، والیِ ریاستِ رامپور نواب یوسف علی خاں کے ملازم
تھے۔ اس کی تصدیق مولانا کی والدہ آبادی بانو (المعروف بی اماں) کے بیان سے بھی ہوجاتی ہے
ملاحظہ ہو "شوکت علی و محمد علی صاحبان" کی نظربندی سے متعلق" ان کی والدہ، آبادی بانو' ان
کے مشیرِ قانونی مسٹر کھو ٹے کے خطوط اور ان کے مقدمات کی مکمل تاریخ کا مجموعہ" (بزبانِ انگریزی) جو
"صدر دفتر، انجمن اعانت نظربندانِ اسلام، دہلی نے مارچ ۱۹۱۸ء میں شائع کیا تھا۔ اس "مجموعے"
میں آبادی بانو کے چار خط شامل ہیں جن میں پہلے دو خط مورخہ ۴ر اگست اور ۴ر ستمبر ۱۹۱۷ء سر سبرامنی
آیر، صدر ہوم رول لیگ، مدراس کے نام ہیں۔ ۴ر اگست والے خط میں وہ ایک جگہ لکھتی ہیں:

"... میرے بیٹے جب سے نظربند ہوئے... میں نے اپنی جاگیر کا بہت بڑا حصہ فروخت
کرڈالا۔ یہ جاگیر میرے خسر [مراد علی بخش خاں] کی کمائی تھی جو انھوں نے غدر کے زمانے
میں، جب وہ نواب رامپور [مراد یوسف علی خاں] کی ملازمت کرتے تھے، روہیل کھنڈ
اور کمایوں میں متعدد انگریز باشندوں اور افسروں کی جانیں بچانے کے صلے میں حاصل
کی تھی۔" (انگریزی سے ترجمہ، صفحات ۴، ۵)

(۲) چوتھے حاشیے میں اعظمی صاحب نے جس "نوٹ" کو "اغلباً فاضل مترجم کی طرف سے" ہونا بتایا
ہے وہ دراصل "مائی لائف" کے فاضل مرتب کی طرف سے ہے۔ (ملاحظہ ہو "مائی لائف ــــ
اے فریگ منٹ" ص ۲۹)۔

(۳) "آپ بیتی" میں ترجمے کی ایک غلطی نظر آئی:

"ہماری والدہ نے دوسری شادی کرنے سے انکار کردیا اور... کہا... کہ پہلے تو
انھیں صرف ایک خاوند کا اتنے عرصے تک خیال رکھنا پڑا، لیکن اب انھیں پانچ خاوندوں

اور ایک بیوی کا خیال رکھنا ہوگا۔"   (ص ۱۳)

مولانا محمد علی کے الفاظ یہ ہیں :

"She refused to remarry and. told those who advised her to do so, that she had had a husband to lookafter her long-enough and now she had herself five husbands and a wife to look after"   (My Life—A Fragment" p 4)

ترجمہ :

"انھوں نے دوسری شادی کرنے سے انکار کردیا اور ان لوگوں سے جو انھیں اس کا مشورہ دیتے تھے ... کہا کہ ان کے شوہر خاصی طویل مدت تک ان کی خبر گیری کرتے رہے (خیال رکھتے رہے) اور اب انھیں خود پانچ شوہروں (خاوندوں) اور ایک بیوی کی خبر گیری کرنا ہوگی، (خیال رکھنا ہوگا)۔"

(۴) "مولانا محمد علی کے خاندانی حالات — مقتبس از "تذکرہ کاملانِ رامپور" کے مصنف جناب عتیق صدیقی نے احمد علی خاں شوق کے اس بیان کو قبول کرلیا ہے کہ "محمد علی خاں [مولانا محمد علی] بی۔ اے آکسن، جناب نواب سید محمد حامد علی خاں بہادر، والیِ رامپور، دام ملکہم کی توجہ سے ولایت گئے۔" حالانکہ مولانا محمد علی کی اپنی تحریروں (اُن کی خود نوشت سوانح عمری اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ان کے ایک مکتوب) سے اس کی تردید ہو جاتی ہے[1] :

(ا)

"چونکہ میں [بی۔ اے کے] امتحان میں اپنے استحقاق سے کہیں بہتر درجے میں کامیاب ہوا تھا، لہٰذا میری اس [غیر معمولی] کامیابی نے میرے بھائی شوکت [صاحب] کو

---

[1] ہم سمجھتے ہیں کہ فاضل مؤلف سے یہ تسامح "عمداً" سرزد ہوا ہے، ورنہ یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ حقیقتِ حال سے باخبر نہ ہوں۔ غالباً نواب موصوف کی خوشنودیِ مزاج کی راہ سے (جن کے وہ "نمک خوار" بھی تھے) انھوں نے اس صریح واقعاتی غلطی کو روا رکھا ہے۔ (رئیس منظر)

ایک معجزہ دکھانے پر آمادہ کیا، اور انھوں نے کسی نہ کسی طرح پیسے کا انتظام کر کے مجھے آکسفورڈ بھجوا دیا۔"

(انگریزی سے ترجمہ) ("مائی لائف — اے فریگ منٹ" ص ۲۹)

(۲)

"میرا پہلا سفر ۱۸۹۸ء کا کن امنگوں اور کن امیدوں کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ ایک غریب بھائی کی بے نظیر اور حیرت انگیز ہمت کی بدولت یکایک آکسفورڈ جانے کا انتظام ہوا تھا پیسہ عنقا کا حکم رکھتا تھا۔"

("خطوطِ محمد علی" مرتبہ محمد سرور، ص ۱۷۵)

(۵) "ہماری زبان" کے مولانا محمد علی نمبر پر اپنے تبصرے میں عبداللطیف اعظمی صاحب نے اس نمبر کے قلم کاروں کی جو فہرست دی ہے اس میں جناب شبیر علی خاں شکیب کے نام میں کتابت کی ایک غلطی در آئی ہے۔ یعنی "شبیر" کے بجائے "بشیر" لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ غلطی "ہماری زبان" سے ہی منتقل ہوئی ہو۔ بہرحال صحیح نام "شبیر علی خاں شکیب" ہے۔

رئیس منظر

بملاحظہ: مدیر ماہنامہ "جامعہ"
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

جواب

ہم فاضل مراسلہ نگار کے ممنون ہیں کہ انھوں نے مولانا محمد علی نمبر کو توجہ اور غور سے پڑھا اور اس کے بعض پہلوؤں پر اظہارِ رائے فرمایا۔ ان کے اعتراضات کے بارے میں، نمبروار راقم الحروف کی گذارش حسبِ ذیل ہے:

(۱) "مولانا محمد علی کی آپ بیتی" کی تلخیص کے شروع میں میں نے وضاحت کر دی ہے کہ حاشیے میرے قلم سے ہیں اور یہ بھی عرض کر دیا ہے کہ ڈاکٹر افضل اقبال کی مرتبہ کتاب: "مائی لائف — اے فریگ منٹ" سے غیر ملکی ناموں اور طباعت کی غلطیوں کی تصحیح کی حد تک استفادہ کیا گیا

ہے۔ اس لیے کسی مماثلت کی وجہ سے یہ سمجھنا کہ کوئی حاشیہ فاضل مرتب کا ہے صحیح نہیں ہے۔ البتہ فاضل مرتب کی کتاب: "لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی (مطبوعہ: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۷۴ء) میرے مطالعہ میں رہی ہے اور میں نے اس سے کافی استفادہ کیا ہے، اس لیے بہت سی معلومات اس سے ماخوذ ہیں۔ زیر بحث مسئلے میں اس کتاب کے فاضل مولف نے لکھا ہے کہ:

> "Mohammad Ali's own father, Abdul Ali Khan, the youngest of five brothers, was a favourite courtier of Nawab Yusuf Ali Khan the Ruler of Rampur" (p. 19)

پاکستان ہی سے ایک اور کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے: "مولانا محمد علی جوہر — حیات اور تعلیمی نظریات" (مولفہ: ثناء الحق)، اس میں بھی کچھ ایسی ہی بات لکھی ہے، ملاحظہ ہو: "نواب یوسف علی خاں ناظم والی ریاست رام پور نے محمد علی کے والد عبدالعلی خاں کو بلا کر اپنے مقربین کے زمرے میں شامل کر لیا، اس طرح عبدالعلی خاں رامپوری مشہور ہو گئے اور رام پور کو مولانا کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہوا۔" (صفحہ ۲۱)

فاضل مراسلہ نگار نے مزید لکھا ہے کہ: "مولانا محمد علی خاں کے دادا علی بخش حسال ۱۸۴۲ء میں لکھنؤ سے رام پور آکر نواب یوسف علی خاں کے ملازم ہوئے نہ کہ ان کے والد عبدالعلی خاں جو ۱۸۴۶ء میں خود رام پور ریں پیدا ہوئے تھے اور نواب موصوف کے انتقال (۱۸۶۵ء) کے وقت مشکل سے سولہ سترہ برس کے تھے، ان کی ملازمت کا زمانہ نواب کلب علی خاں کا دور حکومت (۱۸۶۵ء تا ۱۸۸۷ء) تھا۔" معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مراسلہ نگار کے پیش نظر مکمل اور واضح صورت حال نہیں ہے۔ (۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ مولانا محمد علی کے دادا علی بخش خاں (۱۸۱۳ء۔ ۱۸۶۷ء) ۱۸۴۲ء میں نہیں ۱۸۴۳ء میں ریاست رام پور سے وابستہ ہوئے۔ دوسرے وہ نواب سید محمد سعید خاں کے دورِ حکومت میں آئے تھے، اس وقت نواب سید یوسف علی خاں (۵ مارچ ۱۸۱۶ء۔ ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء) ولی عہد تھے، علی بخش خاں ان ہی کی خدمت میں دے دیے گئے۔ (۲) اسی طرح فاضل مراسلہ نگار کا یہ ارشاد بھی غلط ہے کہ مولانا محمد علی کے والد عبدالعلی خاں (۱۸۴۸ء۔ ...ء) نے نواب کلب علی خاں (۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء۔ ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء) کی ملازمت اختیار کی۔

صحیح بات یہ ہے کہ عبدالعلی خاں رام پور میں پیدا ہوئے تو ریاست کی طرف سے دس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا اور جب وہ جوانی کی عمر میں پہنچے تو رسالۂ ششم کے جمعدار مقرر ہوئے۔ (۳) نواب سید یوسف علی خاں کی مسند نشینی کی رسم یکم اپریل ۱۸۵۵ء کو ادا کی گئی، ان کا عہد حکومت یکم اپریل ۱۸۵۵ء تا ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء ہے۔ اس کے بعد نواب کلب علی خاں کا دور آتا ہے جن کا دورِ حکومت ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء تا ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ عبدالعلی خاں کی ۲۲ سالہ عمر کے ۱۷ سال نواب یوسف علی خاں کے زمانے میں گذرے اور ۵ سال نواب کلب علی خاں کے زمانے میں۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس کی تصدیق و توثیق تذکرۂ رام پور کے ان اقتباسات سے کی جا سکتی ہے جو جامعہ کے مولانا محمد علی نمبر میں شائع ہوئے ہیں، مزید اطمینان کے لیے تذکرۂ کاملانِ رام پور کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں جو ایک دوست ظہیر علی صدیقی (ریسرچ اسکالر مولانا محمد علی جوہر) کی عنایت سے حاصل ہوئے ہیں، جو جامعہ کی تلخیص کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ واضح ہیں:

"... نواب سید محمد سعید خاں صاحب بہادر جنت آرام گاہ پہلے سے علی بخش خاں سے واقف تھے نواب سید محمد یوسف خاں صاحب بہادر فردوس مکاں ولی عہد تھے۔ ان کے پاس ایک اہلکار کی ضرورت تھی، جنت آرام گاہ نے لکھنؤ سے طلب فرما کر فردوس مکاں کی خدمت میں ۱۲۵۹ھ [۱۸۴۳ء] میں مقرر کر دیا اور خانساماں کا عہدہ دیا۔[1]"

"... عبدالعلی خاں خلف حکیم محمد علی بخش خاں، ان کی پیدائش ۱۲۶۵ھ ۱۸۴۸ء رامپور میں ہوئی۔ ... نواب فردوس مکاں ان کا امتحان لیا کرتے تھے۔ پیدائش کے وقت سے دس روپیہ ماہانہ وظیفہ ریاست سے پاتے تھے۔ جوان ہو کر رسالۂ ششم سواران میں جمعدار مقرر ہوئے۔[2]"

فاضل مراسلہ نگار نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ: "حیرت ہے کہ اعظمی صاحب نے افضل اقبال کے اس بیان کو اصل ماخذوں کی کسوٹی پر پرکھے بغیر حرف کا توں قبول کر لیا۔" معلوم نہیں "اصل ماخذوں" سے موصوف کی کیا مراد ہے؟ اسی سلسلے میں "تذکرۂ کاملانِ رام پور کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ ان کے نزدیک

---

[1] احمد علی خاں شوق (مولانا محمد علی جوہر کے حقیقی چچا زاد بھائی): تذکرہ کاملانِ رام پور صفحہ ۴۸۴

[2] ایضاً صفحہ ۲۸۰

اس کتاب کا شمار اصل ماخذوں میں ہوتا ہے، حالانکہ اسی مراسلے کے چوتھے اعتراض میں اس کتاب کے فاضل اور محترم مولف کو نواب رام پور کا خوش آمدی اور "نمک خوار" قرار دے کر نا قابل اعتبار ٹھہرایا ہے۔

۲۔ یہ بات میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں نے "مائی لائف ۔ اے فریگ منٹ" کے حاشیوں کو نہیں دیکھا تھا اور جب زیر بحث حاشیہ لکھ رہا تھا تو اس وقت اتنا وقت نہیں تھا کہ کتب خانے جا کر تحقیق کرتا، اس لیے "اغلباً" کا سہارا لینا پڑا۔ ویسے میں اس سہل انگاری کو غلط اور تحقیق کے منافی سمجھتا ہوں اور مجھے چاہئے تھا کہ تحقیق کرنے کے بعد ہی یہ حاشیہ لکھتا۔

۳۔ ترجمے کی یہ غلطی صحیح ہے۔ یہ یقین نہیں آتا کہ فاضل اور محترم مترجم سے ایسی غلطی ہو سکتی ہے، ممکن ہے کہ کتابت / طباعت کی غلطی ہو یا پھر لغزش قلم ہو۔

۴۔ مجھے اور عتیق صدیقی صاحب کو فاضل مراسلہ نگار کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اس سلسلے میں فاضل مراسلہ نگار نے اپنی حمایت میں جو اقتباسات دیے ہیں، وہ سب ہماری نظر میں پہلے سے ہیں، مگر چونکہ ہم تذکرہ کاملان رامپور کو مستند اور قابل اعتبار ماخذ سمجھتے ہیں، اس لیے ہمارے نزدیک اصولی طور پر اس کی رائے سب پر مقدم اور مرجح ہے، اس کے علاوہ میرے نزدیک مولانا محمد علی کے خط اور "مائی لائف ۔ اے فریگ منٹ" کی منقولہ عبارتوں سے اس کی تردید نہیں ہوتی۔ یعنی ان میں کہیں نہیں لکھا ہے کہ مولانا شوکت علی کے "معجزانہ، بے نظیر اور حیرت انگیز" "کارنامے" کے علاوہ کسی اور گوشے یا کسی اور جانب سے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا گیا۔

ہمارے سامنے ایک اور حوالہ ہے جس سے بڑی حد تک ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ مولانا سید عزیز حسن نقشبندی دہلوی کی ایک کتاب: "حالات علی برادران" کے نام سے جنوری ۱۹۲۱ء میں دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ گویا یہ کتاب مولانا محمد علی کی زندگی میں چھپی ہے اور اس کا امکان ہے کہ ان کی نظر سے گذری ہوگی۔ اس کا دیباچہ قاضی عبدالغفار صاحب نے لکھا ہے جو "ہمدرد" کے ادارۂ تحریر میں رہ چکے ہیں، اس کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے: "مرحوم نواب محمد اسحٰق خاں صاحب مدار المہام ریاست رام پور و آنریری سکریٹری علی گڑھ کالج کی تحریک پر آپ کو [مولانا محمد علی کو] آئی سی ایس کے امتحان کے لیے انگلستان روانہ کیا گیا۔" (صفحہ ۱۳) کیا یہ "تحریک" محض خالی خولی تحریک ہی رہی ہوگی یا ریاست کے اس ہونہار شہری کو اس اہم موقع پر مالی امداد دے کر ریاست نے اپنا فرض ادا کیا ہوگا؟ اس سے

بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت تک اس خاندان کے ریاست سے اچھے اور خوشگوار تعلقات قائم تھے۔ اور میں اپنے مطالعے کی بنا پر یہ کہنے کی بھی جرأت کروں گا کہ تاحیات قائم رہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں اور اس بنیاد پر کہ نواب رامپور کا مولانا بہت لحاظ رکھتے تھے اور خود نواب صاحب بھی مولانا کی بےحد عزت کرتے تھے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ اس امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگلستان جاتے وقت یا دوران تعلیم ریاست سے امداد ملی ہو یا مدتی رہی ہو، مگر قطعیت کے ساتھ کوئی دعویٰ کرنا چاہے اثبات میں ہو یا انکار میں، میرے نزدیک احتیاط کے خلاف ہے۔ لیکن کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کا، جو ایک عرصے تک ریاست رام پور کے چیف منسٹر رہ چکے ہیں، قطعیت کے ساتھ کہنا ہے کہ مولانا کو ریاست سے خفیہ طور پر مالی امداد ملتی رہی ہے۔ پچھلے سال کے اواخر میں، دوسرے مقامات کی طرح رام پور میں بھی مولانا کے صد سالہ یوم پیدائش کی خوشی میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں، ایک مقامی ہفتہ وار اخبار "نشتر" کی روایت کے مطابق زیدی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: "میں اس کا شاہد ہوں کہ ریاست رام پور خفیہ طور پر مولانا محمد علی جوہر کی ہمیشہ معاونت کرتی رہی ہے۔" زیدی صاحب کے اس خیال کی تردید میں، مولانا محمد علی کے ایک ریسرچ اسکالر ظہیر علی صدیقی صاحب نے ایک مفصل مضمون لکھا تھا جو ہفت روزہ "نشتر" کے جمہوریت نمبر میں ۲۶ جنوری ۱۹۷۹ء کو شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد جب صدیقی صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو ان سے بھی میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے، اس کے علاوہ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس وقت محمد علی وہ محمد علی نہیں تھے جو ۱۹۱۱ء کے بعد کے محمد علی تھے، یا کامریڈ اور ہمدرد کے محمد علی تھے یا رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر تھے۔ ابھی حال میں ڈاکٹر مشیر الحسن صاحب نے، جو جامعہ کے شعبۂ تاریخ میں ریڈر ہیں، افضل اقبال کی کتاب، "لائف اینڈ ٹائمز آف محمد علی" پر ایک انگریزی روزنامہ میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا محمد علی نے حکومت ہند میں کوئی معزز عہدہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور اس سلسلے میں وائسرائے کو متعدد خطوط لکھے تھے۔ اگرچہ انھوں نے کوئی زمانہ متعین نہیں کیا ہے، لیکن اگر یہ بات صحیح ہے تو میرے خیال میں انھوں نے ۱۹۱۱ء سے قبل یہ کوشش کی ہوگی۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد کے سلسلے میں خاصے متہم تھے۔ ایک مرتبہ ان سے اس کا ذکر آیا تو انھوں نے

بڑے بیٹے کی بات کہی تھی، انھوں نے فرمایا تھا کہ کسی بڑے آدمی کی عمر کا ہر دور یکساں نہیں ہوتا۔ راقم الحروف کے نزدیک مولانا محمد علی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔

مراسلے کے جواب میں مولانا محمد علی اور ریاست کے تعلق کا ذکر آیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا کا ایک اہم خط ذیل میں پیش کیا جاتا ہے جو "نقوش" (لاہور) کے مکاتیب نمبر (حصہ اول) بابت ماہ نومبر ۱۹۵۷ء کے صفحہ ۲۳۶ پر شائع ہوا ہے اور حاشیہ میں لکھا ہے کہ: غالباً نواب صاحب رامپور کے نام ہے۔ یہ خط رامپور ہی سے لکھا گیا ہے اور تاریخ ۱۱ دسمبر ۱۹۰۰ء کی ہے گویا جب مولانا بڑودہ کی ملازمت میں تھے۔ خط ملاحظہ ہو:

"قبلہ و کعبہ! السلام علیکم۔ ابھی سرکار سے آرہا ہوں اور چونکہ رجسٹری شدہ ڈاک میں چند منٹ باقی ہیں اس لیے عریضہ لکھے دیتا ہوں۔ سرکار نے کچھ نہیں کہا، صرف یہ پوچھا کہ اطلاع مل گئی یا نہیں؟ میں نے کہا کہ جی ہاں۔ فرمایا، پھر؟ میں نے کہا میں تو لکھ چکا ہوں کہ جو حکم ہو۔ سرکھول پر ہز آنر صاحب کا حکم میں نہیں مانتا۔ سرکار کا حکم ہے۔ ان سے واقف نہیں ہوں۔ کہا، پھر؟ میں نے بھی کہا تھا مگر لاٹ صاحب کو شک تھا۔ میں نے کہا کہ اس میں شک کی جگہ نہیں ہے، وہ میرے اشارے کے خلاف نہ چلیں گے۔ پھر فرمایا کہ لاٹ صاحب نے کہا کہ آپ سے قطع تعلق کر لیجیے۔ اس پر میں نے کہا کہ یہ ناممکن ہے۔ وہ میری رعایا ہیں، ان کا خاندان مدتوں سے میری ریاست کا ایک جزو ہو گیا ہے تو لاٹ صاحب سے کہہ کر خیر آپ ان کو آئندہ جرأت نہ دلائیں۔ سرکار نے فرمایا کہ یہ کیا بات ہے۔ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہ ملے گا۔ آج ہی تار دے رہے ہیں کہ محمد علی آیا ہے۔ شوکت علی اور محمد علی دونوں کو مفصل کیفیت سمجھا دی ہے، آئندہ اطمینان رکھیں شکایت کا موقع نہ ملے گا۔ محمد علی آپ کے پاس حاضر ہونا چاہتا ہے، کب بھیجوں۔ میں نے تو زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلنے دیا کہ جو آپ فرمائیں گے، وہ وہی کرے گا گویا گذشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط۔"

۵۔ "ہماری زبان" کے مولانا محمد علی نمبر کو میں نے دوبارہ دیکھ لیا ہے، اس میں شبیر علی خاں شکیب ہی چھپا ہے، مضمون کے ساتھ بھی اور فہرست مضامین میں بھی۔ اگر یہ نام غلط ہے تو اس کی ذمہ داری "ہماری زبان" پر ہے جامعہ کے تبصرہ نگار پر نہیں۔ بہرحال "ہماری زبان" کے اڈیٹر صاحب کو اس غلطی کی اطلاع کر رہا ہوں، وہ مناسب سمجھیں گے تو اس کی تصحیح فرما دیں گے۔

(عبداللطیف اعظمی)

تعارف و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

نقد و نظر (تنقیدی ششماہی)

مرتب: پروفیسر اسلوب احمد انصاری ۔ سالانہ چندہ: پندرہ روپے ۔ ملنے کا پتہ:۔
بزم اقبال ۔ گلفشاں ۔ سول لائنز ۔ دودھ پور ۔ علی گڑھ ۔ ۲۰۲۰۰۱

اردو میں اب تک عام طور پر مخلوط قسم کے رسالوں کا چلن رہا ہے ۔ ان میں کچھ مضامین، کچھ افسانے، کچھ نظمیں اور غزلیں شامل ہوتی تھیں ۔ علی گڑھ کے شعبۂ انگریزی کے اساتذہ نے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی عالمانہ قیادت میں اردو رسالوں کی روایت میں ایک نئی اور خوشگوار تبدیلی یہ کی ہے کہ ایک خالص تنقیدی رسالہ "نقد و نظر" کے نام سے نکالا ہے ۔ اس کی اشاعت کا محرک اردو کی تنقید کو اس انتشار سے نکالنا ہے جس میں وہ مبتلا ہو گئی ہے ۔ اس انتشار کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں ادب، اس کے مزاج اور طینت کے سلسلے میں بہت سی غلط فہمیاں راہ پا گئی ہیں ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ادب میں وہ کچھ دیکھنے اور پانے کی تمنا میں سرگرداں ہیں جس کے لیے ادب کے علاوہ ہمیں کسی اور در پر دستک دینی چاہیے ۔ ہمارے ناقدین میں ایسوں کی تعداد بہت کم ہے جو ادب کے اشارتی اظہار یا ادب پارے کی تنظیم کے بنیادی اصولوں کا عرفان رکھتے ہوں اور اس نکتے سے واقف ہوں کہ " ادب کی کائنات، واقعاتی کائنات کے متوازی اپنا الگ اور منفرد وجود رکھتی ہے ۔" اس کے علاوہ ہمارا تنقیدی محاورہ بہت سی حالیہ تبدیلیوں کے باوجود ابھی بڑی حد تک پرانا ہے اور ادب پاروں کے گہرے تجزیے سے گریز کی دلچسپ شکلیں سامنے لاتا ہے ۔ ہمارے ناقدین کبھی تو ادب پارے سے دامن بچا کر ادیب کی سوانح میں بھٹک جاتے

ہیں، کبھی وہ افکار کی بحث میں کچھ اس انداز سے پڑ جاتے ہیں گویا وہ یہ سمجھ رہے ہوں کہ ادب تجریدات کی تجارت سے زیادہ کچھ اور نہیں ہے، کبھی ادب میں تاریخ کی تلاش کرنے لگتے ہیں۔ یہ بھول کر کہ ادب واقعہ سے زیادہ احساس واقعہ کا اظہار ہے۔ ادب کا حقیقی مزاج تاریخیت کی نفی پر مبنی ہے اس لیے کہ ادب کا سروکار Actual سے زیادہ Vertual سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ہماری تنقید ادب سے زیادہ ادیب پر اور اس کے عہد پر متوجہ رہتی ہے اور اگر نفسیات یا دوسرے علوم کا رخ کرتی بھی ہے تو فن پارے کو فراموش کر کے اس کی Genesis میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہماری ادبی تنقید تعمیم زدہ تکرار کا طلسم باندھتی ہے تنقید کے نام پر انشائیے لکھتی ہے، فن پارے متوجہ کرتے ہیں تو وہ فن کار کا تعارف کرانے لگتی ہے۔

اس صورت کے پیش نظر نقد و نظر کی اشاعت، امید ہے کہ بہت سی ادبی غلط اندیشیوں کا ازالہ کرے گی اور ادب کی حقیقی فہم اور عرفان کے دروازے کھولے گی۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے "حرفے چند" کے عنوان سے اس رسالہ کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی ہے جس سے اس کی خصوصیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس جریدے کے اجرا کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے "شعر و ادب کے سلسلے میں ایک متوازن، مربوط اور بے لاگ تنقیدی نقطہ نظر کو روشنی میں لایا جائے ... یہ رسالہ خالص تنقیدی مضامین کے لیے وقف کیا جا رہا ہے۔ اس میں قدیم و جدید اردو ادب کے مشاہیر کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے گا اور ادبی Hierarchy میں ان کے مقام کی حسب استطاعت، آزمائشی انداز سے نشان دہی کی کوشش کی جائے گی۔ اس رسالے کا ایک خاص پہلو یہ ہوگا کہ اس میں اقبالیات کے مطالعے کو خصوصی اہمیت دی جائے گی اور دوسرے یہ کہ ہر شمارے میں کلاسیکل غزل گو اساتذہ کی انفرادی غزلوں کا مطالعہ پیش کیا جائے گا۔ یہ ایک طور سے عملی تنقید کا نمونہ ہوگا۔ نظری تنقید پر مغرب کے مشاہیر تنقید نگاروں کی اہم نگارشات کا ترجمہ بھی وقتاً فوقتاً دیا جائے گا۔

بلا شبہ یہ ساری خصوصیات اور مقاصد ہماری تنقید کے لیے فال نیک ہیں۔ مگر ان مقاصد کی راہ میں جو دشواریاں ہیں ان کا احساس بھی ضروری ہے کہ بغیر اس احساس کے منزلیں آسان نہیں ہو پاتیں۔ ادب اور نظریۂ ادب پر مغرب میں جو کام اس صدی میں ہو رہا ہے، اس سے اس

IQBAL - His Political Ideas At Crossroads

از ۔ ڈاکٹر سید حسن احمد

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۹۸ صفحات، مجلد مع گرد پوش ۔ قیمت : ۳۵ روپے ۔
تاریخ اشاعت، مارچ ۱۹۷۹ء ۔ ناشر: پرنٹ ویل پبلیکیشنز ۔ علی گڑھ ۔ ۲۰۲۰۰۱

ایک مشہور برطانوی دانشور پروفیسر ایڈورڈ جان ٹامسن کو علامہ اقبال مرحوم نے کچھ خطوط لکھے تھے جو اب تک شائع نہیں ہوئے تھے ۔ تقریباً دو سال ہوئے، ۱۹۷۷ء میں فاضل مکتوب الیہ کے صاحبزادے، پروفیسر ای، پی ٹامسن ہندوستان تشریف لائے تو ان خطوط کو، جو تعداد میں ۹ ہیں اور ۴ مارچ ۱۹۳۲ء سے ۲۶ جولائی ۱۹۳۴ء تک کی مدت پر پھیلے ہوئے ہیں، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ تاریخ کو عنایت فرمایا اور اب مارچ ۱۹۷۹ء میں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات کے ایک لکچرر ڈاکٹر سید حسن احمد صاحب نے ان خطوط کو مع اپنی تشریحات و توجیہات کے کتابی صورت میں شائع فرمایا ہے ۔ یہ کتاب پیش لفظ کے علاوہ حسب ذیل دس ابواب پر مشتمل ہے :
(۱) نئی دریافت ۔ اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط (۲) تصور پاکستان (۳) جمہوریت اقبال کی نظر میں (۴) اسلام اور سیاست (۵) مسلمان اور قوم (۶) روڈس خطبات (۷) مبہم پیشین گوئیاں (۸) سیاست دانوں سے مایوسی (۹) دوراستے ؛ شاعر اور میدان عمل (۱۰) اقبال کی معنویت ۔ ان مباحث کے بعد ان ۹ خطوط کا متن شائع کیا گیا ہے، پہلے ٹائپ میں پھر اقبال کے اصل خط کا عکس ہے ۔

غالباً قارئین جامعہ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال دسمبر کی اشاعت میں فاضل مولف کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا : " اقبال کے سیاسی افکار چند خطوط کی روشنی میں " ۔ یہ مضمون ان ہی زیر تذکرہ خطوط کی بنیاد پر لکھا گیا تھا ۔ اس میں ایک جگہ فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے کہ : " یہ خیال عام ہے کہ اقبال نظریہ پاکستان کے فلسفی تھے ۔ انھوں نے سب سے پہلے پاکستان کا تصور اور نصب العین پیش کیا ۔ متعدد کتابوں میں بھی یہ بات لکھی گئی ہے ۔ انسائیکلوپیڈیا بری ٹینیکا میں بھی کہا گیا ہے کہ اقبال کو نظریہ پاکستان کے خیال کا بانی سمجھا جاتا ہے ۔ " اقبال کے آخری دو سال " کے مصنف عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب میں اقبال اور نظریہ

پاکستان کے سوال پر بحث کی ہے۔ انھوں نے ایڈورڈ ٹامسن کا حوالہ دیا ہے جنھوں نے اپنی کتاب :
Enlist India For Freedom (۱۹۴۰ء) میں کہا ہے کہ اقبال اپنی آخری عمر میں نظریۂ
پاکستان کے مخالف ہو گئے تھے۔ پنڈت نہرو نے بھی اسی بات کو ٹامسن کے حوالے سے مشروط طور پر
دہرایا ہے۔ ٹامسن نے اپنی رائے کی بنیاد ان کے نام اقبال کے خط میں بیانات پر رکھی ہے۔ ٹامسن
کہتے ہیں: "اس بارے میں کچھ جھگڑا چلا آ رہا ہے کہ پاکستان کا خیال سب سے پہلے کس کو سوجھا تھا...
عام طور پر مشہور شاعر سر محمد اقبال کا نام لیا جاتا ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا تھا۔
اقبال میرے دوست تھے اور انھوں نے اس ضمن میں میرے تمام خدشات کو رفع کر دیا تھا۔ پہلے
انھوں نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ 'میرے وسیع غیر منظم اور رفاقت کش ملک میں طوائف الملوکی
برپا ہوتی نظر آتی ہے۔' پھر انھوں نے فرمایا کہ "ان کا خیال ہے کہ پاکستان، ہندوؤں، مسلمانوں اور
برطانوی حکومت تینوں کے لیے تباہی کا موجب ہوگا، لیکن میں مسلم لیگ کا صدر ہوں، اس لیے
میرا فرض ہے کہ میں اس تجویز کی حمایت کروں۔" چونکہ یہ خطوط طبع نہیں ہوئے تھے اور ٹامسن نے صرف
ان کا حوالہ دیا تھا اور دوسرے Circumstantial Evidence یعنی بعد کی تاریخوں
کے اقبال کے خطوط (جناح صاحب کے نام) اور خطبات وغیرہ کی بنا پر عاشق حسین صاحب نے
ٹامسن کی رائے بلکہ ان کے بیان کو صحیح نہیں مانا ہے اور ان کی بات کو "حکایت" کہا ہے۔" اس کے
بعد فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں: "مجھے ۱۹۳۳ء، ۱۹۳۴ء کے لکھے ہوئے جو خطوط دستیاب ہوئے
ہیں، ان میں یہ بیان نہیں ملا ہے کہ اقبال 'نظریۂ پاکستان' کے مخالف تھے اور اسے مسلمانوں،
ہندوؤں اور برطانوی حکومت تینوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ خطوط سے معلوم ہوتا ہے
کہ طوائف الملوکی کا اندیشہ اقبال نے دوسرے وجوہ کی بنیاد پر ظاہر کیا ہے اور بحیثیت صدر انھوں
نے سندھ کی علیحدگی کی حمایت کا ذکر کیا ہے، البتہ انھوں نے "پاکستان اسکیم" کو اپنی اسکیم ماننے
سے انکار کیا ہے اور اپنی دوسری تجویز یعنی "مسلم وفاقی صوبے" کی حمایت کی ہے اور ان کے مطابق
"پاکستان اسکیم کے کیمبرجی موجد اقبال کی مسلم وفاقی صوبے کی تجویز کے مخالف تھے۔" (صفحات ۵۶۳
۵۶۴) یہی باتیں زیر تبصرہ کتاب کے دوسرے باب: "تصور پاکستان" میں ۶، ۷ صفحات میں کہی گئی ہیں۔
اقبال کے ان غیر مطبوعہ خطوط کی اشاعت بہرحال مفید ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کے شعبۂ سیاسیات کی عنایت سے اقبال کے مطبوعہ خطوط میں، جن کی تعداد میرے اندازے کے مطابق تقریباً ۱۲۵ ہے، مزید نو خطوں کا اور ڈاکٹر حسن احمد صاحب کی توجہ اور کوشش سے اقبالیات میں ایک مفید کتاب کا اضافہ ہوا۔ ان خطوط کی اہمیت صرف یہی ہے کہ یہ اقبال کے ہیں اور ایک مشہور انگریز دانشور کے خطوط کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں عام طور پر ان ہی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جو اقبال کے دوسرے خطوط یا تحریروں میں موجود ہیں، سوائے ایک جملے کے جس میں پاکستان کی حمایت سے انکار کیا ہے اور واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ پاکستان میری اسکیم نہیں ہے۔ مزید وضاحت کی ہے کہ میں نے اپنے خطبے میں جو تجویز پیش کی تھی وہ مسلم صوبے کے قیام کی ہے۔ یعنی ہندوستان کے شمال مغربی صوبوں کا، جہاں مسلمان بھاری اکثریت میں ہیں، ایک مسلم وفاق بنایا جائے جو یا تو براہ راست انگلستان کے ماتحت ہو یا ایک ڈومینین ہو۔ (صفحہ ۸۰) مگر اسے نہیں بھولنا چاہیئے کہ علامہ اقبال نے یہ تردید یا وضاحت ۴ مارچ ۱۹۳۴ء کو کی ہے جب کہ پاکستان کا کوئی واضح تصور نہیں تھا اور نہ اس کے مطالبے میں کوئی شدت تھی۔ اقبال نے اپنی پوری زندگی میں ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے یا سیاست کے میدان میں جو عملی کوششیں کی ہیں، ان کی بنا پر میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور قرارداد کی منظوری کے وقت حیات ہوتے تو وہ یقیناً اس کی تائید کرتے، اسی طرح اگر ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان کے مستقبل کا آخری فیصلہ کیا گیا اگر اس وقت زندہ ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کی طرح وہ بھی پاکستان کی اسکیم کو ــــ طوعاً یا کرہاً ــــ قبول کر لیتے۔ اقبال ایک مفکر تھے اور مفکر کے خیالات منجمد نہیں متحرک ہوتے ہیں، اس کا بنیادی خیال یا مقصد تو وہی رہتا ہے جو وہ قوم وملک یا دنیا و آخرت کے لیے مفید سمجھتا ہے، مگر اس کی شکلیں اور تفصیلات حالات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں۔ اگر حالات نے اجازت دی تو انشاء اللہ اس پہلو پر کسی مناسب موقع پر تفصیل سے اپنے خیالات پیش کروں گا۔

یہ کتاب اور زیادہ مفید ہوتی اگر اس میں ٹامسن کے وہ خطوط، جن کے جواب میں اقبال نے نے یہ خطوط لکھے تھے اور وہ تبصرہ شامل ہوتا جو ٹامسن نے علامہ کے چھ خطبات پر آبزرور (Observer) کے لیے لکھا تھا اور جس میں اقبال کو پاکستان کا حامی قرار دیا تھا۔ علامہ نے

اس کو پڑھ کر اس کی اس طرح فوری تردید کی کہ گویا یہ ان پر خواہ مخواہ کا اتہام بلکہ بہتان ہے۔ بہرحال اقبال کے یہ خطوط بذاتِ خود اپنی جگہ پر اہمیت رکھتے ہیں اور فاضل مرتب نے ان کی روشنی میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، چاہے ان سے کسی کو اختلاف ہو مگر اس میں شبہ نہیں کہ اقبال کے سیاسی خیالات و افکار پر بحث و تجسس کی نئی دعوت دیتے ہیں۔ امید ہے کہ علمی دنیا میں بالخصوص اقبالیات کے حلقے میں یہ کتاب مقبول ہوگی۔ (عبداللطیف اعظمی)

محاسن الشعرا الجزء الاول (عربی) مرتب:۔ محمد اجمل اصلاحی

سائز ۲۲×۱۸/۸، حجم ۴۴ صفحات۔ طباعت دیدہ زیب ٹائپ میں۔ قیمت ۴ روپے
سنہ طباعت ۱۹۸۰ء۔ ناشر: مکتبۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڈھ۔ ۲۷۶۳۰۵

عربی زبان و ادب کے منتہی طلبہ کے لیے عربی شاعری کے متعدد مجموعے تیار کیے گئے ہیں جو عربی مدارس اور جامعات میں رائج ہیں لیکن ثانوی درجات کے طلبہ و طالبات کے لیے ان کے ذہنی اور تعلیمی معیار کے مطابق عربی اشعار کے ایک شستہ، شگفتہ، متنوع اور معیاری انتخاب کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ زیر نظر انتخاب جس کا نام حضرت عمر کے مشہور مقولہ "محاسن الشعر تدل علی مکارم الاخلاق وتنہی عن مساویہا" سے ماخوذ ہے اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اس انتخاب کا پہلا حصہ ہے۔ اس مختصر مجموعہ میں مرتب نے صدر اسلام سے لے کر موجودہ دور تک کے تقریباً پچاس شعرا کے سہل، سلیس اور ہلکے پھلکے اسّی قطعات کا انتخاب کیا ہے۔ انتخاب کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام قطعات دینی و اخلاقی مضامین پر مشتمل ہیں لیکن مرتب کے نزدیک انتخاب کی شرطِ اول یہ رہی ہے کہ اشعار فنی اعتبار سے ممتاز اور شعریت سے بھرپور ہوں۔ اس طرح اس مجموعے سے بیک وقت دونوں فائدے حاصل ہوں گے۔ طلبہ کے اندر عربی زبان کا ملکہ اور ادب کا ذوق بھی پیدا ہوگا اور ان کی ذہنی و اخلاقی تربیت بھی ہوگی۔

جن شعراء کے کلام کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں حسان بن ثابت، لبید بن ربیعہ، ضرار بن الازور، نابغہ شیبانی، عروہ بن اذینہ، بشار، ابو نواس، ابو العتاہیہ، عبداللہ بن عبدالاعلیٰ، علی بن الجہم، متنبی اور یوسف العظم قابل ذکر ہیں۔ حاشیہ میں شعراء کا مختصر تعارف بھی درج کیا گیا ہے جس سے مجموعہ

کے شعبۂ سیاسیات کی عنایت سے اقبالؔ کے مطبوعہ خطوط میں، جن کی تعداد میرے اندازے کے مطابق تقریباً ۱۲۵ ہے، مزید نو خطوں کا اور ڈاکٹر حسن احمد صاحب کی توجہ اور کوشش سے اقبالیات میں ایک مفید کتاب کا اضافہ ہوا۔ ان خطوط کی اہمیت صرف یہی ہے کہ یہ اقبالؔ کے ہیں اور ایک مشہور انگریز دانشور کے خطوط کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں عام طور پر ان ہی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جو اقبالؔ کے دوسرے خطوط یا تحریروں میں موجود ہیں، سوائے ایک جملے کے جس میں پاکستان کی حمایت سے انکار کیا ہے اور واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ پاکستان میری اسکیم نہیں ہے۔ مزید وضاحت کی ہے کہ میں نے اپنے خطبے میں جو تجویز پیش کی تھی وہ مسلم صوبے کے قیام کی ہے۔ یعنی ہندوستان کے شمال مغربی صوبوں کا، جہاں مسلمان بھاری اکثریت میں ہیں، ایک مسلم وفاق بنایا جائے جو یا تو براہ راست انگلستان کے ماتحت ہو یا ایک ڈومینین ہو۔ (صفحہ ۸۰) مگر اسے نہیں بھولنا چاہیئے کہ علامہ اقبال نے یہ تردید یا وضاحت ۴ مارچ ۱۹۳۴ء کو کی ہے جب کہ پاکستان کا کوئی واضح تصور نہیں تھا اور نہ اس کے مطالبے میں کوئی شدت تھی۔ اقبالؔ نے اپنی پوری زندگی میں ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے یا سیاست کے میدان میں جو عملی کوششیں کی ہیں، ان کی بنا پر میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور قرارداد کی منظوری کے وقت حیات ہوتے تو وہ یقیناً اس کی تائید کرتے، اسی طرح اگر ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان کے مستقبل کا آخری فیصلہ کیا گیا اگر اس وقت زندہ ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کی طرح وہ بھی پاکستان کی اسکیم کو ـــ طوعاً یا کرہاً ـــ قبول کر لیتے۔ اقبال ایک مفکر تھے اور مفکر کے خیالات منجمد نہیں متحرک ہوتے ہیں، اس کا بنیادی خیال یا مقصد تو وہی رہتا ہے جو وہ قوم وملک یا دنیا و آخرت کے لیے مفید سمجھتا ہے، مگر اس کی شکلیں اور تفصیلات حالات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں۔ اگر حالات نے اجازت دی تو ان شاء اللہ اس پہلو پر کسی مناسب موقع پر تفصیل سے اپنے خیالات پیش کروں گا۔

یہ کتاب اور زیادہ مفید ہوتی اگر اس میں ٹامسن کے وہ خطوط، جن کے جواب میں اقبال نے نے یہ خطوط لکھے تھے اور وہ تبصرہ شامل ہوتا جو ٹامسن نے علامہ کے چھ خطبات پر آبزرور (Observer) کے لیے لکھا تھا اور جس میں اقبالؔ کو پاکستان کا حامی قرار دیا تھا۔ علامہ نے

اس کو پڑھ کر اس کی اس طرح فوری تردید کی کہ گویا یہ ان پر خواہ مخواہ کا اتہام بلکہ بہتان ہے۔ بہرحال اقبال کے یہ خطوط بذات خود اپنی جگہ پر اہمیت رکھتے ہیں اور فاضل مرتب نے ان کی روشنی میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، چاہے ان سے کسی کو اختلاف ہو مگر اس میں شبہ نہیں کہ اقبال کے سیاسی خیالات و افکار پر بحث و تجسس کی نئی دعوت دیتے ہیں۔ امید ہے کہ علمی دنیا میں بالخصوص اقبالیات کے حلقہ میں یہ کتاب مقبول ہوگی۔ (عبداللطیف اعظمی)

محاسن الشعرا الجزء الاول (عربی) مرتبہ۔ محمد اجمل اصلاحی

سائز ۲۲×۱۸/۸، حجم ۴۲ صفحات۔ طباعت دیدہ زیب ٹائپ میں۔ قیمت ۴ روپے
سنہ طباعت ۱۹۷۸ء۔ ناشر مکتبۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڈھ۔ ۲۷۶۳۰۵

عربی زبان و ادب کے منتہی طلبہ کے لئے عربی شاعری کے متعدد مجموعے تیار کئے گئے ہیں جو عربی مدارس اور جامعات میں رائج ہیں لیکن ثانوی درجات کے طلبہ و طالبات کے لیے ان کے ذہنی اور تعلیمی معیار کے مطابق عربی اشعار کے ایک شستہ، شگفتہ، متنوع اور معیاری انتخاب کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ زیر نظر انتخاب جس کا نام حضرت عمر کے مشہور مقولہ "محاسن الشعر تدل علی مکارم الاخلاق وتنہی عن مساویہا" سے ماخوذ ہے اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اس انتخاب کا پہلا حصہ ہے۔ اس مختصر مجموعہ میں مرتب نے صدر اسلام سے لے کر موجودہ دور تک کے تقریباً پچاس شعرا کے سہل، سلیس اور ہلکے پھلکے اسی قطعات کا انتخاب کیا ہے۔ انتخاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تمام قطعات دینی و اخلاقی مضامین پر مشتمل ہیں لیکن مرتب کے نزدیک انتخاب کی شرط اول یہ رہی ہے کہ اشعار فنی اعتبار سے ممتاز اور شعریت سے بھرپور ہوں۔ اس طرح اس مجموعے سے بیک وقت دونوں فائدے حاصل ہوں گے۔ طلبہ کے اندر عربی زبان کا ملکہ اور ادب کا ذوق بھی پیدا ہوگا اور ان کی ذہنی و اخلاقی تربیت بھی ہوگی۔

جن شعراء کے کلام کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں حسان بن ثابت، لبید بن ربیعہ، ضرار بن الازور، نابغہ شیبانی، عروہ بن اذینہ، بشار، ابو نواس، ابو العتاہیہ، عبداللہ بن عبدالاعلی، علی بن الجہم، متنبی اور یوسف العظم قابل ذکر ہیں۔ حاشیہ میں شعراء کا مختصر تعارف بھی درج کیا گیا ہے جس سے مجموعہ

کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ یہ مفید اور پاکیزہ انتخاب عربی مدارس اور اسکولوں کے نصاب میں داخل کیے جانے کے لائق ہے۔ (عبداللطیف اعظمی)

مجلّہ تحقیق (سہ ماہی) مدیر۔ ڈاکٹر وحید قریشی

پاکستان کے مشہور علمی و تعلیمی ادارہ اورینٹل کالج لاہور سے ابھی حال میں ایک سہ ماہی تحقیقی مجلّہ شائع ہوا ہے جس کا ہم پرجوش خیر مقدم کرتے ہیں۔

اس مجلّے کے مدیر اردو کے مشہور ادیب اور متعدد کتابوں کے مصنف پروفیسر ڈاکٹر وحید قریشی ہیں۔ اب تک اس کے دو خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں، پہلا شمارہ نمبر ا/ ۲ پر مشتمل ہے اور دوسرا نمبر ۳/ ۴ پر۔ اس طرح جلد اول بابت ۷۹-۱۹۷۸ء مکمل ہو گئی ہے اور اب نئے مالی سال سے پانچواں شمارہ شائع ہوگا۔ رسالے کے بارے میں پہلے شمارے کے اداریے میں فاضل مدیر نے لکھا ہے کہ: "یہ سہ ماہی جریدہ پاکستان کا شاید واحد تحقیقی مجلہ ہے، جس کا دائرۂ موضوعات جملہ مشرقی زبانوں اور علوم تک پھیلا ہوا ہے۔ انگریزی زبان میں ضرور ایک دو مجلّے شائع ہوتے ہیں، لیکن ان میں دوسری زبانوں کے مقالات کی گنجائش بہت کم ہے۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ہمارے تحقیقی مجلے ایک ایک کرکے دم توڑ چکے ہیں لے دے کر ایک رسالہ "اردو" گردش حالات کا مقابلہ کر رہا ہے، لیکن اس کا موضوع بھی بیشتر اردو ادب کی تحقیق تک محدود ہے۔ "صحیفہ" دس برس کی تحقیقی زندگی کے بعد ایک ادبی پرچے میں منتقل ہو چکا ہے۔ نفع پسندی کے اس دور میں تحقیقی مجلّات تو ایک طرف ادبی مجلّات کا وجود بھی خطرے میں ہے۔ تحقیق، مالی لحاظ سے کوئی منفعت بخش کاروبار نہیں۔ علمی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی تو سرکاری ادارے ہی کر سکتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی نے اساتذہ کے تحقیقی مقالات کو شائع کرنے کے لیے اس جریدے کا ڈول ڈالا ہے، تاہم اس مجلّے کے مشمولات اور تحقیقی نتائج کی عمومی ذمہ داری خود اہلِ قلم پر ہوگی ..."

یہ مجلّہ ٹائپ میں شائع ہوتا ہے، اس کا سالانہ چندہ ۴۰ روپے ہے اور ملنے کا پتہ:
فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ، یونیورسٹی اورینٹل کالج۔ لاہور (پاکستان)

(عبداللطیف اعظمی)

کوائف جامعہ

شیخ الجامعہ صاحب کی علالت

شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب کے قلب پر [illegible] اکتوبر کی شب میں شدید حملہ ہوا اور فوری طور پر ولنگڈن ہسپتال میں انھیں داخل کر دیا گیا۔ اس وقت وہ دلی کے مشہور ماہر امراض قلب ڈاکٹر کرولی کے زیر علاج ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب وہ پہلے سے بہت بہتر ہیں اور امید ہے کہ ان شاء اللہ جلد ہی ہسپتال سے گھر آجائیں گے۔

موصوف کی علالت کی وجہ سے آج کل سینیر ڈین جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب، حسب قاعدہ، قائم مقام کی حیثیت سے شیخ الجامعہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

جناب جے پرکاش نرائن کا تعزیتی جلسہ

لوک نائک شری جے پرکاش نرائن کی اچانک وفات کی ۸ اکتوبر کی صبح کو جونہی اطلاع ملی فوراً ہی جامعہ میں چھٹی کا اعلان کر دیا گیا اور دوسرے روز شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب کی صدارت میں استادوں، کارکنوں اور طالب علموں کا ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں صدر جلسہ کے علاوہ کالج کے پرنسپل جناب ضیاء الحسن فاروقی، پروفیسر علی اشرف، پروفیسر شمس الرحمان محسنی اور طلبائے کالج کی یونین کے صدر جناب عمرالدین نے تقریریں کیں۔ عمرالدین صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ جے پرکاش نرائن صاحب ایک بڑے خواب کے خالق تھے مگر وہ خواب ان ہی کی زندگی میں بکھر گیا۔ محسنی صاحب نے مرحوم کی سماجی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان سے اپنی ان ملاقاتوں کا ذکر کیا جو مختلف سیمناروں کے موقعوں پر ہوئی تھیں۔ علی اشرف صاحب نے لوک نائک کی سیاسی اور سماجی خدمات کا تفصیل سے تجزیہ کیا اور آخر میں

فرمایا کہ ابھی ان کی خدمات کے محاکمے کا موقع نہیں آیا ہے۔ فاروقی صاحب نے جے پرکاش جی کی زندگی کے مختلف مراحل کا تفصیلی طور پر ذکر کیا اور ان تشکیلی عناصر کی نشاندہی کی جن سے ان کی شخصیت عبارت تھی، نیز فاضل مقرر نے ان کی سیاست کو روحانی اور آدرش وادی سیاست سے تعبیر کیا۔ آخر میں شیخ الجامعہ صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں ملک کے محبوب رہنما کی شاندار اور مخلصانہ خدمات کا ذکر کیا اور جامعہ کے اساتذہ، کارکنوں اور طلبا کی طرف سے تعزیتی تجویز پیش کی جس میں موصوف کی حق گوئی، بے باکی، راست بازی اور ملکی و قومی خدمات کا کھل کر اعتراف کیا گیا تھا۔ جلسہ دو منٹ کی خاموشی پر ختم ہوا۔

مولانا مودودی کی وفات پر تعزیتی جلسہ

مفکر اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے سانحۂ ارتحال پر ۱۱ر اکتوبر کو شعبۂ اسلامک و عرب ایرانین اسٹڈیز کے اہتمام میں پرنسپل جامعہ کالج جناب ضیاء الحسن فاروقی کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا اور سکریٹری کے فرائض صدر طلبائے شعبہ جناب عزیز احمد نے انجام دیئے۔ جلسے کی کاروائی کا آغاز مولانا قاری سلیمان قاسمی پیش امام مسجد جامعہ کی تلاوت قرآن حکیم سے ہوا۔ صدر جلسہ کے علاوہ جناب مجیب رضوی (ریڈر شعبۂ ہندی) نے مرحوم کے بارے میں تقریر فرمائی اور طلبائے شعبہ میں سے حفیظ الرحمن صاحب (عربی آنرز) خرم قیومی صاحب (بی۔ اے سال سوم) سید خالد علی صاحب (ایم۔ اے سال اول) نے مقالے پڑھے، جن میں مولانائے مرحوم کی شخصیت اور دینی و علمی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی۔ آخر میں صدر شعبہ پروفیسر بشیر الحق صاحب نے حسب ذیل تعزیتی تجویز پڑھ کر سنائی جسے حاضرین جلسہ نے اپنی دعاؤں کے ساتھ منظور کیا:

"عالم اسلام کی عہد ساز شخصیت، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ۲۲ر ستمبر ۱۹۷۹ء کو امریکہ کے شہر بفیلو میں جہاں وہ علاج کی خاطر گئے تھے، اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، کہ انجام کار ہر مخلوق کو یہ دن دیکھنا پڑتا ہے۔

مولانا مودودی ۲۵ر ستمبر ۱۹۰۳ء کو اس عالم خاک و بو میں آئے۔ انھوں نے ضروری دینی اور دنیاوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد صرف ۱۸ سال کی عمر میں صحافت کی دنیا میں قدم رکھا۔ تحریک خلافت کے عین عروج اور ہندوستانی قومی سیاست کے تہلکہ انگیز دور میں انھوں نے جمعیۃ العلماء ہند کے جماعتی ترجمان

"مسلم" کی ادارتی ذمہ داریاں سنبھالیں، ۱۹۲۴ میں جب مسلم کے بجائے جمیعت کا موجودہ ترجمان "الجمعۃ" نکلا تو ابتدا میں اس اخبار کی مجلس ادارت میں وہ شریک رہے۔ پھر کچھ عرصہ وہ بجنور کے سہ روزہ اخبار مدینہ کی مجلس ادارت میں بھی شامل رہے کچھ عرصے بعد مولانا اپنے وطن حیدرآباد واپس چلے گئے اور وہاں سے نکلنے والے رسالہ ترجمان القرآن کے حق ملکیت کو خرید کر آزادانہ طور پر اپنے خیالات کی ترویج و اشاعت میں مشغول ہو گئے۔

ترجمان القرآن کی ادارت درحقیقت مولانا کی زندگی میں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتی تھی۔ انھوں نے اپنے جاندار قلم سے مسلمانوں کی فکر کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ اپنی کتابوں، رسائل اور خطبات کے ذریعہ انھوں نے امت اسلامیہ میں تلاش حق کا جذبہ پیدا کیا اور ہر قسم کی مخالفتوں کے باوجود مسلمانوں کو اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہنے کا فن سکھایا۔ ۱۹۴۱ میں انھوں نے جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی جو آج بین الاقوامی شہرت کی حامل ایک بڑی تنظیم میں تبدیل ہو چکی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد جماعت بھی دو حصوں میں بٹ گئی، اور مولانا کو جماعت کے ایک بڑے حصے کے ساتھ ساتھ پاکستان ہجرت کرنا پڑا جہاں وہ اپنی وفات سے چند برس پہلے تک جماعت کی امارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی وفات سے امت اسلامیہ کو بڑا گہرا زخم پہنچا ہے لیکن وہ آہستہ آہستہ بھر ہی جائے گا کیونکہ زمانہ بڑے سے بڑے زخم کا مرہم ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود زخم کی ٹیس کا احساس تو زندہ جسموں کو ہوتا ہی ہے۔ اسی احساس کے پیش نظر آج ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو شعبۂ اسلامک عرب و ایرانین اسٹڈیز کی دعوت پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ، طلبہ اور رکارکنان مولانا مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی خاطر جمع ہوئے کہ مولانا اپنی دینی خدمات کی بدولت ملت اسلامیہ کی اہم شخصیت بن گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند سے بلند تر کرے اور ان کے اہل خاندان، جماعتی رفقاء، جماعت اسلامی کے ہمدردوں اور ان تمام مسلمانوں کو جنھیں ان سے عقیدت تھی صبر جمیل عطا فرمائے۔ ہماری یہ دعا بھی ہے کہ مولانا مودودی مرحوم کی وفات سے امت مسلمہ کے قائدوں کی صف میں جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ جلد سے جلد بھری جائے۔ آمین

شعبۂ اردو میں ایک ادبی جلسہ

اردو کے ایک منفرد نظم گو شاعر جناب صباح الدین پرویز، چند مہینے ہوئے سعودی عرب سے ہندوستان

تشریف لائے تھے اور شعبۂ اردو کی بزم جامعہ کی دعوت پر ۲۰ اگست کو جامعہ تشریف لائے اور اپنی متعدد نظمیں سنائیں جنھیں بہت پسند کیا گیا، خاص طور پر "حمد" "محمد رسول اللہ" اور "لوری" پر بڑی داد ملی۔
جلسے کے آغاز پر جامعہ کے ایک قدیم طالب علم اور اردو کے ریسرچ اسکالر جناب شمس الحق عثمانی نے معزز مہمان کا تفصیل سے تعارف کرایا، اس کے بعد جناب آشفتہ چنگیزی نے موصوف کی شخصیت اور ادبی خدمات پر ایک مضمون پڑھا اور جناب محمود ہاشمی اور ابو الکلام قاسمی نے جناب پرویز کی شعری خصوصیات پر تقریریں کیں۔ جلسے کے اختتام پر صدر جلسہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے تقریر کی۔ موصوف نے معزز مہمان کی شاعری کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ: صلاح الدین پرویز اردو کے ان ہونہار شاعروں میں ہیں جن کے تخلیقی سفر کو میں پچھلے کئی برسوں سے دلچسپی اور توجہ سے دیکھ رہا ہوں۔ آج سے کوئی دس سال پہلے جب میں نے ان کی پہلی طویل نظم "ژاژ" پڑھی تھی تو میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ یا تو یہ شخص کھلواڑ کر کے رہ جائے گا یا اس کی آواز سے اردو میں ایک شعری انفرادیت کا اضافہ ہوگا۔ مجھے خوشی ہے کہ "ژاژ" سے "نیگیٹو" اور نیگیٹو سے "جنگل" اور جنگل سے بعد کی تازہ ترین نظموں تک ان کی شعری انفرادیت کے بارے میں ہماری توقعات پوری ہوتی نظر آتی ہیں۔ موصوف نے مزید فرمایا کہ پرویز کے یہاں تخلیقی قوت کی ایسی زبردست صلاحیت ہے جو ان کے ساتھ ابھرنے والے متعدد شاعروں میں نظر نہیں آتی۔ شروع شروع میں صلاح الدین پرویز کی شاعری کو لوگوں کو ایک صدماتی کیفیت سے دوچار کیا تھا، اس کی دو بنیادی وجہیں تھیں، ایک یہ کہ ان کی شاعری جدید شاعری کی مروجہ تنقیدی اصطلاحات کو توڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اس میں اپنے عہد کی شاعری کی طرح خود کلامی کی ایک مدھم اور دھیمی لے تو ہے لیکن اس میں بہاؤ، بے تکلفی، برجستگی اور روانی کی ایک ایسی کیفیت بھی ہے جو کسی جنگل سے گذرنے والی ندی کے پانی میں ہوتی ہے جو گھنے پیڑوں کے سائے میں زمین کے سینے پر اپنا راستہ خود بناتا ہے اور جسے اپنی منزل کی خبر نہیں ہوتی۔ دوسری وجہ کو بیان کرتے ہوئے فاضل مقرر نے فرمایا کہ: اردو ادب کی روایت بالخصوص جدید شاعری میں جنس کے اظہار احساس کی کئی سطحیں اور پرتیں ہیں، لیکن پرویز کے یہاں جنسی جذبے کا اظہار عمداً نہیں بلکہ فطری طور پر زندگی کی ایک نارمل کیفیت کی طرح ہوا ہے جس میں کسی تصنع یا کوشش کو دخل نہیں ہے۔ آخر میں نارنگ صاحب نے فرمایا کہ: اس سے خوشی ہوتی ہے کہ سعودی عرب جانے کے

(بقیہ صفحہ ۴۵۳)

d. No. D-(S)-110 Vol. 76 No. 9 September, 1979

The Monthly JAMIA

JAMIA MILLIA ISLAMIA
NEW DELHI - 110025

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

سالانہ چندہ
چھ روپے

جامعہ

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۷۶ | بابت ماہ اکتوبر ۱۹۷۹ء | شمارہ ۱۰

فہرست مضامین

شذرات

برکات احمد صاحب کی کتاب MUHAMMAD AND THE JEWS ابھی حال میں نظر سے گذری۔ جو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، تغلق آباد نئی دہلی کی طرف سے وکاس پبلشنگ ہاؤس پرائیویٹ لمیٹڈ، نئی دہلی نے اسی سال شائع کیا ہے۔ مستشرقین نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے، لیکن غالباً اب تک کسی مسلمان نے اس موضوع کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی کہ جدید معیار تحقیق کے مطابق اسے الگ سے اپنی ریسرچ کا موضوع بناتا، اس لحاظ سے برکات احمد صاحب کی یہ کوشش لائق صد تحسین ہے۔

مستشرقین نے بھی اس معاملہ میں اپنی تحقیقات کو محدود ہی رکھا، انھوں نے اس کی تلاش زیادہ کی کہ اسلام میں یہودی مذہب کے اثرات کیا ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔ ان میں سے بعض اہل قلم نے تو محض یہ کوشش کی یہ کہہ کر کہ اسلام میں کوئی نئی بات نہیں وہ یہ ثابت کریں کہ پیغمبر اسلامؐ نے جو کچھ یہودیوں اور عیسائی راہبوں سے سنا، اسے قرآن میں پیش کر دیا۔ بعض نے صرف یہ لکھ کر اپنی تسکین کا سامان بہم پہونچایا کہ پیغمبر اسلامؐ کو بڑی مایوسی ہوئی جب یہودیوں نے کبھی آپ کو اللہ کا رسول ماننے سے انکار کر دیا، بعد میں آپ نے انھیں جزیرہ نمائے عرب سے نکال دیا اور ان کی بڑی تعداد قتل کر دی گئی۔ برکات احمد صاحب نے اپنی کتاب میں اس سلسلہ میں جہاں مستشرقین کے تعصبات ذہنی اور محدود نقطۂ نظر کا شکوہ کیا ہے وہیں انھیں مسلم مورخین اور مصنفین کتب فقہ سے بھی گلہ ہے کہ ذمیوں سے متعلق ان کے یہاں جو کچھ ملتا ہے اس میں نقد پر تاریخ قربان کر دی گئی ہے اور ان افسانوں اور کہانیوں کے مقابلہ میں جو وقت کے ساتھ ساتھ دینی رنگ اختیار

کرتی گئیں، تاریخی حقائق کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

برکات احمد صاحب کا خیال ہے کہ عرب کے یہودیوں اور مسلمانوں کے تعلقات سے متعلق تاریخی مواد اتنا کم ہے کہ اُن کی روشنی میں ماضی کے واقعات پوری طرح سامنے نہیں لائے جاسکتے۔ مسلم مورخین کو اس سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی کہ حقیقتاً یہودیوں پر کیا بیتی اور یہودیوں نے بھی اس وقت کا اپنا کوئی ریکارڈ نہیں چھوڑا جب پہلے پہل اسلام سے اُن کا سابقہ پڑا۔ بہرحال، جو کچھ مواد حاصل ہے، اور اگرچہ اس میں متضاد روایتیں کافی ہیں، ان کا ایک تنقیدی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ برکات احمد صاحب نے اپنے مطالعہ کی بنیاد ان چار مآخذ پر رکھی ہے: (۱) قرآن (۲) ابن ہشام کی کتاب سیرت رسول اللہ جو ابن اسحٰق (م ۷۶۸ء) پر مبنی ہے (۳) امام بخاری (م ۸۶۹ء) کی الجامع الصحیح اور (۴) الصحیح للمسلم بن الحجاج (م ۸۷۴ء)۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کتاب میں انھوں نے واقدی (م ۸۲۲ء) کی مغازی اور ابن سعد (م ۸۴۵ء) کی طبقات کو بھی جانچا ہے لیکن مجموعی اعتبار سے استدلال کا سارا بار انھیں چار ماخذوں پر ہے۔

روایات کو جمع کرنے کا جو طریقہ ابن اسحٰق، واقدی اور ابن سعد کا تھا، اس پر مصنف نے بڑی دیدہ ریزی سے لکھا ہے اور ان کے بارے میں موافق اور مخالف رائیں سبھی بیان کر دی ہیں۔ اسی طرح صحیحین اور ان کے مولفین سے متعلق بھی لکھا ہے اور گولڈ تسیہر، مارگولیتھ وغیرہ نے احادیث سے متعلق جو لٹریچر پیش کیا ہے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے اور آخر میں یہ بھی لکھا ہے کہ سنن ابو داؤد اور سمہودی کی وفاء الوفاء باخبار دار المصطفٰی سے بھی مزید معلومات کے لئے استفادہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابو داؤد میں ہمیں اُن واقعات سے متعلق مزید معلومات یا تشریحات مل جاتی ہیں جن کے بارے میں ہمارے اصل ماخذ خاموش ہیں، یا ان میں ابہام ہے

اور عہد اسلام کے مدینہ سے متعلق وفاء الوفاء اولین ماخذ ہے۔

زیر نظر کتاب میں عالمانہ مقدمہ کے علاوہ چھ ابواب ہیں۔ آخر میں کتابوں کی ایک مبسوط فہرست (کتابیات) ہے اور کچھ انڈکس۔ تین نقشے بھی ہیں جن میں ایک ہجرت کے پہلے سال کے مدینہ کا نقشہ ہے، دوسرا جنگ احزاب کے وقت کے مدینہ کا اور تیسرا خیبر اور مخالف قبائل کے مستقر کا۔ کتاب کا چوتھا باب جنگ احزاب میں دشمنان اسلام کی ناکامی اور بنو قریظہ سے متعلق ہے۔ بنو قریظہ کے واقعہ کی حقیقت کیا ہے اور روایات میں اس کو کس کس طرح سے بیان کیا گیا ہے، اس کے سہارے بعض مستشرقین نے ہمارے حضورؐ پر بڑے الزامات لگائے ہیں اور آپ کی سیرت کو جو سراسر رحمت تھی، مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسلم مورخین نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا ہے وہ زیادہ تر معذرت خواہانہ انداز میں لکھا ہے یا پھر الزامی جواب دئے ہیں، لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ برکات احمد صاحب نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اور جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ معروضی تاریخ نویسی کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ انھوں نے روایات کی جانچ کی ہے، تعصب یا عقیدت کے بجائے عقل کا استعمال کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ بنو قریظہ کے قتل عام کا واقعہ محض داستاں سرائی ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ ایک بار لارڈ ایکٹن نے کہا تھا کہ جب کوئی دلچسپ روایت سامنے آتی ہے تو تنقیدی نظر سب سے پہلے اسے شبہ سے دیکھتی ہے۔ مورخ کا بنیادی کام یہ نہیں ہے کہ وہ تاریخی مواد جمع کر دے بلکہ یہ ہے کہ وہ تحقیق کرے اور یہ بتائے کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی زندگی میں بنو قریظہ کا جو واقعہ مشہور ہے وہ ایک عجیب وغریب واقعہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بنو قریظہ نے جب ہتھیار ڈال دئے تو ان کے چھ سو سے نو سو آدمی تک قتل کر دئے گئے، حالانکہ آپ کی زندگی میں جو لڑائیاں ہوئیں اور سرایا کے جو واقعات پیش آئے، ان سب میں مسلمان اور غیر مسلم، سب ملاکر، جو مارے گئے ان کی تعداد پانچ سو سے کم ہے جن میں غیر مسلموں کی تعداد تین سو سے بھی کم ہے۔

بنو قریظہ کے واقعہ پر جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن مغرب کے مصنفین اور مسلم مورخین نے اُن روایتوں اور شہادتوں کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی جو مشہور اور ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتی رہیں۔

برکات احمد صاحب نے بڑے پتہ کی بات لکھی ہے کہ قتل عام کی داستانیں انسان کی قوت متخیلہ پر بہت جلد اثر انداز ہوتی ہیں، بس ایک بار وہ مشہور ہو کر پھیل جائیں، پھر قوموں کے اجتماعی حافظہ سے انھیں نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر تاریخی اعتبار سے انھیں غلط بھی ثابت کر دیجئے تب بھی وہ عوامی کہانیوں کا جزو بنی رہتی ہیں۔ تاریخ میں قتل عام کے واقعات زیادہ تر مشکوک ہوتے ہیں اور اس کا قوی امکان ہوتا ہے کہ یا تو ان میں بہت مبالغہ ہو یا وہ بالکل موضوع ہوں۔ ابن اسحٰق، اور ایک حد تک کم درجہ میں، واقدی، ابن سعد اور ان سے پہلے زہری اور موسیٰ بن عقبہ نے جن حقائق کو اہم سمجھا انھیں یاد رکھا، تلمبند کیا اور بیان کر دیا۔ واقعات اور ان کی تفصیلات جو ہمارے نقطۂ نظر سے اہمیت کی حامل تھیں، وہ غالباً ان کے نزدیک بالکل غیر اہم تھیں۔ یہودیوں کے نزدیک بھی ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس وقت جب بنو قریظہ جیسے المناک واقعات پیش آرہے تھے کوئی یہودی مورخ، مصنف، نامہ نگار نہ تھا جو انھیں لکھ لیتا، یا کوئی یہودی مسافر حجاز کے یہودیوں کی مصائب کی داستانیں دور دور تک پھیلا دیتا۔ لیکن اس کا یقین نہیں آتا کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جب ابن اسحٰق اور ابن سعد اپنی کتاب کے لئے مواد جمع کر رہے تھے، یہودی ربیوں اور عالموں میں کوئی ایسا نہ تھا جو پیغمبر اسلامؐ کے عہد کے واقعات کو یہودیوں کی روایات کے مطابق جمع کر لیتا۔ یہودی شروع ہی سے اپنے مصائب کو لکھتے اور بیان کرتے رہے ہیں، لیکن ۱۸۳۳ء تک جب وائز بیڈن کے ربی ابراہم گائیجر نے اپنی کتاب لکھی یہودیوں کی تاریخ میں کہیں ان کہانیوں کا سُراغ نہیں ملتا۔ یثرب اور خیبر میں یہودیوں نے اپنا اقتدار اس وجہ سے کھو یا کہ قریش مکہ کی طرح حالات کے مطابق اپنے آپ کو نہ ڈھال سکے، حالانکہ قریش اور دوسرے عرب قبائل کے مقابلہ میں ان کے سامنے جو شرائط رکھی گئیں وہ مختلف اور بہت زیادہ رعایت کے ساتھ تھیں۔

ضیاء الحسن فاروقی

امام بخاریؒ، بابر اور احمد دانش کے دیس میں

(۲)

۱۳ اور ۱۴ جولائی کانفرنس کی تاریخیں تھیں۔ کانفرنس میں شرکت کے لئے ٹیونس، لبنان، شرق اردن، عراق، کویت، ایران، ترکی، بلغاریہ، ایتھوپیا اور جاپان سے علماء، مفتی، اہل قلم اور صحافی آئے تھے۔ ان کے علاوہ روس کی مختلف ریپبلکس کے نمایندے تھے۔ ایک عیسائی عالم بھی تھے جو ماسکو سے تشریف لائے تھے اور روسی آرتھوڈوکس چرچ کے نمایندہ تھے۔ ان کی حیثیت مشاہد کی تھی۔ کانفرنس کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا، تلاوت ایک نہایت اچھے اور نوجوان قاری نے کی۔ اس کے بعد مفتی ضیاء الدین بابا خان ابن ایشان بابا خان نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے افتتاحیہ خطبہ دیا جس میں سوویٹ یونین کے مسلمانوں کی مذہبی زندگی اور ان کی مساجد، مقابر، مدارس، تہذیبی آثار اور علماء اسلام کی دینی اور علمی خدمات کا تذکرہ تھا۔ اس عہد میں سوویٹ دیس کے مسلمانوں نے جو تہذیبی، علمی اور معاشی ترقی کی ہے اسے بھی بیان کیا گیا تھا۔ امن عالم، حقوق انسانی اور فلسطین جو

ساری حق پرست دنیا کا مسئلہ بن گئے ہیں ، ان کی طرف بھی توجہ دلائی گئی تھی اور یہ بتایا گیا تھا کہ ان امور و مسائل میں سوویٹ یونین کے مسلمانوں نے بھرپور دلچسپی لی ہے اور وہ دنیا کے سامراجیوں کے خلاف صف آرا رہے ہیں۔

اس کے بعد وسط ایشیا اور قازقستان کے مسلم مذہبی بورڈ کے ڈپٹی چیرمین ڈاکٹر یوسف شاکر نے تقریر کی۔ ان کی تقریر لکھی ہوئی تھی اور انگریزی میں تھی۔ اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ پوری تاریخ انسانی میں اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور نبیوں نے اپنی اپنی قوم کو امن و آشتی اور دوستی و محبت کی تعلیم دی اور ان کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ بنی نوع انسان نے ہمیشہ پرامن زندگی کے لئے جدوجہد کی ہے۔ میں اس موقع پر یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارے مقدس مذہب اسلام نے آغاز کار ہی سے جزیرہ نمائے عرب کے مختلف قبیلوں کو دوستی، محبت اور پرامن بقائے باہم کا پیغام دیا اور جب وہ جزیرہ نمائے عرب کی سرحدوں سے باہر پہونچا تو وہاں بھی اس کی یہی تعلیم تھی ۔۔۔ ہمارے ملک کے مسلمان جن کا ایمان قادر مطلق اللہ تعالیٰ پر پختہ ہے، اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ سارے مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اسی لئے وسط ایشیا اور قازقستان کے مسلم مذہبی بورڈ نے ہمیشہ اس امر کی کوشش کی ہے کہ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے سوویٹ یونین کے مسلمانوں کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے ۔۔۔۔ اور اس سلسلے میں ہمارے رسالے 'مسلمز آف دی سوویٹ ایسٹ' نے نمایاں حصہ لیا ہے۔"

اس دن جلسے میں اور کئی تقریریں ہوئیں جو عربی میں تھیں۔ ان تمام تقریروں میں وسط ایشیا اور قازقستان کے مسلم مذہبی بورڈ کے نائب صدر ڈاکٹر عبد الغنی عبد اللہ کی تقریر نہایت عالمانہ اور معلومات سے پر تھی۔ وہ مذکورہ رسالے کے مدیر ہیں اور کئی زبانیں جانتے ہیں۔ یہ رسالہ اس وقت

چار زبانوں، ازبک، عربی، انگریزی اور فرانسیسی میں چھپتا ہے۔ جلد ہی اسے روسی اور دنیا کی دیگر زبانوں میں چھاپنے کا منصوبہ بھی ہے۔ پروگرام کے مطابق ۲۳ جولائی کو کانفرنس ڈیڑھ بجے تک چلی۔ اس کے بعد ٹیلہ شیخ مسجد میں ظہر کی نماز پڑھی گئی۔ نماز میں کوئی ڈھائی تین سو آدمی ہوں گے۔ سنتوں اور نوافل کے بعد ایک قاری نے کلام پاک کے ایک رکوع کی تلاوت کی، ازبک زبان میں اس کا ترجمہ بیان کیا گیا اور پھر دو تین منٹ تک دعاء ہوئی۔ اس کے بعد لبنان کے مہمان مفتی حسن خالد نے نہایت فصیح عربی میں تقریر کی۔ تقریر میں ایک بات یہ بھی آئی کہ اسلام میں رنگ اور نسل کا کوئی امتیاز نہیں اور تقویٰ ہی بڑائی کا معیار ہے۔ اسی سلسلے میں حضرت بلال حبشیؓ کا ذکر آگیا۔ اس کا ادیس ابابا (ایبی سینیا) کے مہمان الحاج عمر حسینی پر بہت اثر ہوا یہ تاثر ان کے چہرے سے صاف نمایاں تھا، آخر میں ان سے نہ رہا گیا اور مفتی حسن خالد کی تقریر کے بعد وہ خود کھڑے ہوگئے اور کوئی دس منٹ تک بڑے جوش کے ساتھ اسلام کے عالمگیر برادری کے تصور کے موضوع پر بولتے رہے۔ عربی میں ان دونوں تقریروں کا ازبک زبان میں ترجمہ ہوا، میں نے دیکھا کہ میرے قریب بیٹھے ادھیڑ عمر کے ایک ازبک کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، میں نے مجمع پر نظر ڈالی تو کئی ازبکوں کی آنکھوں پر ان کے رومال دیکھے اس منظر سے میری آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔ میں نے سوچا کہ جس سرزمین پر صحابہؓ اور تابعینؒ کے قدم پڑ چکے ہیں اور جس خاک سے امام بخاریؒ جیسے جلیل القدر محدث اٹھے ہیں اور جہاں کی خلوتوں میں صدیوں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوا ہے اور جلوتوں میں اذانیں گونجی ہیں، اس سرزمین سے اسلام کبھی فنا نہیں ہوسکتا، یہ مٹی ذرا بھی نم ہو جائے تو بہت زرخیز ہے، بہت زرخیز ہے۔

ایک بات اور جو میں نے اس پورے سفر میں، تاشقند سے ماسکو تک، دیکھی اور سوویٹ یونین کے خاص حالات میں اس کی افادیت کو محسوس

کیا، وہ یہ ہے کہ یہاں ہر نماز کے بعد قرآن پاک کے کسی حصہ کی تلاوت ضرور ہوتی ہے اور پھر مقامی زبان میں اس کا ترجمہ و تفسیر اور پھر قدرے طویل دعا۔ فرض نمازوں کے بعد جو دعا ہوتی ہے وہ بہت مختصر۔ اس دعا کے بعد امام مقتدی کی طرف رُخ کر کے بیٹھتا ہے اور تسبیح کے کلمات، مثلاً سبحان اللہ ایک بار قدرے بلند آواز سے کہتا ہے، پھر زیرلب مقتدی اس کی اقتدار میں اسی طرح تسبیح پڑھتے ہیں، اس کے بعد الحمد للہ اور آخر میں اسی طور سے اللہ اکبر، ہمارے یہاں یہ طریقہ نہیں ہے۔ میں نے یہاں کے لوگوں میں مسجد اور کلام پاک کا حد درجہ احترام پایا اور ایسا نظم وضبط کہ ذرا بھی شور یا بھاگ دوڑ نہیں۔ میں نے بعض مسجدوں میں بچے بھی دیکھے لیکن کیا مجال جو مسجد کے احترام میں کسی سے پیچھے ہوں۔ میرا احساس یہ ہے کہ یہ کسی خاص موقع کے لئے سکھائی یا سمجھائی بات نہیں، یہ یقیناً وسط ایشیا کے مسلمانوں کی خصوصیت اور روایت ہے جس کا احترام اندر سے پیدا ہوتا ہے اور نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہتا ہے۔

ٹیلہ شیخ مسجد میں ظہر کی نماز ادا کر کے ہم لوگ اس مدرسہ میں آئے جو امام بخاری کے نام پر اعلیٰ دینی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا ہے اور جہاں بخارا کے مدرسہ میر عرب کے فضلاء، حدیث، تفسیر یا فقہ اسلامی میں تخصص کے لئے آتے ہیں۔ یہاں دینی تعلیم کے ساتھ انھیں سماجی علوم اور بین الاقوامی سیاست کا نصاب بھی پڑھنا ہوتا ہے۔ اس مدرسہ کے وسیع وعریض صحن میں چائے خانوں کی طرز کی دو تین بارہ دریاں تھیں۔ انھیں میں کھانے کا انتظام تھا۔ ہم لوگ میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میز پر نہایت خوش سلیقگی سے پلیٹوں میں انواع واقسام کے پھل رکھے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر پھلوں کے رس سے بھرے جگ پیاس کی لذت بڑھا رہے تھے۔ میز پر اسی طرح روٹیاں (نان) سجی ہوئی تھیں، چار پینے

کے لیے نقشین خوشنما پیالے اور کیتلیاں رکھی تھیں۔ لیجئے مفتی ضیاء الدین
باباخاں نے ایک روٹی اٹھائی، اس کے کئی ٹکڑے کئے اور آس پاس
بیٹھے مہمانوں کو تقسیم کئے، یہ گویا اعلان تھا کہ اب کھانا شروع ہو گیا۔
یہاں درحقیقت روٹی ہی کو اصل رزق سمجھا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے
کہ یہ روایت صوفیائے کرام کی خانقاہوں کی رہین منت ہے اور اب
تک باقی ہے۔ مفتی ضیاء الدین باباخاں نقشبندیہ سلسلے سے تعلق رکھتے
ہیں۔ ان کے والد الشان باباخان اور دادا عبدالمجید خاں دونوں نقشبندی
بزرگ تھے، عبدالمجید خاں، حضرت خواجہ عبدالرزاق رح کے مرید و مجاز تھے
اور آخر الذکر کو خلافت ملی تھی حضرت عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم قدس سرہٗ
سے جو حضرت مجدد شیخ احمد سرہندی کے فرزند اور خلیفہ تھے۔

میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی نے نہایت سادگی سے روٹی کا ایک ٹکڑا
بغیر دودھ کی چاء میں ڈبویا اور منہ میں رکھ لیا (اس علاقے میں دودھ کی چاء
کا رواج نہیں)۔ دو تین ٹکڑے انھوں نے اسی طرح کھائے۔ مجھے پیاس
لگی تھی، اس لئے پہلے دو گلاس پھلوں کا رس پیا، چند دانے انگور کے لئے
اور پھر پیالے میں چاء انڈیلی۔ آڑو بہت اچھے تھے، لیکن میں نے اب تک
ان کی طرف توجہ نہیں کی تھی اس خیال سے کہ پہلے کھانا کھالوں، لیکن کھانے
کا کوئی ذکر نہیں، ناچار ایک آڑو لیا، نہایت خوش ذائقہ اور رسیلا۔ کوئی
آدھ گھنٹے بعد شوربے کا بڑا پیالہ (کاسہ) سامنے آیا جس میں گوشت کی
ایک بڑی بوٹی کے ساتھ ٹماٹر اور گاجر کے ٹکڑے بھی تھے اور اوپر سے
ہری دھنیا کی پتی بھی۔ یہ گویا سوپ تھا جو کاسہ بھر تھا۔ میں نے اسے آداب
طعام کے خلاف سمجھا کہ پیالے میں کچھ رہنے دوں۔ پھر اس کے بعد ایک طویل
وقفہ، ناچار پھلوں سے وقت گذاری کرتا رہا، کافی دیر بعد گرم گرم تکے
کباب کی تین تین سیخیں ہم کو ملیں، بہت لذیذ، اچھے بھنے ہوئے، سیخ کو

ایک طرف سے پکڑتے اور ہولے ہولے کھاتے رہیئے۔ میں نے ایسے عمدہ کباب پہلے کبھی نہ کھائے تھے، بس لطف آگیا۔ میں سمجھا کہ اب معاملہ ختم ہے، اس لئے پھلوں کی طرف توجہ کی، لیکن دس پندرہ منٹ کے بعد دیکھا کہ پلاؤ چلا آرہا ہے۔ میں نے ہمت ہار دی، قریب ہی شرف الدین صاحب تشریف فرما تھے، ان سے کہا کہ بھئی، میں ازبک نہیں، شکست تسلیم کرتا ہوں اور ہتھیار ڈالتا ہوں۔ بولے، ایسا نہ کرنا، یہی تو خاص مہمانی کھانا ہے، مہمان پلاؤ نہ کھائے تو ازبک اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ تھوڑا سا لے لو اور یاد رکھو کہ اس کے بعد آئس کریم ہوگی۔ میں نے پلیٹ میں تھوڑا سا پلاؤ لیا، اس میں کشمش بھی تھی، پلاؤ لذیذ تھا، لیکن چاول موٹا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں باریک چاول نہیں ہوتے، یہی سب سے اچھی قسم ہے۔ میں نے دیکھا کہ لوگ پلاؤ کے ساتھ بھی خاصا انصاف کر رہے ہیں، لیکن میں نے نا انصافی ہی میں عافیت سمجھی، یہ دور ختم ہوا تو آئس کریم آئی اور خدا خدا کرکے کھانے کا آخری مرحلہ بھی طے ہوا، پھر بھی چائے کا دور جاری رہا۔ اس طرح کوئی دو پونے دو گھنٹے میں لنچ کا سلسلہ ختم ہوا۔ میں نے کھانے کی تفصیل کو جان بوجھ کر طویل کر دیا ہے اس لئے کہ میں چاہتا تھا کہ وسط ایشیا کی معاشرتی زندگی کے ایک خاص پہلو کی جھلک آپ بھی دیکھ لیں، اس لنچ کے بعد میں نے سمجھ لیا کہ اسی طرح اب دعوتیں ہوں گی، آئندہ ہر موقع پر اپنے ذہن میں انتخاب کرلیتا تھا کہ یہ کھاؤں گا اور وہ نہیں کھاؤں گا کیونکہ مجھے بہرحال ہندوستان اپنے بال بچوں میں واپس آنا تھا، البتہ پلاؤ سے کہیں مفر نہ تھی، لینا ضرور پڑتا تھا، چاہے چکھنے کی ہی حد تک۔

ابھی اوپر ذکر کیا گیا کہ امام بخاریؒ کے نام پر قائم کئے گئے اس مدرسہ میں بخارا کے مدرسہ میر عرب کے فضلاء جو کسی فن میں تخصص کے خواہاں ہوتے ہیں، داخل ہوتے ہیں۔ یہاں تعلیم کی مدت چار سال ہے جبکہ مدرسہ میر عرب

میں سات سال ہے۔ بخارا کے اس مدرسہ میں جو طلباء داخل ہوتے ہیں ان کی تعلیم پہلے ہی سے سکنڈری اسکول تک ہو چکی ہوتی ہے اور چونکہ سکنڈری اسکول میں کسی قسم کی مذہبی تعلیم کا انتظام نہیں ہوتا، اس لئے اکثر بچے اپنے والدین کی خواہش پر گھر پر کسی معلم سے مذہبی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے مدرسہ میرعرب میں وہی طلباء آتے ہیں جنھیں اپنی سکنڈری اسکول کی تعلیم کے دوران مذہبی تعلیم سے رغبت یا مناسبت ہو جاتی ہے۔ داخلے میں بھی انتخاب کا ایک معیار ہوتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ مدرسہ پندرہویں صدی میں قائم ہوا تھا اور عرصہ تک اس کی رونق اور علمی شہرت باقی رہی، پھر یہ ویران ہو گیا اور یہاں صرف اللہ کا نام باقی رہا، اور یہ اسی نام کی برکت ہے کہ کعبہ کی پاسبانی کے لئے صنم خانے ہی سے لوگ مل گئے۔ آج یہ مدرسہ آباد ہے اور یہاں ایک نئی زندگی نظر آتی ہے۔ مختلف سوویٹ جمہوریتوں سے جو نوجوان یہاں آتے ہیں وہ اس مقصد سے آتے ہیں کہ وہ اپنی پوری زندگی دین اسلام کی خدمت میں کھپا دیں گے۔ سوویٹ یونین ایک ایسا ملک ہے جہاں کوئی شخص بیکار نہیں رہ سکتا، کام بہرحال اسے ملے گا اور کوئی نہ کوئی کام اسے کرنا ہوگا۔ اس لئے وہ نوجوان لائق صد ستائش ہیں جو جدید زندگی کی تابناکیوں اور ترقیوں کی طرف سے منہ پھیر کر اور "دانشور" کا فیشنیبل لقب قبول نہ کر کے، عالم، امام اور خطیب بننا پسند کرتے ہیں۔

مدرسہ میرعرب میں اتنے ہی عالم، قاری اور امام خطیب تیار کئے جاتے ہیں جتنی کہ سوویٹ یونین کے مسلمانوں کی ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ پرانی مسجدوں کے کھلنے اور آباد ہونے اور نئی مسجدوں کے تعمیر ہونے کے سبب ضرورت بڑھ رہی ہے اس لئے مدرسہ میں داخل ہونے والوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ حضرت مفتی نے مجھے جب یہ بات بتائی تو میں نے کہا کہ یہ بہت مناسب ہے اور سوویٹ یونین کے مخصوص حالات کے پیش نظر جہاں سب

کو اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے ہندوستان میں مذہبی تعلیم کا طریقہ ہی وہاں کے مسلمانوں کے لئے مفید ہوگا۔

مدرسہ میر عرب ہو یا امام بخاری مذہبی ہائر اسکول، دونوں جگہ تعلیم کا معیار اونچا ہے اور دوسرے ملکوں کے علماء اور مذہبی تعلیم کے معیاری ادارے انھیں اچھی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہاں کے جن علماء سے میری ملاقات ہوئی انھیں میں نے دوسرے ملکوں کے علماء کے علم اور دینی فراست کا قدر داں پایا اور انھوں نے بتایا کہ وہ اپنے مدرسوں کے ذہین اور باصلاحیت طلباء کو دنیائے اسلام کے ممتاز علماء کے پاس مشہور درسگاہوں میں بھیجتے رہتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی ان کے یہاں کے طلباء قاہرہ، دمشق، اردن، لیبیا اور مراکش وغیرہ میں موجود ہیں۔ ان کے مُسلم مذہبی بورڈوں میں اس وقت کئی ایسے حضرات اچھے عہدوں پر فائز ہیں جنھوں نے مصر، دمشق اور لیبیا کی اعلیٰ مذہبی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔

مدرسہ میر عرب میں جن علوم کی تعلیم ہوتی ہے وہ یہ ہیں: عربی زبان و ادب، فارسی زبان، قرآن (تجوید اور تفسیر) فقہ و اصول فقہ، حدیث۔ ان کے علاوہ اس مدرسہ میں طلباء کو تاریخ اسلام، ازبک زبان و ادب، جغرافیہ، علم اقتصاد سیاسی، سماجی علوم اور روسی زبان۔ ان سیکولر علوم کی تعلیم آج کے زمانے میں وہ مذہبی تعلیم کے ساتھ ضروری تصور کرتے ہیں۔ مجھے جب یہ بات معلوم ہوئی تو بہت خوشی ہوئی اور میں نے اس نصاب تعلیم کے مرتب کرنے والوں کی روشن خیالی اور روشن ضمیری دونوں کی داد دی۔ اس کانفرنس کے موقع پر مختلف سوویٹ جمہوریتوں سے جو امام خطیب یا مُسلم مذہبی اداروں کے نمائندے آئے تھے، ان میں وہ بھی تھے جو کئی سال پہلے مدرسہ میر عرب کے طالب علم رہ چکے تھے اور وہ بھی جو ابھی گذشتہ سال فارغ ہوئے ہیں یا جو وہاں زیر تعلیم ہیں، میں نے دیکھا کہ ان میں سے ہر شخص میں عربی کی لیاقت

اچھی ہے۔ وہ عربی روانی سے بولتے ہیں، فارسی زبان سے بھی واقفیت رکھتے ہیں، اپنی مادری زبان ازبک، تاجیکی، آذربائیجانی یا ترکی وغیرہ تو وہ جانتے ہی ہیں، روسی زبان پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اور کئی ایسے تھے جو انگریزی بھی جانتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی جنرل ایجوکیشن بھی معقول ہے۔ اس احساس کے ساتھ مجھے اپنے ملک کے عربی مدارس کے طلباء یاد آرہے تھے اور وہ بھی جو جدید طرز کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، جدید اور قدیم دونوں قسم کی تعلیم گاہوں کے اساتذہ کی تصویریں بھی نگاہوں کے سامنے تھیں۔ اور خود اپنا حال بھی۔ سوویٹ جمہوریتوں میں آج ایک عالم کم از کم چار زبانیں جانتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان چار زبانوں کے ذریعہ چار تہذیبوں اور ان کی خصوصیات سے واقف ہو سکتا ہے اور اس کا ذہنی افق کافی وسیع اور روشن ہے۔

امام بخاری مذہبی اسکول کے صحن سے نکلے تو ہم لوگ امام ابوبکر محمد بن اسماعیل قفال شاشی کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گئے۔ علامہ قفال کو قفل بنانے کے فن میں کمال حاصل تھا۔ اسی لئے قفال کے لقب سے مشہور ہوئے، گیارہویں۔ بارہویں صدی عیسوی کے علمائے کبار میں ان کا شمار تھا۔ انھوں نے دور دراز مقامات کی سیر کی تھی اور حجاز، بغداد، خراسان اور دمشق میں قیام کر کے علوم دینیہ کی تحصیل کی تھی اور فقہ، اصول فقہ اور علم حدیث کی دنیا میں اپنی تالیفات کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتے تھے، اُن کے شاگردوں کی تعداد خاصی تھی، اُن کی کتاب 'محاسن الشریعۃ' مشہور ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ بمبئی میں موجود ہے۔ شاشیؒ ہی کے مزار سے متصل مفتی الیشان باباخان ابن عبدالمجید خاں کا مزار ہے جن کا انتقال ۱۹۵۷ء میں ہوا۔ وہاں اور بزرگوں کے مزارات بھی ہیں، جگہ نہایت صاف ستھری ہے اور چاروں طرف سیب آڑو اور دوسرے پھلوں کے بہت سے درخت ہیں۔ انگور کی بیلیں بھی

ہیں، درخت اور بہاریں پھلوں سے لدی کھڑی تھیں، اور ہر طرف ایک دلآویز سکون کا سماں تھا۔

اس علاقہ سے کوئی پونے پانچ بجے رخصت ہوئے اور ازبک سوسائٹی آف فرینڈشپ کے خوبصورت ہال میں پہونچے جہاں ہم لوگوں کا استقبالیہ تھا۔ بیرونی ملکوں سے دوستی اور ثقافتی روابط کو مضبوط کرنے کی غرض سے یہ سوسائٹی قائم ہے۔ اس کی صدر ایک خاتون اقبال خاں توختا خوجا ہیں، اچھے قد و قامت کی خوبصورت خاتون جو نہایت سلیم الطبع، متین اور پڑھی لکھی ہیں، انھوں نے ہمارا استقبال بڑی خندہ پیشانی سے کیا اور خاصے لوازمات کے ساتھ عمدہ دم کی ہوئی سبز چاء پلائی۔ پھر ایک مختصر اور پُر از معلومات تقریر کی، سبز چاء اور ایک حسین و پر وقار خاتون کی دلنشیں آواز میں پُر مغز تقریر، بس دن بھر کی تھکن دور ہوگئی اور ہم لوگ تازہ دم ہوگئے۔ رخصت ہوئے تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں شکریہ یا تشکر کے بجائے 'رحمت' کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ غالباً ازبکوں کے یہاں 'رحمکم اللہ' نے مخفف ہوکر 'رحمت' کی شکل اختیار کرلی ہے۔ جواب تھا، شاید، لیکن بہرحال یہ لفظ ہمیں اُس کی رحمت کی (یہ کہتے ہوئے انھوں نے ہاتھ سے اوپر اشارہ کیا) یاد دلاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ دیکھئے کس طرح اسلامی اقدار ازبک تہذیب کا جزو بن گئی ہیں۔

دوسرے دن کانفرنس کا دوسرا اسیشن تھا جو ایک بجے ختم ہوا۔ اختتام ایک خوش الحان قاری کی قرارت کلام پاک پر ہوا جو تاتاری تھے اور جنھوں نے مصر میں قرارت سیکھی تھی۔ قاری صاحب کی عمر زیادہ نہ تھی۔ انھوں نے سورۂ رحمان کی تلاوت اس انداز سے کی کہ گویا قرآن نازل ہورہا ہے اور میں نے دیکھا کہ اگرچہ ان کی آنکھیں بند تھیں لیکن دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کی دو لکیریں نمایاں تھیں، یا بقول غالب دو شمعیں فروزاں تھیں۔ اس خوبرو نوجوان قاری

کے حسین چہرے کہ یہ دو فرور شمعیں میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ تلاوت ختم ہوئی تو مفتی ضیاء الدین باباخان نے رومال سے اپنی آنکھوں کی نمی خشک کی اور بڑے دلدوز انداز میں دعا کرائی۔ جلسہ برخاست ہوا، میری زبان پر مولانا محمد علی مرحوم کا یہ مصرع تھا۔

- اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ہمارا قافلہ وہاں سے روانہ ہوا تو شہر کے دوسرے سرے پر شیخ زین الدین کی مسجد میں اترا۔ یہاں ہم نے ظہر کی نماز ادا کی۔ مسجد کے احاطہ سے متصل ایک سہروردی بزرگ شیخ زین الدین کا مزار اور مقبرہ ہے اور اسی کے ملحق قبرستان ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر نکلے تو ایک جنازہ رکھا تھا۔ نماز جنازہ ہوئی اور میں نے بڑھ کر میت کو کاندھا دیا، کئی ازبک بھائیوں نے اس کے لئے میرا شکریہ ادا کیا۔ تھوڑی دور جنازہ کے ساتھ چلا، لیکن مجمع چونکہ خاصا تھا اور قدآور ازبکوں کی بھیڑ میں زخمی ہو جانے کا خطرہ تھا، اس لئے پیچھے رہ گیا لیکن سب کچھ اسی طرح جیسے اپنے یہاں ہوتا ہے۔ لوگ کلمہ پڑھ رہے تھے اور میت کو کاندھا دینے کے لئے بیتاب تھے۔ پیچھے رہ کر میں نے قبرستان کی سیر کی اور فاتحہ پڑھ کر اصحابِ مزار کو بخشتا رہا۔ قبرستان نہایت سلیقے کا، صاف ستھرا، روشیں بنی ہوئیں، کہیں کہیں پھولوں کے تختے اور سارے قبرستان پر پھلدار درختوں کا خنک سایہ۔ روشوں کے ساتھ پانی کی چھوٹی رواں نہریں۔ اس پوری فضا کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔ میں نے سوچا کہ کیسے خوش نصیب ہیں یہاں کے مرنے والے بھی کہ ایسی خوشنما جگہ سوتے ہیں جہاں نہریں بھی ہیں اور انواع و اقسام کے پھلوں کے سایہ دار درخت بھی۔ گویا اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے تو بظاہر سیدھے جنت میں پہونچے۔ آگے خدا کی رحمتوں کا کوئی شمار نہیں، وہ بے پناہ ہیں اور خدا ہی کو اس کا علم ہے۔

یہاں ایک بات اور بتادوں۔ سوویٹ یونین میں مسلمانوں کے چار

مذہبی بورڈ ہیں۔ ایک مسلم مذہبی بورڈ سوویٹ یونین کے یوروپین حصے اور سائبیریا
کے لئے (صدر دفتر اوفا میں)، دوسرا مسلم مذہبی بورڈ شمالی قفقاز اور
داغستان کے لئے (صدر دفتر بونقش میں)، تیسرا مسلم مذہبی بورڈ ماورائے
قفقاز کے لئے (صدر دفتر باکو میں) اور چوتھا مسلم مذہبی بورڈ وسط ایشیا
اور قزاقستان کے لئے (صدر دفتر تاشقند میں)۔ ویسے تو مسلمانوں کی
ضلع وار انجمنیں ہیں اور حکومت انھیں تسلیم کرتی ہے، ان انجمنوں کو جماعت
کہا جاتا ہے۔ جماعت ضابطہ کے مطابق جب بن جاتی ہے تو اسے قانون کے
مطابق تعمیر مسجد کے لئے زمین کا ایک قطعہ ملتا ہے۔ مسجد جب تیار ہو جاتی
ہے تو امام خطیب کا تقرر ہوتا ہے۔ اس تقرر میں مقامی جماعت کا مشورہ
شامل ہوتا ہے لیکن تمام امام خطیب متعلقہ مسلم مذہبی بورڈ کے ماتحت ہوتے
ہیں۔ درحقیقت یہی بورڈ مسلمانوں کے مذہبی امور و رسومات کے نگراں ہیں۔
چونکہ سوویٹ یونین میں مذہبی اختلافات کا کوئی موقع اور کوئی گنجائش نہیں،
اس لئے سنیوں اور شیعوں کا مشترک بورڈ بھی ہے جیسے ماورائے قفقاز کا
مذہبی بورڈ۔ یہ تمام مذہبی بورڈ مختلف مذہبی مسائل کو حل کرنے کے ذمہ دار
ہیں۔ یہ اماموں کا تقرر اور ان کے تبادلے کرتے ہیں، مسلم انجمنوں (جماعتوں)
کی سرگرمیوں کی سرپرستی کرتے ہیں، مذہبی کتابیں شائع کرتے ہیں، نئی مسجدوں
کی تعمیر میں مدد دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ، اور اپنی سرگرمیوں اور کارکردگی کے لئے
مذہبی انجمنوں کی کانفرنس کے سامنے جواب دہ ہیں جو اختیارات کے اعتبار سے
سوویٹ یونین کے مسلمانوں کا سب سے اعلیٰ ادارہ ہے۔

مذہبی انجمنیں اور مذہبی بورڈ اپنا خرچ مسلمانوں کے عطیات سے پورا
کرتے ہیں۔ میں نے مسجدوں میں بڑے بڑے بکس بڑے دروازے کے ساتھ
رکھے دیکھے جو مقفل تھے۔ اصحاب خیر (اور ایسا لگتا ہے کہ ایسے لوگوں کی یہاں
کمی نہیں) ہر روز اور خاص طور سے جمعہ کے دن اور عیدین کے موقع پر، بڑی

فراخ دلی سے اس بکس کی نذر کچھ نہ کچھ کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ خواتین بھی اپنے طور پر اس میں کچھ نہ کچھ ڈالتی ہیں۔ اس طرح ہر ماہ مسجدوں میں خاصی بڑی رقم جمع ہوجاتی ہے۔ زکواۃ سے بھی مذہبی بورڈوں کی خاصی آمدنی ہوتی ہے۔ مسجدوں، مدرسوں اور مذہبی بورڈوں کا سارا خرچ انہیں آمدنیوں سے پورا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت کوئی مداخلت نہیں کرتی۔ موذنوں اور اماموں کی تنخواہیں معقول ہیں اور سرکاری دفاتر اور کارخانوں وغیرہ میں اوسط اجرت کا جو معیار ہے تقریباً اسی کے مساوی۔ سماج میں ان کی ایک حیثیت اور ان کا بہت احترام ہے۔ یعنی ہمارے ملک سے بالکل مختلف صورت حال ہے، ہمارے یہاں تو ان کا مرتبہ عملاً قل اعوذیوں کا سا ہے اور اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں کوئی نظام نہیں ہے۔ محلہ یا گاؤں کا ہر شخص امام اور موذن کو اپنا خادم ہی تصور کرتا ہے اور ایسا انداز اختیار کرتا ہے کہ گویا ان کا رازق وہی ہے۔

سوویٹ یونین میں جو معاشی نظام ہے، اس سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کی معاشی حالت بہت اچھی ہے اور معیار زندگی بھی بلند ہو گیا ہے۔ ازبکستان، تاجیکستان اور آذربائیجان جن تین جمہوریتوں میں مجھے جانے کا موقع ملا صنعتی اعتبار سے خاصی ترقی یافتہ ہیں۔ زرعی صنعتوں کی ترقی کے سبب زرعی پیداوار بھی بڑھی ہے، باغات، فارموں، شہروں، قصبوں اور گاؤں میں پانی کی افراط ہے۔ ان تمام باتوں کا مجموعی اثر یہ ہے کہ وسط ایشیا کا علاقہ ایک حسین چمنستان بن گیا ہے۔ سوویٹ یونین کے مسلمانوں کی زندگی کے معاشی پہلو کے جو مناظر سامنے آئے اور تعلیم اور صحت و صفائی سے متعلق جن حالات کا علم ہوا، اُن کے پیش نظر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اگر اس علاقے میں زارشاہی باقی رہتی تو وہاں کے عام مسلمانوں کی معاشی حالت ویسی ہی ہوتی جیسی کہ آج ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور ایران وغیرہ میں ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر۔

میرا خیال ہے کہ لینن کا یہ نظریہ جو سوویٹ یونین کے دستور اساسی کا جزو

بنا، کہ روس میں جو تہذیبی و لسانی قومیتیں (nationalities) ہیں، انھیں
اندرونی طور پر خود مختار ہونا چاہیئے، بڑے دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا
ہے۔ پھر ازبک ہوں یا تاجیکی، تاتار ہوں یا داغستانی، سبھی کو اپنی تہذیبی
خصوصیت باقی رکھنے کا احساس رہا۔ اس سلسلے میں زبانوں کی توسیع و ترقی
نے نمایاں رول ادا کیا ہے۔ نتیجہ میں سوویٹ یونین کے مسلمانوں کا تہذیبی و
لسانی رشتہ، رسم خط کی تبدیلی کے باو[illegible] اپنے ماضی سے کسی وقت بھی منقطع
نہیں ہوا۔ اور ان کے اس ماضی میں مذہب اسلام کو ایک محوری حیثیت حاصل
رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوویٹ نظام کی پابندیوں اور سختیوں کے باوجود
وہاں کے عام مسلمانوں کی زندگی میں اسلامی تہذیب کے عناصر کسی نہ کسی روپ
میں باقی رہے اور جب فضا قدرے سازگار ہوئی اور سوویٹ یونین کے دستور
کے مطابق سوویٹ شہریوں کو مذہبی عبادات و رسوم کی بجا آوری اور ضمیر کی
آزادی بنیادی حق کے طور پر مل گئی ہے تو وہاں مسلمانوں میں ایک طرح کی
مذہبی نشاۃ ثانیہ کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی
کے تجربے نے یہ راہ دکھائی ہے کہ سوشلزم اور مذہب میں بقائے باہم ممکن ہے۔
ہمارے قافلے میں ایک ایرانی بھی تھے، ڈاکٹر محمود تقی بانکی۔ ایران کے "اسلامی"
انقلاب اور آیتہ اللہ خمینی کے بڑے پرجوش نقیب۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ
سوویٹ یونین کے معاشی نظام کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے کیجیئے کہ کیا اسلام میں
ایسے نظام کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ایران میں اسلام کے ساتھ اسی نوع کا
کوئی معاشی نظام قائم ہو جائے تو ایران دنیائے اسلام کی قیادت کر سکتا ہے،
دنیا کی بڑی طاقت بن سکتا ہے اور یہ ثابت کر سکتا ہے کہ اسلام سے متعلق اس
کے مخالفین کا یہ الزام غلط اور بے بنیاد ہے کہ اس میں عصر حاضر کے مسائل کو
حل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس سلسلے میں تو بڑا اجتہاد
کرنا ہوگا، میں نے عرض کیا کہ ایران میں تو مجتہدین کی کمی نہیں ہے۔

گذشتہ برسوں میں ازبکستان نے اقتصادی طور پر بہت ترقی کی ہے، اس کا اندازہ اس نمائش کو دیکھنے سے ہوا جو تاشقند میں لگی ہوئی ہے۔ ازبکستان یا دوسری وسط ایشیائی جمہوریتوں کی اقتصادی ترقی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے سوویٹ یونین کے دوسرے علاقوں میں جہاں صنعتی ترقی کی رفتار پہلے ہی سے تیز تھی، جاکر کام کرنے کے لئے بہت زیادہ جوش وخروش کا اظہار نہیں کیا۔ زیادہ تر لوگ اپنے ہی تہذیبی ماحول اور اپنے ہی علاقے سے وابستہ رہے، اس سے دو فائدے ہوئے، ایک تو یہ کہ ان علاقوں سے کبھی بڑے پیمانے پر انتقال آبادی نہیں ہوا اور دوسرا یہ کہ ان علاقوں میں بھی چھوٹی بڑی صنعتیں قائم ہوگئیں جن میں باہر سے مزدور یا ماہرین کو لانے کی ایسی کوئی خاص بڑی ضرورت پیش نہیں آئی۔

نمائش میں میری گائڈ ایک لڑکی تھی جس کا نام ناز تھا۔ انگریزی بہت اچھی بولتی تھی اور خوش طبع بھی تھی۔ اس نے بہت تفصیل سے ایک ایک بات سمجھائی، اپنی جمہوریت کی زرعی اور صنعتی ترقی کا حال بتاتے بتاتے وہ کبھی جوش میں آجاتی اور چہرے سے مسرت چھلکی پڑتی۔ یہاں یہ بات بتادوں کہ ناز ایک جدید تعلیم یافتہ لڑکی ہے، ازبک، روسی اور انگریزی جانتی ہے، لیکن جتنی دیر بھی وہ میرے ساتھ رہی، میں نے دیکھا کہ کوئی انداز ایسا نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر ہمارے یہاں جدید طرز کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ انکسار، نسائیت اور حیا کا وہ ایک پیکر ہے۔ نمائش کے آخری اسٹال میں سبز چائے پینے کو ملی۔ اس نے کہا کہ مہمانوں کو یہاں ہم چائے ضرور دیتے ہیں تاکہ نمائش دیکھنے سے جو تھکن ہوجاتی ہے، وہ قدرے دور ہوجائے۔ میں نے اس سے کہا: ناز صاحبہ، ایک بات پوچھوں اگر آپ برا نہ مانیں۔ جواب ملا، ضرور پوچھئے۔ میں نے کہا کہ آپ کے یہاں جب لڑکیوں کی شادی ہوجاتی ہے تو وہ اپنے شوہروں کے ساتھ ساس سسر اور نندوں سے الگ ہوکر، کسی دوسرے مکان میں رہنے لگتی ہوں گی۔

جواب تھا کہ بعض صورتوں میں ایسا ہوتا ہوگا لیکن عام طور پر ایسا نہیں ہے، ہمارے یہاں خاندانی بندھن بہت مضبوط ہیں۔ ہمارے یہاں شادی کے بعد لڑکیاں کم از کم پانچ چھ سال تو اپنے شوہروں کے والدین کے ساتھ ضرور رہتی ہیں، دیکھئے، میری شادی کو دو تین سال ہو چکے ہیں اور میں اپنے ساس سسر کے ساتھ رہتی ہوں۔ ہم لوگ اپنے بزرگوں کا بڑا احترام کرتے ہیں اور ہماری معاشرت میں آج بھی بزرگوں اور بڑوں کے جذبات کی بڑی پاسداری ہے۔ مسز ناز کی اس بات کی تصدیق دوسرے لوگوں اور اپنے دوسرے تجربوں سے بھی ہوئی۔

---

۵ رجولائی کی صبح کو ناشتہ کے بعد ہم لوگ تاشقند میں واقع زرعی مشینوں کا ایک کارخانہ دیکھنے گئے۔ یہ کارخانہ بہت بڑا ہے اور اس میں ٹریکٹر اور کپاس چننے کی بڑی مشینیں تیار ہوتی ہیں، ازبکستان اور تاجیکستان دونوں جمہوریتوں میں کپاس کی کاشت بہت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ کپاس کی کاشت میں پہلے مرحلے سے لے کر آخری مرحلے تک تقریباً سبھی کام مشینوں سے ہوتا ہے اور لاکھوں ٹن کپاس پیدا کی جاتی ہے۔ کارخانے سے لوٹے تو قافلہ غلبہ (غلابہ) علاقے کی طرف روانہ ہوا۔ تاشقند سے کوئی ستر، اسی کلومیٹر دور ایک قصبہ میں ہمیں ایک زیر تعمیر مسجد کی زیارت کرنی تھی۔ وادی غلبہ بڑی خوبصورت ہے، کشت زاروں اور باغات کی یہ وادی واقعی ایک جنت ارضی ہے۔ ہم قصبہ میں پہونچے تو ایک بڑے باغ میں اترے جس میں روشوں کے دونوں طرف ٹھنڈے پانی کی نہریں جاری تھیں جن میں ہمیں معدنی پانی کی بوتلیں دبی نظر آئیں۔ پانی کی بوتلوں کو ٹھنڈا کرنے کا یہ طریقہ یہاں گاؤں اور اجتماعی فارموں میں عام ہے۔ یہاں ہمارے استقبال کی پوری تیاری تھی۔ اس باغ میں ایک طرف ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے جس میں معمار اور مزدور لگے ہوئے تھے، چھت ڈالنے کی تیاری تھی، وہیں اوپر سے مزدوروں نے ہمیں سلام کیا اور دعا کی درخواست کی۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ باغ اسی مسجد سے

متعلق ہے اور یہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں مختلف النوع پھلوں کے ہزاروں درخت ہیں۔ یہاں ہمیں نہایت عمدہ تربوز اور خربوزے کھانے کو ملے اور آڑو اتنے شیریں کہ کیا کہئے۔ ہماری کرسیاں بڑے اور گھنے درختوں کے سایے میں لگی تھیں اور ہوا خنک اور خوشگوار تھی۔ قریب ہی پانی کی نالیاں تھیں جن میں قلقل کی آواز کے ساتھ پانی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ ہمارے چاروں طرف قصبہ کے لوگ، بوڑھے، بچے اور جوان گھیرے کھڑے تھے، تواضع و انکسار کے پیکر، میں نے دل میں سوچا کہ یہی وہ شیبانی خاں اور ازبک سواروں کی قوم ہے جو ہمیشہ سے مصاف زندگی میں سیرت فولاد رکھتی رہی ہے اور شبستان محبت میں حریر و پرنیاں بن کر رہی ہے، اسی کے آباو اجداد تھے جن کے مقابلہ میں کبھی بابر نے صف آرائی کی تھی اور آخر تنگ آکر کابل میں اپنی حکومت قائم کی تھی۔ اپنے قومی لباس میں یہ لوگ مجھے شیبانی خاں کے لشکر کے سپاہی ہی نظر آتے تھے، مگر اس وقت تہذیب و شائستگی کے بہترین نمونے۔ اللہ، تیرے ایام کس طرح قوموں میں بدل بدل کر وجود میں آتے رہتے ہیں۔ یہاں مفتی ضیاء الدین بابا خان نے ایک بڑی اثر انگیز تقریر کی جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ اس بستی کے لوگوں نے اس مسجد کی تعمیر میں کس طرح دل کھول کر عطیات دئے ہیں اور کس ذوق و شوق سے اس کام میں شریک ہیں۔ یہ ان کے ایمان اور اسلام سے ان کے گہرے تعلق کا اظہار ہے مسلمانوں کی زندگی میں مسجد کی جو اہمیت ہے مفتی صاحب نے اس پر بھی روشنی ڈالی، میں نے دیکھا کہ کئی بوڑھے ازبک ایسے تھے جن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ کیا عجب کہ ان آنسوؤں میں وہ سوز بھی ہو جو مرد مومن کے قلب میں اللہ کے ذکر سے پیدا ہوتا ہے اور وہ مسرت بھی جو خاص حالات میں اسلامی زندگی کے روشن امکانات ظاہر ہو کر رہتی ہے۔

اس باغ سے نکلے تو ایک اور آبادی میں پہونچے جو وہاں کے اجتماعی فارم کے دوسرے سرے پر ہے۔ وہاں بھی ایک مسجد دیکھی جو ابھی حال میں تعمیر ہوئی ہے۔ وہیں ظہر کی نماز ہوئی۔ پھر ہمارا قافلہ اس منزل کی طرف روانہ ہوا جہاں لنچ کا انتظام تھا۔ کئی میل تک اس سڑک پر ہماری کاریں دوڑتی رہیں جن کے دونوں طرف اجتماعی

فارم کے دور دور تک پھیلے کھیتوں میں، کہیں کہیں کپاس کے پودے، کہیں انگور کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں، پھر ہم نے ایک چوڑی نہر عبور کی۔ تھوڑی دور اس نہر کے کنارے سڑک پر چلنے کے بعد ہم لوگ اپنی کاروں سے اترے۔ نہر میں ہم نے بچوں کو تیرتے اور نہاتے دیکھا، اور دور کچھ عورتیں بھی نظر پڑیں جن میں دو ایک کپڑے دھو رہی تھیں اور دو ایک پانی میں تھیں، غالباً وہ بھی نہا رہی تھیں۔ کاروں سے اتر کر تھوڑی دور ہم پیدل چلے اور ایک ایسے مقام پر پہونچے جہاں اس چوڑی نہر کو روک کر اس کے دھارے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ گویا اب دو نہریں بن گئیں، ایک طرف کی نہر زیادہ گہری تھی اور اس میں پانی اونچائی سے شور مچاتا ہوا گرتا تھا اور تیزی سے بہہ رہا تھا۔ دوسری طرف کی نہر میں پانی کی روانی تیز نہ تھی۔ ایک طرف گیٹ سے گزر کر ہم سب ایک ایسے مقام پہ پہونچے جس کے دونوں طرف کوئی سو گز کے فاصلے سے یہ دونوں نہریں بہہ رہی تھیں۔ وہاں ذرا فاصلے سے ایک عمارت بھی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ تفریحی مقام ہے اور یہاں لوگ اپنی چھٹیاں گذارنے آتے ہیں۔ کھانے کی میزیں باہر سایہ دار درختوں کے نیچے لگائی گئی تھیں، یہاں ہم نے کوئی دو تین گھنٹے قیام کیا۔ بہترین قسم کے تکے کباب اور دہی کھانے کو ملے اور نہایت عمدہ آئس کریم، انواع و اقسام کے پھل اس پر مستزاد۔ اتفاق سے میری کرسی مفتی ضیاء الدین بابا خاں کے پاس ہی تھی میں نے ان سے اس پر فضا اور جنت نما مقام کی تعریف کی اور کہا کہ اس وقت مجھے اپنے شاعر اقبال کی یاد آرہی ہے، کہنے لگے وہ کیا، میں نے کہا کہ اقبال نے ایک نظم خضر راہ لکھی ہے، جس میں انھوں نے حضرت خضرؑ سے اپنی ملاقات اور گفتگو کا ذکر کیا ہے اور ایشیا کی نکبت و زبوں حالی اور امت مسلمہ کے انحطاط پریشانی اور پراگندگی کا نوحہ کیا ہے۔ خضرؑ اپنے جواب کے ابتدائیہ کلمات میں اپنی صحرا نوردی کی مصلحت و افادیت کا نقشہ صحرا کے ایک دلآویز منظر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے کے دو شعر آپ کو سناتا ہوں:

وہ سکوتِ شام صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بینِ خلیل

اور وہ پانی کے چشمے پر مقام کارواں
اہل ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل

ان اشعار کا فارسی میں میں نے ترجمہ کیا اور کہا کہ اس چھوٹے سے دو آبے میں جس کے دونوں طرف آب سرد کی نہریں رواں دواں ہیں، ہمارے قافلے کا یہ قیام کیا اہل ایمان کے سلسبیل کے گرد جمع ہونے کی ایک تصویر ارضی نہیں ہے۔ اس توجیہہ پر وہ پھڑک اٹھے اور پھر انھوں نے سب کو مخاطب کر کے، ساری گفتگو اور ان اشعار کا ترجمہ عربی میں کیا (وہاں تقریباً سبھی لوگ عربی سمجھتے تھے)، ہر طرف سے داد و تحسین کی آواز بلند ہوئی۔ بعد میں ایک دوست نے اپنی نوٹ بک پر یہ اشعار مجھ سے لکھوائے۔

اب تقریباً ساڑھے چار بج رہے تھے اور تاشقند واپسی کا پروگرام تھا۔ وہاں سے آنے کو جی نہ چاہتا تھا، مگر اٹھے، اس طرح کہ جیسے کوئی غم زدہ کسی کی محفلِ ناز سے اٹھتا ہے۔ تقریباً ساڑھے پانچ بجے تاشقند اپنے ہوٹل پہونچے۔ عصر کی نماز پڑھی۔ تھکا ہارا تھا، لبستر پر دراز ہوگیا، مغرب کے وقت آنکھ کھلی، نماز پڑھی اور ہوٹل کے لاؤنج میں آیا، ماسکو نیوز مل گیا، اسے پڑھتا رہا، پھر مفتی صاحب کی طرف سے دئے گئے عشائیے کے لئے دوسرے ڈیلیگیٹ بھی لاؤنج میں جمع ہونے لگے اور تھوڑی دیر بعد ہم گلستاں ریسٹوراں کے لئے روانہ ہوگئے جہاں اس عشائیے کا انتظام تھا۔ گلستاں ریسٹوراں دو منزلہ، خوبصورت اور کافی بڑا ہے۔ سامنے پارک ہے جس میں گلاب کے تختے اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ اس کا نام گلستاں کیوں رکھا گیا ہے۔ عشائیے میں ڈشیں روایتی تھیں، لیکن پکانے والے کی فنی مہارت کی غماز تھیں۔ کوئی دو گھنٹے وہاں لگے، پھر ہم اپنے ہوٹل آگئے۔

۶ر جولائی کو جمعہ کا دن تھا اور ہمیں صبح سویرے بذریعہ ہوائی جہاز فرغانہ کے لئے سفر کرنا تھا۔ وادی فرغانہ بابر کی سرزمین ہے، بابر کی شجاعت، سخاوت، شائستگی اور خوش ذوقی میرے لئے ہمیشہ سے باعث کشش رہی ہے۔ وہ ایک مہذب اور بھرپور انسان تھا، اس کے صبر و استقامت، بہادری اور اولوالعزمی کی داستانیں اس علاقے میں بکھری پڑی ہیں، وہ جہاں بھی گیا ایک داستان چھوڑ آیا، فرغانہ اسی بابر کا وطن اور یہ وادی اسی آہوئے ختن کی وادی ہے۔ میرے لئے ۶ر جولائی کی رات شب انتظار تھی، اسی انتظار میں رات کٹ گئی اور صبح غالباً میں پہلا شخص تھا جو قافلہ کی روانگی کے انتظار میں سب سے پہلے ہوٹل سے باہر آکر ٹہلنے لگا۔ فرغانہ کی وادی ہی میں وہ شہر بھی ہے جسے مرغیلان یا مرغینان کہتے ہیں۔ اسی شہر میں حنفی فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ کے مصنف برہان الدین مرغینانی ۵۱۱ھ میں پیدا ہوئے تھے جو اپنے زمانے کے امام، فقیہ اور محدث، مفسر، محقق، اصولی، ادیب اور شاعر تھے اور علم و ادب کے ساتھ زہد و ورع میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ علماء کے حلقے میں ہدایہ کو وہ مرتبہ اور وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ صدیاں گذر گئیں دنیائے اسلام میں اس کی مقبولیت کا وہی عالم ہے۔ (صاحب ہدایہ کا انتقال ۵۹۳ھ میں سمرقند میں ہوا اور وہیں وہ مدفون ہیں) بابر اور علامہ مرغینانی کی ہدایہ کا نام بچپن ہی سے سنتے آئے تھے۔ اس لئے وادی فرغانہ میں میرے لئے بڑی کشش تھی۔ اس کے علاوہ اسی وادی میں فاتح ترکستان قتیبہ بن مسلم کا مزار بھی ہے جنھوں نے ۷۰۶ اور ۷۱۵ء کی درمیانی مدت میں سمرقند و بخارا اور ان کے نواحی علاقوں کو فتح کیا اور ترکستان کو خلافت اسلامیہ کا ایک حصہ بنا دیا۔ انھوں نے توخاقانِ چین کو بھی للکارا تھا اور اس پر اپنی ہیبت بٹھا دی تھی۔ قتیبہ ہی کی ہمت اور اولوالعزمی نے اسلامی سلطنت کی سرحد چین سے ملا دی تھی۔

فرغانہ کے ہوائی اڈے پر ہم ساڑھے ۹ بجے اترے اور پھر ہم لوگ کاروں سے فرغانہ اور مرغلینان کی طرف روانہ ہوئے۔ وادی فرغانہ بڑی حسین ہے، یہاں انگور کے باغات دور دور تک پھیلے نظر آئے، پھلوں کی بہتات، پانی کی فراوانی، صحتمند اور خوبصورت مردوں، عورتوں اور بچوں کی ٹولیاں، چارخانے، صاف اور شفاف شہر، شہر میں سڑکوں کے کنارے دورویہ سایہ دار درخت، کیا کہوں کہ کیا کیفیت ہوئی، جدھر نظر اٹھتی، دامن دل اس طرف کھینچ اٹھتا۔ بابر عمر بھر وادی فرغانہ کے حسن کو فراموش نہ کر سکا کہ یہ اس کا وطن بھی تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وادی کو اور یہاں کے حسینوں کو اگر کوئی ایک بار دیکھ لے تو بار بار دیکھنے کو جی چاہے۔

مرغلینان اور فرغانہ درحقیقت جوڑواں شہر ہیں۔ یہ دونوں شہر اس قدیم شاہراہ پر واقع ہیں جو تاریخ میں شاہراہ اطلس (Silk Road) کے نام سے مشہور رہی ہے۔ یہ شہر آج بھی اپنی اطلس کی صنعت کے لئے مشہور ہیں۔ مرغلینان میں ہم نے ایک ریشم کا کارخانہ دیکھا جہاں سیکڑوں عورتیں کام کرتی ہیں معلوم ہوا کہ اس کارخانے میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ کارخانے کے جس ڈپارٹمنٹ میں بھی ہم پہونچے ہمارا استقبال بڑی گرم جوشی، خندہ پیشانی اور تبسم ہائے پنہاں سے کیا گیا۔ یہاں وہ اطلس تیار ہوتا ہے جسے اب بھی کچھ لوگ "خان اطلس" کہتے ہیں۔ ایک لڑکی نے بتایا کہ خان اطلس نام اس لئے پڑا کہ کسی زمانے میں یہ امراء کے گھرانوں ہی میں استعمال ہوتا تھا، لیکن آج اسے سب پہنتے ہیں، میں نے کہا کیوں نہیں، آج تو یہاں ماشاء اللہ سبھی خان ہیں۔

مرغلینان میں جو جامع مسجد ہے وہ خانقاہ مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اسی مسجد میں ہمیں جمعہ کی نماز پڑھنی تھی۔ اطلس کے کارخانے سے نکلے تو نماز کا وقت قریب تھا۔ مسجد شہر میں اندر کی طرف ہے۔ اس کے چاروں طرف لوگوں کے پرانے طرز کے رہائشی مکانات ہیں۔ میں نے دیکھا کہ مسجد کی طرف پیدل اور

سواریوں سے لوگ چلے جارہے ہیں ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مضافات میں جو قریے اور آبادیاں ہیں، وہاں سے جمعہ کی نماز کے لئے لوگ یہیں آتے ہیں اور پھر بعد میں شہر کے بازار میں خرید و فروخت کرتے ہیں ۔ ہم لوگ جب اس سڑک پر چلے جو مسجد کی طرف جاتی ہے تو رفتہ رفتہ ہجوم بڑھتا گیا، ہجوم میں ہر عمر کے لوگ تھے ۔ سڑک کے کنارے مکانوں کے سامنے، مکانوں کی چھتوں پر، ہر جگہ عورتیں بچے، بچیاں اور مرد موجود تھے اور ہاتھ ہلا ہلا کر ہمارا استقبال کرتے تھے مسجد قدیم ہے اور بڑی بھی، اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ مسجد کا صحن بڑا وسیع و عریض ہے اور لوگ صفیں بنائے بڑے سلیقے سے بیٹھے ہیں ۔ برآمدوں میں بھی نمازیوں کی صفیں بھر چکی تھیں، ہم کسی طرح وضو خانے پہونچے، وضو کیا اور پھر مسجد سے مسقف حصے کے باہر صدر دروازے کے قریب سامنے کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئے تاکہ پورا صحن ہماری آنکھوں کے سامنے رہے ۔ اندر مسقف حصہ نمازیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ۔ اس دن دھوپ ذرا تیز تھی، لیکن چونکہ پورے صحن میں اوپر سایہ دار انگوروں کی گھنی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں اور شامیانے کا کام دے رہی تھیں، نمازی دھوپ سے محفوظ تھے، چونکہ قدرے گرمی تھی اس لئے دسیوں بیسیوں آدمی لکڑی میں جھنڈے کی طرح کپڑا باندھ کر نمازیوں کو ہوا کر رہے تھے، تھوڑی تھوڑی دیر بعد پہلوں کی جگہ دوسرے اشخاص لے لیتے تھے ۔ معلوم ہوا کہ یہاں کا یہ دستور رہے اور ہر شخص اس خدمت کی فکر میں رہتا ہے اور اسے کارِ ثواب سمجھتا ہے ۔ میرا اندازہ ہے کہ اندر باہر اور برآمدوں میں، کل ملا کر چھ سات ہزار نمازی ہوں گے اور ان میں ہر عمر کے لوگ تھے ۔ اس سے خوشی ہوئی کہ ان میں خاصی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کی عمریں بیس اور پینتیس کے درمیان ہوں گی، ویسے کچھ بچے بھی تھے ۔ ممکن ہے کہ کسی زمانے میں صرف بوڑھے ہی مسجد میں نظر آتے ہوں اور یہ بات مشہور بھی کر دی گئی ہے ۔ لیکن یہاں جو کچھ دیکھا وہ کچھ اور تھا اور اس سے یہ بھی

اندازہ ہوا کہ حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔
نماز کے بعد سب لوگ بیٹھے رہے۔ پہلے تلاوت کلام پاک ہوئی اور اس کے بعد دعا۔ پھر مفتی صاحب کی تقریر ازبک زبان میں ہوئی جس میں بتایا گیا کہ کن کن ملکوں کے لوگ آج اس مسجد میں موجود ہیں۔ مفتی صاحب کی تقریر میں اسلامی اخوت اور امت مسلمہ کی عالمگیر برادری کا ذکر تھا اور یہ بھی کہ سوویٹ یونین کے مسلمان اس عالمگیر برادری کا ایک اہم جزو ہیں جنھیں دنیائے اسلام کے مسائل سے دلچسپی ہے، خصوصاً یروشلم، مسجد اقصیٰ اور فلسطینی عرب کے مسئلے کو وہ اپنا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ مفتی صاحب کی تقریر کے بعد باہر سے آئے مہمانوں میں سے چند حضرات کی تقریریں ہوئی۔ میں نے بھی تقریر کی۔ چونکہ اس وقت وہاں کوئی انگریزی جاننے والا دستیاب نہیں تھا جو میرا ترجمان بنتا، اس لئے مفتی صاحب نے کہا کہ آپ اردو میں تقریر کیجئے۔ مجھے تعجب ہوا جب مفتی صاحب خود میرے ترجمان بن گئے۔ اس سے پہلے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ مفتی صاحب اُردو خوب سمجھ لیتے ہیں۔ تقریر میں پہلے تو میں نے اب تک کے تاثرات بیان کئے، ازبک قوم کی بے مثال مہمان نوازی کا ذکر کیا اور پھر ہندوستان اور وسط ایشیا کے تہذیبی و علمی روابط پر روشنی ڈالی، آخر میں وسط ایشیا، خصوصاً سمرقند، بخارا، مرو، خیوا اور بلخ وغیرہ کا اسلامی علوم و معارف کی ترویج و ترقی میں جو حصہ ہے اس کا تفصیل سے تذکرہ کیا اور خاتمہ تقریر کا اس دعا پر ہوا کہ اللہ تعالیٰ ایک بار پھر اس علاقے کو اسلام کی خدمت کی سعادت نصیب کرے۔

مسجد سے باہر نکلے تو پہلے سے بھی زیادہ بڑا ہجوم ملا۔ ہزاروں کا مجمع اب ہماری زیارت بھی کر رہا تھا اور ہمیں رخصت بھی کر رہا تھا۔ مرد مصافحے کے لئے بڑھتے تھے اور بوڑھی عورتیں ہماری بلائیں لیتی تھیں، جوان عورتیں اور لڑکیاں یہ تو نہ کرسکتی تھیں کہ کچھ تو حجاب و حیا اور کچھ یہ کہ یہ تو بڑی بوڑھیوں کا خصوصی حق ہے، لیکن ان کے لبوں کی مسکراہٹ اور ابروؤں کی جنبش صاف پتہ دیتی تھی کہ ان کے شہر اور گھر میں ہماری آمد باعث مسرت و برکت ہے۔ بعض عورتیں اپنی گود کے بچوں سے اشارہ کر کے کہہ رہی تھیں کہ انھیں

سلام کرو۔ اس منظر سے جو برجستہ اور بے پناہ خلوص ومحبت سے معمور تھا، میری آنکھیں ایک بے نام مسرت آگیں کیفیت سے نمناک ہوگئیں، میں سوچ رہا تھا، یا اللہ، یہ سب کیا ہے۔ انسانوں کا یہ مجمع جو ہماری زبان سے واقف نہیں؛ جسے یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کیسے ہیں، ہاں، صرف یہ معلوم ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور ابھی ابھی ہم نے اس مسجد میں نماز پڑھی ہے، کس طرح ہم پر ٹوٹ کر گر رہا ہے اور زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ ابھی ابھی تو آپ لوگ آئے، جانے کی اتنی جلدی کیوں ہے، کچھ دن تو ہمارے ساتھ رہئے، کچھ اپنی کہئے، کچھ ہماری سنئے۔ یا اللہ، تیرے نام کی یہ برکت، تیرے رسول کی یہ عظمت، اللہ اور رسول یہی تو دو کلمے ہیں جنھوں نے انھیں ہم سے ایسے مضبوط رشتے میں باندھ دیا ہے جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا، انقلابات آتے رہیں گے اور آسمان اپنا رنگ بدلتا رہے گا، لیکن اللہ کا رنگ (صبغۃ اللہ) سب پر غالب رہے گا۔

۷ر جولائی کی صبح کوئی دس بجے ہم لوگ بذریعہ ہوائی جہاز سمرقند پہونچے اور ہوٹل سمرقند میں ٹھہرائے گئے جو امیر تیمور کے مقبرے گورامیر سے بہت قریب ہے۔ سمرقند تاریخی عمارتوں کا شہر ہے۔ صدیوں یہ علم وفن کا مرکز رہا ہے اور مسلمانوں نے یہاں تہذیب وتمدن کے ایسے روشن اور تابناک چراغ جلائے جن کی روشنی دور دور تک پہونچی۔ امویوں کے عہد کے اولین برسوں سے ہی مسلمانوں کی آمد اس علاقے میں شروع ہوگئی تھی اور اس شہر کو جو بت پرستوں کا شہر تھا، کیسی کیسی لڑائیاں لڑکر قتیبہ بن مسلم نے فتح کیا تھا، بلاذری اور ابن اثیر وغیرہ نے اس سلسلے کے سارے واقعات کو اپنی کتابوں میں محفوظ کرلیا ہے۔ اس شہر کی سیر کو نکلئے تو قدم قدم پر مسجدیں اور مقبرے نظر آتے ہیں اور زبانِ حال سے اپنے آباد کرنے والوں کی داستانیں سناتے ہیں۔ عرفی کا یہ شعر یہاں بہت یاد آیا:

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدیداست صنادید عجم را

ہم لوگوں نے یہاں سب سے پہلے مزارات ومقبروں کی اُس بستی کی زیارت کی جہاں حضورؐ کے چچا زاد بھائی قثم ابن عباس کا مزار ومقبرہ ہے جو شاہِ زندہ' کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں ہمہ وقت زائرین کا مجمع رہتا ہے۔ مقبرہ کافی بلندی پر ہے اور یہاں تک پہونچنے کی جو لمبی گیلری ہے اُس کے دونوں طرف علماء، صلحاء، امراء اور شاہی خانوادوں کے افراد کے مزارات ہیں۔ مشہور عالم اور ہیئت داں قاضی زادہ رومی بھی یہیں آسودۂ خاک ہیں۔ حضرتِ قثم کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور پھر میں کبھی اِس مقبرہ میں، کبھی اُس مقبرہ میں، تنہا گھومتا رہا، اور میری زبان پر یہ مصرع بار بار آتا رہا:

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونناب بار

وہاں سے بارِ غم اٹھائے ہوئے لوٹے تو قلب شہر میں وارد ہوئے جہاں الغ بیگ کے مدرسے کے ساتھ شیردر مدرسہ اور اس کے سامنے طلاکاری مدرسہ کی عمارتیں ہیں اور ساتھ ہی ایک عالیشان مسجد کے آثار ہے۔ کبھی یہ مدرسہ آباد ہوگا اور یہاں سے علوم ومعارف کے چشمے ابلتے ہوں گے، ایک وقت تھا کہ اس مسجد میں علماء وصلحاء اور عابدِ شب زندہ دار اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے سربسجود ہوتے ہوں گے، اور آج یہ صرف ٹورسٹ کی تماشہ بیں نگاہوں کا مرکز ہے آج بھی ان عمارتوں کا حسن پھوٹا پڑتا ہے، جب یہ اپنے جوبن پر ہوں گی تو ان کی رعنائیوں کا کیا حال ہوگا۔

سمرقند میں ہم نے وہ رصدگاہ بھی دیکھی جسے امیر تیمور کے پوتے الغ بیگ نے ۱۴۲۱ء میں تعمیر کیا تھا۔ یہی وہ رصدگاہ ہے جہاں قاضی زادہ رومی، ملا علاء الدین علی قوشچی، غیاث الدین جمشید اور معین الدین کاشانی نے الغ بیگ کے ساتھ شریک ہوکر زیج الغ بیگ یا زیج جدید سلطانی تیار کیا

تھا۔ رصدگاہ اب خستہ حالت میں ہے لیکن اس کے پاس کی عمارت میں جو میوزیم
ہے، وہ اس کی کہانی تصویروں اور تحریروں سے زندہ کئے ہوئے ہے۔ ہم نے
اس سے تھوڑی دور پر مسجد بی بی خانم کی بھی زیارت کی۔ بی بی خانم امیر تیمور کی
بڑی بیگم تھی اور جب تیمور نے ۱۳۹۸ء میں ہندوستان کا رُخ کیا تھا، تو اس نے
ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرانی شروع کی تھی اس ارادہ سے کہ جب امیر خیر و عافیت
کے ساتھ ہندوستان کی مہم سے لوٹے گا تو وہ یہ مسجد اس کی نذر کرے گی۔ یقیناً
یہ مسجد جب بن کر تیار ہوئی ہوگی تو فن تعمیر کا شاہکار ہوگی۔ آثار اور
کھنڈرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں صلابت بھی ہوگی اور نزاکت
بھی، جلال بھی اور جمال بھی۔ مسجد کے نقشے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ
اسی کے ساتھ ایک مدرسہ بھی ہوگا جیسا کہ اس زمانے کا چلن تھا۔ افسوس
کہ یہ مسجد زلزلے کے پے بہ پے جھٹکوں کے سبب کھنڈر اور غیر آباد ہو کر
عبرت کا مرقع بن کر رہ گئی۔ معلوم ہوا کہ حکومت اب تاریخی عمارتوں کو نئی
زندگی بخش رہی ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ مسجد بی بی خانم کو بالکل ویسا ہی
بنا دینے کا منصوبہ ہے جیسی کہ وہ اپنی اصل شکل میں تھی۔ دو تین سال سے
یہاں کام ہو رہا ہے۔ خدا کرے کہ وہ دن جلد آئے جب نہ صرف یہ مسجد
پہلے جیسی بن کر تیار ہو جائے بلکہ یہ نمازیوں سے بھی آباد ہو جائے۔

سمرقند میں امیر تیمور کا مقبرہ گور امیر بھی دیکھا۔ مٹے نامیوں کے نشاں
کیسے کیسے، لیکن یہ مقبرہ ابھی اچھی حالت میں ہے۔ اسے خود امیر نے اپنے
پوتے اور جانشین محمد سلطان کے لئے جس کا ایک مہم میں انتقال ہو گیا تھا،
تعمیر کرایا تھا۔ بعد میں تیمور اور الغ بیگ بھی اسی میں دفن ہوئے، امیر تیمور
کے پیر و مرشد کا مزار اسی میں ہے، اس کے علاوہ اور قبریں بھی ہیں۔ مقبرہ کی
عمارت اور خاص طور پر اس کے گنبد سے صلابت عیاں ہے لیکن یہ عمارت
اور بھی خوبصورت ہوتی اگر اس کا پلنتھ اونچا ہوتا یا یہ کسی ٹیلے پر ہوتی۔

نہ معلوم تیمور نے اس جگہ کا انتخاب کیوں کیا اور معماروں اور شاہی مہندسوں نے اس کا پلنتھ اتنا کم کیوں رکھا۔

سمرقند آکر یہاں کی تاریخی عمارتوں کو دیکھنے کے علاوہ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس کے قریب پائی ارک علاقے کے اجتماعی فارم کے اس قدیم قریے کی زیارت بھی کریں جہاں امام بخاریؒ کا مزار ہے۔ اس قریہ کا نام خرتنگ ہے یہاں امام بخاری مسجد میں ظہر کی نماز پڑھنی تھی، امام محترم کے مزار پر حاضری دینی تھی اور پھر دوپہر کا کھانا کھانا تھا۔ امام بخاری کے مزار کی خاک ہماری آنکھوں کا سُرمہ ہے۔ خرتنگ پہونچے تو سیدھے اسی احاطے میں پہونچے جہاں مزار اور مسجد ہے۔ احاطے میں اونچے اور گھنے درختوں کا سایہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک بڑا حوض ٹھنڈے اور جاری پانی سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے گرد کرسیاں اور تخت بچھے تھے جن پر قالین اور گاؤ تکیے بھی تھے۔ چونکہ تھکا ہوا تھا اس لئے قدرے آرام کیا، جب ظہر کی اذان ہوئی، اٹھا وضو کیا اور مسجد پہونچا، نماز سے فارغ ہوکر امام موصوف کے مزار پر حاضر ہوا۔ آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے۔ امام عالی مقام کی پوری زندگی اور جمع حدیث میں اُن کی ساری مشقتیں جن کا حال کتابوں میں پڑھا اور بزرگوں سے سنا تھا، ایک ایک کرکے نگاہوں کے سامنے آگئیں۔ کیسا عظیم الشان کارنامہ آپ نے انجام دیا۔ آج دنیا کا ہر مسلمان ان کے نام اور ان کی جامع صحیح کی عظمت و اہمیت سے واقف ہے۔ بہت دیر تک میں وہاں کھڑا رہا، پھر بیٹھ گیا، قریب ہی پھولوں کے تختے تھے، انھیں دیکھ کر غالب کی یاد آئی:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

وہاں سے ہٹنے کو جی نہ چاہتا تھا، لیکن کھانے کے لئے طلبی ہوئی۔ کھانے کے بعد میں تخت پر لیٹ گیا، تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک دولہا اور ایک دلہن چند مردوں اور عورتوں کے جلو میں چلے آرہے ہیں، معلوم ہوا کہ کورٹ میں تو ان کی شادی

ہو چکی ہے لیکن کورٹ سے سیدھے یہاں آتے ہیں تاکہ اسلامی طریقے سے نکاح ہو جائے۔ (یہاں یہ عام دستور ہے) مفتی ضیاء الدین بابا خان نے نکاح پڑھا، دولہوں نے ہم سب کی مبارکباد لی، اس کے بعد دولہا اور دلہن مسجد میں گئے، پھر مزار پر حاضر ہوئے اور چلے گئے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ چونکہ یہ مزار وسط ایشیا کے مسلمانوں کی زیارت گاہ ہے اس لئے زائرین کی سہولت کے لئے خرتنگ میں ایک ہوٹل بھی بنا دیا گیا ہے۔ کوئی چار بجے خرتنگ سے واپسی کی تیاری ہوئی، میں چپکے سے ایک بار پھر مزار پر حاضر ہوا، رخصتی فاتحہ پڑھی اور آکر کار میں بیٹھ گیا، واپسی میں ہمارا سفر دور تک ایک دریا کے ساتھ ساتھ رہا، دریا کا نام پوچھا، بتایا گیا کہ نام زرافشاں ہے، کیسا خوبصورت اور شاعرانہ نام لیکن کیسی حقیقت اپنے ساتھ لئے ہوئے کہ اسی کے طفیل سمرقند اور اس کے مضافات چمن زار ہیں اور سونا اگلتے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں کہ سمرقند کی زبان تاجکی ہے اور سمرقند کے باہر سب لوگ ازبک بولتے ہیں۔

تاجکستان کی راجدھانی دوشنبے کے نام سے مشہور ہے، اکثر خیال آتا تھا کہ دوشنبہ بھی خوب نام ہے، اسٹالن کے عہد میں اس شہر کا نام بدل کر اسٹالن آباد رکھا گیا تھا، پھر اسٹالن کی وفات کے بعد جب اس کی مخالفت کی رو عام ہوئی تو اس کا نام پھر دوشنبہ ہو گیا۔ میں نے ایک صاحب سے اس کی وجہ تسمیہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ عرصہ گزرا یہ ایک گاؤں تھا جس میں ہر دوشنبہ کو بازار لگتا تھا اور آس پاس کے گاؤں سے دوکاندار اور خرید و فروخت کرنے والے یہاں جمع ہوتے تھے، رفتہ رفتہ اس گاؤں کی آبادی بڑھی اور یہ قریہ اچھا خاصا شہر بن گیا، چونکہ دوشنبہ کو بازار لگنے سے یہ قریہ دوشنبہ کے نام سے مشہور ہو گیا، اس لئے شہر کا نام بھی دوشنبہ ہی رہا۔

سمرقند میں مفتی ضیاء الدین بابا خان اور ان کے بعض تاشقندی ساتھیوں

نے ہمیں الوداع کہا اور ہمیں سید اللہ خان کلاں اور تاجیکی میزبانوں کے سپرد کر کے تاشقند واپس ہو گئے۔ دوشنبہ ہم بذریعہ ہوائی جہاز پہونچے اور ایک شاندار ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ یہ شہر پہاڑوں کے دامن میں آباد ہے۔ شہر میں ہر جگہ سبزہ اور پانی کی نہریں رواں پہاڑی دریاؤں، خصوصاً دریائے ورزاب کے ٹھنڈے پانی کو جو پامیر کے پہاڑوں سے نکلتا ہے، پورے شہر میں پھیلا دیا گیا ہے۔ دوشنبہ کی سرسبزی و شادابی اسی پانی کی رہین منت ہے۔ بازار میں نکلئے تو سڑکوں پر اونچے درختوں کے گھنے سایے بڑے فرحت بخش ہیں، بڑے چوراہوں پر تاجیکی انقلابیوں اور ادیبوں اور شاعروں کے اسٹیچو نصب ہیں، رودکی کا ایک خوبصورت اسٹیچو ایک نمایاں جگہ اس بات کی یاد دلاتا ہے کہ تاجیکی قوم کو اپنے کلاسیکی ادب سے گہرا تعلق ہے۔ ہم نے یہاں کی مشہور لائبریری دیکھی جو اپنے اورینٹل کتابوں کے شعبہ کے لئے دنیا میں مشہور ہے۔ یہ فردوسی لائبریری ہے۔ یہاں مختلف علوم و فنون کی تقریباً تیس لاکھ کتابیں ہیں۔ افسوس کہ ہم زیادہ وقت اس لائبریری میں نہ گزار سکے، لیکن مجھے جو وقت ملا میں نے عربی اور فارسی کے مخطوطات کے سیکشن میں گزارا، اس سیکشن کی انچارج ایک خوبصورت خاتون ہیں جن کا نام منورہ ہے۔ وہ کئی زبانیں جانتی ہیں اور انگریزی بھی خوب بولتی ہیں۔ انھوں نے تاریخ طبری، دیوان جامی، شاہنامہ فردوسی، گلستان سعدی، کشف المحجوب، اخلاق محسنی، سلسلۃ الذہب، دیوان حافظ اور دوسری فارسی و عربی کتابوں کے کئی مصور و مطلا نسخے دکھائے اور ان کا تعارف بھی کرایا کہ یہ نسخے کہاں کہاں رہے اور کس طرح کتب خانہ فردوسی میں پہونچے۔ آخر میں انھوں نے اس سیکشن کا ایک مطبوعہ کیٹیلاگ بھی مجھے نذر کیا۔ دوشنبہ ہی میں ایک دوست تولا نصرت شاہ نے امیر خسرو دہلوی کے منتخب قصائد و غزلیات کا ایک مجموعہ جو آثار منتخب کے نام سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا ہے، مجھے اپنی دوستی کی یاد کو تازہ زندہ رکھنے کے لئے دیا۔ اس کے لئے میں ان دونوں کا بیحد ممنون ہوں۔

اوپر دریائے ورزاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہمارے میزبان ہمیں تقریباً بیس پچیس

میل دور اُس پہاڑی درّہ میں لے گئے جو درّۂ ورزاب کے نام سے مشہور ہے۔ دونوں طرف اونچے پہاڑ، بیچ میں صرف اتنی جگہ کہ کوئی تیس فیٹ چوڑی ندی، بہت تیز بہتی، شور مچاتی اور پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر جھاگ اگلتی جیسے اُسے اس بات پر غصّہ آرہا ہو کہ کوئی کیوں اس کی راہ روکتا ہے۔ اور پھر اس ندی کے ساتھ ساتھ بل کھاتی کوئی پندرہ بیس فٹ چوڑی سڑک، بس دونوں طرف کے پہاڑوں کے درمیان کوئی پچاس فٹ کا فاصلہ ایک جگہ ہم کاروں سے اترے جہاں سے دور پامیر کے پہاڑی سلسلے کی برف آلود چوٹیاں صاف نظر آرہی تھیں، خیال آیا کہ یہاں سے ہمارا وطن کتنا قریب ہے، اور اوپر جاکر آواز دیجئے تو یہ آواز دوسری طرف پہاڑی ڈھلوانوں سے اتر کر ہمارے ملک میں پہونچ جائے گی۔ کیا عجب کہ امیر تیمور کی فوج کا ایک حصہ اسی درّۂ ورناب سے گذر کر پامیر کو عبور کر کے ہندوستان پہونچا ہو۔

ورزاب کے کنارے جہاں ہم اترے تھے۔ وہاں دریا میں دو تین فٹ اندر اونچے پتھروں پر جاکر بیٹھ گئے۔ پانی میں پاؤں ڈالا تو نہایت سرد، دو تین منٹ بعد کپکپی طاری ہوگئی، صاف وشفاف پانی جھاگ کے ساتھ ہمارے کپڑے بھگو رہا تھا۔ پیاس لگی تھی، برفیلا پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ کیسے کیسے فطرت کے حسین شاہکار نگاہوں کے سامنے ہیں جنھیں دیکھ کر آنکھوں میں نور اور قلب میں سرور پیدا ہوتا ہے، یا یوں کہیئے کہ قلب میں نور اور آنکھوں میں سرور پیدا ہوتا ہے۔ یہاں اقبال کی نظم ہمالہ بہت یاد آئی، کلیم طور سینا کے لئے تو فقط ایک جلوہ تھا اور یہاں تجلّی تھی کہ سراپا دیکھی جاسکتی تھی۔ میں گنگنا رہا تھا:

آتی ہے ندّی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئنہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی — سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

اسی ورزاب کے آبِ حیات بخش کو تاجیکی و روسی انجینیروں نے دوشنبہ کے ہر چمن میں، ہر سبزہ زار میں، ہر دریں اور ہر گھر میں پہونچا دیا ہے جنھیں دوشنبہ والے بڑے سلیقے سے استعمال کرتے ہیں۔ درۂ ورزاب سے لوٹے تو عصر کی نماز کے لئے مسجد سر آسیا پہونچے۔ اس کے قریب ہی اسی نام کی ایک چھوٹی سی ندی بھی ہے۔ اس ندی کے کنارے گندم کی کاشت ہوتی ہے۔ اس مسجد کا صحن وسیع ہے۔ صحن کے بیچ میں ایک حوض ہے۔ حوض کے کنارے دو طرف فرشی نشست کا نہایت معقول انتظام تھا۔ قالین اور رنگین گاؤ تکیوں سے مُزین یہ فرشی نشست بڑی دیدہ زیب تھی۔ ہم سب نے وضو کیا اور نماز پڑھی، نماز اس مسجد کے امام خطیب حبیب اللہ نے پڑھائی۔ پھر ہم لوگ آکر بیٹھ گئے۔ اس وقت تک مسجد کا صحن، مردوں، عورتوں، بچوں اور بچیوں سے بھر چکا تھا۔ یہاں میں نے ایک بات یہ دیکھی کہ کچھ عورتیں آئیں اور صحن کے ایک طرف کے کمروں میں جا کر بیٹھ گئیں، وہ بُرقع میں تو نہ تھیں لیکن غالباً حجاب وحیا کے تقاضوں کو سمجھتی تھیں، اس طرح صحن اور کمروں میں کُل ملا کر دو تین سو آدمی ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ یہاں ہماری ضیافت کا انتظام محلے کی طرف سے ہے اور کھانے کی جو چیزیں آئی ہیں وہ کئی گھروں سے پک کر آئی ہیں۔ یہاں ایک خاص قسم کی نان بھی تھی، موٹی اور اوسط درجہ کی سینی کے سائز کی، نہایت خستہ جس میں میوے بھی تھے، مثلاً بادام اور کشمش وغیرہ، معلوم ہوا کہ ایسی نان اس وقت پکائی جاتی ہے جب مہمانوں کی خصوصی ضیافت مقصود ہوتی ہے ہر مہمان کے سامنے ایک ایک پیالہ مصفا اور خوشبودار شہد بھی رکھا گیا۔ بڑے بڑے مٹی کے کورے کونڈے میں دہی بھی تھا جسے کھایا تو محسوس ہوا جیسے بالائی کھا رہے ہیں، پھر طرح طرح کے پھل اور سیخ کباب وغیرہ۔ دستر خوان پر ہمارے ساتھ محلہ کے کوئی سو آدمی ہوں گے۔ اس محلہ کے رہنے والوں کا خلوص اور جذبۂ یگانگت مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ کیسے شریف اور وضعدار ہیں یہ تاجیکی مسلمان اور اپنی قومی روایات کے کیسے محافظ۔ چہروں سے مسرت عیاں، اصرار کہ اور کھائیے، اور لیجئے،

یہ شہد بہت اچھا ہے، یہ دہی ہے، اس نان میں اہل محلہ کی محبت کی خستگی اور برشتگی ہے۔ اسی طرح دیر تک یہ محفل جمی رہی، پھر مغرب کی نماز پڑھ کر روانگی ہوئی، مسجد کے دروازہ سے باہر نکلے تو ایک ہجوم عورتوں اور بچوں کا رخصت کرنے کے لئے موجود، مرد بھی تھے مگر کم۔ بوڑھی عورتیں بلائیں لے رہی تھیں اور جوان عورتیں اور لڑکیاں اور چھوٹے بچے سلام اور خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ آنے کو جی نہ چاہتا تھا لیکن ہم ٹھہرے مسافر، ہمیں کہاں قیام۔

دوسرے دن گلستاں کی سیر کو نکلے۔ کبھی یہ ایک قریہ تھا اور اس کا نام تھا تُلفِتو۔ اب اسے گلستاں کہتے ہیں اور اس علاقے میں اسٹیٹ فارم ہے، بڑی پُر رونق جگہ ہے اور واقعی ہر لحاظ سے اسم بامسمیٰ۔ اس فارم کی افسر اعلیٰ ایک تاجیکی خاتون ہیں، ان سے ملاقات ہوئی۔ عمر زیادہ سے زیادہ تیس تیس سال، خوبصورت اور صحتمند، شلوار اور جمپر میں ملبوس اس گلستاں کی بہار لگتی تھیں۔ یہاں اسٹیٹ فارم کی سیر کرتے ہوئے ہم لوگ ایک بہت بڑے احاطے میں داخل ہوئے۔ یہ وہی احاطہ ہے جس میں مولانا یعقوب بن عثمان چرخی الغزنوی (م ۸۵۱ھ) کا مزار ہے۔ مزار پر جو لوح ہے اس پر تاریخ وفات شمس الہدایت (۸۵۱ھ) درج ہے۔ اسی کے پاس ایک مسجد ہے جسے مسجد حضرت یعقوب چرخی کہتے ہیں۔ یہ ۹۱۶ھ میں تعمیر ہوئی اور "کلاہ سرخ" سے تاریخ تعمیر نکلی۔

مولانا یعقوب چرخی حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبندؒ کے بڑے اصحاب میں سے ہیں۔ آپ علوم ظاہری و باطنی میں مرجع خلائق تھے۔ آپ کی ذات سے اس علاقے کے لوگوں کو بڑا فیض پہونچا۔ آپ نے فارسی زبان میں قرآن پاک کی تفسیر لکھی تھی، اس کا مخطوطہ میں نے تاشقند میں ٹیلہ شیخ مسجد کے کتب خانے میں دیکھا تھا۔ حضرت یعقوب چرخی کا مزار آج بھی مرجع خاص و عام ہے اور تاجک اور افغانستان کے مسلمان اس کی زیارت کو آتے ہیں۔

احاطہ میں داخل ہوتے ہی میں سب سے پہلے مزار پر حاضر ہوا، فاتحہ پڑھی

اور پھر کچھ قرآن ، دعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ صاحب مزار کی نیکیوں کے طفیل اس علاقے کو ایک بار پھر روحانیت کا گہوارہ بنا دے ۔ بڑی دیر تک مزار کے احاطے میں ایک طرف خاموش کھڑا رہا اور نگاہِ تصور سے قصرِ عارفاںؒ کے اس مزار کو دیکھتا رہا جہاں سے کئی ایسے ستارے ٹوٹے جن سے نہ صرف پورا وسط ایشیا بلکہ افغانستان، ہندوستان ، ترکی ، مشرقی یورپ اور شام و عراق کے افق روشن ہو گئے ۔ اب تو سب کہانیاں بن گئے ہیں اور یہ کہانیاں بھی نہ معلوم کہاں کہاں کھوئی جا رہی ہیں ، لیکن کبھی یہ ایک حقیقت اور قوت تھی جس نے مسلمانوں کی سیاسی و معاشرتی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا ۔ بس یوں سمجھئے کہ اسی گردوں کا ایک تارا خواجہ محمد باقی قدس سرہٗ تھے جو وسط ایشیا سے ہندوستان میں وہ روشنی لائے جو اکبر اور جہانگیر کے عہد میں شیخ احمد سرہندیؒ کی شخصیت میں کوکب تاباں بن کر ایک عالم کو منور کر گئی ۔

ماضی سے حال میں لوٹا تو نہایت ادب سے چند قدم الٹے پاؤں چل کر بوجھل قدموں سے مزار کے احاطے سے باہر آیا ۔ یہاں یہ طے ہو چکا تھا کہ پہلے ظہر کی نماز پڑھی جائے گی ، پھر لنچ ہو گا ۔ نماز سے فارغ ہوئے تو اپنی اپنی مسندوں پر آ گئے ۔ میرا تخت احاطہ کے بڑے حوض کے کنارے تھا ۔ حوض میں خربوزے اور تربوز تیر رہے تھے ۔ نہ معلوم کب سے وہ وہاں پڑے تھے اور اب وہ نکالے جا رہے تھے ۔ ایک لمبی لکڑی سے جس کے ایک سرے پر پنجے کی شکل کی کوئی چیز تھی ، وہ کنارے لائے جاتے اور انھیں کاٹ کر مہمانوں کے سامنے رکھا جاتا ، ٹھنڈی اور شیریں قاشیں بس مزا دے گئیں ۔ بابر کو ہندوستان سے یہی شکایت تھی کہ یہاں تربوز اور خربوزے نہیں ، باغات نہیں ، پھل اور پھول نہیں اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ وسط ایشیا

۱۔ قصر عارفاں شہر بخارا سے کوئی دو کلومیٹر کے فاصلے پر وہ مقام ہے جہاں حضرت خواجہ نقشبندؒ پیدا ہوئے تھے اور جہاں آپ کا مزار ہے ۔ آپ سے پہلے اس قریہ کا نام کوشک ہندواں تھا

کے خربوزے اور تربوز کھائیے تو انھیں کبھی بھول نہیں سکتے۔ پورا احاطہ پھل دار درختوں اور رنگ برنگ پھولوں سے بھرا ہوا، انگور کی بیلیں جن میں خوشے لٹک رہے تھے، الگ اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔ ہر طرف ایسی حسین فضا ہو تو خوبصورت، سبک اور نفتشین پیالوں میں سبز چائے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ سُغال آفریدہ ایاغ آفریدم' کے معنی ایک بار پھر یہیں سمجھ میں آئے اور

بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

کی اصل معنویت کے راز یہیں آشکارا ہوئے۔ انسان میں تسخیر فطرت کی صلاحیت اپنی جگہ آپ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ انسان خدا کی کن کن نعمتوں کو جھٹلائے گا۔

گلستاں سے رخصت ہوئے تو عصر کی نماز آکر مسجد حاجی یعقوب میں پڑھی جو انقلاب سے پہلے کی ہے۔ اب اسے اور بڑا کیا گیا ہے۔ یہاں بھی نمازیوں کی تعداد خاصی تھی۔ نماز کے بعد تقریریں ہوئیں۔ میں نے تقریر کی۔ میری تقریر کا موضوع نقشبندی سلسلہ اور اس کے عالمگیر فیوض تھے۔ تقریر کا ترجمہ تاجیکی زبان میں ہوا۔ تقریر کے بعد جب سب اُٹھے تو لوگ مصافحہ کے لئے مجھ پر لوٹ پڑے۔ اس مسجد میں مصافحہ کا یہ تجربہ انوکھا تھا۔ اس سے پہلے ایسا کہیں نہیں ہوا۔ درحقیقت یہ اثر تھا نقشبندی سلسلے پر میری تقریر کا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وسط ایشیا میں بھی ہندوستان کی طرح تصوف کی جڑیں گہری ہیں اور خواجگان نقشبند سے اس علاقے کے مسلمانوں کو بے پناہ عقیدت ہے۔

دوشنبہ سے ہمارا قافلہ اڑا تو باکو میں اترا جو ماورائے قفقاز کے مسلمانوں کے مذہبی بورڈ کا مرکز ہے اور جس کے تحت آذربائجان، آرمینیا اور جارجیا کی جمہوریتیں ہیں۔ کیسپین کے کنارے یہاں تیل کے چشمے ہیں جس کی وجہ سے یہ ایک

بڑا صنعتی شہر بن گیا ہے۔ یہ شہر قدیم بھی ہے اور جدید بھی۔ یہاں ہم نے قدیم عمارتیں بھی دیکھیں اور جدید بھی۔ یہاں وہ مسجد بھی دیکھی جو تازہ پیر مسجد کے نام سے مشہور ہے اور جس کا بلند مینار یاد دلاتا ہے کہ

یہیں ملیں گے تجھے نالۂ بلند ترے

باکو میں جس ہوٹل میں ہمارا قیام تھا وہ شہر کے سب سے بلند حصے میں اُس مقام پہ ہے جہاں سے کیسپین کا نیلا پانی دور دور تک نظر آتا ہے۔ ایک شام ہم نے دو تین گھنٹے سمندر کے کنارے پارک کی لمبی روشوں پر گذارے، بس چلتے رہے، چلتے رہے، یہاں شام کو سارا باکو جمع ہو جاتا ہے، یہاں میں نے بڑے حسین مرد اور عورتیں دیکھیں، جدید طرز کا لباس پہنے ہوئے یونیورسٹی کے طلبار اور طالبات، دفتروں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مرد اور عورتیں، اسکولوں کے بچے اور بچیاں، غرض سب طرح کے لوگ وہاں موجود تھے۔ کچھ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں سے بزبان فارسی گفتگو بھی ہوئی۔ باکو کا علاقہ کوہ قاف کا علاقہ ہے۔ کوہ قاف کی پریوں کے قصّے کہانیاں بچپن سے سنتے اور پڑھتے آئے تھے، اب حقیقتاً پریاں دیکھیں، خدا کا شکر ہے کہ کسی جن سے سابقہ نہیں پڑا۔

باکو میں ہم نے کئی کارخانے بھی دیکھے جو کافی بڑے تھے اور جہاں ہزاروں مزدور، مرد اور عورت کام کرتے ہیں، ایک ایسے کارخانے میں بھی گئے جہاں الیکٹرونکس کے محیر العقول کارنامے دیکھنے کو ملے۔ لیکن مجھے اس کا افسوس ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ شدید خواہش اور اس خواہش کے بار بار اظہار کے باوجود میں اس شہر کی وہ لائبریری نہ دیکھ سکا جہاں مشرقیات کا وافر ذخیرہ ہے۔ مشکل یہ تھی کہ ہمارے قافلے کے دوسرے لوگوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور ہمارے آذربائیجانی میزبان اکثریت کے ذوق کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ باکو میں ہماری ملاقات آذربائیجان کی جمہوریہ کی وزیر خارجہ سے ہوئی جو ایک دانشمند اور مہذب خاتون ہیں۔ انھوں نے آذربائیجان کی معاشی اور سماجی ترقی

کے اجمال اعداد و شمار کے ساتھ بتائے۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ یہاں کے مسلمان، خاص طور پر وہ جو گاؤں اور قصبوں میں رہتے ہیں، کافی مذہبی ہیں اور اپنی مذہبی رسومات کے پابند ہیں۔

سمرقند اور دوشنبہ سے باکو میں آئیے تو ایسا لگتا ہے کہ یورپ میں آ گئے یا 'قدیم' سے 'جدید' کی طرف نکل آئے۔ اور واقعی ہم باکو سے جو نکلے تو 'جدید' ہی کی طرف بڑھتے گئے یہاں تک کہ ماسکو آ گئے۔ ماسکو کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کا پہلا اتفاق تھا، پچھلی مرتبہ وہاں جب گیا تھا تو یہ بھی پتہ نہ چلا تھا کہ جامع مسجد ہے کہاں، کیونکہ صرف دو دن قیام تھا اور جمعہ کا دن بھی نہیں پڑا تھا۔ جامع مسجد میں جمعہ کے دن کافی بڑا مجمع ہوتا ہے اور خواتین بھی آتی ہیں، میں نے ایک خاتون سے دریافت کیا (انگریزی میں) کہ آپ روسی ہیں؟ انھوں نے بڑے فخر سے کہا کہ 'میں ترک ہوں' (وہ اتفاق سے کچھ انگریزی جانتی تھیں) ماسکو میں ہزاروں کی تعداد میں ترکی النسل لوگ رہتے ہیں۔ میں نے اس مسجد میں کالے گورے ہر طرح کے مسلمان دیکھے اور ان میں بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی۔ میں نے یہاں ایسے بوڑھے ترک بھی دیکھے جن کی عمریں اسی پچاسی کے قریب ہوں گی۔ ان کے چہرے کی جھرّیوں کی سطروں میں میں نے پین تورانی تحریک کی تحریریں پڑھنے کی کوشش بھی کی اور بعض بوڑھے ترک میرے واہمہ میں 'ینگ ٹرکس' بھی نظر آئے۔ لیکن ماسکو کا قصہ میں چھوڑتا ہوں کہ یہ شہر امام بخاریؒ، بابرؒ اور احمد دانشؒ کے دیس سے بہت دور ہے۔

عبداللطیف اعظمی

ماہنامہ جامعہ پر ایک نظر

جنوری ۱۹۲۳ء تا جولائی ۱۹۴۷ء

(آج کل مختلف یونیورسٹیوں میں جو تحقیقی کام ہو رہے ہیں اس سلسلے میں ہم سے بارہا یہ خواہش کی گئی ہے کہ ماہنامہ جامعہ کی مفصل تاریخ اور اس کے مضامین کی، از اول تا آخر توضیحی ببلیوگرافی، مرتب کر کے شائع کی جائے۔ توضیحی ببلیوگرافی کی ترتیب و اشاعت کے لیے جس قدر رقم درکار ہو گی اس کا فی الحال کوئی انتظام مشکل معلوم ہوتا ہے اس لیے یہ کام ابھی تک شروع نہیں کیا جا سکا، ورنہ اس کی ضرورت اور اہمیت کا خود ہمیں بہت زیادہ احساس ہے۔ البتہ ماہنامہ جامعہ پر ایک مختصر مضمون کچھ عرصہ پہلے راقم الحروف نے لکھا تھا جو ستمبر ۱۹۷۰ء کے ماہنامہ "سب رس" (حیدرآباد) میں شائع ہوا ہے جس میں رسالے کے متعلق تمام ضروری معلومات دے دی گئی ہیں، مگر کچھ یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالروں نے شکایت کی ہے کہ "سب رس" کا وہ شمارہ آسانی سے نہیں ملتا، اس لیے ان کی خواہش ہے کہ خود ماہنامہ جامعہ میں اسے دوبارہ شائع کیا جائے، لہٰذا ان کی خواہش اور روز بروز بڑھتی ہوئی ضرورت کے پیش نظر اس میں اس قدر اضافہ کیا گیا ہے کہ یہ بالکل نیا مضمون ہو گیا ہے۔ اگر ممکن ہوا تو ماہنامہ جامعہ کے اہم مضامین کے بارے میں بھی ایک مبسوط مضمون آئندہ کسی موقع پر شائع کیا جائے گا۔)

ماہنامہ جامعہ برصغیر ہند و پاک کے قدیم ترین ماہناموں میں سے ہے اور اس وقت اس برصغیر میں جو معیاری علمی و ادبی ماہانہ رسالے شائع ہوتے ہیں، میرے خیال میں ان میں سب سے قدیم معارف (اعظم گڑھ) اور اس کے بعد جامعہ (دہلی) ہے۔ جامعہ کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۲۳ء

میں علی گڑھ سے شائع ہوا۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد علی گڑھ میں ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو رکھی گئی اور اس کے قیام کے کچھ
دنوں کے بعد تصنیف و تالیف کا ایک شعبہ قائم ہوا، جس کے اہتمام میں ماہنامہ جامعہ شائع ہوتا تھا
اس کے پہلے مدیر جناب نور الرحمٰن صاحب (۱۸۹۴ء - ۱۹۷۲ء) مقرر ہوئے۔ نور الرحمٰن صاحب مسلم یونیورسٹی
کے قوم پرور گریجویٹ میں سے تھے۔ ان کی طالب علمی کے زمانے میں ان کے بہت سے مضامین علی گڑھ میگزین
میں شائع ہو چکے تھے، بعد میں میر (۱۷۲۲ - ۱۸۱۰) اور اکبر (۱۸۴۶ - ۱۹۲۱) کے کلام کے انتخابات الگ الگ
کتابی صورت میں، سرسید (۱۸۱۷ - ۱۸۹۸) کی مختصر سوانح حیات اور انوار الرحمٰن (مصنفہ: مولوی نور اللہ
مرحوم) کی تلخیص شائع ہوئیں۔ ماہنامہ جامعہ کا جب پہلا شمارہ شائع ہوا تھا تو "تقریب" کے عنوان کے
تحت، سات سطروں کی تمہید کے بعد، رسالے کے اجرا اور اس کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے حسب
ذیل تحریر شائع کی گئی:

> "ہر دار العلوم کی یہ بھی قدیمی سنت ہے کہ اس کا ایک مخصوص علمی رسالہ ہو لیکن جامعہ ملیہ
> نے اس کو اس وقت تک ضروری نہیں سمجھا کہ طلبہ کے علمی ذوق، مشاغلِ تصنیف و تالیف کی
> مقبولیت اور جامعہ کی علمی زندگی کی تدریجی ترقی کے ساتھ خود رسالے کا وجود بھی مسئلۂ ارتقا کے
> عالمگیر اثر میں پیدا نہ ہو جائے چنانچہ تقریباً ایک سال تک طلبائے جامعہ اپنے رسالہ جوہر کو
> قلمی[1] نکالتے رہے اور اس طرح وہ تمام اسباب جو ایک علمی رسالے کی اشاعت کے لیے ناگزیر ہوتے
> ہیں، خود ہی فراہم ہو گئے، جن کی موجودگی میں مجلس تعلیمی کو رسالہ جامعہ کی طبع و اشاعت کی
> منظوری دینا ضروری ہو گیا۔ اس عرصے میں شعبۂ تصنیف و تالیف کی گزشتہ یک سالہ کوششوں
> کے نتائج بھی ظاہر ہونے لگے تھے اور آئندہ کے لیے بھی تنظیم و ترتیب کے ابتدائی مدارج سے
> فراغت حاصل ہو چکی تھی، لہٰذا اس بارِ گراں کا اس شعبے کو ذمہ دار قرار دینا زیادہ دشوار نہ ہوا۔
> اس اعتبار سے غالباً یہ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ رسالہ جامعہ جو بفضل خدا آج آپ کے ہاتھوں

---

[1] اس قلمی پرچے (جوہر) کے کئی خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں جنھیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے، مثلاً
۱۔ ۱۹۲۵ء میں خصوصی شمارہ جو کسی ایک موضوع پر نہیں ہے (مرتبہ: حامد علی) ۲۔ ۱۹۳۸ء میں اقبال نمبر (مرتبہ: محمد جعفر
سید۔ ۳۔ ۱۹۴۰ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق (مرتبہ: عبداللطیف اعظمی) ۴۔ ۱۹۴۶ء میں جوبلی نمبر۔ جامعہ
ملیہ اسلامیہ کے بارے میں (مرتبہ: محمد عمر فان نوری۔

میں ہے، کسی رسمی ضرورت یا خارجی اثر سے نہیں بلکہ خود ہی عالم وجود میں آیا ہے، گویا:
ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ — شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما
اور یہ جامعہ ملیہ جیسے تعلیمی مرکز کے لیے ہرگز قابلِ تعجب بھی نہیں۔

جامعہ کے متعلق اس قدر عرض کرنا ضروری ہے کہ اگرچہ یہ رسالہ شعبۂ تصنیف و تالیف کے زیرِ نگرانی شائع ہوگا لیکن یہ طلبۂ جامعہ ملیہ ہی کا رسالہ ہے، انھیں کا ہاتھ اس کی ترتیب و تہذیب میں، ان ہی کی کوششیں اس کی طبع و اشاعت میں اور انھیں کی کاوش و محنت اس کے علمی و ادبی مضامین میں نظر آئے گی۔[۳۵]"

جناب نورالرحمٰن صاحب (۱۸۹۴ - ۱۹۷۲) جامعہ کے پہلے مدیر مقرر ہوئے۔ نورالرحمٰن صاحب مسلم یونیورسٹی کے قوم پرور گریجویٹ میں سے تھے اور ان کی طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میگزین میں ان کے بہت سے مضامین شائع ہو چکے تھے، بعد میں میر تقی میرؔ (۱۷۲۲ - ۱۸۱۰) اور اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ - ۱۹۲۱) کے کلام کے انتخابات الگ الگ کتابی صورت میں، سر سید (۱۸۱۷ - ۱۸۹۸) کی مختصر سوانح حیات اور انوار الرحمٰن (مصنفہ: مولوی نوراللہ مرحوم) کی تلخیص شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (۱۸۹۷ - ۱۹۶۹) سے نورالرحمٰن صاحب کے شروع سے آخر تک گہرے مراسم رہے ہیں چنانچہ آزادی کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) کی از سرِ نو تشکیل و تنظیم ہوئی اور ذاکر صاحب اس کے صدر مقرر ہوئے تو نورالرحمٰن صاحب کو اس کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ بعد میں وہ پاکستان چلے گئے اور وہیں ۱۸ اپریل ۱۹۷۲ء کو انتقال کیا۔

ماہنامہ جامعہ کی عمر جب ایک سال کی ہوگئی تو مدیرِ رسالہ نے لکھا کہ:

"رسالہ جامعہ نے اس ایک سال میں جو خدمت کی ہے، اس کا صحیح اندازہ ممکن ہے کہ ناظرین و علم دوست حضرات کر سکیں، لیکن جن لوگوں کے ذمے ادارت کا بار ہے وہ اس کے اہل نہیں۔ ایک نمایاں خصوصیت اس رسالے کی یہ رہی ہے کہ ابتدا ہی سے وہ ایک خاص مقصد کے ساتھ نکالا گیا، ترتیب و تہذیب، مضامین کی نوعیت، حجم اور ظاہر شکل و صورت میں وہ ہمیشہ یکساں رہا اور بڑی حد تک وقت کی پابندی کو بھی ہاتھ سے نہ دیا۔ ان کوششوں

---

۳۵ نورالرحمٰن: شذرات، ماہنامہ جامعہ جلد ا نمبر ا بابت ماہ جنوری ۱۹۲۳ء صفحات ۱، ۲

میں جس قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس کی وجہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تعلق ہے جو ملک میں بہ اعتبار اپنے مقاصد کے اک خاص حیثیت رکھتی ہے۔[۳]"

جنوری ۱۹۲۳ء تا جون ۱۹۲۴ء، ڈیڑھ سال تک رسالہ جامعہ نورالرحمن صاحب کی ادارت میں شائع ہوا، اس کے بعد جولائی اور اگست ۱۹۲۴ء کا مشترک شمارہ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری (۱۸۸۱ء۔ ۱۹۵۵ء) کی ادارت میں شائع ہوا۔ جامعہ ملیہ کے اساتذہ میں مولانا اسلم صاحب کی ایک ایسی شخصیت تھی جن کی تصنیفات کی تعداد سب سے زیادہ تھی، اس وقت تک اُن کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی تھیں :

(۱) تاریخ الامت۔ چار جلدیں۔ آخر میں کل آٹھ جلدیں شائع ہوئیں اور یہ مولانا کی مقبول ترین کتاب ہے۔ (۲) تاریخ القرآن (۳) خواتین (۴) حیات جامی (۵) حیات حافظ (۶) محجوب الارث (۷) الوراثۃ فی الاسلام (عربی میں) ان کے علاوہ رسالہ جامعہ میں کچھ مضامین اور ایک نظم اور ایک غزل شائع ہوئی تھیں۔ نظم کا عنوان تھا: " نوید امید"، جو مولانا محمد علی کی آمد کے موقع پر کہی گئی تھی اور دسمبر ۱۹۲۳ء کے جامعہ میں شائع ہوئی تھی اور مدیر رسالہ نورالرحمن صاحب نے اس کے بارے میں حسب ذیل نوٹ لکھا تھا :

> " مولانا محمد علی کی تقریب تشریف آوری نے مولانا اسلم صاحب کو اپنی عرصے کی خاموشی کو خیرباد کہنے پر مجبور کر ہی دیا اور اس موقع پر جو نظم آپ نے تحریر کی وہ بلاشبہ ان خاص چیزوں میں سے ہے جو دل ہی سے نکلتی ہیں اور دل ہی میں گھر کرتی ہیں۔ ہم فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اس گرانقدر تحفہ کے لیے صاحب نظم کا شکریہ ادا کریں یا مولانا محمد علی صاحب کا جن کی دوبارہ رہائی نے یہ دوسری نظم اسلم صاحب سے لکھوائی۔"[۴]

اسی طرح مولانا کی ایک غزل فروری ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی تو اس کے بارے میں مدیر رسالہ نے لکھا تھا:

> " مولانا کی یہ غزلِ مسلسل صرف بادۂ شاعری ہی نہیں ہے، بلکہ خمار چشم ساقی کا کیف بھی اس میں شامل معلوم ہوتا ہے۔"[۵]

---

[۳] نورالرحمن؛ شذرات، ماہنامہ جامعہ جلد ۲ نمبر ۶ بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۳ء صفحہ ۴۰۳
[۴] ایضاً جامعہ بابت ستمبر ۱۹۲۳ء صفحہ ۱۷۹ [۵] ایضاً جامعہ فروری ۱۹۲۴ء صفحہ ۱۱۳

غرض مولانا اسلم صاحب ایک مصنف اور شاعر کی حیثیت سے ایک اچھی شہرت رکھتے تھے اور وہ رسالہ جامعہ کی ادارت کے لیے ہر لحاظ سے موزوں اور اہل تھے۔ ایک سال کے بعد، ستمبر ۱۹۲۵ء سے جامعہ کے ایک گریجویٹ یوسف حسین خاں صاحب کا ادارت میں اضافہ ہوا۔ موصوف اس وقت جامعہ سے نئے نئے فارغ ہوئے تھے اور علم و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں ماہنامہ جامعہ میں ان کے حسب ذیل مضامین شائع ہو چکے تھے جو علمی و تحقیقی معیار پر پورے اترتے تھے:

(۱) سیاست بین الاقوامی (جنوری ۱۹۲۳ء) ۲۔ مسئلۂ اشتراکیت (اپریل ۱۹۲۲ء)
(۳) دول یورپ اور ترکی (مئی ۱۹۲۳ء) (۴) جدید عالم اسلامی (جولائی ۱۹۲۳ء) (۵) کشمیر بہشت نظیر (اکتوبر ۱۹۲۳ء) (۶) انقلاب (ترجمہ۔ مارچ ۱۹۲۴ء) (۷) ہندوستانی قومیت (ستمبر ۱۹۲۵ء)

یوسف حسین خاں صاحب کا ادارت میں جب اضافہ ہوا تھا تو اس وقت رسالے کی اشاعت میں بہت زیادہ بے ضابطگی پیدا ہو گئی تھی اور غالباً اسی کو دور کرنے کے لیے یہ اضافہ کیا گیا تھا۔ اس بے ضابطگی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۲۵ء کے وسط میں جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ سے دہلی منتقل کی گئی، اس کی وجہ سے اپریل سے اگست تک، پانچ ماہ میں کوئی شمارہ شائع نہیں ہوا۔ (علی گڑھ سے آخری شمارہ مارچ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا۔) اس لیے ستمبر کے شمارے کو چھ ماہ (۴ تا ۹) کا شمارہ قرار دیا گیا اور نئی جگہ اور نئے حالات کی وجہ سے جو دقتیں پیدا ہو گئی تھیں، ان پر قابو حاصل کرنے کے لیے نئے خون کی ضرورت تھی، چنانچہ چھ ماہ کے بعد، فروری ۱۹۲۶ء میں جب یوسف صاحب اعلیٰ تعلیم کے لیے پیرس کے لیے روانہ ہوئے تو ان کو الوداع کہتے ہوئے اور ان کی خدمات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مولانا اسلم صاحب نے مارچ ۱۹۲۶ء کے شذرات میں خاص طور پر اس طرف اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: "جامعہ ملیہ کے علی گڑھ سے دہلی منتقل ہونے کے سبب سے ہمارے رسالے کی اشاعت میں جو بے نظمی پیدا ہو گئی تھی، اسے دور کرنے میں یوسف حسین خاں صاحب نے نہایت قابلیت اور محنت سے کام کیا اور رسالے کو ایسی حالت میں چھوڑا ہے کہ اس کی بہتری اور ترقی پہلے کی نسبت زیادہ آسان ہو گئی ہے۔" (صفحہ ۲۰۷)

اِدھر فروری (۱۹۲۶ء) میں یوسف حسین خاں صاحب پیرس جانے کی تیاری کر رہے تھے اور تین

ماہ کے بعد مئی میں روانہ بھی ہو گئے، اُدھر ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مزید تعلیم حاصل کرنے کے بعد جرمنی سے جامعہ ملیہ واپس آگئے اور ان کے ساتھ دو اور ساتھی، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور (پروفیسر) محمد مجیب صاحب جامعہ کی خدمت کے لیے تشریف لائے۔ ان حضرات کا خیر مقدم کرنے اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کا ماہنامہ جامعہ کی ادارت میں شمولیت کا اعلان کرتے ہوئے، مولانا محمد اسلم صاحب نے ۲۶ فروری کے شذرات میں لکھا:

"... آج ہم نہایت مسرت کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ جامعہ کی خوش قسمتی سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صاحب ایم، اے، پی، ایچ، ڈی، ڈاکٹر عابد حسین صاحب پی ایچ ڈی اور محمد مجیب صاحب بی۔ اے آکسن نے اپنی خدمات جامعہ کے لیے پیش کی ہیں اور عنقریب تینوں حضرات اپنے اپنے شعبوں میں کام شروع کر دیں گے۔ ان حضرات کے جامعہ میں رہنے سے جامعہ کی ایک بڑی کمی پوری ہو گئی۔ قیام یورپ کے زمانے میں ان حضرات کے جو خطوط آتے رہے، ان سے نہ صرف ان کے بلند حوصلوں اور ارادوں کا پتہ چلتا ہے بلکہ ان سے افسردہ دلوں کی ڈھارس بھی بندھتی تھی اور وہ لوگ بھی جو جامعہ کے قیام سے ناامید ہو چکے تھے یہ سن کر کہ یہ تینوں حضرات اپنی خدمات جامعہ کے لیے پیش کر رہے ہیں، خاموش ہو جانے تھے۔ ... ہم تینوں حضرات کا دلی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔

اسی سلسلے میں ہم اپنے ناظرین کو یہ بھی بتا دیں کہ آئندہ مہینے سے رسالۂ جامعہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی کی زیر ادارت شائع ہوگا۔ موصوف کا نام نامی جامعہ کے ناظرین کے لیے تعارف کا محتاج نہیں، آپ کے مضامین اور نظمیں متعدد مرتبہ ہمارے رسالے میں شائع ہو چکی ہیں اور ان کا اعلیٰ معیار ہمارے ناظرین سے پوشیدہ نہ ہوگا۔"[۳۶]

جیسا کہ اوپر کے اقتباس میں بیان کیا گیا ہے کہ عابد صاحب کی متعدد نظمیں اور مضامین ماہنامہ جامعہ میں اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں، ان کی فہرست حسب ذیل ہے:

(۱) ہلنسی (فروری ۱۹۲۳ء) (۲) مخمس بر غزل غالب (مئی ۱۹۲۳ء) (۳) تلافی مافات (نظم) (جولائی ۱۹۲۳ء) (۴) جرمنی کی تعلیمی زندگی (اگست ۱۹۲۳ء) (۵) شرح درد اشتیاق (نومبر ۱۹۲۳ء)

۳۶؎ مولانا محمد اسلم: جامعہ بابت ماہ فروری ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۲۸

مارچ ۱۹۲۶ء سے دسمبر ۱۹۳۳ء (جلد ۲۱ نمبر ۲) تک مولانا محمد اسلم جیراجپوری اور ڈاکٹر سید عابد حسین کی مشترک ادارت میں رسالہ جامعہ شائع ہوتا رہا۔ جنوری ۱۹۳۴ء سے رسالے میں ایک بنیادی تبدیلی کی گئی اور طے کیا گیا کہ باری باری ہر شمارہ اسلامیات، عمرانیات اور فنون لطیفہ کے موضوعات پر ہوگا چنانچہ اس سال کے بارہ شماروں میں سے جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر کے شمارے اسلامیات پر فروری، مئی، اگست اور نومبر کے شمارے عمرانیات پر اور مارچ، جون، ستمبر اور دسمبر کے شمارے ادب اور فنون لطیفہ پر شائع ہوئے۔ اس نئی اسکیم کو بروئے کار لانے کے لئے حسب ذیل حضرات پر مشتمل ایک مجلس ادارت مقرر کی گئی تھی:

(۱) مولانا محمد اسلم جیراجپوری (۲) ڈاکٹر سید عابد حسین (۳) ڈاکٹر ذاکر حسین (۴) پروفیسر محمد مجیب اور (۵) ڈاکٹر عبدالعلیم

یہ خاص نمبر اپنے مضامین اور مباحث کے لحاظ سے بہت کامیاب اور معیاری تھے مگر ہر ماہ کسی خاص موضوع پر مضامین حاصل کرنا، تجربہ کار حضرات کو معلوم ہے کہ کس قدر کٹھن کام ہے، اس لیے یہ کامیاب اور مفید تجربہ ایک سال سے زیادہ نہ چل سکا اور جنوری ۱۹۳۵ء سے پھر وہی حسب معمول عام شمارے شائع ہونے لگے اور جنوری سے اپریل تک ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی ادارت میں شائع ہوا۔ مئی ۱۹۳۵ء سے اگست ۱۹۳۶ء تک پروفیسر محمد عاقل صاحب نے قائم مقام اڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ ٹائیٹل پر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کا نام بھی شائع ہوتا رہا۔ ستمبر سے صرف عابد صاحب کا نام رہ گیا اور اکتوبر ۱۹۳۸ء تک عابد صاحب کی ادارت میں رسالہ نکلتا رہا اس کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں عابد صاحب کی جگہ عاقل صاحب نے یہ ذمہ داری سنبھالی اور ستمبر ۱۹۳۹ء تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ اکتوبر میں (ڈاکٹر) نورالحسن ہاشمی صاحب ماہنامہ جامعہ کے اڈیٹر مقرر ہوئے اور دسمبر ۱۹۴۳ء تک یہ خدمت انجام دی۔ ۱۹۴۱ء میں راقم الحروف نے جامعہ ملیہ سے اپنی تعلیم مکمل کر لی اور ستمبر میں مکتبہ جامعہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف اور طباعت کے انچارج کی حیثیت سے میرا تقرر عمل میں آیا۔ اس وقت ہاشمی صاحب کا قیام دہلی کے بجائے بھوپال میں تھا اور وہ وہیں سے رسالہ مرتب کر کے بھیجا کرتے تھے، مقامی طور پر رسالے کی ترتیب و اشاعت کی

ذمہ داری بھی میرے فرائض منصبی میں شامل تھی۔ دسمبر ۴۳ ۱۹ء کے شمارے میں "اظہارِ تشکر" کے عنوان سے نور الحسن ہاشمی کے دستخط سے رسالے کے آخر میں ایک صفحے کا نوٹ شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے فرمایا ہے:

"اکتوبر ۱۹۳۹ء سے رسالہ جامعہ کی خدمت میرے سپرد کی گئی تھی اور مجھے اپنے شوق اور ولولے سے امید تھی کہ ان اسکیموں کے پیش نظر جو اس وقت میرے سامنے تھیں، رسالے کو بہتر بنایا جاسکے گا، لیکن بدقسمتی سے یہی چار سال کا عرصہ ایسے ابتلا کا دور تھا کہ مجبوراً میں رسالے کی اس قدر اور اس طرح خدمت نہ کر سکا جیسی کہ اول اول پیش نظر تھی۔ اب میرے سپرد دوسری خدمات ہو گئی ہیں، لیکن یہ امر باعثِ صد اطمینان و مسرت ہے کہ رسالہ مجھ سے بہتر ہاتھوں میں جا رہا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ رسالہ انشاء اللہ اب بہت بہتر ہو سکے گا اور ان بلندیوں پر پہنچ جائے گا جن پر میں نہ لے جاسکا۔" (صفحہ ۲۸۸)

اگرچہ ہاشمی صاحب نے لکھا تھا کہ "رسالہ مجھ سے بہتر ہاتھوں میں جا رہا ہے" مگر جنوری سے ستمبر ۴۴ ۱۹ء تک نو مہینے رسالہ بند رہا اور اکتوبر ۴۴ ۱۹ء میں پروفیسر محمد عاقل صاحب کی ادارت میں شائع ہوا تو اس میں اس تعطل کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا گیا اس لیے اب اس کی وجہ معلوم کرنا ممکن نہیں ہے۔

فروری ۴۷ ۱۹ء تک عاقل صاحب کی ادارت میں رسالہ نکلتا رہا، اس کے بعد مارچ سے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے یہ ذمہ داری قبول کی اور جولائی ۴۷ ۱۹ء تک وہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اگست کا شمارہ ابھی پریس میں تھا کہ دلی کی فرقہ وارانہ فضا خراب ہونے لگی اور ۳ر ستمبر کو بہت بڑے پیمانے پر فساد پھوٹ پڑا۔ اس وقت اگرچہ میں جامعہ کے مرکزی کتب خانے میں زائد مہتمم کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، مگر میرا قیام مکتبہ جامعہ ہی کی عمارت میں تھا۔ کتب خانہ لوٹ لیا گیا اور مکتبہ جامعہ نذرِ آتش کر دیا گیا اور جامعہ کے وہ لوگ جو اب تک قرول باغ میں تھے، وہاں سے شہر کے نسبتاً محفوظ مقام پر منتقل ہونے پر مجبور ہو گئے اور جب حالات بہتر ہوئے تو وہ تمام

ادارے اور اشخاص جو جامعہ نگر کسی وجہ سے نہ آسکے تھے، منتقل ہو گئے۔ ایک طویل عرصے کے بعد مکتبہ جامعہ پھر قائم کیا گیا، مگر اب اس نے جامعہ کے ادارے کی حیثیت سے نہیں، ایک لمیٹڈ کمپنی کی شکل میں کام شروع کیا۔ اس لمیٹڈ کمپنی نے ماہنامہ جامعہ جاری کرنے کی ذمہ داری قبول نہیں کی اور ۱۳ سال ۲ ماہ بند رہنے کے بعد نومبر ۱۹۶۰ء میں، جامعہ کے جشن چہل سالہ کے موقع پر میری کوششوں سے دوبارہ جاری ہوا اور اب تک جاری ہے۔ اس دور ثانی کے بارے میں انشاء اللہ کسی اور موقع پر دوسرا مضمون لکھا جائے گا۔

چار علمی و ادبی ماہنامے

برصغیر ہند و پاک کی اردو صحافت پر جون ۱۹۶۳ء میں لاہور سے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی ایک وقیع کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے "صحافت پاکستان و ہند میں"۔ اس میں جامعہ کا ذکر صرف چند سطروں میں کیا گیا ہے۔ چالیسویں باب میں علمی و ادبی صحافت کی ایک جھلک" کے تحت لکھا ہے۔ "اسی دور میں [بیسویں صدی کے آغاز میں] چار اہم علمی رسائل معرض وجود میں آئے: (۱) "الناظر" جسے مولانا ظفر الملک علوی نے لکھنؤ سے جاری کیا۔ یہ کلاسیکی ادب کا علمبردار تھا لیکن سیاسی اور معلوماتی مضامین بھی پیش کرتا تھا۔ (۲) "زمانہ" جسے منشی دیا نراین نگم نے نکالا۔ یہ بھی خالص ادبی رسالہ نہیں تھا۔ جہاں ادبی مضامین دیئے جاتے تھے، وہاں سیاسی اور دوسرے معلوماتی مقالے بھی درج کئے جاتے تھے (۳) "معارف" جو سید سلیمان ندوی کی ادارت میں اعظم گڈھ سے جاری ہوا اس میں ادب کا حصہ کم تھا اور فلسفہ، تاریخ اور عمرانیات پر مواد غالب تھا (۴) "جامعہ" جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام دہلی سے نکلتا تھا، اس میں بھی ادب کم تھا اور علم السیاست، فلسفہ، بین الاقوامی سیاست اور تاریخ کا عنصر نمایاں تھا۔

موخر الذکر تین رسائل کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ ان میں عصر حاضر کی علمی اور تہذیبی خبریں بالالتزام چھپتی تھیں اور تمام اردو مطبوعات پر مفصل تبصرے دیئے جاتے تھے۔" (صفحہ ۵۰۳ و ۵۰۴)

ایک خط

مولانا محمد علی اور ریاست کی مالی امداد

یہ شمارہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا کہ کامپٹی ضلع ناگپور سے جامعہ کے ایک قدیم خریدار جناب محمد ظہیر وارثی صاحب کا ایک طویل خط موصول ہوا جس میں مولانا محمد علی مرحوم کے بارے میں مفید کتابوں اور خصوصی شماروں کی نشاندہی کی گئی ہے اسی میں اس مسئلے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ آیا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ جاتے وقت ریاست رام پور سے مولانا کو مالی امداد ملی تھی یا نہیں۔ قارئین جامعہ کی دلچسپی اور معلومات کے لیے یہ حصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے (ادارہ)

محترم اعظمی صاحب ! سلام ورحمت

"آخر میں چلتے چلتے ایک بہت ہی پرانی بات کو تازہ کر رہا ہوں جس کو مرور ایام کے باعث ایک طرح سے فراموش کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ جوہر صدی کے موقع پر کثرت سے مولانا مرحوم پر مضمون لکھے گئے لیکن اس کا حوالہ کہیں بھی نظر سے نہیں گزرا وہ یہ ہے کہ:

فروری ۱۹۳۲ء میں مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی نے مولانا شوکت علی صاحب سے خاص طور سے یہ فرمائش کی تھی کہ وہ محمد علی کے حالات قلمبند فرمائیں۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ رئیس احمد جعفری کی سیرت محمد علی ابھی شائع نہیں ہوئی تھی، چنانچہ اخبار خلافت بمبئی کی اشاعت ۲۹ مارچ ۱۹۳۲ سے ۲۱ مئی ۱۹۳۲ء کی اشاعتوں میں ۱۴ قسطوں میں محمد علی کی پیدائش، بچپن، ابتدائی تعلیم، خاندانی حالات اور علی گڑھ کی تعلیم، پھر روانگی انگلستان، واپسی وطن، شادی، ملازمت رام پور اور استعفیٰ، بڑودہ کی ملازمت تک کے واقعات ہیں جو بہت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

اس کے بعد مولانا شوکت علی کی سیاسی اور قومی مشغولیات کی وجہ سے یہ مفید سلسلہ

جاری نہ رہ سکا، اگرچہ ۳۱ جولائی ۱۹۳۲ء کو مولانا دریا آبادی نے مولانا شوکت علی کو پھر توجہ دلائی کہ یہ سلسلہ قائم رکھا جائے، تاکہ محمد علی کے سوانح نگار کا کام آسان ہو جاتے۔ مذکورہ بالا مضمون کی قسط ۷ ویں میں مولانا شوکت علی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ انگلستان کے تعلیمی اخراجات کے لیے انھوں نے نواب رام پور سے ۱۰ ہزار روپیہ، ایک ہزار روپیہ سالانہ واپسی کی قسط کی شرط پر قرض لیا۔

اس سے اس دعوے کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے کہ نواب محمد اسحٰق خاں صاحب کی تحریک پر نواب صاحب رام پور کی مالی امداد پا کر مولانا محمد علی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان گئے۔

محمد ظہیر وارثی

مدیر معاون

مولانا محمد علی نمبر کے لیے رام پور سے ایک مضمون موصول ہوا ہے، جو جون ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا تھا، گویا جب مولانا مزید تعلیم کے لیے یورپ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس مضمون میں امداد کی یہ رقم آٹھ ہزار درج ہے، البتہ واپسی کی قسط وہی ہے جو مولانا شوکت علی مرحوم نے لکھی ہے، یعنی ایک ہزار سالانہ۔ بہرحال یہ بات تو اب صاف ہو گئی کہ مولانا کو ریاست رام پور سے مالی امداد ملی تھی، خواہ وہ قرض کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ اب غور طلب مسئلہ صرف یہ ہے کہ یہ قرض واپس بھی کیا گیا یا نہیں۔ اگر نہیں کیا گیا تو اسے وظیفہ سمجھا جا سکتا ہے جو کسی مصلحت سے قرض کے نام پر دیا گیا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں اتنی بڑی رقم یا اس کی کوئی قسط واپس کرنا ممکن نہیں تھا، البتہ زمانۂ ملازمت میں یہ ممکن تھا، مگر رام پور میں مولانا کی ملازمت اور اس کی جو تفصیلات رام پور گزٹ میں شائع ہوئی ہیں، ان میں اس قرض کی واپسی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سلسلے میں نواب صاحب کے دو فرمان ملاحظہ ہوں:

۱۔ "روبکار اجلاس جناب نواب بہادر دام اقبالہم وملکہم والی ریاست رام پور"

... مسٹر محمد علی کو اس وجہ سے کہ وہ رام پور کے رہنے والے ہیں اور انھوں نے ولایت میں بھی تعلیم پائی ہے، تین سو روپے ماہوار پر ایجوکیشن افسر تقرر فرماتے

ہیں۔ مسٹر محمد علی انگریزی اسکول رام پور کی اعلیٰ جماعتوں کو پڑھائیں گے اور مدارس انگریزی و اردو کی نگرانی کرتے رہیں گے۔"

(رام پور گزٹ، ۲۷ر جنوری ۱۹۰۲ء)

۲۔ "مسٹر محمد علی افسر سررشتہ تعلیم کی رخصت رعایتی سہ ماہ منظور کی جاتی ہے۔ تین مہینے کی تنخواہ بھی ان کو پیشگی دی جائے، لیکن اب ان کو تین برس تک کسی قسم کی رخصت نہیں ملے گی۔ ان کے بھتے کا معاملہ جو زیر تجویز ہے، وہ بعد از واپسی نیپال طے ہوگا۔"

(رام پور گزٹ، ۱۳ر مارچ ۱۹۰۳ء)

کام کی تفصیل، تنخواہ، رخصت اور بھتہ وغیرہ جزئیات کا گزٹ میں ذکر ہے، اگر قرض کی واپسی کا معاملہ ہوتا تو کسی نہ کسی نوعیت سے اس کا بھی ذکر ہوتا۔ بہرنوع مولانا محمد علی پر کام کرنے والوں کے لیے، تحقیق کا ایک نیا پہلو سامنے آیا ہے۔ صلائے عام ہے "یارانِ نکتہ داں" کے لیے۔

اگلا شمارہ مولانا محمد علی نمبر

جامعہ کا اگلا شمارہ مولانا محمد علی نمبر ہوگا جو نومبر اور دسمبر کے دو شماروں پر مشتمل ہوگا اور امید ہے کہ جنوری ۱۹۸۰ء کے وسط میں شائع ہوگا، اس لیے قارئین جامعہ سے درخواست ہے کہ وہ نومبر اور دسمبر میں جامعہ کا انتظار نہ کریں۔

(ادارہ)

کوائف جامعہ

شیخ الجامعہ صاحب کی صحت : جامعہ کی پچھلی اشاعت میں شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب کی علالت کی خبر دی گئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اچھے ہو کر ہسپتال سے واپس آ گئے ہیں اور معمول کے مطابق کام کر رہے ہیں۔

جلسہ یوم تاسیس : حسب معمول ۲۹ر اکتوبر کو روایتی جوش و خروش کے ساتھ جامعہ کا یوم تاسیس منایا گیا۔ اس مرتبہ جلسے کا انتظام ٹیچرز کالج کے طلبا نے کیا تھا۔ اس جلسے کے خصوصی مہمان جامعہ کے قدیم طالب علم اور ٹیچرز کالج کے سابق اور پہلے پرنسپل جناب سعید انصاری صاحب تھے جنھوں نے جامعہ کی خصوصیات پر تقریر کی، نیز جامعہ کے ایک قدیم طالب علم اور دارالعلوم دیوبند کے استاد جناب عزیز احمد قاسمی وجامعی نے اپنے زمانے کی جامعہ پر ایک مختصر مضمون پڑھا۔ ان کے علاوہ جامعہ کے مختلف اداروں کے طلبا اور طالبات نے جامعہ کے بارے میں مضامین اور نظمیں پڑھیں۔ آخر میں قائم مقام شیخ الجامعہ جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں جامعہ کے مقاصد کا ذکر کیا اور اس کے تمام بانیوں کی خدمات پر روشنی ڈالی، چونکہ ابھی حال میں مولانا محمد علی کا برصغیر ہند و پاک میں صد سالہ یوم پیدائش منایا گیا تھا اور خود جامعہ میں مرحوم کے بارے میں ایک سمینار منعقد ہوا تھا، اس لیے مولانا کی خدمات کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔

مولانا محمد علی پر ایک سمینار : مولانا محمد علی مرحوم کے صد سالہ یوم پیدائش کے سلسلے میں، جامعہ کے شعبۂ تاریخ کے اہتمام میں ۲۶ر تا ۲۸ر اکتوبر کو جامعہ میں ایک سہ روزہ کل ہند سمینار منعقد ہوا، جس کا افتتاح

امیر جامعہ جناب محمد ہدایت اللہ صاحب، نائب صدر جمہوریہ نے فرمایا۔ قائم مقام شیخ الجامعہ جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے امیر جامعہ اور ڈیلیگیٹوں کا خیر مقدم کیا اور سمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر مشیر الحسن صاحب نے سمینار کے موضوع: "مولانا محمد علی اور ہندوستانی قومیت (۱۹۰۶ء - ۱۹۳۱ء)" پر عالمانہ روشنی ڈالی۔ اس سمینار میں اردو انگریزی میں تقریباً ۲۵ مقالے پڑھے گئے۔ اس موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کی طرف سے مولانا پر ایک نمائش کا انتظام کیا گیا تھا جس کا افتتاح بھی امیر جامعہ صاحب نے فرمایا۔

ڈاکٹر انصاری مرحوم کا صد سالہ یوم پیدائش: ۲۵ دسمبر ۱۹۷۹ء کو دوسرے امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی پیدائش کو سو سال ہو جائیں گے، اس لیے چوتھے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کے مکان پر ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں صاحب خانہ کے علاوہ شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی، کرنل بشیر حسین زیدی، جناب ضیاء الحسن فاروقی، پروفیسر اظہر انصاری، جناب عتیق صدیقی، جناب شہاب الدین انصاری، ڈاکٹر مشیر الحسن اور عبد اللطیف اعظمی نے شرکت کی۔ اس میں طے پایا کہ مرحوم کے صد سالہ یوم پیدائش کے انتظام کے لیے شیخ الجامعہ صاحب ایک کمیٹی تشکیل فرما دیں اور جلد ہی کسی مناسب موقع پر ایک عام جلسہ منعقد کیا جائے جس میں ملک کے ممتاز رہنما اور دانش ور مرحوم کی شخصیت اور خدمات پر روشنی ڈالیں اور اس موقع پر صدی سال کا اعلان کیا جائے۔ (کوائف نگار)

براہ کرم نوٹ فرما لیجئے کہ

نومبر اور دسمبر ۱۹۷۹ء کا جامعہ مولانا محمد علی نمبر ہوگا اور جنوری میں شائع ہوگا۔ (ادارہ)

gd. No D-(S)-110 Vol. 76 No. 10 October, 1979

The Monthly JAMIA

JAMIA MILLIA ISLAMIA
NEW DELHI-110025

ماہنامہ جامعہ دہلی

مدیر: ضیاء الحسن فاروقی — مدیر معاون: عبداللطیف اعظمی
سالانہ چندہ: چھ روپے — قیمت فی کاپی: پچاس پیسے

جلد ۷۶ | بابت ماہ نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء | شمارہ ۱۱، ۱۲

مولانا محمد علی نمبر

ماہنامہ جامعہ کے پچھلے شمارے میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ مولانا محمد علی نمبر، جو نومبر اور
دسمبر ۱۹۷۹ء کے شماروں پر مشتمل ہوگا، وسط جنوری ۱۹۸۰ء تک شائع ہوگا، آج ۱۲ جنوری
ہوگئی ہے مگر افسوس کہ ہماری توقعات کے خلاف اب تک کتابت مکمل نہ ہوسکی، اس
تاخیر کی بڑی وجہ لوک سبھا کے وسط مدتی انتخابات ہیں جن کی وجہ سے کتابت کی راہ میں
بڑی مشکلات پیدا ہوگئی تھیں۔ رسالے کو پوسٹ کرنے کے لئے ہم ڈاکخانہ سے دوسری
[تار]یخ پہلے سے لے چکے ہیں، اس لئے مجبوراً یہ چار ورقی ایڈیشن نکالا جا رہا ہے، تاکہ
[ڈاک]خانہ پری بھی ہوجائے اور قارئین جامعہ کو صحیح صورت حال کی اطلاع بھی مل جائے۔
اب ان شاء اللہ محمد علی نمبر اگلے مہینے (فروری) کے پہلے ہفتے میں چھ یا سات تاریخ
[تک پوس]ٹ ہوگا، ہماری کوشش تو یہی ہوگی لیکن اگر اتفاق سے مزید تاخیر ہوگئی تو یہ چھ روز
[سے زیاد]ہ نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر ۱۸، ۱۹ فروری تک رسالہ نہ ملے تو قارئین پریشان نہ ہوں،
[۲۰]، ۱۹ تک نہ ملے تو ہمیں فوراً اطلاع کریں ورنہ بعد میں یہ خصوصی نمبر دوبارہ

بھیجنا ہمارے لئے مشکل ہوگا۔

ہمارا اندازہ ہے کہ یہ خصوصی شمارہ تقریبا سو صفحات کا ہوگا اور اس کی قیمت ۴ روپے ہوگی مگر جامعہ کے مستقل خریداروں سے اس کی الگ سے کوئی قیمت نہیں لی جائے گی۔ البتہ جن لوگوں کا چندہ دسمبر ۷۹ء کو یا اس سے پہلے ختم ہوگیا ہے، براہ کرم وہ نئے سال کے لئے جلد سے جلد اپنا سالانہ چندہ ضرور بھیج دیں تاکہ یہ خصوصی شمارہ انہیں وقت پر ضرور مل جائے۔

اس وقت تک ہمیں جو مضامین موصول ہوچکے ہیں اور جن میں سے بیشتر کی کتابت ہوچکی ہے۔ اور باقی کی ہورہی ہے ان کی فہرست حسب ذیل ہے :

۱۔ حالات زندگی

۱۔ مولانا محمد علی کی ابتدائی زندگی	مولانا شوکت علی مرحوم
۲۔ مولانا محمد علی پر پہلا مضمون خاندانی حالات اور ریاست کی امداد	محمد اعزاز الدین
۳۔ مولانا محمد علی مرحوم	ضیاء الرحمن بچھرایونی
۴۔ مولانا محمد علی کی صحافتی زندگی	قاضی عبدالغفار مرحوم
۵۔ بیگم محمد علی کے خطوط آخری ایام	امجدی بیگم مرحومہ

۲۔ سیاسی، صحافتی اور ادبی خدمات

۱۔ ہندوستانی سیاست میں محمد علی کا حصہ	معین شاکر ترجمہ : محمد خلیق
۲۔ مولانا کی صحافت نگاری	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید
۳۔ کلام جوہر چند تبصرے	مختلف رسالے

۳۔ بزرگ اور ساتھی

۱۔ مولانا محمد علی اور اقبال — سید نذیر نیازی

۲۔ محمد علی ۔ پیر بھائی — مفتی محمد رضا انصاری

۳۔ محمد علی اور جواہر لال نہرو — ڈاکٹر محمد سلیم قدوائی

۴۔ بزرگ، معاصر اور رفیق کار — عبد اللطیف اعظمی

۴۔ متفرقات

۱۔ وفات جوہر پر اقبال کی دو تضمینیں

۲۔ کوائف جامعہ (مولانا سے متعلق) — کوائف نگار

۳۔ تبصرے (مولانا سے متعلق) — عبد اللطیف اعظمی

جامعہ ملیہ میں مولانا محمد علی مرحوم پر سیمینار ہوا تھا اس کے بعض مقالوں کا ترجمہ ہو رہا ہے، اس کے علاوہ کچھ لوگوں نے مضامین بھیجنے کا وعدہ کیا ہے اگر بر وقت مل گئے تو انھیں بھی شامل کر لیا جائے گا۔

مولانا محمد علی نمبر

۱۴ر فروری ۱۹۸۰ء کو یقینی طور پر روانہ کیا جائیگا

(ادارہ)

مولانا ظفر علی خاں مرحوم

زعیم ہند مولانا محمد علی مرحوم

جس وقت ہو رہی تھی خلافت میں کاٹ چھانٹ
اور دشمنوں کی زد میں درِ دانیال تھا

خیبر سے چل کے تا بہ سوادِ طرابلس
پھیلا ہوا صلیب پرستوں کا جال تھا

مغرب کا عزم تھا کہ عرب پارہ پارہ ہوں
ایرانیوں کی تاک میں دیو شمال تھا

برقِ فرنگ کو ند رہی تھی حجاز پر
ناموس خواجہ دوسرا پائمال تھا

دیتا تھا بوسہ قدس لوائے صلیب کو
لتھڑا ہوا لہو میں نشان ہلال تھا

ارضِ حرم تھی خون مسلمانوں سے لالہ رنگ
اسلام کا خود اپنے ہی گھر میں یہ حال تھا

اس جاں گسل جہاد میں کیونکر شریک ہو
ہندوستاں کا عقدہ یہی اک سوال تھا

آخر کیا یہ عقدہ محمد علی نے حل
حالانکہ ساری قوم میں قحط الرجال تھا

محروم تھا اگرچہ وہ تیغ و تفنگ سے
لیکن زبان میں جوہر سحر حلال تھا

ملت کے احتجاج کی قوت تھی پشت پر
اور آ گئے آگے اس کے نبی کا جلال تھا

اس لشکر گراں نے نصاریٰ کو دی شکست
ممکن وہ ہو گیا جو اک امر محال تھا

دیتا گیا جو فتح مبین کی ہمیں نوید
اسلام کا یہ قاصدِ فرخندہ فال تھا

ہند اور عرب کو جس نے ہم آغوش کر دیا
پیوند قدس ہو کے وہ اس کا وصال تھا

میں اس کے حق میں اس کے سوا اور کیا کہوں
ہندوستان میں آپ وہ اپنی مثال تھا

کرم آباد ۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۳۴ء

حضرت جوش ملیح آبادی

رئیس الاحرار

اے متاعِ بردۂ ہندوستان الیسبا | اے کہ تھا ناخن پہ تیرے عقدۂ حق کا مدار
عرش تھا کاوش پہ تیری اندازۂ صبح و مسا | ختم تھی قدموں پہ تیرے نیرنگیِ لیل و نہار
اے غرورِ ملک و ملت تو وہاں لیتا تھا سانس | موت جس عالم میں بنتی ہے حیاتِ پائدار
وقت کے سیلاب سے تیرا سفینہ ہے بلند | سیرتِ پیغمبرِ اسلام کے آئینہ دار
تجھ کو بخشی تھی مشیت نے وہ برتر زندگی | جس بہادر زندگی پر موت کو آتا ہے پیار
تیرے آگے لرزہ بر اندام تھی روحِ فرنگ | اے دلِ ہندوستاں کے عزمِ تند و استوار
طنطنے سے تیری ہیبت آفریں آواز کے | تھی حسین ابن علی کی استقامت آشکار
ڈوب جاتی تھی دلِ باطل میں لہراتی ہوئی | تیرے لہجے میں لچکتی تھی وہ تیغِ آبدار
موڑ کر رکھ دی تھی تو نے جنگ کے میدان میں | اہلِ بدعت کی کلائی خنجرِ قاتل کی دھار
تجھ سے آتا تھا پسینہ افسر و اورنگ کو | اے کہ تھی ہمت تری قوت شکن سلطاں شکار
خوں میں تیرے یہاں تھی جنبشِ فیضِ علی | خون میں تیرے ودیعت تھا مزاجِ ذوالفقار
تیری سیرت میں تھی مضمر صولتِ پیغمبری | تیری فطرت میں تھی پنہاں سطوتِ پروردگار

روئے ملت پہ ہے تیری موت کی تابندگی
کج ہوئی جاتی ہے ماتھے پر کلاہِ افتخار

نا محمد علی کی تیسری برسی کے موقع پر ۱۹۳۴ء میں روزنامہ خلافت مولانا محمد علی نمبر میں یہ نظم شائع ہوئی تھی)

محمد علی نمبر کے بارے میں ایک مفید مشورہ

مورخہ ۲۴ دسمبر ۷۹ء

معظمی اعظمی صاحب، سلام و رحمت

جناب کے ارسال کردہ پوسٹ کارڈ کا جواب موصول ہوا ہوگا۔ اس خط کی روانگی کے غالباً دوسرے دن ناگپور جانا ہوا وہاں ایک عزیز کے پاس جامعہ کا محمد علی نمبر تھا، دن بھر پوری یکسوئی کے ساتھ پڑھتا رہا۔ علامہ شبلی اور دار المصنفین سے مولانا محمد علی مرحوم کے تعلقات پر محمد علی نمبر میں ڈاکٹر نعیم صدیقی صاحب نے سیر حاصل روشنی ڈالی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ واقعہ نگاری کے صحیح حق ادا کر دیا ہے۔

محمد علی نمبر کے مضمون "مولانا محمد علی کے خاندانی حالات" کے ختم پر صفحہ ۴۸۱ پر جو جناب کا نوٹ ہے اس میں بیگم محمد علی کا تذکرہ ذرا کھل کر ہونا چاہئے تھا، "مولانا کی وفات کے وقت وہ ساتھ تھیں" بس اس پر جملہ ختم ہو جاتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ملک و ملت کی تاریخی اور عظیم خدمات جو بیگم صاحبہ نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک انجام دی میں طبقہ نسواں میں ان جیسی منتظم اور سلیقہ شعار خاتون کی مسلمانان ہند میں پھر کوئی دوسری مثال نہیں پیدا ہو سکی۔ ۲۹ مارچ ۱۹۴۷ء کو بیگم صاحبہ کا بمبئی میں ۶۳ سال کی عمر میں انتقال ہوا اور خلافت ہاؤس کے احاطے میں صدر دروازے کے بالمقابل دفن ہوئیں۔ پورا ملک اس حادثہ میں سوگوار رہا اور اس وقت کے تمام زعمائے ملت نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا، خاص طور سے مہاتما گاندھی نے مولانا کی صاحبزادی گلنار کو تعزیتی پیغام بھیجا تھا۔

یہی کیفیت زاہد علی اور مولانا محمد علی کی بڑی صاحبزادی زہرہ کے ذکر میں ہے۔ یہاں بھی مختصر طور پر اگر یہ باتیں ظاہر کر دی جائیں تو مولانا کے خاندانی حالات کے آخر کا علم قارئین

جامعہ کو ہوجاتا کہ مولانا کے بھتیجے اور داماد زاہد شوکت علی کی وفات ۲۸ نومبر ۳۸ء کے بعد مرکزی خلافت کمیٹی کے سکریٹری اپنی وفات ۱۹ دسمبر ۶۵ء تک رہے، اخبار خلافت انہیں کی نگرانی میں جاری رہا اور ایک مدت تک خلافت ہاؤس کی سرگرمیاں انہیں کی ذات سے وہاں باقی رہیں۔ زاہد علی صاحب کی وفات بمبئی میں ہوئی اور ناریل باڑی بمبئی کے قبرستان میں وہ دفن ہوئے

مولانا محمد علی کی سب سے بڑی صاحبزادی زہرہ کی شادی زاہد علی صاحب سے ہوئی تھی زہرہ اپنے اکلوتے فرزند طارق علی کے ساتھ کراچی پاکستان میں سکونت پذیر ہوگئی تھیں وہاں جنرل محمد ایوب خاں صدر مملکت پاکستان نے جو مولانا محمد علی کے خاص عقیدت مند بھی تھے، زہرہ کو از راہ قدردانی پانچ سو روپیہ ماہواری تاحیات پنشن مقرر کر دی تھی۔ یہاں یہ واقعہ تاریخی اعتبار سے لائق تحریر ہے کہ صدر جنرل محمد ایوب خاں پہلے صدر مملکت ہیں جنھوں نے ۱۲ نومبر ۶۶ء کو مزار مولانا محمد علی پر حاضری دی اور احترام و اکرام کے ساتھ فاتحہ خوانی اور خراج عقیدت پیش کیا،

زہرہ کی وفات کراچی میں یکم دسمبر ۱۹۷۷ء کو ۷۵ سال کی عمر میں ہوئی وہ مولانا محمد علی کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں اور ان کی وفات پر اب مولانا کی کوئی اولاد باقی نہیں رہی صرف نواسے طارق علی کراچی میں موجود ہیں جو نسلی اعتبار سے علی برادران کی واحد یادگار ہیں۔ کاش مذکورہ بالا واقعات جامعہ کے دوسرے محمد علی نمبر میں کسی طور سے شائع ہو سکتے

امید کہ مزاج گرامی بعافیت ہونگے۔

آپ کا مخلص

محمد طہیر وارثی

مقام کامٹی ضلع ناگپور مہاراشٹر

Regd. No. D(SE) Vol 76 No. 12 Dec. 1979

THE MONTHLY JAMIA

مطائبات محمد علی

مولانا محمد علی مرحوم کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی بہت مشہور ہے۔ اس قسم کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

مسجد کانپور کے ایجی ٹیشن کے زمانے ۱۹۱۳ء میں ایک مرتبہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم دہلی تشریف لائے مولانا محمد علی مرحوم سے ان کے گہرے اور دیرینہ تعلقات تھے اس لئے ان کے اعزاز میں ایک ڈنر دیا جس میں دہلی کے بہت سے معززین نے شرکت کی۔ دعوت کے بعد میزبان کی فرمائش پر مولانا نے اپنی چند رباعیاں سنائیں جو سب کی سب مسجد کانپور سے متعلق تھیں۔ اس کے بعد مولانا محمد علی کی مساعی جمیلہ کا اپنے مخصوص انداز میں ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ: میں نے جن جن اشخاص کے ناموں میں محمد اور علی کا اجتماع دیکھا ہے انھیں ہمیشہ ممتاز پایا۔ محمد علی خاموشی سے اپنی تعریف سنتے رہے اور جب مولانا کی بات ختم ہوئی تو فوراً فرمایا: "محمد علی والی ایران کو آپ بھول گئے" اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ (محمد علی شاہ کے خلاف اس وقت قومی تحریک زوروں پر تھی۔)

"ہمدرد" کی نشاۃ ثانیہ کے بعد اس کی پہلی سالگرہ کے موقع پر مولانا محمد علی نے معززین شہر اور ممتاز صحافیوں کو ایک پر تکلف ڈنر دیا۔ مجلس ادارت کی طرف سے مولانا محمد عارف ہسوی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور مہمانوں کی طرف سے حکیم اجمل خاں مرحوم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا: خدا کرے ایسی سالگرہ ہر تیسرے مہینے آیا کرے۔ اس پر فوراً مولانا محمد علی نے فرمایا: "پھر اخبار کا چندہ بھی اسی حساب سے لیا جایا کرے گا"

طابع و ناشر:- عبد اللطیف اعظمی مطبوعہ:- جمال پریس دہلی